تالیفاتِ عثمانی
جلد (۱)

- اسلام کے بنیادی عقائد
- اسلام اور معجزات
- اعجاز القرآن
- الروح فی القرآن
- المعراج فی القرآن
- العقل والنقل
- ہدیہ سنیہ
- تحقیق الخطبہ
- سجود الشمس
- مسئلہ تقدیر
- الشہاب



شیخ الاسلام حضرت علامہ
شبیر احمد عثمانی
قدس سرہ

محدث دار العلوم دیوبند

کے اہم علمی و دینی رسائل کا مجموعہ



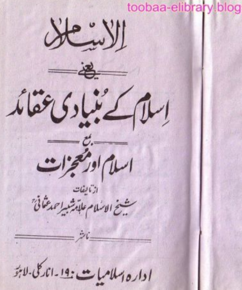
ناشر
ادارہ اسلامیات
۱۹۰-انارکلی
لاہور ۲

طباعت اول : صفر المظفر ۱۴۱۱ھ
: ستمبر ۱۹۹۰ء
باہتمام : اشرف برادران سلمہم الرحمان
ناشر : ادارہ اسلامیات، لاہور
مطبع :
قیمت :

ملنے کے پتے

ادارہ اسلامیات ۱۹۰ انارکلی لاہور
دارالاشاعت، اردو بازار، کراچی
ادارۃ المعارف۔ دارالعلوم کورنگی، کراچی
مکتبہ دارالعلوم۔ دارالعلوم کورنگی، کراچی

رسائل کے عنوانات



الاسلام

یعنی

اسلام کے بُنیادی عقائد

مع

اسلام اور معجزات

از تالیفات

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ

ناشر

ادارہ اسلامیات نمبر ۱۹۰۔ انار کلی۔ لاہور

فہرست عنوانات

اسلام کے بُنیادی عقائد

عرضِ ناشر

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کا برصغیر میں جو علمی و دینی مقام ہے وہ اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں مولانا علمی و عملی کمالات کا مجموعہ زہد و تقویٰ کی تصویر، اور شرافت و ذہانت، کا نادر نمونہ تھے، شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسنؒ کے خصوصی تلامذہ میں سے تھے۔ دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے اور وہیں ایک عرصہ تک تفسیر و حدیث کی درس و تدریس میں مشغول رہے۔

قیامِ پاکستان کی تحریک میں اپنے ہمراہیوں مولانا ظفر احمد تھانویؒ اور مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم، وغیرہ کے ہمراہ عظیم اور نمایاں خدمات انجام دیں۔ اور قیامِ پاکستان کے بعد اسلامی دستور، اور اسلامی قوانین کے نفاذ کے لیے مقدور بھر کوشش کرتے رہے۔ افسوس کہ اب تدریج مولانا کے علمی اور عملی کارنامے لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہوتے جا رہے ہیں۔ اور نئی نسل مولانا کے بارے میں یہ تک نہیں جانتی کہ پاکستان کے قیام کے لئے اُنہوں نے کتنی قربانیاں دی ہیں اور یہ کہ مولانا کا علمی دُنیا میں کیا مقام ہے۔ اسی ضرورت کا احساس کرتے ہوئے "ادارہ اسلامیات" کی جانب سے مولانا کے تحریر فرمودہ رسائل اور کتب کی اشاعت کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔

اس سلسلہ میں مولانا کے تحریر فرمودہ دو رسائل "اعجاز القرآن" اور "العقل والنقل" اس سے قبل زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر قبولیت عام حاصل کر چکے ہیں اور یہ مجموعہ بھی اُسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

زیرِ نظر مجموعہ میں شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے دو رسالے شامل ہیں۔ پہلا رسالہ الاسلام جو "اسلام کے بنیادی عقائد" کے نام سے پیش خدمت ہے دوسرا خوارقِ عادات جو "اسلام اور معجزات" کے نام سے پیش کیا جا رہا ہے۔

پہلے رسالہ میں حضرت شیخ الاسلامؒ نے اسلام کے بُنیادی عقائد، خدا کا وجود، توحید، نبوت، قیامت، ملائکہ اور شیاطین کا وجود جیسے اہم اور نازک مسائل پر انتہائی دلنشین اور سلیس انداز سے بحث کی ہے۔ بیان اس قدر شگفتہ اور انداز اس قدر دلآویز ہے کہ مذہب اسلام کی حقانیت دل کی گہرائیوں میں اُترتی چلی جاتی ہے۔

دوسرے رسالہ میں مولاناؒ نے معجزات کے وجود پر بحث کی ہے اور اپنے مخصوص انداز سے ثابت کیا ہے کہ معجزات کا وجود برحق اور عین قوانین قُدرت کے مُطابق ہے۔ اسی ضمن میں علامہؒ نے ارہاص کی تعریف اور کرامت، اور استدراج کے درمیان فرق کو بھی خوب واضح کر دیا ہے

اللہ تعالیٰ حضرت مولانا کی دیگر تصانیف کی طرح ان رسالوں کو بھی قبولیت عامہ سے نوازے آمین۔ والسلام

ناشر



اسلام

بِسمِ اللہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیم، نَحمَدُہٗ وَنُصَلِّی عَلٰی رَسُولِہِ الکَرِیم، وبعد

یہ مبارک عنوان جس کی بقدر مناسب تفصیل لکھنے پر آج میری خوش قسمتی اور سعادت نے مجھ کو آمادہ کیا ہے جس قدر اپنے تلفظ کی حیثیت سے چھوٹا، مختصر اور مفرد دکھائی دیتا ہے اسی قدر اپنی معنوی وسعت کے اعتبار سے تفصیل طلب اور دِقت خیز ہے۔ اسلام کی تاریخ اس کی صداقت، اس کے فوائد اس کے برکات، اور اس کی ترقی و تنزل کی داستان بے حد پُر نتائج اور دلچسپ ہونے کی وجہ سے اگرچہ اس قلیل وقت میں پوری نہیں ہو سکتی جو اس تحریر کے لکھنے میں میں اپنے پاس سے صرف کر سکتا ہوں لیکن محض یہ نیت کر کے کہ ایسے مقدس اجلاس کے سلسلہ میں مضامین کا اس طرح کہ اہم اور ضروری عنوان سے خالی رہنا بھی شاید بہتر علامت نہ ہو، میں نے یہ کوشش کی ہے کہ اپنی بے بضاعتی اور کم مائیگی کا اقرار کر دینے کے بعد بہ کمال اختصار اسلامی اصول کو جس طرح پر کہ میں سمجھا ہُوا ہُوں اپنی قوم اور احباب کے رُوبرُو پیش کر دوں تاکہ ہمارا یہ مجمع اسلام کے بابرکت تذکرہ کے ثواب سے محروم نہ رہے اور مولینا عبیداللہ صاحب کے

حکم کی دجنہوں نے میرے دل میں اس مضمون کی تحریک پیدا کی) تعمیل نہ کرنے کا بھی مجھ کو گنہگار نہ ہونا پڑے

اس میں کچھ شک نہیں کہ مجھ سے پہلے سینکڑوں مصنفین نے اسی مضمون پر مستقل کتابیں لکھی ہیں اور ہزاروں فضلاء اسی عنوان پر خامہ فرسائی کر چکے ہیں اور لاکھوں پیرایوں میں انہیں مسائل کا اعادہ ہو چکا ہے اور بے شمار آدمی اس موضوع پر اپنی جادو بیانی کا ثبوت دے چکے ہیں اور ایسی حالت میں ہماری اس ناچیز تحریر کی کوئی وقعت قائم ہونا نہایت مشکل ہے لیکن ہم خوش ہیں کہ ہم کو اپنے مضمون کی وقعت قائم کرنے کی خلش ہرگز دامن گیر نہیں ہے اور نہ ہمارے دل میں یہ تمنا ہے کہ ہمارے ہر ہر جملہ پر واہ واہ کے نعرے بلند کئے جاویں یا احسنت اور مرحبا کی صداؤں سے آسمان سر پر اُٹھایا جاوے یا بات بات پر سُبحان اللہ اور الحمدللہ کا وِرد پڑھا جاوے

ہماری صرف ایک ہی آرزو ہے، اور اسی میں کامیاب ہونے کو ہم اپنی محنت کا اصلی صلہ سمجھتے ہیں وُہ یہ ہے کہ جو دلی خیالات ہم نہایت صفائی کے ساتھ عام پبلک میں پیش کریں گے اگر سچائی اور راستی پر مبنی ہیں اور درحقیقت ان خیالات کا ماننے والا حیاتِ ابدی کا مستحق ہو سکتا ہے تو اہل عقل ان کی تصدیق فرما کر ہم کو راحت اور تسلی بخشیں اور اگر فی الواقع ان خیالات کو ہم نے اپنی غلطی سے دل میں جما لیا ہے یا ان کے تسلیم کرنے میں اوہام کی آمیزش لگی ہوئی ہے یا کسی کو زمانہ

تقلید اور بے جا حسن ظن کی وجہ سے اُنہوں نے ہمارے دل میں راہ پالی ہے تو براہِ نوازش ہماری غلطیوں پر ہم کو متنبہ فرما کر ایک گم گشتہ راہ کی ہدایت کا اجر جو خدا کے یہاں سے مل سکتا ہے اپنے دفترِ حسنات میں درج کرانے کی کوشش کریں۔

سامعین کو یہ مَیں اطمینان دلاتا ہُوں کہ میری تحریر کا عام ماخذ اگرچہ اکابرِ سلف کی تصنیفات سے باہر نہ ہوگا، لیکن اس کا پیرایۂ بیان اور ترتیبِ دلائل جُداگانہ طرز پر ہوگی اور شاید اصولِ اسلام کے ضمن میں بعض ایسے مضامین بھی نظر پڑیں گے جن کی اس قدر تفصیل دُوسری کتابوں میں نہ مل سکے گی کیوں کہ اسلام کی فیض رسانی ہر خاص و عام اور ہر عالم و جاہل کے واسطے ہے اور اس کے اسرار اور فیوضِ عامہ کسی شخص پر ختم ہونے والے نہیں ہیں وہ اسلام جس کے چشمہ سے قطرہ قطرہ آبِ حیات بن کر نکلا ہے۔ جس کے خزانے میں سے علم و معرفت کے لعل و جواہر تقسیم ہوتے رہے ہیں جس کی عالمگیر روشنی سے دُنیا کا ذرہ ذرہ جگمگا اُٹھا ہے وہ اپنے اخیر زمانہ کے پیروؤں کو اپنی فیاضی سے محرُوم رکھے اور اپنے ایک سچے مناقب و کمالات بیان کرنے والے کی کچھ امداد نہ کرے یہ بالکل قیاس سے باہر ہے۔

مَیں یقین کرتا ہُوں کہ میری تقریر کا روشن عنوان اس مضمون میں خود میری رہبری کرے گا اور اگر اور کچھ نہیں تو اس سے بھی کیا کم کہ ایک ایسے اولوالعزم مذہب کے نام لینے ہی سے میری تقریر کی کافی حد تک عزت کی جا سکے گی۔

یہ بالکل یقینی بات ہے کہ اسلام کے یا اور کسی مذہب کے غیر متناہی فروع کا احاطہ کرنا اور ہر ایک جزئی جزئی کو دلائل یا قیاسات سے ثابت کر دکھانا صرف دشوار ہی نہیں بلکہ فضُول اور بے کار بھی ہے کیوں کہ جب ایک مذہب کے تمام اصُول بروئے عقل و انصاف تسلیم کر لئے گئے تو فروعات اور جزئیات کے ماننے میں انکار کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ سکتی، اس لئے ہر مذہب و مِلّت کی جانچ اس کے اصُول اور کلیات ہی کی صداقت سے کی جائے گی اور اس کی حقانیت کی پڑتال کا بھی بہتر اور آسان ذریعہ قرار پائے گا۔

اس قید کو ملحُوظ رکھ کر ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ اسلام کے اصول بلکہ (تنگیٔ وقت کا لحاظ کر کے) اصل الاصُول کہاں تک عقلِ صحیح اور فطرتِ سلیمہ کے زیرِ حمایت ہیں وُہ انسان کی فلاح و بہبُود کی کس حد تک کفالت کر سکتے ہیں۔ دُنیا کے دُوسرے شاندار مذاہب سے ان کو کیا فوقیت اور امتیاز حاصل ہے اُنہوں نے بندوں کے دلوں میں خدا کی کیسی قدر و منزلت قائم کرائی ہے اور پیغمبروں کا کس قسم کا احترام منوانے کی کوشش کی ہے۔ اگر ہم اپنی اس تحقیق میں جس کا مدار محض نیک نیّتی پر ہوگا خاطر خواہ کامیاب ہو گئے تو یوں سمجھو کہ ہم نے اپنی زندگی کا ایک بڑا بھاری فرض ادا کر لیا، اور بہت سے دوستوں کو جو مجھ ہی جیسے ہوں سخت محنت اور کدّ و کاوش اور دردِ سری سے نجات دلا دی اور ہزار ہا بندگانِ خُدا کو تفتیشِ مذاہب میں ایک طویل جانکاہی سے بچا دیا۔

ہاں یہ بات بار بار یاد دلانے کے قابل ہے کہ اس مختصر تحریر میں جو کچھ مذکور ہوگا وہ طویل و عریض بیانات نہ ہوں گے، نہ کثیر التعداد علماء کی رایوں کا استقصا اور موازنہ کیا جاوے گا اور نہ بے انتہا کتابوں کے حوالے درج ہوں گے کیوں کہ ان مباحث کے لئے ہم نے خود ایک ایسی مبسوط اور مستقل تصنیف کا ارادہ کر رکھا ہے جس کو ہماری اس تحریر سے وہی نسبت ہوگی جو کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر دلپذیر کو ان کی حجۃ الاسلام سے اس تحریر میں جو کچھ خیال ہے وہ صرف اتنا ہی ہے کہ اصول اسلام کی تشریح میں بعض کار آمد اور مفید عام مضامین نہایت ایجاز کے ساتھ لکھ دیئے جائیں جن سے ایک طرف تو ہمارے مذہبی خیالات کا اندازہ ہو جائیگا اور دوسری طرف اس مفصل کتاب کی جس کا قصد ہیں نے ابھی ظاہر کیا، نوعیت مضامین سے واقف ہونے اور طرز تحریر کے پرکھنے کا بھی مشتاقوں کے واسطے یہ تحریر ایک نمونہ بن جائے گی۔

بلاشبہ اس قدر وسیع عنوان (اسلام) کو ان چند اوراق میں کھپا دینا دریا کو کوزہ میں بند کرنے سے ہرگز کم نہیں ہے مگر اسلام کے تعجب انگیز اعجازوں میں سے یہ بھی ایک ہے جس پر ڈاکٹر گستاؤ لیبان وغیرہ محققین یورپ نے بھی حیرت ظاہر کی ہے کہ جس قدر طویل ہے اسی قدر مختصر بھی ہے اور جتنا دشوار ہے اتنا ہی آسان بھی ہے اور جیسا کہ اس سے ایک حکیم اور ارسطوئے وقت فائدہ اٹھا سکتا ہے ایسے ہی ایک

عامی اور افریقہ کا ایک وحشی بھی اپنا کام نکال لیتا ہے، اسلام کے برگ و بار اگرچہ بہت دور تک پھیلے ہوئے ہیں مگر ان سب کی جڑ صرف ایک کلمہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ہے۔ ان ہی دو جملوں میں تمام اسلامی معتقدات کا خلاصہ اور لب لباب نکل آتا ہے اور یہی کلمہ شریعت اسلام کا جوہر ایمان کی روح، راستی کا نشان، ہدایت کی زندہ تصویر اور علوم حقائق کا سرچشمہ ہے، اسی کلمہ سے دائمی راحت حاصل ہوتی ہے اسی سے روحی مسرت اور حقیقی آرام ملتا ہے، اسی کی بدولت مسلمان خیر الامم کے لقب سے سرفراز کئے گئے ہیں اور اسی کے چھوٹنے سے آج ان کو قعر مذلت میں گرا دیا گیا لیکن جبکہ یہ کلمہ کل اہل اسلام کے نزدیک ایسی نعمت عظمیٰ اور رحمت کبریٰ تصور کر لیا گیا، تو نہایت ضروری ہے کہ اسلام پر مضمون لکھنے والا اول اسی کی حقیقت کے واضح کرنے میں اپنا وقت صرف کرے اور جب تک اس کی کامل تحقیق سے فارغ نہ ہو جائے اسی کو مطمح نظر بنائے رکھے چنانچہ میرا ارادہ بھی اس وقت یہی ہے کہ جہاں تک غور کیا گیا اس کلمہ کے دو جز نظر آئے ان میں سے پہلا جزو جس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی چیز معبود بننے کی صلاحیت و استحقاق نہیں رکھتی فی الواقع تین مضمونوں پر مشتمل ہے خدا کا وجود ہونا اس کا قابل عبادات ہونا اور اس کی خدائی میں کسی کا شریک نہ ہونا۔

خُدا کا وجُود

یہی وہ مضمون ہے جس کی تائید تمام ادیان و مذہب نے یک زبان ہوکر کی ہے اور جس پر بلا نکیر اہلِ ملل کا اجماع منعقد ہو چکا ہے۔ ملاحدہ جن کا دُوسرا نام منکرین مذہب بھی ہے، زور شور کے ساتھ اسی مضمون کی تردید پر تلے ہوئے ہیں اور مادیین (میٹریسٹ) کے گروہ سے ہماری سب سے بڑی معرکہ آرائی اسی میدان میں ہو سکتی ہے۔

یورپ میں مادہ پرستوں کی جو جماعت تیار ہوئی ہے اس نے آج کل مذہبی دُنیا میں ایک عام ہلچل ڈال رکھی ہے اور نہایت بیباکی کے ساتھ اس کا اظہار کیا ہے کہ خُدا کا وجُود ہرگز کوئی واقعی وجُود نہیں ہے بلکہ وُہ بھی ان وہمی اشیاء میں سے ایک شے ہے جن کو انسانی تخیل نے قوانین طبیعہ سے مرعوب ہوکر اختراع کر لیا تھا رفتہ رفتہ اس فرضی خُدا نے لوگوں کے دماغوں پر ایسا کچھ قبضہ اور اقتدار حاصل کیا کہ اُنھوں نے اپنے تمام اعمال و افعال اور تمام ارادوں بلکہ تمام کائنات کی عنان حکومت اسی کے ہاتھ میں دے دی اور محض اپنی خوش اعتقادی سے یہ سمجھ لیا کہ دُنیا میں جو کچھ کرتا ہے خُدا ہی کرتا ہے اور جس قدر حوادث پیش آتے ہیں یا واقعات کا ظہور ہوتا ہے یہاں تک کہ اگر ایک پتّہ بھی ہلتا ہے اور ایک تنکہ بھی اپنی جگہ سے سرک جاتا ہے تو بغیر اس کے حکم اور ارادہ کے

نہیں ہو سکتا۔

مادہ پرست کہتے ہیں، کہ اہل مذاہب سے کوئی پُوچھے کہ تم کو ایک ایسی ما فوق الفطرت ہستی کے ماننے پر کس چیز نے مجبُور کیا ہے کیا عالم میں جو حوادث واقع ہوتے رہتے ہیں یا زمانہ جو پلٹیاں کھاتا ہے یا وجُود کی آمد و شد جو اکثر چیزوں میں مشاہدہ کی جارہی ہے تمہارے اس فرضی خُدا کے سوا اور کسی سبب سے ربط نہیں کھا سکتے یا مادہ جو مع اپنی حرکت کے ابدی و ازلی ہے ان ضرورتوں کو سرانجام نہیں دے سکتا یا خواہی نخواہی تم کو ایک موہوم خارج از عقل ہستی کے سامنے جبہہ سائی ضروری معلوم ہوئی اگر ہم سے پُوچھو تو یہ سب خیالات ارباب مذاہب کی ناواقفیت اور کوتاہ فہمی پر مبنی ہیں کیونکہ زمانہ حال کی تحقیقات نے یہ ثابت کر دیا ہے ——— کہ عالم کی تمام سماوی اور ارضی اشیاء کی اصل دو چیزیں ہیں، مادہ اور اس کی قوت (حرکت) اور ازل سے دونوں تلازم کے ساتھ موجود ہیں یہ ناممکن ہے کہ مادہ اور اس کی حرکت میں جدائی اور انفصال ہو سکے اور ایک بغیر دُوسرے کے پایا جاوے، مادہ سے وہی اجزاء ویمقراطیسی مراد ہیں جو اس خلاء میں بھرے ہوئے ہیں اور جو اگرچہ ذہنی قسمت قبُول کر سکتے ہیں لیکن خارجی تقسیم کا ان میں امکان نہیں انہیں ذرات کو اثیر (ایتھر) سے تعبیر کرتے ہیں، اور انھیں کی دوامی حرکت کی وجہ سے اجرام سماوی یعنی ستارے اور کائنات ارضی یعنی جمادات و نباتات اور حیوانات جو

پہلے سے موجود نہ تھے وجود میں آئے ہیں اور ان چیزوں کا مادہ اور اس کی حرکت سے بننا بھی ویسا ہی ہے جیسا کہ کوئی معلول اپنی علت سے بے اختیار بن جاتا ہے چنانچہ ان اشیاء کی پیدائش میں مادہ اور اس کی حرکت کو نہ کسی قسم کا ادراک ہوتا ہے اور نہ ان میں قصد و ارادہ پایا جاتا ہے اور جب ہم کائنات عالم اور تمام مخلوقات کے وجود کو مادہ اور اس کی حرکت سے منسوب کر سکتے ہیں تو نہ ہم کو کسی فرضی خُدا کی حکومت ماننی پڑتی ہے اور نہ اپنے کو مذہبی طوق و سلاسل میں پھانسنے کی ضرورت رہتی ہے غرض ہمارے نزدیک مادہ بھی قدیم ہے اور اس کی حرکت بھی قدیم ہے اور جو سلسلہ صورتوں کا مادہ کے اندر قائم رہتا ہے وُہ بھی قدیم ہے اگرچہ صُورت شخصیہ علیٰحدہ علیٰحدہ حادث ہے اِس حالت میں ہم کو خُدا کے وجُود کی اصلاً ضرورت نہیں بلکہ مادہ اور اس کے قوانین فطریہ ہی عالم کی ہستی اور بقا کی ضمانت ہیں۔

ہم کہتے ہیں کہ بے شک مادیّین نے بزعمِ خود کائنات کے وجُود کا ایک خاص سبب پیدا کیا لیکن ابھی تک جس منتظم اور مرتب کائنات کے سبب کی ہم کو تلاش تھی اس میں کامیابی نہیں ہُوئی اُنھوں نے ہم کو ایک نہایت علیم و حکیم اور ہمہ صفت موصُوف خُدا سے علیٰحدہ کر کے ایک ایسے خُدا پر قناعت کرنے کی رائے دی جو بالکل اندھا، بہرہ، گونگا، اور بے حس و بے شعور ہے جس کا کوئی کام نہ قصد و اختیار سے ہو سکتا ہے، نہ مصنوعات میں کسی قسم کی ترتیب اور تناسب پیدا کرنے پر

قادر ہے نہ اس میں سمجھ کا مادہ ہے نہ وُہ کسی قاعدہ و قانون سے واقف ہے نہ اس کو امورِ انتظامیہ کی اطلاع ہے، حالانکہ جس عالم کے فاعل کا ہم کو کھوج لگانا تھا وہ عالم کائنات کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس کے ہر ہر جزو میں بیش قیمت حکمتیں ودیعت رکھی ہوئی ہیں جس کے عجیب و غریب اسرار کا مشاہدہ کرتے کرتے عقل انسانی تھک جاتی ہے اور جس کے بہُت تھوڑے سے حصّہ کا تتبع کرنے سے حکماء کو خصوصاً ان مادہ مئین کو یہ اعتراف کرنا پڑا ہے کہ مظاہر فطرت کی جس قدر باریکیاں ہم معلوم کر سکے ہیں وُہ اس سے بہُت ہی کم ہیں جو اب تک معلوم نہیں ہو سکیں۔ علم تشریح علم الافلاک، علم الحیوانات، علم نباتات اور علم طبقات الارض کے ماہرین سے دریافت کرو جو رازہائے قدرت تُم نے موجُودات عالم میں آج تک دریافت کیے ہیں وُہ کس قدر ہے، اور ان کی حفاظت کے واسطے کتنے دفتر اور کتنے کتب خانہ تم کو درکار ہوتے ہیں۔

پھر عالم کے احوال میں جو تفاوت اور حاجت مندی کے آثار پائے جاتے ہیں، اس پر بھی ایک نظر ڈالو اور ہر ہر شے کی پستی و ذلت کو جس سے خُدا تعالیٰ کی پُر حکمت و جبروت کا سبق حاصل ہوتا ہے، بہ نظرِ تعمق ملاحظہ کرو تاکہ تُم کو معلوم ہو کہ یہ کارخانہ یُوں ہی بے سرا اور بخت و اتفاق سے پیدا ہونے کے قابل نہیں ہے۔

آسمان، چاند، سورج اور ستاروں کو دیکھئے کہ ایک حال پر قرار نہیں کبھی عروج ہے، کبھی نزول، کبھی طلوع ہے کبھی غروب، کبھی نور، کبھی

گہن، آگ کو دیکھئے کہ بے قرار ہے تھامے نہیں تھمتی، ہُوا کا یہ حال ہے کہ کبھی حرکت کبھی سکون اور حرکت بھی ہے تو کبھی شمال کبھی جنوب، کبھی پورب اور کبھی پچھم کو ماری ماری پھرتی ہے، ادھر پانی کا کرّہ ہَوا کے دھکوں سے کہیں کا کہیں نکلا جاتا ہے، اور زمین کو بھی پستی کے سوا لاچاری اس درجہ کی ہے کہ اس پر کوئی دوڑتا ہے، کوئی بھاگتا ہے، کوئی کھودتا ہے، کوئی بھرتا ہے، اسی طرح نباتات کبھی چھوٹے ہوتے ہیں کبھی بڑے، کبھی تر ہو جاتے ہیں کبھی خشک ہو جاتے ہیں اور اس پہ ایک زمین ایک پانی اور ایک آفتاب ہونے کے باوجود اس قدر مختلف پھول اور پھل لاتے ہیں کہ ایک دوسرے سے کچھ بھی مناسبت نہیں رکھتے علیٰ ہذا القیاس حیوانات خصوصاً بنی نوع انسان باوجودیکہ سب کے سب اربع عناصر ہی سے مرکب ہیں شکل و شمائل خُو، بو، اور خاصیت و مزاج میں اتنے مختلف معلوم ہوتے ہیں کہ حدِ ادراک سے باہر ہے، اس کے علاوہ بھوک پیاس صحت، مرض، گرمی، سردی اور حرص و ہَوا وغیرہ کے بہت سے موکل ان کے پیچھے ایسے لگا دیئے ہیں کہ جس سے شرف حیات بھی خاک میں مل گیا، اور حضرت انسان کے پیچھے تو اتنا لشکر خواہشات اور حاجات کا متعین ہُوا کہ جس نے اُس کی فہم و دانش کو ناچار کر کے تمام شرافت و عزّت کو ملیامیٹ کر دیا، دُوسرے حیوانات تو صرف کھانے پینے ہی کے محتاج ہیں،

لباس، مکانات، سواری، عزّت، منصب، جاگیر، میٹھے

کھٹے، نمکین کی کچھ پرواہ نہیں رکھتے لیکن انسان کو بغیر ان چیزوں کے بھی زندگی بسر کرنا محال یا دشوار ہے بلکہ غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس میں کوئی خوبی اور کمال زیادہ تر تھا اسی کو اوروں کی نسبت زیادہ قیودات میں بند کر کے رکھا ہے اور یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ بادشاہ اگر غریبوں کو قید کرتے تو کئی کئی قیدیوں کو ایک محافظ سپاہی کفالت کرتا ہے، اور اگر کوئی بادشاہ یا امیر ان کی قید میں آ جاتا ہے تو گو اُسے تعظیم سے رکھیں لیکن اس پہ بہت پہرے اور بڑے بڑے بہادر حفاظت کے لئے مقرر کیا کرتے ہیں۔

بہر حال جبکہ ایسے ایسے اشرف اجزائے عالم اس ذلت و خواری میں گرفتار ہیں جس کا ذکر اوپر ہُوا، ایسے مجبور ہیں کہ دم بھر کو بھی ان قیودات کے شکنجوں سے وُہ علیحدہ نہیں ہو سکتے تو بلاشبہ اُن کے سر پر کوئی ایسا منتظم حاکم ہے جو ان سے ہر وقت قیدیوں کی مانند یہ سب بیگاریں لیتا ہے اور چین سے نہیں رہنے دیتا تاکہ یہ مغرور نہ ہو جائیں اور اوروں کو ان پر بے نیازی کا گمان نہ پیدا ہو۔

بلکہ ان کو ایسا ذلیل و خوار دیکھ کر یہ خود بھی اور دُوسرے لوگ بھی خُدا کو پہچانیں اور سمجھ لیں کہ یہ اس کے انتظام کی خوبی ہے کہ ان سے طرح طرح کے کام لیتا ہے اور ان پر قسم قسم کے احوال بھیجتا ہے اور یہ ایسا قصہ ہے جیسا کہ ایک بیدار مغز اور مدبر حاکم اپنے ماتحتوں کو فارغ نہیں رہنے دیتا، اور اس پہ بھی کہیں کبھی کہیں تبدیل کرتا رہتا ہے۔

یورپ کا ایک محقق راسکین بھی انہیں مناظر قدرت کو دیکھ کر کہتا ہے کہ " اے آسمانو! مجھ کو خبر دو، اے دریاؤ مجھ کو بتاؤ، اے زمین مجھ کو جواب دے اے بے انتہا ستارو تم بولو کہ کون سا ہاتھ ہے جس نے تمہیں افق میں تھام رکھا ہے۔ اے شب چاردہ کس نے تیری تاریکی کو خوب صورت بنا دیا ہے، تو کس قدر شان والی ہے، اور کس قدر عظمت مآب ہے، تو خود بتا رہی ہے کہ تیرا کوئی صانع ہے جس نے تجھ کو بغیر کسی زحمت کے بنایا ہے، اس نے تیری چھت کو قبہ ہائے نور سے مرصع کیا ہے جس طرح کہ اس نے زمین پر خاک کا فرش بچھایا ہے، اور گرد کو ابھارا ہے۔ او! مژدہ رساں سحر! او نیر شگرف! او ہمیشہ روشن رہنے والے ستارے! او آفتاب درخشاں! سچ بتا تو کس کی ادائے طاعت کے لئے محیط کے پردے سے باہر آتا ہے، اور نہایت فیاضی کے ساتھ اپنی روشن شعاعیں عالم پر ڈالتا ہے۔ اے پُر رعب سمندر، اے وہ کہ غضب ناک ہو کر زمین کو نگل جانا چاہتا ہے کس نے تجھ کو محبوس کر رکھا ہے، جس طرح شیر کٹہرہ میں قید کر دیا جاتا ہے تو اس قید خانہ سے بے فائدہ نکل جانے کی کوشش کرتا ہے تیری موجوں کا زور ایک حدِ معین سے آگے ہرگز نہیں بڑھ سکتا۔

ملین ڈورڈ کہتا ہے کہ " انسان اس وقت سخت حیرت زدہ ہو جاتا ہے جب یہ دیکھتا ہے کہ ان مکرر اور ناطق مشاہدات کے

ہوتے ہوئے ایسے بھی موجود ہیں کہ جو یہ کہتے ہیں کہ یہ تمام عجائبات صرف بخت و اتفاق نتائج کے ہیں یا دوسری عبارت میں یوں کہنا چاہیئے کہ مادہ کی عام علم خاصیت کے نتائج کے ہیں یہ فرضی احتمالات اور عقلی گمراہیاں جن کو لوگوں نے علم المحسوسات کا " لقب دیا ہے علم حقیقی نے ان کو بالکل باطل کر دیا ہے، فزیکل سائنسدان کبھی اس پر اعتقاد نہیں لا سکتا۔ ہربرٹ اسپنسر کہتا ہے کہ " یہ اسرار جو روز بروز زیادہ دقیق ہوتے جاتے ہیں جب ان پر زیادہ بحث کرتے ہیں تو یہ ضرور ماننا پڑتا ہے کہ انسان کے اوپر ایک ازلی و ابدی قوت ہے جس سے تمام اشیاء وجود میں آتی ہیں " پروفیسر لینا کہتا ہے وہ خدائے اکبر جو ازلی ہے، جو تمام چیزوں کا جاننے والا ہے، جو ہر چیز پر قادر ہے اپنی عجیب و غریب کاری گریوں سے میرے سامنے اس طرح جلوہ گر ہوتا ہے کہ میں مبہوت اور مدہوش ہو جاتا ہوں۔

اب ان سب کے جواب میں مادہ پرست کہتے ہیں کہ یہ تمام عمدہ انتظام اور مضبوط قاعدے جو دنیا میں جاری ہیں یہ سب بھی " مادہ اور حرکت کی " ہی کارسازیاں ہیں اور مادہ اگرچہ خود نہیں جانتا مگر خود بخود اس سے بے سوچے ایسے ایسے حیرت انگیز قوانین اور اصول بن جاتے ہیں جن کی اس عالم کو ضرورت رہتی ہے اور جس پر نظام عالم کا دار و مدار ہے لیکن ان حضرات سے اگر کوئی یہ کہے کہ ہندوستان کے کسی گاؤں میں بچہ پیدا ہوا اور بچہ پیدا ہوتے ہی

اس نے نہایت فصیح و بلیغ تقریر شروع کی اور وُہ علوم و معارف اس کی زبان سے ظاہر ہوئے ہیں جن کی خبر نہ ارسطو کو ہوئی تھی، نہ افلاطون کو، نہ بیکن کا ذہن وہاں تک پہنچا تھا اور نہ نیوٹن کا۔

نہ رازی کو وُہ مضامین خواب میں نظر آئے تھے نہ امام غزالی کو تو یہ لوگ ہرگز اس کے بیان کی تصدیق نہ کر سکیں گے، بلکہ جو شخص اس عجُوبہ قصّہ کی تصدیق کرے گا اس کو بھی ان لوگوں کے یہاں سے مجنُوں، دیوانہ، اور خبطی و پاگل کا خطاب ملے گا،

تو کیا اے عقلمند! مادّہ کی وُہ سحر کاریاں اس واقعہ کی نُدرت سے کچھ کم حیرت افزا ہیں وُہ بچّہ جو ایک نامکمل انسان ہے ان امور کی قدرت نہ رکھے جن کو چند تعلیم یافتہ مرد انجام دے سکتے ہیں، اور ایک "جمادِ لایعقل" جس کو ذرّہ برابر بھی ادراک و شعور نہیں، تمام مخلوقات کی حفاظت اور زینت کے ایسے محکم دستور العمل تیار کرے جن کو دیکھ کر دُنیا کے عقلاء حیران ہیں اور جن کے اسرار حکمت کی گہرائی کو سب مل کر بھی آج تک معلوم نہیں کر سکے، اگر اس پر بھی آپ یہی کہے جاویں کہ نہیں کچھ ہی ہو ان تمام قوانین کی واضع وہی مادّہ کی بے اختیاری حرکت ہے تو بقول علامہ حسین آفندی "ہماری اور آپ کی مثال ٹھیک ان دو شخصوں کی سی ہوگی جو کسی نہایت رفیع الشان اور مضبوط کوٹھی میں داخل ہُوئے جس میں متعدد کمرے اور نشستگاہیں پائی جاتی ہوں وہ شاندار دروازوں اور مضبوط جنگلوں سے آراستہ ہو،

اس کے برآمدے اور ڈیوڑھیاں بہت استحکام کے ساتھ بنائی گئی ہوں، اور کمروں میں اعلیٰ درجہ کے فرش بچھے ہُوئے ہوں، بڑے بڑے بلند تخت لگے ہوں، نہایت بیش قیمت برتن اس کے چاروں طرف قرینے سے رکھے ہُوں۔

مختلف گھڑیوں، متعدد "مقیاس الحرارۃ" اور مقیاس الھواء کے ذریعہ اس کی دیواروں کی زیبائش کی گئی ہو۔

غرض اس میں بود و باش کرنے کے لئے جتنے سامان ضروری ہوں سب ہی کچھ موجود ہوں، اس کے چاروں طرف نہایت خُوب صُورت سیرگاہیں نظر آتی ہوں۔ گرداگرد ایسی چمن بندی کی گئی ہو جن میں درختوں کا صف باندھ کر کھڑا ہونا نگاہوں کو بھلا معلوم ہوتا ہو قسم قسم کے پھُولوں کی کیاریاں موقع موقع سے بنائی گئی ہوں اس کی نہروں اور جدولوں میں پانی بھرا ہوا ہو، اس کے مستحکم بنے ہُوئے حوض لبالب بھرے ہوں،

خلاصہ یہ کہ عیش و آرام کے سب سامان مہیا ہوں، اور جو بھی انہیں دیکھے یہی کہے کہ فلاں شئے فلاں حکمت پر مبنی ہے، اس کی یہ ضرورت ہے، اس کا بنانے والا کیسا ذی اختیار اور خُوش تدبیر تھا جس نے کہ جو چیز بنائی ایک قرینے سے بنائی، اور جس شئے کے لئے جو مقام تجویز کیا وہی مناسب تھا۔

اب ایسے مقام پر پہنچ کر ان دونوں شخصوں میں سے ایک تو یہ

کہنے لگا کہ صاحب اس میں ذرا شک نہیں کہ اس کا بنانے والا ان ساری عجیب غریب صناعیوں پر خوب ہی قادر تھا، اور ان کی ماہیت و ترتیب کے طریقوں سے بھی بڑی واقفیت رکھتا تھا جب ہی تو اس نے انتہا درجہ کی حکمت کے اس کو اس قدر مضبوط اور استوار بنایا، اور خوبی یہ کہ اس کے تمام لوازمات کامل طور پر مہیا کر دیئے تاکہ یہاں رہنا اور رکھنا عیش و آرام سے بسر کرنا ممکن ہو اور کوئی امر آسائش و راحت میں مخل نہ ہونے پائے، اس کے بنانے والے کو اگرچہ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا نہیں مگر یہ بالکل یقینی امر ہے کہ اس میں علم و قدرت، تدبیر و حکمت وغیرہ اوصاف جن کی کہ اس کوٹھی کے بنانے میں ضرورت پڑتی ہے سب موجود تھے۔

باقی اس کوٹھی کے ساز و سامان میں اگرچہ بعض چیزیں ایسی بھی پائی جاتی ہیں جن کی حکمت میری سمجھ میں نہیں آئی لیکن ان میں کوئی نہ کوئی حکمت ضرور ہوگی۔ اگرچہ میں اس کو دریافت نہیں کر سکا کیونکہ جن اشیاء کی حکمت میری سمجھ میں آگئی میں نے اس سے اطمینان کر لیا ہے کہ اس کا بنانے والا بڑا حکمت والا ہے تو اس نے اُن کو بھی خارج از حکمت و مصلحت نہ بنایا ہوگا۔

اب دُوسرا شخص اپنے ساتھی سے کہنے لگا کہ اس کوٹھی کے وجود کا سبب جو تُم نے بتلایا یہ درست نہیں بلکہ ایک پہاڑی کی طرف (جو اس کوٹھی کے پاس استادہ تھی اور جس کی جڑ میں ایک پانی کا چشمہ جاری تھا) اشارہ کر کے کہا کہ اس پہاڑی کی چوٹی سے اس قطعۂ زمین کی

جانب جس میں یہ کوٹھی واقع ہے ہمیشہ زمانہ قدیم سے ہُوا چلا کرتی ہے یہی ہُوا لاکھوں برس تک مٹی اور پتھروں کو پہاڑوں سے منتقل کرتی رہی اور وہ سب چیزیں اس کی وجہ سے مختلف شکلوں پر اس قطعہ زمین پر جمع ہوتی رہیں اور بارش کا پانی ہمیشہ اس میں کچھ تصرف کرتا رہا کبھی اس کی شکل کچھ ہو گئی کبھی کچھ اسی طرح کبھی وہ چیزیں مجتمع ہو گئیں اور کبھی پراگندہ اور ان کی اوضاع شکلوں میں ہُوا اور بارش کی وجہ سے کچھ نہ کچھ تبدیلی واقع ہوتی رہی یہاں تک کہ کروڑوں برس کا زمانہ گزرنے کے بعد اب اس کوٹھی کی باقاعدہ صورت بن گئی جس میں کمرے، نشستگاہیں دروازے جنگلے، برآمدے، راستے، حوضیں اور نہریں سبھی کچھ پائی جاتی ہیں۔۔ رہا نہروں کا جاری ہونا اس کی یہ صورت ہُوئی کہ اس چشمہ سے جو کہ اس پہاڑی کی تلی میں واقع ہے ہمیشہ پانی بہ بہ کر اس قصر کے صحن میں مختلف طریقوں سے جاری ہُوا، اس لئے پانی سے اس کی مٹی گلتی رہی ہوا اور بارش کا اثر اس کے راستہ میں ہوتا رہا، شدہ شدہ لاکھوں برس کا زمانہ گزرنے کے بعد باقاعدہ نہریں اور حوضیں جاری ہو گئیں اور اس میں پانی اس موجودہ انتظام کے ساتھ بہنے لگا۔

اب اس کے برتن، گھڑیاں، فرش اور مختلف قسم کے مقیاسوں کو لیجئے، ان کی یہ صورت ہُوئی کہ مسافروں کا قافلہ جو کبھی اس پہاڑ پر اس زمین میں اُترا تو قافلہ والوں کی یہ چیزیں اتفاق سے چھوٹ گئیں، اور ہُوا ان کو مختلف طرح پر ادھر ادھر منتقل کرتی رہی حتیٰ کہ سالہا سال

کے بعد یہ نوبت پہنچی کہ فرش باقاعدہ بچھ گئے، برتن قطار وتیں آراستہ گھڑیاں اور متیاسں دیواروں پہ آویزاں ہوگئیں، یہی حالت ان درختوں اور پھولوں کی ہوئی جو یہاں کی سیرگاہوں میں باقاعدہ لگے ہوئے ہیں، ان کے بیج ہوائیں اڑ کر یہاں تک پہنچ گئے اور اس زمین پر جم کر اگ آئے اور ہوا کی وجہ سے اِدھر اُدھر منتقل ہوتے ہوئے باقاعدہ طور پر آراستہ ہوگئے اور موجودہ حالت پر نظر آنے لگے۔

اب وہ شخص جس کے دماغ میں کچھ بھی عقل اور سر میں کچھ بھی انصاف ہے بے لاگ ہو کر ان دونوں بیانات کا فیصلہ کر دے اور بے تعصبی کی راہ سے بتلا دے کہ اس کوٹھی کے تیار ہونے کا وہ سبب جو پہلے آدمی نے بتلایا ہے عقل کے نزدیک ماننے کے قابل ہے یا دوسرے شخص کی بیہودہ بکواس، اور اسی طرح عالم کی پراسرار ہستی کے واسطے ایک قادر مطلق اور "علام الغیوب" خدا کا اعتقاد رکھنا زیادہ قرین قیاس ہے، یا ایک جاہل اور اپاہج مادہ کا، اور ایسی صورت میں اربوں کھربوں انسانوں کی رائے (جو آدم علیہ السلام کے عہد سے اس وقت تک گزرے ہیں اور جن کے بڑے بڑے حکماء اور اولوالعزم انبیاء بھی شامل ہیں) صحت اور واقعیت سے زیادہ قریب معلوم ہوتی ہے یا ہزار دو ہزار غافل اور بدمستوں کی۔

بلاشبہ ہمارے زمانے کے بعض عقلاء سے سخت غلطی ہوئی کہ انہوں نے ایسے ایسے اعلیٰ درجہ کے قوانین قدرت کو جن سے خدا تعالیٰ کی حکمتوں

اور صناعیوں کی بوقلمونی ظاہر ہوتی ہے، خدائے برتر کی امداد کا محتاج نہیں سمجھا، بلکہ صرف ان قوانین میں جو حرکت مادہ سے پیدا ہوئی ہیں باہم توافق تناسب ربط واتحاد پیدا کرنے کے لئے خدا کے وجود کی ضرورت باقی رکھی حالانکہ اس تناسب واتحاد کا باقی رکھنا بھی اسی مادہ اور حرکت کو کچھ زیادہ مشکل نہیں تھا جس نے ایسے ایسے غامض اور غیر متغیر قوانین عالم میں جاری کر دیئے ہیں۔

تماشے کی بات یہ ہے کہ جیسا کہ مسلمانوں میں بعض علماء نے مادہ پرستوں کی دھمکی سے مرعوب ہو کر مادہ وغیرہ کو قدیم مان لیا اسی طرح بعض دوسری اقوام کے لیڈروں نے بھی یورپ کے ملحدوں سے ڈر کر قدامت کے مسئلہ کو جزو مذہب بنا لیا ہے اور اسی پر مسئلہ تناسخ کی بھی نیو جانا شروع کر دی حالانکہ دنیا کی وہ پرانی کتاب جس پر یہ لوگ نہایت زور شور کے ساتھ ایمان رکھتے ہیں اور جس کو اہل ہند کی عزت افزائی نے الہامی کتاب بھی بنا دیا ہے خوب پکار کر کہہ رہی ہے کہ خدا کی ذات وصفات کے سوا کوئی قدیم نہیں ہے چنانچہ رگوید منترا اشلوک ۱۸ دھیائے ورک ۱۷ کا جو ترجمہ خود سوامی دیانند جی مہاراج نے بھاشیہ بھومکا صفحہ ۵ میں کیا اس کی حرف بحرف نقل یہ ہے:۔

جس وقت ذرّوں سے مل کر بنی ہوئی دنیا پیدا نہیں ہوئی تھی اس وقت یعنی پیدائش کائنات سے پہلے است (غیر محسوس حالت) تھی یعنی شونیہ اکاش بھی نہیں تھا۔ کیونکہ اس کا اس وقت کچھ کاروبار نہیں

تھا اس وقت (ست پر کرتی) یعنی کائنات کی غیر محسوس علت جس کو ست کہتے ہیں وہ بھی نہ تھی اور نہ پرمانو (ذرّے) تھے وارٹ (کائنات) میں جو آکاش دوسرے درجہ پایا جاتا ہے وہ بھی نہ تھا بلکہ اس وقت صرف پربرہم کی سامرتھیہ (قدرت جو نہایت لطیف اور اس تمام کائنات سے برتر پرم (بے علت) ارکان ہے موجود تھی الخ

کیا رگوید کی اس صریح عبارت میں کوئی تاویل چل سکتی ہے کیا کسی تاویل کرنے والے کے لفظی الٹ پھیر کچھ کام دے سکتے ہیں، کیا اس کے بعد بھی ان حضرات کے دو اہم اصول قدامت عالم اور تناسخ کی بیخ و بنیاد قائم رہ سکتی ہے ہم کو افسوس ہے کہ اس قوم کے لیڈروں کی کوشش جو انہوں نے وید کی جدت طرازی میں کی تھی بالکل رائگاں گئی اور انہوں نے خدا کو لوہار، بڑھئی، کمہار کے ساتھ تشبیہ دینے میں فضول اپنا وقت ضائع کیا ان کا خیال ہے کہ جس طرح بڑھئی، لوہار، ظروف ساز، وغیرہ اپنے ہر چیز کے بنانے میں مادہ کی احتیاج رکھتے ہیں اسی طرح خداوند کارساز کے لئے بھی یہ ممکن نہ ہوگا کہ وہ دنیا کے کارخانوں کو بغیر کسی مادہ کے بنادے۔

لیکن ان صاحبوں کو یہ خیال نہیں رہا کہ بڑھئی، لوہار وغیرہ کو بغیر ہاتھ پاؤں، اعضاء جسمانی وغیرہ سامان اور اوزاروں کے بھی کسی چیز کا بنانا محال ہے، حالانکہ خدا کی نسبت خود بھومکا صفحہ ۹ میں تسلیم کر لیا گیا ہے کہ اس کو ان آلات کی ضرورت نہیں۔

بڑھئی، لوہار وغیرہ کو جیسا کہ کسی چیز کے بنانے میں مادہ کی ضرورت ہے ایسے ہی دیکھنے میں آنکھ کی اور سننے میں کان کی اور بولنے میں زبان کی ضرورت ہے حالانکہ ستیارتھ پرکاش کی تصریح کے موافق خدائے عزوجل بغیر آنکھوں کے دیکھتا ہے بغیر کانوں کے سنتا ہے اور بغیر زبان کے کلام کرتا ہے۔

تو ایسی حالت میں نہ معلوم ان حضرات کو ویدک تعلیم کے برخلاف مادہ کو قدیم کہنے اور اس پر تناسخ کا خیال باندھنے کی کیا ضرورت پیش آئی کیوں صاف طور پر یہی نہ کہدیا جو مسلمان وغیرہ کہتے تھے کہ خدا تعالے کی ذات و صفات کے سوا سب اشیاء فانی اور حادث ہیں اور سب چیزوں کا وجود خدائے تعالیٰ کے اعتبار سے ایسا ہی عرضی و مستعار ہے جیسا کہ زمین و آسمان اور در و دیوار کا نور آفتاب کے نور سے یا گرم پانی کی گرمی آگ کی حرارت سے، اس خدائے واحد نے اپنی قدرت کاملہ اور ارادہ نافذہ سے ہر چیز کو نیست سے ہست کیا اور وہی اپنے اختیار سے جب چاہے گا نیست کر دے گا نہ اس کو مادہ کا احتیاج ہے نہ اس پر روح کی حکومت ہے نہ اس کے اختیارات محدود ہیں، اور نہ اس کا کوئی فعل حکمت سے خالی ہے وہ تمام کمالات کے ساتھ موصوف، اور جملہ نقصانات اور عیوب سے پاک ہے، کیونکہ تمام کمالات وجود کے تابع ہیں اور وجود ہی ان کا سرچشمہ ہے اور تمام نقصانات عدمی ہیں اور عدم ہی ان کا باعث ہوا ہے تو جب خدا کا وجود غیر محدود اور خانہ زاد ہے کسی دوسری جگہ سے آیا ہوا نہیں اور نہ ہی عدم کا قطعاً اس کے

ساتھ اختلاط ہوا ہے تو جملہ کمالات بھی اس کے بے حد و بے پایاں اور غیر مستعار ہوں گے اور مخلوقات میں سے کسی مخلوق کے اندر جو کوئی بھی خوبی اور حسن ہوگا وہ سب اس کے محاسن اور صفات کا پرتو ہوگا

پس جب ایسی ذات ستودہ صفات نے اپنے اختیار و قدرت سے دُنیا کو بنا دیا ہے تو یقیناً اس کی ایجاد اور ابقاء میں بے انتہا حکمتیں صرف ہوئی ہوں گی اور بے شبہ بنانے سے پہلے ہی خدائے تعالیٰ کے علم میں اس کا مرتب نقشہ اور ابتدا سے انتہا تک ہر ہر چیز کا اندازہ اور پیمانہ موجود ہوگا۔ جس کو غالباً اہل اسلام لفظ تقدیر سے تعبیر کرتے ہیں اور یہ تعبیر اس اعتبار سے بالکل موضوع ہے کہ لغت میں اس لفظ کے معنے اندازہ ہی کرنے کے ہیں۔

بہرحال اب تک جو کچھ ہم نے لکھا اس میں اگرچہ اثبات صانع عالم کے متعلق وہ زبردست استدلالات نہیں لکھے گئے جن کی تفصیل ہمارے متکلمین نے اپنی مبسوط تصانیف میں کی ہے یا جن کو ہم انشاءاللہ اپنی مفصل کتاب میں ہم درج کریں گے جس کا وعدہ پہلے ہو چکا ہے یہاں تو ایک سچے دلنشین اور عام فہم طریقہ سے جس قدر اس مختصر تحریر میں گنجائش تھی عالم کے واسطے ایک جامع الکمالات فاعل کا ہونا ضروری قرار پا گیا اور یہی وہ مدعا تھا جس کو ہم ثابت کرنا چاہتے تھے۔ اب جو کچھ گفتگو باقی ہے وہ اس میں ہے کہ اتنی بڑی کائنات کے لئے کیا تنہا ایک ہی خدا کا وجود کافی ہو سکتا ہے اور اسی سے ہماری سب حاجتیں پوری ہو سکتی ہیں

یا ہم کو مختلف ضروریات کے واسطے در در بھٹکنا پڑے گا اور بہت سے خود مختار بادشاہوں کے سامنے گردن جھکانا ہوگی۔

توحید

یہی وہ بحث ہے جس کے ضمن میں اسلام کے چمکتے ہوئے امتیازات ظاہر ہوتے ہیں یہی وہ مقام ہے جس میں آ کر تمام مذاہب کے قدم لغزش کھا گئے ہیں اور یہی وہ موقعہ ہے جہاں پہنچ کر دینِ برحق کے کارناموں کی آزمائش ہوتی ہے مگر قبل اس کے کہ ہم اس بارے میں مذہب اسلام کی خصوصیات کو نہایت جلی حرفوں کے اندر ظاہر کریں یہ لازم خیال کرتے ہیں کہ جملہ مذاہب سے علیحدہ ہو کر محض عقلی حیثیت سے اس مسئلہ کو سمجھیں اور خدائے کامل کے دریافت کرنے والی عقلوں سے دریافت کریں کہ آیا فی الواقع ایک ہی خدا ساری دُنیا کا بلا مشقت انتظام کر سکتا ہے، یا اس کو اپنی حکومت کے برقرار رکھنے میں یار و مددگار رکھنے کی بھی ضرورت ہے۔

جہاں تک فکر کی گئی اس سوال کا جواب حکیم الامۃ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ سے زیادہ پر مغز اور جامع کسی نے نہیں دیا اور مصنفین میں سے غالباً اس قسم کی فلسفیانہ بحث کو اس قدر سلیس زبان میں کوئی نہیں سمجھا سکا چنانچہ مولینا کے ان مضامین کا

ماحصل جو تقریر دلپذیر میں ہے درج ذیل ہے۔ شعر ؎

مطرب از گفتۂ حافظ غزل نغز بخواں
تا بگویم کہ ز عہد طربم یاد آمد

جناب من دنیا کے پیدا کرنے والے اگر دو یا دو سے زائد خدا ہوتے تو ہرگز کوئی چیز بھی وجود میں نہ آسکے گی اور یہ سارا قدرتی کارخانہ بالکل درہم برہم ہو جائے گا کیونکہ یہ بات تو یقینی طور پر تسلیم کی جا چکی ہے کہ جس چیز کو خدا کہا جائے اس میں کسی طرح کی کمی اور نقصان نہ ہونا چاہیئے اگر ایسا ہو تو عام بندوں میں اور اس میں فرق نہیں رہ سکتا اس لئے کہ بندے خدا بن لے سے اسی لئے محروم ہیں کہ ان میں قسم قسم کے نقصانات پائے جاتے ہیں اور وجود کی باگ ان کے قبضہ میں نہیں ہے کہ جو خوبی اور جو کمال چاہیں اپنے واسطے موجود کر لیں اب اگر خدا بھی ایسا ہی مجبور ناقص ہو تو اس کو کیا استحقاق ہے کہ وہ ہمارا خدا بن بیٹھے جب یہ بات قرار پا گئی تو اب یہ تو کبھی نہیں ہو سکتا کہ آدھی مخلوق ایک خدا کی اور آدھی ایک کی ورنہ ہر خدا میں نصفا نصف خدائی کی کمی او کسر ہو گی، اسی بنا پر یہی کہنا پڑے گا کہ ہر ایک خدا پوری پوری خدائی کا مالک ہے۔

مگر اس صورت میں جیسا وہ کامل ہو گا دوسرے پر اس کی تاثیر بھی کامل ہی واقع ہو گی کیونکہ ممکنات اور خالق کی ایسی مثال ہے، جیسے آفتاب یا چاند اور زمین و آسمان وغیرہ کی، آفتاب سے آفتاب کی طرح

کا، اور چاند سے چاند کی طرح کا نور پھیلتا ہے، اور زمین و آسمان در و دیوار کوہ و اشجار وغیرہ میں سے ہر ایک شے کو حسب قابلیت منور کر دیتا ہے اور چیزیں تو فقط نظر آنے لگتی ہیں لیکن آئینے کا اتنے ہی نور سے کچھ اور حال ہو جاتا ہے، وہ خود بھی منور ہوتا ہے اور دوسری چیزوں کو بھی روشن کر دیتا ہے، الغرض جتنا چاند اور سورج میں فرق ہے اتنا ہی ان کی شعاعوں میں اور چیزوں کے منور ہونے میں فرق ہے تو جب خدا کا وجود بڑا ہی کامل ٹھہرا اور مخلوقات کے موجود کرنے میں اس کی تاثیر بھی کامل ہوئی۔ اب اگر ایسے ایسے دو یا کئی خدا ہوں گے اور مخلوقات مشترک ہو گی تو ہر طرف سے کامل ہی کامل وجود ہر مخلوق کے پیمانہ اور حوصلہ کے موافق آئے گا، گز میں گز بھر اور بالشت میں بالشت بھر اور ہم دیکھتے ہیں کہ ایک سانچہ میں دو چیزیں اور ایک سیر بھر کے برتن میں دو سیر اناج اور ایک جوتے میں ویسے ویسے دو قدم، اور ایک اچکن میں اس کے موافق دو بدن اور ایک نیام میں اسی مقدار کی دو تلواریں، اور ایک مکان میں اسی کی گنجائش کے موافق دو چند اسباب نہیں سما سکتا اور دھینگا دھینگی سے ایک میں دو کو ڈالنے لگتے ہیں تو وہ سانچے اور برتن وغیرہ ٹوٹ پھوٹ کر برابر ہو جاتے ہیں اسی طرح اگر دونوں خداؤں کی طرف سے پورا پورا وجود ایک مخلوق میں سمانے لگے تو بے شک وہ مخلوق معدوم اور نیست و نابود ہو جائے گی۔

ہاں اگر خدا کے وجود کا کامل ہونا ثابت نہ ہوتا بلکہ اس میں نقصان اور کمی کا احتمال ہوتا تو یوں بھی کہہ سکتے کہ جیسے دو چراغوں کا نور ملکر کامل نور ہو

جاتا ہے وہ خُدا کے وجُود کا پرتو مل کر کمال کو پہنچ جاتا ہوگا، مگر اس کو کیا کیجئے کہ خُدائی کے واسطے کامل الوجُود اور تمام الصفات ہونا لازم ہے اور تمام اہل مذاہب کو اس اعتراف کرنا پڑا ہے۔

اس کے علاوہ ہم کہتے ہیں کہ وُہ دو وجُود جو خُداؤں کی جانب سے مخلوق کو عطا ہوئے، اگر ایک ہی خُدا کے خزانہ میں ہوتے اور جو زور و قُوت اور شوکت وحشمت دُوسرے کو حاصل ہے وہ سب بھی اس ایک خُدا کے پاس ہوتے تو بلاشُبہ یہ سب مل کر اس ایک تنہا خُدا کی انفرادی قوّۃ میں بہت کچھ اضافہ ہو جاتا اس سے ثابت ہُوا کہ ہر ایک خُدا کے وجُود میں فی الجملہ کوتاہی اور نقصان ہے جس کی مکافات دُوسرے کے وجُود سے کی جاسکتی ہے باوجُودیکہ اس کا اقرار کیا جاچکا ہے کہ خُدائے پاک کی ذات ہر قسم کے قصُور و فتور سے مبّرا ہے وُہ بے نقصان ہے سب چیزیں اس کے بھروسہ پر قائم ہیں وُہ کسی کے سہارے کا محتاج نہیں وُہ سب کی اصل ہے اور سب اس کی فرع ہیں۔

اور کیوں نہ ہو جس سلسلہ کو دیکھئے ایک ہی اصل پر قرار پکڑتا ہے، نورِ آفتاب اگرچہ ہزاروں مکانوں اور ہزار ہا روشندانوں میں جدا جلوہ گر ہے لیکن ان سب متفرق انوار کو اسی ایک آفتاب کے ساتھ رابطہ ہے اعداد کا سلسلہ گو ایک سے الیٰ غیر النّہایۃ پھیلا ہُوا ہے کہیں دو کہیں تین کہیں چار کہیں پانچ کہیں بیس۲ کہیں سو کہیں ہزار اور اس پر کہیں جذر کہیں مجذور کہیں حاصل ضرب کہیں مضروب فیہ کہیں حاصل قسمت

کہیں مقسوم کہیں مقسوم علیہ وغیرہ لیکن ان سب کی اصل وہی ایک۱ کا عدد ہے اگر ایک نہ ہو تو یہ سارا سلسلہ اعداد کا نیست و نابود ہو جائے موجوں اور حبابوں کے کارخانوں کو دیکھئے تو سب کی اصل وہی ایک جز ہے آدمی وغیرہ کو دیکھئے تو سب اصل میں جسے انسانیت وغیرہ کہتے ہیں مشترک ہیں۔

اسی طرح جہاں نظر پڑتی ہے کوئی ایسا سلسلہ نظر نہیں آتا جس کا کوئی "سرمنشا" نہ ہو اور پھر ان سرمنشاؤں کو دیکھئے تو ان کا کوئی اور سرمنشا ہے۔ وھلم جرا مثلاً ہم تم ہندو مُسلمان اور یہوُد و نصاریٰ وغیرہ میں آدمیت سرمنشا ہے۔ اسی طرح گھوڑوں میں کوئی اور سرمنشا ہے اور گدھوں کی اور اصل اور کتوں کی اور اصل ہے، ان سب اصولوں کی اصل جاندار ہوتا ہے ادھر نباتات کی اصل علیحدہ ہے اور ان کا جدا ہی سلسلہ اور جدا ہی سرمنشا ہے۔ پھر ان کی اصل اور، اور جانداروں کی اصل جسمیت کی زیرِ حکومت ہے اسی طرح اوپر تک چلے چلو آخر میں جاکر سارے عالم کا اشتراک وجُود میں نکلتا ہے لیکن چونکہ شئے مشترک عین موجودات نہیں (جیسا کہ اپنے موقعہ میں دلائل سے ثابت ہو چکا ہے) بلکہ بایں لحاظ کہ ایک شئے کبھی موجُود ہو سکتی ہے کبھی معدُوم، یہ کہا جائے گا کہ وجُودِ عالم ایک خارجی اور عارضی چیز ہے اصلی اور ذاتی نہیں جیسا کہ پانی اپنی ذات سے گرم نہیں ہے اور آگ کی حرارت سے جو کہ اس کی اصلی اور ذاتی ہے، اس میں عارضی گرمی پیدا کرسکتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح عالم کے وجود عارضی کے لئے بھی ضرورت ہے

ہے کہ وہ کسی ایسے موجودِ اصلی سے مستعار ہو جس کا وجود عرضی و مستعار نہ ہو پھر جیسے آفتاب سے گو ہزار ہا جگہ دھوپ پھیلے پر سب کی سب ایک ہی آفتاب کا فیض ہے یُوں یقین کرنا چاہیئے کہ تمام عالم کا وجود بھی ایک موجودِ حقیقی و اصلی کا پرتو ہے اسی کو ہم خُدا سمجھتے ہیں اور اسی کی نسبت ہمارا یہ خیال ہے کہ اس میں تعدد کی گنجائش نہیں۔

اب یہاں پہنچ کر آپ شاید بول اُٹھیں کہ ہم نے مانا کہ موجودات کے وجود میں باہم اس طرح کا فرق نہیں جیسے دھوپ اور چاندنی میں جس کا وجود ایسا ہی یکساں نظر آتا ہے جیسے اس میدان کی دھوپ اور اُس میدان کی جس طرح ہر جگہ کی دھوپ کو خواہ وہ میدان وسیع اور جنگل میں ہو یا صحن مکان میں دھوپ ہی کہا جاتا ہے، اسی طرح ہر چیز کے وجود کا نام بھی خواہ وہ زمین و آسمان کا ہو یا چاند سورج کا یا انسان و حیوان کا وہی وجود رہتا ہے لیکن اگر فرض کریں کہ آسمان پر ایسے ایسے کئی آفتاب ہوں تو جس طور پر بہت سے ستاروں کا نور مل کر رات کو یکساں نظر آتا ہے بالیقین ان آفتابوں کا نور بھی مل کر یکساں نظر آئیگا پس اگر عالم کے واسطے کئی صانع ہوں اور سب کے وجود کا پرتو مل کر اسی طرح یکساں دکھائی دیتا ہو تو کیا بعید ہے۔

اس شُبہ کا جواب اوّل تو وہی ہے جو اس تقریر کے شروع میں معلوم ہو چکا کہ جس کارخانہ کو دیکھیے وہ کسی ایک چیز پر منقطع ہوتا ہے اور جس سلسلہ کو دیکھیے کسی ایک پر منتہی ہو جاتا ہے چنانچہ دھوپوں کا آفتاب پر سلسلہ

اعداد کا ایک پر، موجوں کے قصّہ کا پانی پر تمام ہونا اور چند مثالیں ان کے سوا پہلے بیان ہو چکی ہیں، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں میں جتنے پھیلاؤ ہیں وہ کسی ایک شئے کی طرف سمٹے جاتے ہیں۔

اب ہم دریافت کرتے ہیں کہ پانی اور آفتاب وغیرہ اشیاء مذکورہ کی وحدت (یعنی ایک ہونے کی صفت) بھی منجملہ موجودات کے شئے موجود ہے اور ان اشیاء میں وحدت کا وجود بھی عارضی طور پر ہے کیونکہ آفتاب اور پانی وغیرہ کے بہت سے ٹکڑے ہو سکتے ہیں اگر ان کی وحدت اصلی اور ذاتی ہوتی تو وہ ان سے کسی طرح زائل نہ ہو سکتی یعنی نہ ان میں تقسیم جاری ہوتی اور کثرت کی گنجائش کسی نہج نکل سکتی، اس سے ظاہر ہُوا کہ جیسا عالم کا وجود عارضی ہے وحدت بھی اس کی عارضی ہوگی، اور یہ وحدت بھی اسی موجودِ اصلی کا فیض ہوگا، جس کا فیض خود وجودِ عالم ہے اور اس کی وحدت بھی اسی طرح اصلی ہونی چاہیئے جس طرح اس کا وجود اصلی ہے۔ اس موقع پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ جیسا کہ وحدت اقسامِ وجود میں سے ہے ایسی ہی کثرت بھی ہے اور عالم کا ہر قسم کا وجود عارضی ٹھہرا اور خدا کے وجود کا پرتو ہُوا تو لازم آئے گا کہ وہ صفت کثرت بھی خُدا کے اندر پایا جاوے اور اس کے واسطے وصف اصلی اور ذاتی ہو لیکن یہ مغالطہ تمکو اس وجہ سے لگا کر وحدت کے مانند کثرت کو بھی تم نے اقسامِ وجود میں شمار کر لیا حالانکہ کثرت کا منشا عدم پر ہے۔

دیکھو ہم جانتے ہیں کہ نورِ آفتاب ایک شئے واحد ہے لیکن اگر کسی دیوار

میں ایک مکان کے دو روشندان برابر برابر ہوں تو درمیان میں اندھیرا ہونے کی وجہ سے ہر روشندان کا نور علیحدہ علیحدہ معلوم ہوگا غرض یہ کثرت اندھیرے کے سبب سے معلوم ہوتی ہے اگر ادھر ادھر نور اور بیچ میں اندھیرا نہ ہو، مثلاً دیوار کو مکان میں سے اٹھا ڈالیں تو سب جگہ نور ہی نور ہو جائے گا اور یہ فرق و امتیاز اور تعدد جس کا نام کثرت ہے ذرا باقی نہ رہے گا اب چونکہ اندھیرا نور کے نہ ہونے کو کہتے ہیں اور نہ ہونا ہی عدم ہے تو معلوم ہوا کہ کثرت عدم کے باعث پیدا ہوتی ہے وجود کے اقسام میں سے نہیں۔

بہرکیف اس تقریر سے یہ ثابت ہوگیا کہ جو اوصاف وجودی ہیں اور عالم میں پائے جاتے ہیں وہ ضرور ہیں کہ خدائے تعالیٰ میں بھی ہوں اور جو اوصاف عدمی ہیں وہ لازم ہے کہ خدا میں نہ ہوں اور یہ ثابت ہوا کہ جو موجود اصلی ہوگا اس میں کسی قسم کی تقسیم کی گنجائش نہ ہوگی اور نہ وحدت جو اوصاف وجود میں سے ہے جیسا کہ ابھی مذکور ہوا اس میں اصلی نہ رہے گی حالانکہ یہ محال ہے کہ وجود تو اس کا اصلی ہو اور سب قسم کا وجود مخلوقات کو اس سے پہنچے اور ہر طرح کے وجود کا منبع اور معدن ہو اور پھر اس میں بعض انواع وجود کے اصلی نہ ہوں اور یہ بھی ثابت ہوا کہ وجود اس کا عین ذات ہے اور ذات اس کی عین اوصاف ہے اور اوصاف اس کے عین وجود ہیں ورنہ وحدت اصلی اور موجودیت ذاتی باقی نہیں رہ سکتی۔

اس وقت گو میں یقین کرتا ہوں کہ جو شبہ تم کو تعدد صانع کے متعلق پیش آیا تھا اس کا حل کافی حد تک ہو گیا ہے بلکہ اس کے ضمن میں اور بہت

سے گراں قدر فوائد بھی اختصار کے ساتھ حاصل ہو گئے لیکن میری یہ رائے ہے کہ ابھی اس مضمون کی کچھ اور بھی تشریح کروں اور توحید کے بارے میں جو کچھ بھی شبہات ہوں اُن کو بیخ و بُن سے اکھاڑ ڈالوں بگوش وہوش سنیئے۔

مَیں کہتا ہوں کہ اگر کم از کم دو صانع ایجاد عالم میں شریک ہوں گے تو وہ دونوں جیسا کہ صانع ہونے اور موجود اصلی ہونے میں شریک ہوں گے ایسے ہی کسی نہ کسی امر میں علیحدہ بھی ہوں گے کیوں کہ جہاں اشتراک کے ساتھ تعدد پایا جائے تو وہاں لازمی بات ہے کہ کسی حیثیت سے ایک کو دوسرے سے علیحدہ اور ممتاز بھی سمجھا جائے مثلاً دو آدمی باوجود یکہ آدمیت میں شریک ہیں مگر بعض اوصاف میں مختلف بھی ہیں جیسا کہ شکل و صورت قد و قامت، مکان و زمان، رنگ و روپ، خاصیت مزاج وغیرہ میں اگر یہ علیحدگی اور فرق نہ ہو تو تعدد ہرگز نہ ہو، وہی ایک آدمی رہے اس وجہ سے ضروری قرار پایا کہ جو دو چیزیں کسی امر میں مشترک ہوں تو ان میں سے ہر ایک کے اندر ایسے خصوصیات ہونی چاہئیں جو دوسری میں نہ پائی جائیں ان ہی خصوصیات کے مجموعہ کو ہم اپنی اصطلاح میں ذات سے تعبیر کرتے ہیں۔

مگر ذات بے وجود کہ معدوم محض ہے کیوں کہ دنیا کی ہر ایک چیز وجود کے ذریعہ سے ہی موجود کہلاتی ہے البتہ خود وجود کو اپنے موجود ہونے میں کسی دوسرے وجود کی حاجت نہیں اور یہ بالکل اسی طرح ہے جیسا کہ ہر شئے کو اپنے روشن ہونے میں نور کی حاجت ہے مگر خود نور کو اپنی نورانیت میں دوسرے نور کی حاجت نہیں اب اگر دو یا کئی صانع ہوں اور

وہ دونوں وجود میں اشتراک رکھتے ہوں تو ان دونوں کی ذات (یعنی وہ خصوصیات خاصہ جن سے ایک دوسرے سے امتیاز حاصل ہے) وجود کے ماسوا کوئی اور چیز ہوگی اور چونکہ وجود کے سوا سب چیزیں اصل سے معدوم ہیں، اس لئے ہر ایک خدا فی حد ذاتہ وجود سے بالکل خالی ہوگا اور ان پر وجود اسی طرح عارض ہوگا جس طرح زمین آسمان وغیرہ سب چیزیں جو فی نفسہ تاریک اور مظلم تھیں مگر آفتاب کے نور نے ان سب کو روشن کر دیا اس صورت میں ہم دونوں خداؤں کو کسی طرح موجود اصلی نہیں کہہ سکتے بلکہ یہ دونوں بھی کسی ایسے موجود اصلی کے محتاج ہوں گے جس کا وجود خود اس کی ذات کے اندر داخل ہو اور ہمارا مقصد بھی توحید سے صرف اتنا ہی تھا کہ موجودات کا سلسلہ ایک موجود اصلی پر ختم ہوتا ہے چنانچہ یہ بات اس تقریر سے بخوبی حاصل ہو گئی کیونکہ جب موجودات دو خداؤں سے مثلاً پیدا ہوئے اور وہ دونوں ایک موجود اصلی میں شریک اور اصلی سے معدوم ٹھہرے تو یہ معنی ہوئے کہ موجود اصلی کا فیض ان دونوں کے واسطے سے اوروں کو پہنچتا ہے جیسے پرنالہ کے وسیلے سے چھت کا پانی نیچے آتا ہے اور آتشی شیشہ کے طفیل سے آفتاب کی سوزش دوسری چیزوں کو پہنچتی ہے اور قلعی دار آئینہ کے صدقہ سے آفتاب کا نور ان در و دیوار کو پہنچتا ہے جو آفتاب کے مقابل نہیں ہوتے ان تمام صورتوں میں سب کو معلوم ہے کہ چھت کا پانی پرنالہ کی راہ سے آتا ہے پرنالہ سے پیدا نہیں ہوتا۔ آفتاب کی سوزش آتشی

شیشہ کی راہ سے آتی ہے آتشی شیشہ میں کچھ حرارت نہیں آفتاب کا نور آئینہ کی راہ سے اور اشیاء کو پہنچتا ہے آئینہ میں ذرہ برابر نور نہیں تو اسی طرح اگر بہت سے موجود اصلی اور بکثرت صانع موجود ہوں تو توحید میں کچھ رخنہ نہیں پڑ سکتا بلکہ اور یہ زیادہ مضبوط اور مستحکم ہو جاتی ہے۔

کیونکہ فلک اور زمانہ جو باعتبار شہرت کے وقائع عالم کا فاعل گنا جاتا ہے یا انسان و حیوان وغیرہ جو ظاہر بینوں کو افعال اختیاریہ کے خالق معلوم ہوتے ہیں یا دوا اور دعا وغیرہ جو بہ نسبت اپنی تاثیروں کے مؤثر حقیقی سمجھے جاتے ہیں یہ سب چیزیں اس وقت بحیثیت اپنے فیوض کے وسیلہ فیض اور واسطہ ایجاد سمجھی جائیں گی اور ان کے خالق ہونے کا شبہ جو بعض ظاہر پرستوں کو پڑا ہوا ہے بے محنت حل ہو جائے گا اور اس وقت ہم باآواز دہل یہ ندا دے سکیں گے کہ ماسوا خالق بزرگ کے جو چیزیں ظاہر میں مصدر افعال یا مصدر تاثیرات نظر پڑتی ہیں وہ سب خدائے اکبر کے سامنے ایک کاریگر کے آلات کی طرح ہیں بادی النظر میں ان چیزوں سے کام ہوتا ہے اور حقیقت میں خدا کرتا ہے اعلیٰ طبقہ کے حضرات جیسے نبی ہوں یا ولی اور ادنیٰ درجہ کے مثلاً دیو ہوں یا پری، اوتار ہوں یا فلک دوار، دوا ہو یا دعا، پتھر ہو یا کوئی جاندار چیز زمانہ ہو یا مکان، چاند ہو یا سورج، ستارے ہوں یا اور کچھ، سب کے سب خدا کے سامنے ایسے ہیں جیسے بڑھئی کے سامنے بسولہ نہانی برما وغیرہ فرمانبردار ہوتے ہیں کہ بے ہلائے اس کے نہیں ہلتے اور بغیر اس کی مرضی کے کوئی کام نہیں کر سکتے۔

اور اس سارے سلسلہ عالم کی مثال ایسی ہے جیسے کہ مشینوں اور کارخانوں اور گھڑیوں وغیرہ میں بہت سی کلیں اور پرزے آگے پیچھے ہوتے ہیں پھر اگر کوئی کام لینا منظور ہوتا ہے اول کل کو ہلاتے ہیں اور سب کلیں بترتیب ہلتی ہیں اور آخر میں جو کام مقصود ہوتا ہے وہ اخیر کی کل سے ہوتا ہے اب ظاہر ہے کہ یہ کلیں خود بخود نہیں ہلتیں کیونکہ وہ بےحس و حرکت جمادات میں سے ہیں ان کے واسطے جبتک کوئی ذیعقل اور صاحب ارادہ کام لینے والا نہ ہوگا ہرگز کام نہ چلے گا اسی طرح سلسلہ عالم کے واسطے علت العلل اور فاعل حقیقی ایک خدائے تعالیٰ ہے کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ فعل اور حقیر سے حقیر چیز بھی اس کے ارادہ اور مشیت کے بغیر وجود میں نہیں آسکتی اور کسی شے کو اس کی سطوت اور حکومت کے آگے دم مارنے کی مجال نہیں جو کچھ وہ چاہے اس میں کوئی مزاحمت نہیں کر سکتا اور مقرب سے مقرب بندے بھی اس کے دربار میں بغیر اس کی اجازت کے لب نہیں ہلا سکتے یہی وہ عقیدہ ہے جس کی طرف اسلام نے نہایت زور شور کیساتھ دعوت دی ہے۔ یہی خیال آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کا سنگ بنیاد ہے اور اسی مضمون کی اشاعت تمام انبیاء کی بعثت کا مقصد اولین ہے۔

اس میں شک نہیں کہ تمام دُنیا کے مذاہب میں توحید کی فی الجملہ جھلک پائی جاتی ہے اور جن مذاہب میں شرک صریح کی تعلیم موجود ہے وہ بھی توحید کے بالکلیہ ترک کرنے پر راضی نہیں ہوتے بلکہ توحید کے چھوڑنے

سے یہ بہتر سمجھتے ہیں کہ شرک کو توحید کے ساتھ جمع کر لیا جاوے اگرچہ یہ اجتماع اجتماع نقیضین ہی کیوں نہ ہو، لیکن یہ عزت خاص مذہب اسلام کو حاصل ہے کہ اس نے بالکل خالص اور بے لوث توحید کی طرف لوگوں کو رجوع کیا اور شرک جلی یا خفی کا تسمہ باقی لگا نہیں رکھا اس جہالت اور تاریکی نے زمانہ میں جبکہ دُنیا میں خالص توحید سے بڑھ کر کوئی گناہ نہ تھا، ہزاروں بندگانِ خدا کو توحید سے مانوس بنا دیا اور آج تک کروڑہا کروڑ انسانوں کے دلوں سے شرک فی الذات شرک فی الصفات اور شرک فی العبادۃ کی ظلمتوں اور کدورتوں کو دھو ڈالا۔

کیا اسلام کی اس بے غل و غش توحید کا مُقابلہ اس قوم کی توحید کر سکتی ہے جس نے خدا کے سوا ہر اینٹ پتھر کے سامنے گردن ڈال دی اور آگ پانی وغیرہ کو بھی قابل پرستش سمجھا اور اپنے ہاتھوں سے بنائی ہوئی مورتیوں کو حاجت روا اور مشکل کشا تصور کیا، اس قوم کی جن کے خُدا کی تکمیل مادہ اور روح سے ہوتی ہے ان کا کمزور خدا ان دونوں کے منشاء کے خلاف نہ کبھی کوئی کارروائی کر سکتا ہے اور نہ ان سے بگاڑ کر ایک دم اپنی خدائی کو قائم رکھ سکتا ہے یا اس قوم کی جنکا مثلث خُدا اپنی کرسی عظمت سے اتر کر تمام انسانی حوائج اور بشری خصوصیات کا محکوم بنا اور بنی آدم کی خطائیں معاف کرنے کے واسطے اس کو سخت تکالیف اور مشقتیں برداشت کرنا پڑیں، یا اس قوم کی جن کا خدا خلقت کے بے سوچے سمجھے پیدا کرنے پر سخت نادم ہوا اور دنیا میں طوفان آجانے سے اسے بیحد ملول ہونا پڑا ایسا

تنگ کر روتے روتے اس کی آنکھیں سوج گئیں اور ملائکہ کو اس کی عیادت کرنی پڑی اور حضرت یعقوب علیہ السلام سے جب اس کی کشتی ہوئی تو انہوں نے اس کو زمین پر پٹک دیا۔

کیوں منصفو! کیا ایمان سے کہہ سکتے ہو کہ آج صحیح اور مکمّل توحید ان میں سے کس مذہب کی بدولت دُنیا میں نظر آ رہی ہے۔

نبوّت

ان تمام مراحل کے بعد جو ہم نے یہاں تک طے کئے ہیں سب سے زیادہ ضروری اور معرکۃ الآرا بحث جو باقی رہ جاتی ہے وہ نبوّت کی بحث ہے اور افسوس کہ جس قدر وقت اس کے لئے درکار ہے اس کا عشرِ عشیر بھی ہمارے پاس موجود نہیں لیکن اس پر بھی ہم نے یہ کسی حال میں مناسب نہیں سمجھا کہ اسلام کے اتنے بڑے رکن اعظم کو بالکل قلم انداز کر دیا جاوے ہاں یہ ممکن ہے کہ یہاں پر ایک اجمالی بحث اس کے متعلق لکھ کر تفصیل تمام کو اسی ضخیم کتاب کو اُوپر اٹھا رکھیں جس کی اُمّید ہم پہلے دلا چکے ہیں، تاکہ ہمارے سامعین کے دلوں میں اگر کوئی گھبراہٹ اور تشویش پیدا ہو تو وُہ اس سے اپنی تسکین کر لیں،

نبوّت کا عقدہ حل ہونے سے پہلے ہر انسان پر یہ فرض ہے کہ وُہ اسباب اطاعت پر غور کرے یعنی یہ کہ ایک آدمی کی اطاعت دوسرے

پر عقلاً کن حالتوں میں اور کن وجُوہات سے ضرُوری سمجھی جاتی ہے اس بارے میں جہاں تک تامل سے کام لیا گیا کل تین سبب اس کے متعین ہوئے جلب منفعت، دفع مضرت اور عشق و محبّت، چنانچہ نوکر اپنے آقا کی اطاعت ملازمت کی اُمّید پر اور رعیت اپنے حاکم کے اندیشہ تکالیف سے اور عاشق اپنے محبوب کی بتقاضاء محبت کرتا ہے اور اطاعت کی کوئی ایک فرد بھی ایسی نظر نہیں آتی جو ان تینوں وجوہات سے خالی ہو اب اگر یہ تینوں سبب فرض کرو کسی ایک ہی شخص میں جمع ہو جائیں تو فطرت انسانی یقیناً اس کی خدمت و اطاعت کو فرض عین قرار دے گی پس جبکہ پچھلے اوراق میں حق تعالےٰ شانہٗ کی نسبت مدلّل طریقہ سے یہ طے ہو چکا ہے کہ دنیا کے تمام کام اسی کے ارادہ اور اختیار سے انجام پاتے ہیں اور ہر قسم کی داد و ستد، سلب و عطا، اور نفع اور ضرر اسی کے ہاتھ میں ہے اور ہر قسم کا کمال اور حسن و خوبی اسی کی ذاتِ اقدس میں موجود ہے اور اس کے سوا کوئی عالم کا مربّی اور محسن بھی نہیں ہے تو بے شبہ عقل کے نزدیک ایسی خدا کی عبادت سے سرمو انحراف جائز نہ ہوگا اور یہ لازم ہوگا کہ اسی کی خدمت گزاری میں آدمی مصروف رہے اسی کا ہر دم دھیان رکھے اور اسی کی محبّت میں اپنے کو دیوانہ بنائے، جئے تو اسی کے نام پر جئے، اور مرے تو اسی کا کلمہ پڑھتا مرے، غرض کسی حالت میں اس سے جدا نہ ہووے اور ظاہر و باطن میں اسی کا تابع فرمان رہے۔

باطن کی فرمانبرداری تو یہی ہے کہ دل میں خدائے تعالیٰ کے متعلق

یہ یقین ہو کہ ہماری ہستی اس کی ہستی کے سامنے بالکل حقیر اور اسی کا وجود ہر طرح پُر عظمت اور کامل اور مکمل ہے۔ ہمارے ہر قسم کے نفع و نقصان کا اختیار اُسی کو ہے اور وہ ہمارا حاکم ہم محکوم ہیں اس میں اعلیٰ درجہ کی شانِ محبوبیت موجود ہے اور ظاہری فرمانبرداری وہ افعال و حرکات ہیں جن سے ہمارے اُنہیں اندرونی جذبات اور باطنی اعتقادات کا سراغ ملتا ہو اور خدا کی محبوبیت کا خیال ان سے مترشح ہوتا ہو۔

مثلاً خدائے تعالیٰ کے سامنے اس کی خاص تجلی گاہ کیطرف ہاتھ باندھ کر کھڑا ہونا اس سے اپنے حال کے متعلق عرض معروض کرنا ادھر سے حکم آجانے پر سرِ نیاز جھکا دینا، اور اس کے آستانہ پر اپنے کو ذلیل و حقیر سمجھ کر ناک اور پیشانی رگڑنا یہ سب آثار محکومیت اور آداب شاہی کے قائمقام ہیں، علیٰ ہذا القیاس اپنے مال و دولت کو خدا کے بتلائے ہوئے مصارف میں خرچ کرنا اور ہر آمد و صرف میں اس کے حکم کا منتظر رہنا یہ بھی سراپا اطاعت ہونے کے لوازمات میں سے ہے،

پھر اگر خدائے تعالیٰ کو محبوب حقیقی سمجھتا ہے تو اس کے قرب و وصل کی فکر میں ہر ایک ماسوا سے بیزار ہو جانا آب و طعام اور لذت جماع کو (جو کہ خلاصہ تمام کائنات کا ہے) ترک کر دینا اس کے بعد تجلی گاہِ ربانی کی طرف پا برہنہ سر برہنہ لبیک کہتے ہوئے دوڑنا اور وہاں پہنچکر کبھی حالت شوق و وجد میں اس تجلی گاہ کے گرد گھومنا کبھی جنگلوں میں بھٹکتے پھرنا، کبھی دشمنِ محبوب کے خاص مکان پر سنگ باری کرنا اور کبھی جان و

مال سے فدا ہونے کے لئے تیار رہنا یہ سب محبت قلبی کی علامات اور عشق حقیقی کے ظاہری نشانات ہوں گے، الغرض یہ امر تو اب عقلاً پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا ہے کہ دل سے زبان سے ہاتھ پاؤں سے جس طرح بھی بن پڑے آدمی اپنے خالق کی اطاعت کی طرف متوجہ رہے اور ہرگز اپنا روئے نیاز دوسری جانب نہ پھیرے، لیکن سخت مشکل یہ تھی کہ کسی کی اطاعت بغیر اس کے متصور نہیں کہ ہم کو اس کی پسندیدہ اور ناپسندیدہ باتوں کا علم ہو اور خدائے تعالیٰ کی نسبت یہ دریافت کرنا کہ وہ کن امور سے خوش اور کن امور سے ناخوش ہوتا ہے ہر شخص کی قدرت سے باہر تھا، کیونکہ محض اپنی عقل سے اگر ہم نے چند احکام معلوم کر لئے تو اول تو تمام احکام کی تفصیل اس سے معلوم نہیں ہو سکتی، دوسرے یہ کہ خدائے تعالیٰ شانہ ہماری عقل کا ہر بات میں پابند بھی نہیں ہو سکتا اس بنا پر خدائے تعالیٰ کی اطاعت و عبادت بغیر اس کے ممکن نہیں کہ خود خدائے برتر اپنی رضاء و عدم رضا سے بندوں کو مطلع فرمائے۔

اور یہ خوب معلوم ہے کہ جب سلاطین دنیا اس تھوڑی سی نخوت و تکبر اور ذرا سے جھوٹے استغنا پر ہر دوکان، دوکان اور مکان، مکان اپنے احکام سناتے نہیں پھرتے، اور نہ ان کو یہ گوارا ہے کہ ہر کس و ناکس کو اپنے مافی الضمیر کی اطلاع کے واسطے ہمکلامی بخشیں تو کیا وہ احکم الحاکمین وراء الورا، ثم الورا جس کو تمام عالم سے بالکل استغنا اور سب چیزوں کو اس کی احتیاج ہے ہر ایک عام و خاص اور ہر ایک رند بازاری کو منہ لگاتا اور

اپنی حضوری و ہمکلامی سے باریاب فرمانا پسند فرمائے گا جب ایسا نہیں تو بیشک خدا کے یہاں بھی کچھ لوگ ایسے خاص ہوں گے جیسے بادشاہوں کے یہاں وزیر یا نائب السلطنت یا وائسرائے اور جیسا کہ تمام سرکاری احکام رعایا کے پاس انہیں صاحبوں کے توسط سے پہنچتے ہیں ایسے ہی خدا کے پیغام اور امر و نواہی ان معتمدین کے ذریعہ سے ہم تک پہنچے ہوں گے ہم انہیں معتمدین کو انبیاء رسول اور پیغمبر کہتے ہیں اور ہمارا خیال ہے کہ جس زمانہ میں خدائے تعالیٰ سمجھتا ہے، ایسے رسولوں کو اس زمانہ کے مناسب ہدایات دے کر مبعوث فرما دیتا ہے۔

یہاں پر تم کو شاید یہ شبہہ گزرے کہ مختلف قرون میں جب انبیاء علیہم السلام تشریف لاویں گے اور ظاہر ہے کہ ان میں سے مؤخر کی شریعت مقدم کی شریعت کے واسطے ناسخ ہوگی تو وہم یہ ہوتا ہے کہ ... پہلے نبی کے بھیجنے میں شاید خدائے تعالیٰ سے کچھ سہو ہو گیا تھا یا بھول چوک سے اُس کو مناسب احکام دیئے تھے جو دُوسرے نبی کے ذریعے سے اس غلطی کی اصلاح کرائی گئی، مگر یہ شبہہ آپ کا سراسر کم فہمی اور نادانی پر مبنی ہے، نسخ کے معنی صرف تبدیلی احکام کے ہیں یہ آگے آپ کا قیاس ہے کہ وہ تبدیلی پہلی غلطی کی اصلاح کی وجہ واقع ہوئی ہوگی۔

خدائے برتر کی نسبت ایسا خیال باندھنا سخت گستاخی ہے۔

آپ نے بارہا دیکھا ہوگا کہ طبیب اگر کسی مریض کو مسہل دینا چاہتا ہے تو اُس کے لئے پہلے منضج کا نسخہ تجویز کرتا ہے، چند روز بعد وہ نسخہ

بدل کر مسہل کا نسخہ پلاتا ہے تو کیا آپ نے اس طبیب کی نسبت بھی یہی رائے قائم کی ہے کہ اس سے منضج کا نسخہ دینے میں غلطی ہو گئی تھی جس کی مکافات وہ دُوسرے نسخے سے کر رہا ہے، جب یہاں آپ نے ایسا نہیں سمجھا تو خدائے تعالیٰ کے معاملہ میں آپ کو کس چیز نے مجبور کیا ہے کہ بلا وجہ ایک ایسا مہمل خیال پیدا کریں کیوں یہ نہیں مان لیتے کہ اس نے بھی ہر زمانہ کی طبیعت اور مزاج کا اندازہ کر کے اس کے موافق مختلف احکام جاری کر دیئے ہیں، اور اس میں کچھ مضائقہ نہیں۔ باقی یہ خلجان کہ کیا خدائے برتر اس پر قادر نہیں تھا کہ ابتدائے عالم میں ہی کوئی ایسی مکمل کتاب ہدایت کے لئے نازل فرما دیتا جس میں ہر زمانہ کے تغیرات کی رعایت کر لی جاتی اور اس کی حاجت نہ رہتی کہ بار بار وہ اپنے بچے الہام میں دست اندازی کرے۔ اس کی بابت میں عرض کرتا ہوں کہ بیشک خدا اگر اس پر قادر تھا تو کیا اس پر قادر نہ تھا کہ بغیر نطفہ اور خون بننے، رحم مادر میں پرورش پانے اور بتدریج نشو و نما کرنے کے ایک کامل و مکمل انسان دفعتاً پیدا کر دیتا (جیسا کہ آریہ سماج اپنے چار رشیوں کی نسبت کہتے ہیں) یا بغیر تخم ریزی آب پاشی وغیرہ سامان زراعت کے خود بخود تمام نباتات کو زمین سے اُگا دیتا اگر اس لئے باوجود قدرت کے ان جسمانیت میں (نعوذ باللہ) یہ دردسری اُٹھائی تو رُوحانیت میں بھی اس کو اپنی اسی عادت سے معذور سمجھنا چاہیئے اور اگر وہاں اس تدریجی ترقی میں کچھ خاص حکمتیں اور مصلحتیں متعلق ہو سکتی ہیں تو یہاں اسی قسم کی مصلحتوں کا لحاظ کر لینے سے کونسی چیز

مانع ہے؟

بہر کیف اس میں کچھ حرج نہیں بلکہ عین حکمت اور رحمت ہے کہ حق تعالیٰ سُبحانہ ان مختلف تخم ہائے اخلاق کی (جو ازل سے قلوب بنی آدم کی زمینوں میں ڈالدیئے گئے ہیں) تربیت اور نشوو نما کے واسطے اپنی رحمت کے بادل بھیجے اور بادلوں کے برسنے سے جس زمین میں جیسا کچھ اچھا یا بُرا بیج بویا گیا ہے، اس کو ترقی اور نشوونما حاصل ہو وہ ابرہائے رحمت جیسا کہ بلال رضؓ اور سلمان رضؓ کے کھیتوں کو سرسبز و شاداب کریں ایسے ہی ابوجہل وغیرہ کے دلوں میں جو کفر و شقاوت کا بیج بکھیرا گیا ہے اس میں بھی جان تازہ ڈال دیں ان ہی سحابہائے معارف کو انبیاء کہا جاتا ہے۔ ان کے اثر کو تقویت پہنچانے والوں کا نام ملائکہ ہے اور ان کی تدابیر کی رہبری کرنے والوں کو شیاطین کا لقب دیا جاتا ہے۔

ملائکہ اور شیاطین

ملائکہ اور شیاطین کا لفظ سُنکر بعض منکرین کو شاید بہت غُصّہ آ جائے اور وہ اِس تصوّر پر کہ ہم نے ان کے نزدیک چند فرضی چیزوں کا نام لے دیا ہے کہیں ہمارے تمام سابق بیانات کو واقفیت سے دُور نہ سمجھ بیٹھیں اس وجہ سے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں لفظوں کی بھی کچھ مختصر تشریح کر دی جائے۔

یہ خوب یاد رہے کہ باجماع اہل عقل جسم انسان کی ترکیب چند ایسے مختلف عنصروں سے دی گئی ہے جن میں سے ایک عنصر کی تاثیر دُوسرے کے مخالف اور متضاد ہے مثلاً بدن انسان میں گرمی کے آثار پائے جانے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اقوام میں کوئی حصّہ آگ کا موجود ہے اور سردی کی کیفیات محسوس ہونے سے جزوِ ہوائی کا تیقن ہوتا ہے، اور خشکی سے جزوِ خاکی کا ثبوت اور تری سے جزوِ آبی کا پتہ چلتا ہے گویا کہ مٹی پانی، ہوا، اور آگ میں سے ہر ایک کا بقدر مناسب حِصّہ لے کر جسم کا خمیر بنایا گیا ہے۔ اس کے بعد جب حکماء نے دیکھا کہ جو آدمی پیدا ہوتا ہے اس میں یہ چاروں اجزاء ضرور ملے ہوئے ہوتے ہیں تو انہوں نے ایسے چار خزانوں کا کھوج لگایا جن میں یہ چاروں چیزیں الگ الگ بافراط موجود ہوں اور جن میں سے تھوڑا تھوڑا لے کر خدائے تعالیٰ نے آدم کے جسم کو ترکیب دیا ہو، اس قسم کے چار خزانوں کے نام انہوں نے کرۂ ارض، کرۂ ہوا، کرۂ نار، اور کرۂ آب اور ان میں سے ایک ایک کو حرارت، برودت، رطوبت، یبوست کا منبع اور معدن قرار دیا۔

ٹھیک اسی طرح رُوح انسان کی ترکیب اور اس کا امتزاج ایسے دو متضاد اور معارض اجزاء سے واقع ہُوا ہے جس کی بناء پر انسان کبھی نیکی کی طرف مائل ہوتا ہے اور کبھی بدی کی طرف اس کی رغبت ہوتی ہے، کیونکہ جس طرح کسی نے خدائے تعالیٰ کو آدم کا خمیر بناتے نہیں دیکھا، بلکہ صرف یہ سمجھ کر کہ رطوبت، اور یبوست مثلاً دو متضاد اثر ایک ہی چیز سے پیدا

نہیں ہوتے، یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ یقیناً جسم کی ترکیب آب و خاک وغیرہ سے ہوئی ہے، اسی طرح طاعت و معصیت کی طرف میلان جو ایک ہی آدمی سے متفرق اوقات میں مشاہدہ کیا جاتا ہے اس کے بتغیر جوڑ نہیں کھاتا کہ رُوح کی ترکیب بھی دو مختلف قسم کی اشیاء سے مانی جاوے،

اور جب یہ ہے تو جیسا کہ عناصر جسم کے لئے علیحدہ علیحدہ چار مخزن تسلیم کر لئے گئے تھے ایسا ہی ان دونوں رُوحانی خبروں کے واسطے بھی مخلوقات میں دو مخزن مان لئے جاویں تو کیا استبعاد ہے۔ پس خدا کی وہ مخلوق جس میں ہمیشہ امور خیر اور نیکی ہی کی طرف توجہ پائی جاوے اور ان کا بھی اقتضاء طاعت ہی ہو اور ان کی صرف یہی شان ہو کہ لَا یَعْصُوْنَ اللّٰہَ مَا اَمَرَھُمْ وَ یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ اسی مخلوق کو ہم ملائکہ اور فرشتوں سے تعبیر کرتے ہیں اور ان کے مقابلہ میں وہ گروہ جس کی طبیعت میں معصیت ہی معصیت رکھی ہو اور اطاعت و عبادت سے اس کا پیمانہ بالکل خالی ہو اور اس کی حالت محض وَکَانَ الشَّیْطٰنُ لِرَبِّہٖ کَفُوْرًا ہی سے ادا کی جا سکتی ہو ایسے گروہ کو ہم شیاطین کا لقب دیتے ہیں

اس پر بھی اگر ہم سے کوئی مہربان آریہ دریافت کریں کہ گو عقلی دلائل سے ایسی چیزوں کا وجود ثابت ہو سکتا ہے مگر ہم نے اور کسی نے آج تک اُن کو نہیں دیکھا اور نہ رجماً بالغیب ایمان لانے کو ہمارا دل گوارا نہیں تو ہم اُن حضرات کی خدمت با ادب گزارش کریں گے کہ آپ نے وہ تین حصے بذاتِ خود روشن دُنیا کے جو ہماری دُنیا سے بالکل علیحدہ ہیں،

اور جن کا ذکر یجر وید کے تیسرے منتر میں موجود ہے کب اور کس وقت اور کس جگہ مشاہدہ کئے ہیں۔ اور اگر کئے ہیں تو کیا آپ دوسرے لوگوں کو ان کا مشاہدہ کرانے کے لئے تیار ہیں دیکھئے اب آپ خود اس منتر کا ترجمہ بحاشیہ بھومکا صفحہ ۸۰، میں ملاحظہ فرمائیے کہ گذشتہ و آئندہ و موجودہ جس قدر کائنات ہے اس سب کو پرا سی پرکش کے مہیمی عظمت کا نشان سمجھنا چاہیئے"

یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ محدود کائنات کو اس کی عظمت کا نشان بنانے سے اس کی عظمت محدود ہو جاتی ہے اس کا جواب اسی منتر میں آگے دیتے ہیں کہ اس کی عظمت اس پر محدود نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ اور غیر محدود ہے پرکرتی سے لے کر زمین تک تمام (لطیف و کثیف) کائنات اس غیر متناہی قدرت والے ایشور کے ایک پہلو میں قائم ہے اس کی ذات پر نُور میں امرت (عالم عرفانی یا موکش کا سکھ) موجود ہے یعنی تین حصے کائنات عالم لطیف و روشن میں موجود ہے گویا غیر روشن دُنیا ایک حصہ ہے اور بذات خود روشن دنیا اس سے تگنی ہے اور اور وہ ایشور عین راحت موکش سوروپ حاکم کل معبود کل عین مسرت اور سب کو روشن و منور کرنے والا ہے"۔ اس عبارت کو سننے کے بعد بھی کیا ہندوستان کی پرجوش سوسائٹی کا کوئی ممبر جن و ملک یا بہشت و دوزخ کے وجود سے انکار کر سکے گا"

نبی کی علامات

منکرین کے شبہات کا حل کرنے میں چونکہ اب ہم اپنے اصلی مقصد سے دور نکل گئے ہیں اس لئے ہم کو اسی طرف پھر عود کرنا چاہیئے اور یہ بتلانا چاہیئے کہ کسی شخص کو رسُول برحق ماننا کن شرائط پر موقوف ہے آیا جو کوئی بھی دعوۂ نبوت زبان سے کرنے لگے یا جو کوئی بھی دُنیا کو چند عجیب وغریب تماشے دکھلا دے یا جو کوئی بھی، دو چار ہزار مرید جمع کرلے اسی کو ہم نبی اور پیغمبر مان لیں یا نبوت کیواسطے کوئی معیار ایسا تجویز کیا گیا ہے جس کے ذریعہ سے ماہر طبیبوں کو اشتہاری حکیموں سے جدا کیا جاسکے رہبر اور رہزن کے پہچاننے میں دھوکہ نہ لگے اور محافظوں کی جماعت پر لیٹروں کا اشتباہ نہ ہو۔

بلاشبہ غور کرنے سے یہ معلوم ہوا ہے کہ جبکہ انبیاء علیہم السلام خدا کے معتمد، اس کے وکیل اس کے رازدار اور اس کے نائب ہیں تو ان کی ذات میں ایسے پاکیزہ اوصاف اور حقیقی خوبیاں مجتمع ہونی چاہئیں جو ایک ایسے باخبر شہنشاہ اعظم کا قرب حاصل کرنے کے لئے درکار ہیں ہم دیکھتے ہیں کہ سلاطین دُنیا بھی جن کو کچھ عقل ہو باوجود اس مجازی حکومت کے اپنی مسند قرب پر ان لوگوں کو نہیں بٹھلاتے جو بے عقل، کج خلق پست حوصلہ یا حکومت کے دشمن ہوں، چہ جائیکہ خدائے برتر اپنے منصب

وزارت کے لئے ایسے لوگوں کا انتخاب کرے جن کی اخلاقی حالت نہایت پست عملی حیثیت نہایت ذلیل اور عقلی قوتیں نہایت کمزور ہوں اور بجائے ہدایت پھیلانے کے گمراہ کرنے میں زیادہ مشتاق ہوں اور لوگوں سے بمقابلہ خدا کی عبادت کرانے کے اپنی پرستش کے زیادہ متمنی ہوں۔ اگر نعوذ باللہ خدائے عزوجل ایسا کرے تو یوں کہو کہ وہ خدا بالکل بے خبر اور جاہل بندوں سے عداوت رکھنے والا ہے جس کو اتنی بھی خبر نہیں ہے کہ میں جس شخص سے جو کام لینا چاہتا ہوں وہ اس کی اہلیت نہیں رکھتا۔

تو اس صورت میں یہ واجب ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کے دلوں میں اوّلاً تو خدا کی محبت اور اخلاص اس درجہ ہو کہ ارادۂ معصیت کی گنجائش ہی نہ نکلے۔ دوسرے یہ کہ اخلاق پسندیدہ جو اعمال حسنہ کی جڑ ہیں، ان کے اندر فطرتی طور پر راسخ ہوں تاکہ جو کام بھی وہ کریں قابلِ اقتداء اور جو فعل بھی اُن سے سرزد ہو باعثِ ہدایت سمجھا جائے۔ تیسرے یہ کہ فہم و فراست انہیں امتیوں کے اعتبار سے اعلیٰ درجہ کی ہو کیونکہ کم فہمی فی نفسہٖ عیب ہونے کے علاوہ اس وجہ سے بھی ان کے حق میں مضر ہے کہ کلام خداوندی کے اسرارِ غامضہ کا سمجھنا اور دقیق علل پر مطلع ہونا اور ہر ایک ذکی و غبی کو احکام الٰہی دلنشین طریقے سے سمجھا دینا بغیر عقل صحیح اور فہم کامل کے ہرگز متصور ہی نہیں۔

یہی تین اصُول ہیں جو ایک مدعیٔ نبوت کی صداقت کا سم کو ایک ایسے زمانہ میں پتہ دے سکتے ہیں جس میں کسی نبی کی بعثت کا احتمال ہو سکتا ہو

باقی معجزات وہ اگرچہ اصل نبوت کے اعتبار سے ضروری نہیں لیکن مدعی نبوت سے ان کا صادر ہونا بیشک اس کی راست بازی کی دلیل ہے کیونکہ اگر ایک شخص مثلاً سلطان روم کے رُوبرُو لوگوں سے یہ کہے کہ میں سلطان کا معتمد اور محبوب ہوں اور اس کی دلیل یہ بیان کرے کہ دیکھو جس طرح میں اُن سے کہونگا برابر وہ اسی کے موافق کریں گے اور جو فرمائش کروں گا اس کو پورا کرکے دکھلائیں گے یہ کہہ کر سلطان کو کھڑا ہونے کی طرف اشارہ کرے اور کھڑے ہو جائیں پھر ان سے بیٹھنے کو کہے اور وہ معاً بیٹھ جائیں اور اس طرح لگاتار بہت سے کاموں کی خواہش کرتا رہے اور وہ بھی ایک ذرہ اس کے خلاف نہ کریں اور فرض کرو کہ وہ سب کام سلطان کی عادت مستمرہ اور مزاج کے خلاف بھی ہوں تو کیا کسی جاہل اور معاند کو بھی ایسی حالت میں اس شخص کے دعوے کی تصدیق میں کچھ تردّد رہے گا، اور کیا کوئی بیوقوف بھی یہ حجت کرے گا کہ دعویٰ تو اس کا محبوب اور معتمد ہونے کا تھا اور اس کے معتمد ہونے اور سلطان کے کھڑے ہونے میں کوئی مناسبت نہیں اس لئے اس سے اس پر کوئی استدلال نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ سلطان اپنی زبان سے اس کے معتمد ہونے کا اقرار نہ کرے۔

ایسے ہی احمق سے کہنا چاہیئے کہ تصدیق دعوئی دو طرح پر ہوتی ہے ایک حالی اور ایک مقالی تو گو اس جگہ زبانی اور قولی تصدیق سلطان کی جانب سے نہیں پائی گئی مگر حالی تصدیق جو اس سے بھی بڑھ کر ہے حاصل ہو گئی یہی حال بعینہٖ انبیاء علیہم السلام کے معجزات کا ہوتا ہے کہ وہ اپنی نسبت خدا

کا وزیر اور معتمد ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور خدا ہر وقت اور ہر جگہ ان کے دعویٰ کو سُنتا ہے پھر وہ عادت اللہ کے خلاف بہت سے کاموں کی فرمائش کرتے ہیں تاکہ ان کے دعویٰ کی سچائی دنیا پر ظاہر ہو جاوے اور خدائے تعالیٰ برابر ان کے حسب مدعا فرمائشوں کو پورا فرماتا رہتا ہے تو کیا منجانب اللہ یہ ان کے دعویٰ کی حالی تصدیق نہیں ہوئی اور ظاہر ہے کہ جھوٹے آدمی کی تصدیق کرنا خود جھوٹ کی ایک قسم ہے تو اس سے (اس مدعی کے کاذب ہونے کی صورت میں) خدائے برتر کا کذب ثابت ہوا (نعوذ باللہ منہ) حالانکہ خدائے تعالیٰ کا خالق کذب ہونا تو ضروری لیکن قولاً وعملاً کاذب ہونا محال ہے،

اب اگر کسی کو یہ وہم گذرے کہ یہ سب تقریر اس وقت قابل تسلیم ہے جبکہ معجزہ یا خوارق عادت کا وجود ممکن ہو حالانکہ اس کا امکان ابھی محل تردد میں ہے تو میں کہتا ہوں کہ ہم معجزہ اُسی کو کہتے ہیں کہ جو عقلاً محال نہ ہو لیکن خلاف عادت ہو اور خلاف عادت کے بھی یہ معنی ہیں کہ علم عادت کے خلاف ہو کیونکہ معجزہ بھی ہمارے نزدیک خُدا کی خاص عادت ہے جو خاص خاص اوقات میں خاص خاص مصلحتوں سے ظاہر ہوتی ہے اور جیسا کہ زید مثلاً ہمیشہ سے قمیض پہننے کا عادی ہو، مگر عید کے روز ہمیشہ اچکن پہنا کرے، تو گو اچکن پہننے کو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ زید کی عام عادت کے خلاف ہے مگر ایک حیثیت سے یہ بھی اُس کی عادت میں داخل ہے اسی طرح آگ سے کسی چیز کا جلا دینا اگرچہ خداوند تعالیٰ کی علم عادت لیکن بعض مواقع میں جبکہ کسی نبی کی تصدیق یا اور کوئی مصلحت ملحوظ ہو تو آگ سے وصف احراق سلب کر لینا بھی اُس کی

عادت ہے کیونکہ ثابت ہو چکا کہ تمام اسباب و مسببات میں جو کچھ تاثیر ہے وہ خدا کے ارادہ سے ہے وہ جب چاہے سبب کے وجود کو مسبب سے اور مسبب کے وجود کو سبب سے علیحدہ کر سکتا ہے تو جب مشاہدہ سے یا نہایت ثقہ راویوں کے ذریعے سے یہ معلوم ہو جائے کہ ایک شخص نے دعویٰ نبوت کیا اور بہت سے معجزات دکھائے اور تمام عمر میں کسی ایک بات میں بھی اس کے کہنے کے خلاف نہ ہوا ہو تو بلے شک و شبہ ایسے شخص کو نبی سمجھنا چاہیئے کیونکہ نبی کاذب کی تصدیق خدائے تعالیٰ قولاً یا عملاً ہرگز نہیں کر سکتا، اور وہ اگر ایسا کرے تو دین منجملہ رحمت نہ ہوگا۔

مجھ کو افسوس ہے کہ ہمارے زمانے کے بعض عقلاء کو معجزات کے ممکن الوقوع ہونے سے انکار ہے اور طرفہ تماشہ یہ کہ وقوع کی صورت میں وہ ان کے نزدیک دلیل نبوت بھی نہیں ہو سکتا کیونکہ ان کو اب تک یہ معلوم نہیں ہوا کہ موسیٰ کے نبی ہونے اور لاٹھی کے سانپ بن جانے میں کیا تعلق پایا جاتا ہے جو ایک سے دوسرے پر استدلال ہو سکے۔ (فاعتبروا یا اولی الابصار)

میرا قصد تھا کہ اس بحث کو نہایت تفصیل کے ساتھ لکھتا اور ان عقلاء کے خیالات کی پوری جانچ کرتا مگر تنگیٔ وقت سے مجبور ہو کر اس مسئلہ کو بھی دوسرے مسائل کی طرح اسی کتاب موعود کے حوالے کرتا ہوا خاص سرور کائنات آقائے نامدار محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور ختم رسالت کے متعلق کچھ تھوڑا سا لکھنا چاہتا ہوں۔

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت

اس بدیہی معیار رسالت کے مان لینے کے بعد جو میں عرض کر چکا ہوں حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا ثبوت بالکل آسان ہو جاتا ہے کیونکہ آپ کے بیشمار علمی و عملی کارنامے اس وقت بھی دنیا کی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہیں اور نہ تمام اولوالعزم انبیاء علیہم السلام کے معجزات مل کر آپ کے معجزات کی ہمسری کر سکتے ہیں آپ کے فہم و اخلاق کا موافق و مخالف کو اعتراف کرنا پڑا ہے اور چار دانگ عالم میں آپ کی صداقت کا سکہ بیٹھ گیا ہے اور دنیا کے ہر خطہ میں آپ کا آفتاب فیض لمعہ افگن ہے۔

جب ایک غیر متعصب اور عقلمند آدمی آپ کے احوال کا انبیاء سابقین کے احوال سے اور آپ کی تعلیم کا ان کی تعلیم سے اور آپ کی قوت و ہمت کا انکی قوت و ہمت سے مقابلہ کرے گا تو یہی اس کے لئے ضروری ہوگا کہ آپ کی محض صداقت کا نہیں بلکہ رسالت کا اور رسالت کا نہیں بلکہ ختم رسالت کا زبان و دل سے اقرار کرے۔ عرب کی جہالت و درشت مزاجی گردن کشی کون نہیں جانتا جس قوم میں ایسی جہالت ہو کہ کوئی کتاب اس کے پاس آسمانی ہو نہ زمینی اور اس کے اخلاق کا یہ حال کہ قتل و غارت وغیرہ ایک معمولی حرکت ہو، عقل و فہم کی یہ کیفیت کہ پتھروں کو اٹھا لائے اور پوجنے لگے اور گردن کشی کی یہ صورت کہ کبھی کسی بادشاہ کی اطاعت قبول نہ کرے جفاکشی کی یہ نوبت کہ ایسے ملک

میں شاد و خرم عمر گذارے۔ ایسے جاہلوں اور خود سروں کو راہ پر لانا ہی دشوار تھا چہ جائیکہ علم الٰہیات، علم معاملات، علم عبادات، علم اخلاق اور علم سیاست میں رشکِ حکما نامدار بنا دیا یہاں تک کہ دنیا نے ان کی اور ان کے شاگردوں کی شاگردی کی۔ ڈاکٹر لیبان کہتا ہے "اس پیغمبر اسلام، اس نبی امی کی بھی ایک حیرت انگیز سرگذشت ہے جس کی آواز نے ایک قوم ناہنجار کو جو اس وقت تک کسی ملک گیر کے زیر حکومت نہیں آئی تھی، رام کیا اور اس درجہ پر پہنچایا کہ اس نے عالم کی بڑی بڑی سلطنتوں کو زیر و زبر کر دیا اور اس وقت بھی وہی نبی امی اپنی قبر کے اندر سے لاکھوں بندگانِ خدا کو کلمۂ اسلام پر قائم رکھے ہوئے ہے۔"

اگر انصاف کرو تو آپ کے حسن اخلاق کا اندازہ کرنے کے لئے یہی کافی ہے کہ آپ نہ کہیں کے بادشاہ تھے نہ بادشاہ کے گھرانے میں پیدا ہوئے تھے نہ کچھ زیادہ مال و دولت آپ نے جمع کر رکھا تھا، نہ باپ دادا نے کوئی اندوختہ میراث میں چھوڑا تھا نہ آپ کے پاس تنخواہ دار فوج تھی نہ اہلِ وطن آپ کے ہمراہ تھے نہ قبیلے والوں کو آپ کے مذہب سے ہمدردی تھی۔ ایسی بیکسی اور بے بسی کی حالت میں آپ نے ان تند خو گنواروں کو ایک صدائے نامانوس سے مخاطب کیا کہ جس سے بڑھ کر اس وقت تک ساری دنیا میں کوئی ناپسند آواز نہ تھی اور نہ ایسی صدا دینے والے سے زیادہ ان کے نزدیک کوئی شخص ان کا دشمن اور بدخواہ سمجھا جا سکتا تھا۔ یہ وہی لا اِلٰہ اِلَّا اللّٰہ کی آواز تھی کہ جس نے دفعتًہ تمام عرب میں تہلکہ ڈال دیا جس سے باطل معبودوں کی

حکومت میں بونچال آنا شروع ہو گیا اور جس کی چمک سے اس کفر اور جہالت کی تاریکیوں میں بجلی سی کوند گئی گویا وہ ایک زور شور کی ہوا تھی جس کے چلتے ہی شرک و بت پرستی کے بادل چھٹ گئے اور آفتاب توحید ابر کے پردہ سے باہر نکل آیا یا ابابیل رحمت تھی جس کی بوچھاڑ نے مخلوق پرستی کے سیاہ ہاتھوں کے پرخچے اڑا دیئے اور خدا کے گھر کو ان کی زد سے بچا لیا۔

غرضیکہ ایک ایسے بے یار و مددگار نے ایسی سخت قوم کو ایسے ظلمت کے زمانہ میں ایسے اجنبی مضمون کی طرف ابھارا اور تھوڑے سے عرصہ میں ان سب کو ایسا مسخر اور گرویدہ بنا لیا کہ جہاں آپ کا پسینہ گرے وہاں خون گرانے کے لئے تیار ہو گئے گھر بار کو ترک کر دیا زن و فرزند سے بگاڑ لی۔ مال و دولت کو سنگ ریزوں سے زیادہ حقیر سمجھا اپنے بیگانوں سے آمادۂ جنگ و پیکار ہوئے کسی کو آپ نے مارا کسی کے ہاتھ سے آپ مارے گئے۔ پھر وہ چار روز کا ولولہ نہ تھا بلکہ آپ کے بعد بھی اسی حالت پر استقلال کے ساتھ جمع رہے یہاں تک کہ قیصر و کسریٰ کے تخت الٹ دیئے۔ فارس و روم کو تہ و بالا کر دیا اور اس پر معاملات میں وہ شائستگی رہی کہ کسی لشکری نے سوائے مقابلۂ جہاد کسی کی ایذا رسانی یا ہتک ناموس کو گوارا نہ کیا یہ تسخیر اخلاق بتلایئے۔ اس سے پہلے زمانہ میں بھی کسی سے ظاہر ہوئی ہے اس پر بھی اگر کوئی یہی کہے کہ نہیں اسلام بزور شمشیر پھیلا ہے تو فی الواقع اس سے زیادہ کور چشم تنگ دل متعصب کوئی نہیں ہو سکتا، کاش کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کو یہ لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھتے اور وہ اپنے اسلام کا

واقعہ ان کے سامنے بیان فرماتے یا سلمان فارسی سے جا کر ان کی داستان سنتے یا عبداللہ بن سلام خدمت میں اپنا اعتراض پیش کرتے اور وہ ان کو اس کا جواب سمجھاتے۔

مگر یہ تو آپ کے اخلاق کی حالت تھی باقی آپ کے علم و فہم کا نشان سب سے بڑا یہی ہے کہ آپ بذاتِ خود امّی محض جس ملک میں پیدا ہوئے، جہاں ہوش سنبھالا بلکہ ساری عمر گذاری علوم سے یک لخت خالی نہ وہاں علوم دینی کا پتہ نہ علوم دنیاوی کا نشان پھر اس پر ایسا دین، ایسے آئین، ایسی کتاب لاجواب، اور ایسی ہدایات بینات لائے کہ آج تک بڑے بڑے حکماء اس کا جواب نہ لا سکے بلکہ بڑے بڑے مدعیانِ عقل و تہذیب نے اس کی داد دی قرآن جیسا زندہ اور علمی معجزہ کس پیغمبر کو دیا گیا جس کا مقابلہ کیا باعتبار فصاحت و بلاغت کے اور کیا باعتبار علوم و معارف کے اور کیا باعتبار تحریف و تبدیل سے محفوظ رہنے کے دنیا کی کوئی کتاب نہیں کر سکتی اور نہ انشاء اللہ تعالیٰ کر سکے گی۔ قرآن کے حق میں ہم اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ جو خود قرآن تیرہ سو برس سے پکار پکار کر کہہ رہا ہے یعنی یہ کہ جس میں ہمت ہو وہ میرا جواب لکھدے مگر آج تک کسی کا حوصلہ نہ ہوا اور نہ ہو گا اور اس کی ایک چھوٹی سی سورت کی مثال بھی پیش کر سکے۔

اب میں اس کے سوا کیا کہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جیسا کہ اپنی عادات و اخلاق میں تمام انبیاء علیہم السلام سے فائق تھے، ایسے ہی علوم کے بھی سارے مراتب آپ پر تمام کر دیئے گئے تھے، کیونکہ انبیاء سابقین میں نہ ایسا

اعجاز علمی کسی کو دیا گیا نہ اُن کے اتباع میں کسی نے اُن علوم کے دریا بہائے جو اہلِ اسلام کے بہائے ہیں اور جبکہ صفت علم تمام ان صفات کی خاتم ہے جو مربّیِ عالم ہیں تو جس کا اعجاز علمی ہو گا گویا اس پر تمام کمالاتِ علمی کا خاتمہ کر دیا جائے گا اور اسی کو ہمارے نزدیک خاتم الانبیاء کہنا مناسب ہو گا اور چونکہ اس کا دین قیامت تک رہے گا اس لئے اس کتاب کا بھی تا قیامت باقی رہنا ضروری ٹھہرے گا، باقی قرآن کے سوا آپ کے جو اور علمی اور عملی معجزات ہیں ان کے بیان کی اس وقت بالکل گنجائش نہیں رہی اور نہ ہیں قلتِ وقت کی وجہ سے توریت و انجیل وغیرہ کے بشارات آپ کی نبوت کے متعلق نقل کر سکا، جس کسی کو شوق ہو۔ اوّل مضمون کے واسطے حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کی حجۃ الاسلام اور دوسرے کیلئے علامہ ابن القیم کی ہدایۃ الحیاری کا مطالعہ کرے

اسلام اور علم و فن

البتہ اس اخیر موقع پر اس قدر عرض کر دینا ضروری ہے کہ آپ کے بعد جو علوم و فنون دنیا میں مسلمانوں کے ذریعہ سے پھیلے اور تمدن کے شعبوں کو ترقی ہوئی اس کا بھی قدرِ اندازہ غیروں کی زبان سے ہم سامعین کو کرا دیں تاکہ جو لوگ مسلمانوں کو علم اور تمدن کا دشمن بناتے ہیں اور پھر اس دشمنی کو ان کی مذہبی تعلیم کا نتیجہ سمجھتے ہیں وہ بھی اپنی کم فہمی اور کوتاہ نظری سے کچھ شرمائیں ترقیِ علوم فنون کے متعلق انسائیکلو پیڈیا میں لکھا ہے جس کا خلاصہ نقل کرتا ہوں۔

سنہ ۷۴۹ء خلفاء عباسیہ کے عہد میں علم ادب و فنون حکمت کا ظہور ہوا اور المنصور سنہ ۷۵۴ء کے ایام حکمرانی سے ہارون رشید سنہ ۷۸۶ء تک

بڑی فیاضی سے اس کی تربیت ہوئی۔ بہت سے ملکوں سے اہلِ علم طلب کئے گئے اور بادشاہانہ سخاوت سے ان کی بہت کچھ داد و دہش کی گئی۔ اہلِ یونان و شام و ایران قدیم کی عمدہ عمدہ کتابیں عربی میں ترجمہ ہوکر شائع اور مشتہر ہوئیں خلیفہ مامون نے سلطان روم کو ساڑھے بارہ من سونا دینا اور ہمیشہ کے لئے صلح اس شرط پر منظور کی کہ لیو فیلسوف کو اجازت دی جاوے کہ کچھ عرصہ کے لئے وہ یہاں آکر مامون کو فلسفہ و حکمت سکھا جاوے فلسفہ حاصل کرنے کے لئے ایسی زرِ خطیر صرف کرنے کی بہت کم مثال ملے گی اس مامون کے زمانہ میں بغداد، بصرہ، بخارا، اور کوفہ میں بڑے بڑے مدرسوں کی بنا پڑی اور اسکندریہ اور بغداد اور قاہرہ میں عظیم الشان کتب خانے بنائے گئے اسپین میں مدرسہ اعظم مقام قرطبہ کا بغداد کی علمی شہرت کی ہمسری کرتا تھا اور دسویں صدی میں جہاں دیکھو وہاں مسلمان ہی علوم کے حافظ اور سکھانیوالے نظر آگے تھے فرانس اور ممالک فرنگستان کے جوق جوق طالب علم اندلس کو آنے لگے، اور ریاضی اور طب عربوں سے سیکھنے لگے اندلس میں چودہ مدرسے اور بڑے بڑے کتب خانے جن میں سے حاکم کے کتب خانہ میں چھ لاکھ کتابیں جمع ہوئیں یہ کیفیت ترقیِ علم کی جبکہ اس زمانہ سے ملائی جاوے جو قبل زمانہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے گذرا تو ثابت ہے کہ جیسا کہ عرب فتوحات میں سبقت کرتے تھے ایسے ہی ترقی علم میں بھی یہ لوگ تیز رفتار تھے جغرافیہ، تاریخ فلسفہ، طب، طبعیات اور ریاضی میں مسلمانوں نے بڑا ہی کام کیا ہے اور

عربی الفاظ جو آج تک علوم حکمیہ میں بولے جاتے ہیں اور بہت سے ستاروں کا نام وغیرہ اس بات کی دلیل ہیں کہ یورپ کے اکتساب علوم پر قدیم سے مسلمانوں کو بہت دخل و تصرف ہوا ہے مگر بعد کے زمانہ میں اس سے زیادہ جغرافیہ کا علم بہت کچھ یورپ کے حاصل ہوا ایشیا، اور افریقہ میں جغرافیہ کی بہت اشاعت ہوئی اور علی ہذا جغرافیہ میں پرانی عربی اور سفر و سیاحت کے رسالے تصنیفات ابوالفدا اور لیسی لیوا فریقانوس ابن بطوطہ ابن فضلان بن جبیر البیرونی المنجم اور ان کی تحریریں اب تک مفید اور گرامی قدر ہیں، علم تاریخ بھی محنت سے حاصل کیا گیا اور قدیم عربی مؤرخ جس کا حال ہم کو ملتا ہے محمد الکلبی ہے جو ۸۱۹ء میں گذرا مگر اسی زمانہ میں اور کئی ایک مؤرخ گذرے اور دسویں صدی کے شروع سے تو عرب نے علم تاریخ پر بہت توجہ کی اور جن لوگوں نے تمام جہاں کی تاریخ لکھنے کا ارادہ کیا ان میں اوّل مسعودی، طبری، حمزہ، اصفہانی اور بطارق اسکندری ہیں (مسعودی کی تاریخ کا نام مروج الذہب اور معدن الجواہر ہے) اس کے بعد ابوالفرج اور جارج المااقین (ہر دو عیسائی) اور ابوالفدا وغیرہ ہیں، نویری نے جزیرہ سسلیہ کی تاریخ ایام سلطنت عرب لکھی بہت سے ابواب عربی تاریخوں کے جن میں عیسائیوں کی جنگِ مقدس کا بیان ہے۔ فرانسیسی زبان میں ترجمہ ہوئے ہیں اور اندلس میں مسلمانوں کی سلطنت کے حالات ابوالقاسم قرطبی تمیمی وغیرہ کے متعدد کتابوں میں لکھے کسی کو ان کے حالات دریافت کرنے کا زیادہ شوق ہو تو قطر ہمیر کی تصنیفات خصوصاً

وان ہمیر کی کتابوں پر رجوع کرے ۔ عرب کے فلسفہ کو جو یونانی الاصل تھا قرآن سے وہی نسبت ہے جو اوسط زمانہ کی معقولات کو عیسائیوں کی کتب مقدسہ سے تھی ۔ یعنی فلسفہ کو دینیات کا خادم سمجھا جاتا تھا ۔ عربوں نے ارسطالیس کی تصنیفات کو بہت پڑھا اور اس پر ان کی بہت شہرت ہوئی اور بالآخر تمام فرنگستان میں عربی زبان سے لاطینی زبان میں ترجمہ کے ذریعہ سے اس کی اشاعت ہوئی گو عرب کو خود ہی عہد عباسیہ میں ترجمہ کے وسیلہ سے حاصل ہوا تھا منطق اور علم مابعد الطبیعہ پر زیادہ توجہ ہوئی اور مسلمانوں میں اہل فلسفہ یہ لوگ ہوئے ۔

الکندی البصری جو نویں صدی عیسوی میں تھا ۔ الفارابی جس نے ۹۵۴ء میں اصول ایک کتاب لکھی ، ابن سینا جس نے منطق اور علم مابعد الطبیعۃ اور طب کو جمع کیا اور علم کیمیا اور تشخیص امراض و شناخت ادویات بنانے میں بڑی ترقی کی ، ابن یمنی جس کی تحقیق کی بڑی شہرت ہوئی الغزالی جس نے "تہافتہ الفلاسفہ" تصنیف کی ابو بکر بن طفیل جس نے حی بن یقظان میں انسانوں کا حیوانوں سے ظہور میں آنے کا مسئلہ بیان کیا اور اس کا شاگرد ابن رشد جو ارسطالیس کے مفسر ہونے میں بڑا مشہور اور گرامی قدر تھا ، ان لوگوں کا اور ان کے مسلک کا بیان شمول سدرس اور شڑ کی کتابوں میں مفصل ملیگا بہت سے ان عرب فیلسوفوں میں طبیب بھی تھے ان کے علم خواص ادویہ میں مہارت کامل حاصل کرنے کو نیوست نے معلومات جغرافیہ سے منسوب کیا ہے ۔ علم طب اس حیثیت سے کہ وہ ایک علم ہے عرب ہی کی ایجاد ہے جن کو نہایت

قدیم اور وسیع ماخذ یعنی ہندی طبیب شروع ہی سے مل گئے تھے معجون بنانے کی کیمیائی ترکیب عربوں ہی نے ایجاد کی اور دواؤں کے مرکب کرنے اور نسخہ لکھنے کی ایجاد بھی انہیں سے ہوئی اور مدرسہ سالرنو کے ذریعہ سے یہ علم فرنگستان جنوبی میں پھیل گیا دواسازی اور قرابادین کی وجہ سے علم نباتات اور کیمیا کی حاجت پڑی اور تین سو برس تک کثرت سے ان علوم کی تحصیل ہوتی رہی ، اور جندیسابور ، بغداد ، اصفہان ، فیروزآباد ، بلخ ، کوفہ ، البصرہ ، اسکندریہ قرطبہ وغیرہ میں فلسفہ اور طب کے مدرسے جاری ہو گئے اور طبابت کے ہر صیغہ میں بجز علم تشریح کے بڑی ترقی ہوئی اس کے استثنا کی وجہ یہ ہے کہ قرآن میں اجسام کی تشریح منع کی گئی ہے ،

علم طب میں یہ لوگ بڑے نامی مشہور ہوئے ۔ ہارون کندی ابن سینا جس نے قانون لکھا اور عرصہ تک اس فن میں یہی ایک کتاب درس میں رہی ۔

علی بن عباس ، اسحاق بن سلیمان ، ابو القاسم اور روس جس نے طب کی تکمیل کی ، اور علی ابن عیسیٰ وغیرہم ریاضی میں اہل عرب نے بڑی ترقی کی اور الجبرا و المقابلہ کو بڑی ترقی دی ، بغداد اور قرطبہ کے مدرسوں اور صدر گاہوں میں علم ہیئت کمال شوق سے پڑھا جاتا تھا ۔ الحسن نے علم مناظرہ پر تصنیف کی ، اور نصیر الدین توسی نے اصول اقلیدس کا ترجمہ کیا ۔ جبیر بن عقلا نے بطلیموس کے علم مثلث پر شرح لکھی ، اور نظام بطلیموسی کی کتاب کا بیسو میوس نے عربی میں ترجمہ کیا اور دسویں صدی عیسوی میں البانی نے زمین کے دائرۂ عظیمہ کے ارتفاع پر نظر کی اور محمد بن الجبر الثانی نے رفتار شمس کی دریافت

کی، البیرجیوشی نے قرابت کے بیان میں کتاب لکھی اور ابوالحسن علی نے آلات علم ہیئت میں تصنیف کی، انتہی کلامہٗ۔

یہ حالات جو انسائیکلوپیڈیا کے ذریعہ سے درج کی گئی مسلمانوں کے علم و فضل کے متعلق تھی، اب ان کے چند تمدنی خصوصیات کو سن لینا چاہیئے۔ فرانس کا مشہور و معروف محقق ڈاکٹر لیبان عربوں کی ملک گیری کی خصوصیات میں لکھتا ہے۔ "یہ خلفائے راشدین جس خوش تدبیری کو کام میں لائے وہ مافوق ان کی سپاہ گری اور فن حرب کے تھی جسے انہوں نے آسانی سے سیکھ لیا تھا۔"

شروع ہی سے انہیں ایسی اقوام سے کام پڑا جن پر سالہا سال سے مختلف صورتوں میں مختلف حکومتوں نے ظلم کر رکھا تھا اور اس مظلوم رعایا نے نہایت خوشی کے ساتھ نئے ملک گیروں کو قبول کر لیا جن کی حکومت میں انہیں بہت زیادہ صاف و صریح طور پر مقرر کر دیا گیا تھا۔ اور خلفاء اسلام نے ہرگز بزور شمشیر دین کو پھیلانے کی کوشش نہیں کی بلکہ بعوض اس کے اپنے دین کی اشاعت کرتے جیسا کہ بار بار کہا جاتا ہے وہ صاف طور پہ کہہ دیتے تھے کہ اقوام مفتوحہ کے مذاہب اور رسوم و اوضاع کی پوری طرح سے حرمت کی جائے گی۔

اور اس آزادی کے معاوضہ میں وہ ان سے ایک بہت خفیف سا خراج لیتے تھے جو اس مطلوب کے مقابلہ میں جو ان اقوام کے پرانے حکام ان سے وصول کیا کرتے تھے نہایت کم تھا۔ کسی ملک پر فوج کرنے سے پہلے عرب ہمیشہ ان کے پاس سفیروں کے ذریعہ سے صلح کے شرائط بھیجا کرتے تھے

اور یہ شرائط جن کا ذکر المکین نے کیا ہے علی العموم اسی قسم کے ہوا کرتے تھے جیسا کہ عمرؓ نے ۱۸ھ میں باشندگان غزوہ کے سامنے جو اس وقت محصور تھا پیش کیے تھے اور یہ شرائط مصریوں اور ایرانیوں دونوں سے کی گئی تھیں وہ شرائط ذیل میں لکھی جاتی ہیں۔

ہمارے حاکم نے ہمیں حکم دیا ہے کہ اگر تم قانونِ اسلام قبول نہ کرو تو ہم تمہارے ساتھ جنگ کریں پس تم بھی ہم سے مل جاؤ اور ہمارے ساتھی بن جاؤ اور ہمارے منافع اور ہمارے منصوبوں میں شریک ہو جاؤ اس کے بعد ہم تم سے کوئی برائی نہ کریں گے لیکن اگر تم یہ کرنا نہیں چاہتے تو تم ہمیں اپنی زندگی تک ایک سالانہ خراج بالالتزام دیا کرو۔ اس کے بعد تمہارے بدلے ہم تمام ان لوگوں سے لڑیں گے جو تمہیں ستانا چاہیں یا کسی طرح تمہارے دشمن ہوں اور ہم اپنے وعدہ پر مضبوط رہیں گے مگر تمہیں یہ بھی منظور نہیں ہے تو پھر ہم میں اور تم میں بجز تلوار کے کوئی چیز نہیں رہتی۔ اور ہم تم سے اس وقت تک جنگ کرتے رہیں گے جب تک اللہ تعالٰی کے حکم کو پورا نہ کر لیں۔

بیت المقدس کی فتح کے وقت حضرت عمرؓ کا اخلاق ہم پر ثابت کرتا ہے کہ ملک گیران اسلام مفتوح اقوام کے ساتھ کیا نرم سلوک کرتے تھے اور یہ سلوک اس حرارت کے مقابل جو صلیبیوں نے اس شہر کے باشندوں سے کئی صدی بعد کیا نہایت حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے۔ حضرت عمرؓ اس شہر مقدس میں بہت تھوڑے اشخاص کے ساتھ داخل ہوئے، اور آپ نے سفرانیئس بطریق سے درخواست کی کہ مقامات مقدسہ کی زیارت میں آپ

کے ہمراہ چلے اسی وقت عمرو نے منادی کرا دی کہ میں ذمہ دار ہوں کہ باشندگان شہر کے مال اور ان کی عبادت گاہوں کی حرمت کی جائے گی اور مسلمان عیسائی گرجوں میں نماز پڑھنے کے مجاز نہ ہوں گے۔

سب سے پہلا سلوک عمر رضی اللہ عنہ نے مصریوں کے ساتھ کیا وہ اس سے کم نہ تھا انہوں نے باشندگانِ مصر سے وعدہ کیا کہ انہیں پوری مذہب کی آزادی پورا انصاف بلا رد و رعایت اور جائیداد کے ملکیت کے پورے حقوق دیئے جائیں گے اور ان ظالمانہ اور غیر محدود مطالبوں کے عوض میں جو شاہنشاہ یونانی ان سے وصول کرتے تھے صرف ایک سالانہ جزیہ لگایا جائیگا جس کی مقدار فی کس تقریباً دس روپیہ تھی۔ رعایائے صوبہ جات نے ان شرائط کو اس قدر غنیمت سمجھا کہ وہ عہد و پیمان میں شریک ہو گئے اور جزیہ کی رقم انہوں نے پیشگی ادا کر دی عمال اسلام اپنے عہد پر اس قدر مستحکم رہے اور انہوں نے ان رعایا کے ساتھ جو ہر روز شاہنشاہ قسطنطنیہ کے عاملوں کے ساتھ سے انواع و اقسام کے مظالم سہا کرتی تھی اس طرح کا عمدہ برتاؤ کیا کہ سارے ملک میں بکشادہ پیشانی دین اسلام اور زبان عربی کو قبول کر لیا، میں بار بار کہوں گا کہ یہ وہ نتیجہ ہے کہ ہرگز بزور شمشیر حاصل نہیں ہو سکتا اور عربوں سے پہلے جن اقوام نے مصر پر حکومت کی وہ ہرگز یہ کامیابی حاصل نہ کر سکیں۔

عربوں کی ملکگیری میں ایک خاص بات ہے جو ان کے بعد کے ملک گیروں میں ہرگز نہیں پائی جاتی دیگر اقوام نے بھی مثل بربریوں (جنہوں نے روم کے ملک کو فتح کیا ہے) یا ترکوں وغیرہ نے ملک گیری کی ہے لیکن انہوں نے کبھی کوئی تمدن

نہیں قائم کیا اور ان کی ساری ہمت اسی طرف مصروف رہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو تو اقوام مفتوحہ کے مال سے فائدہ اٹھائیں برخلاف اس کے عربوں نے قلیل زمانہ میں ایک جدید تمدن کی عمارت کھڑی کر دی اور انہوں نے ایک گروہ اقوام کو اس جدید تمدن کے ساتھ اپنے مذہب اور اپنی زبان اختیار کرنے پر آمادہ کیا۔ عربوں کی صحبت کے ساتھ ہی مصر اور ہندوستان کے سے قدیم اقوام نے ان کا دین ان کا لباس، ان کا طرز معیشت بلکہ ان کا طریقہ تعمیر تک اختیار کر لیا۔ عربوں کے بعد بہت سی اقوام نے انہیں خطوط پر حکومت کی ہے لیکن پیغمبر اسلام کی تعلیم کا اثر اس وقت تک ان ملکوں میں باقی ہے کل ممالک ایشیا و افریقہ میں مراکش سے لے کر ہندوستان تک جہاں کہیں عرب پہنچے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اثر ان ملکوں میں ہمیشہ کے لئے قائم ہو گیا ہے بہت سے نئے ملک گیروں نے ان ممالک کو عربوں کے بعد فتح کیا ہے لیکن وہ ان سے عربوں کا مذہب عربوں کی زبان کو ہرگز نہ مٹا سکے۔"

انتہی کلامہٗ یہ شائستہ تمدن جس کا ذکر محقق موصوف نے کیا چند ہی روز میں دریائے سندھ سے اندلس تک پہنچ گیا اور رفتہ رفتہ ہندوستان میں جو ہزارہا معبودوں کا گھر تھا مسلمانوں کے بابرکت قدم آئے اور انہوں نے اس ظلمت کدہ میں توحید کا چراغ روشن کیا اور گویا بت خانہ کے اندر مسجد بنا دی، ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے زلزلے سے جہاں اور قومی عمارات گرنا شروع ہوئیں یہ مسجد بھی انہدام کے قریب آ پہنچی، اس پر ایک طرف تو دشمنان اسلام نے اس کی بنیادیں نکال ڈالنے کا ارادہ کر لیا اور دوسری طرف خود مسلمانوں نے اس کی

اینٹوں سے اپنے رہنے کے مکانات تعمیر کرنا چاہے، اسی پُر خطر وقت میں ایک مرد کو خدائے تعالیٰ نے بھیجدیا جس نے اس مسجد کی عمارت کو زمانے کی دستبرد سے بچالیا اور پہلے سے بھی زیادہ رفیع الشان اور باعظمت بنانے کی کوشش میں کامیاب ہوا۔

یہ رفیع المنزلت عمارت مدرسہ عربی دیوبند ہے جس کا مفصل تذکرہ آپ میرے اور دیگر لوگوں کی رپورٹوں میں پائیں گے، اور وہ مرد اسلام قدسی صفات حضرت مولینا محمد قاسم صاحب قدس سرہٗ ہیں جنھوں نے اس مدرسہ کی بنیاد ڈالی اور جن کے اسم گرامی پر ہی ہم اپنی اس تحریر کو ختم کردینا چاہتے ہیں۔

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا!
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کیلئے

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔

بالخیر تمت

خوارقِ عادات

اِسلام اَور مُعجزات

یعنی

مُعجزات وکرامات اور قانُونِ قُدرت کے باہمی تعلق پر عقلی ونقلی حیثیت سے جدید انداز میں بہترین تبصرہ

از

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ

ناشر

ادارہ اسلامیات ۱۹۰ انار کلی لاہور

فہرست مضامین

اسلام اور معجزات

تقریظ حضرت العلامہ سید محمد انور شاہ صاحب قبلہ کشمیری

شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ ڈابھیل سملک ضلع سورت

الحمد للہ وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ ایک مدت گزرتی ہے کہ احقر نے حضرت علامۃ العصر مولانا مولوی شبیر احمد صاحب عثمانی کی خدمت عالی میں عرض کی تھی کہ تفسیر قرآن اس زمانہ کی ضرورت کو لحاظ کرکے جو بقاء دین محمدی کا واحد مدار اور دنیا کو اس کا انتظار ہے اس کا ایک مقدمہ مبسوط علیحدہ لکھا جانا چاہیئے جس میں چند مسائل اور عقائد عقلاً ونقلاً سلف صالح اور اہل سنت والجماعت کے طریقہ پر طے کئے جاویں مثلاً مسئلہ تقدیر، خلق افعال عباد اور مسئلہ معجزات جس میں اکثر یورپ کے جذبات کے مقلد ہی تحریف سے کام لیتے ہیں الحمد للہ والمنۃ کہ جناب مستطاب موصوف الصدر نے مسئلہ معجزات کو لکھ لیا ہے اور انشاء اللہ المستعان ایسا واقع ہوا ہے کہ احقر کے دائرہ تمنا سے بہت اعلیٰ وارفع، اور حاوی اور منضبط کہ ہر ایک حق پسند سے یہ امید قائم ہوگئی کہ دیکھتے ہی انشاء اللہ بدون کسی تردد کے مطمئن ہو جائیں گے اور ایک بڑے مقدمۂ تفسیر کا فیصلہ ہو جائے گا۔ حق تعالیٰ مؤلف علام کو جملہ اہل حق کی طرف سے جزاء خیر دے واللہ ولی التوفیق۔

احقر محمد انور عفا اللہ عنہ،

۱۵ ربیع الاول ۱۳۴۶ھ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
حَامِداً وَّ مُصَلِّیاً وَّ مُسَلِّماً

خوارقِ عادات اور قانونِ قدرت کا باہمی رشتہ

ہندوستان کی عام فضا اگرچہ خُدا کے فضل سے ابھی تک ایسی مسموم نہیں ہُوئی کہ خوارق عادات کا لفظ سُننے سے لوگوں کو وحشت ہونے لگے لیکن انگلش تعلیم و تربیت کے تیار کئے ہُوئے نوجوانوں کی جماعت ایسی موجود ہے جو ان چیزوں کا مذاق اڑاتی ہے، خواہ ملحدین یورپ کی کورانہ تقلید سے یا نئی تعلیم کے خاص اثرات اور ماحول سے یا محض "ینگ مین" کہلانے کے لئے خوارق سے تمسخر کرنا اُن کا فیشن ٹھہر گیا ہے۔

اُردو زبان کی زرق برق تصنیفات میں چونکہ بیشتر حصّہ انہی صاحبوں کا ہے اِس لئے ان کے خیالات کے جراثیم پبلک میں بھی تیزی سے سرایت کرتے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ چند پُرانے راسخ الاعتقاد علماء کو مستثنیٰ کر کے ہمارے عربی مدارس کے بہت سے نئے تعلیم یافتہ بھی "خوارق" کے ذکر سے کچھ کتراتے لگتے ہیں، کہ مبادا ہم کو مقدم الذکر جماعت کی طرف سے "احمق" اور "وہم پرست" کا خطاب دیا جائے۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ کاتب سطور ایک ایسی جماعت سے تعلق رکھتا ہے۔ جو نہ صرف قدامت پسند ہے بلکہ اپنی قدامت پسندی پر ناز کرتی ہے۔

لہٰذا اس مضمون کے لکھتے وقت اس کا کوئی غم نہیں کہ کچھ لوگ اپنی عقل کے نشہ میں مجھے "سادہ لوح" اور "وہم پرست" یا "پُرانی لکیر کے فقیر" کہیں گے یہ لوگ اپنے کو کتنا ہی عاقل سمجھیں لیکن میری درخواست صرف یہ ہے کہ ہم کو نہ سمجھیں۔ جو کچھ اُن سے کہا جائے انہیں اختیار ہے رد کر دیں۔ مگر بغور سُننے کے بعد رد کریں۔

اس مضمون میں جو کچھ میں کہنا چاہتا ہُوں یہ دعویٰ نہیں کہ کوئی نئی تحقیق ہے، ہاں طرزِ ادا اور ترتیب بیان ضرور نئی ہے۔

مَیں نے اسی موضوع پر پہلے بھی کچھ لکھا ہے جو بعض رسائل کے ضمنی مباحث میں شائع ہو چکا ہے لیکن اس وقت کلام کی ایک خاص نوعیت ہو گی جو پہلے مضامین میں اس قدر اہتمام سے مرعی نہ تھی، اور وُہ نوعیت یہ ہے کہ "خوارقِ عادات" (معجزات وغیرہ) اور "قانونِ فطرت" کے باہمی تعلق پر ایک صاف اور تیز روشنی ڈالی جائے جو ہمارے اور منکرین خوارق کے اختلافات کے اصلی نقطہ بحث کو پوری طرح واضح اور آشکارا کر دے۔

خوارق کا وجود "قوانین فطرت" کا دشمن نہیں موجُودہ سائنس کی ساری عمارت کی بُنیاد یہ ہے کہ فطرت یکساں اور باقاعدہ کام کرتی ہے، اگر واقعاتِ عالم ایسے طور سے وقوع میں آئیں جیسے مرض "کابوس" یا خوابہائے پریشاں میں واقع ہوتے ہیں تو فطرت کا مطالعہ کرنا فضول ہو گا۔ اگر خوارق و معجزات کے پائے جانے

سے فطرت کی یکسانی اور باقاعدگی میں فرق آئے اور قوانین قدرت میں بے ربطی اور گڑبڑی پیدا ہو، تو جو لوگ خوارق کے امکان پر غور کرنے سے انکار کرتے ہیں اُن کو شاید معذور رکھا جائے لیکن واقع اس طرح نہیں ہے ہم معجزات و خوارق کو قوانین قدرت کے خلاف نہیں کہہ سکتے بلکہ ہمارے نزدیک وہ ایک ایسی چیز ہے جہاں سے قدرت کا چہرہ زیادہ صفائی اور زیادہ قریب سے نظر آتا ہے خوارق کا احیاناً وقوع ہی وہ چیز ہے جس سے ہم اس منظم قوانین قدرت کے متعلق یہ یقین حاصل کرتے ہیں کہ وہ قوانین قدرت ہیں، کسی غیر قادر یا غیر مختار ہستی سے قول ہی بالاضطرار نہیں بن گئے ہیں۔

معجزہ قوانین فطرت کی حمایت کرتا ہے اگر کوئی احمق کائنات کی پُراسرار ہستی میں نہایت محکم اور مرتب قوانین فطرت کی موجودگی سے اِنکار کرے تو معجزہ بجائے اُس کی تائید کرنے کے اُس کو رد کرنے کی کوشش کرے گا، کیونکہ معجزہ اسی وقت معجزہ کہلایا جاسکتا ہے جبکہ دُنیا میں تکوین کا کوئی ضابطہ اور قانون موجود ہو پھر وہ (معجزہ)، اپنے کو اِس ضابطہ اور قانون سے اعلیٰ اور ارفع ثابت کرے۔

معجزات وغیرہ کے ماننے سے دُنیا کا نظام مختل نہیں ہوتا اسی لئے معجزات و خوارق کی حمایت کرنے والے بھی دُنیا کو منظم اور مرتب ماننے میں اپنے مخالفین کے ہمنوا ہیں اور اُن کے اعمال، تجاویز، توقعات اور سارے اِنتظامات بھی ایسے ہی مستقل، ہموار اور یکساں ہیں جیسے اُن کے، جو معجزات وغیرہ کو نہیں مانتے۔

معجزہ قانون قدرت کے مُطابق ہے معجزات وغیرہ اگر گاہ بگاہ وقوع میں

آئیں تو وہ اُسی خلاق عالم کا کام ہوں گے جو ہمیں روزانہ فطرت کے عمل کے معمولی عجائبات دکھاتا رہتا ہے اور جب ایسا ہے تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ خود معجزات قانونِ قدرت کے مطابق ہوں۔ البتہ وہ قانون اُس قانون سے اعلیٰ ہوگا جس سے طبیعی سائنس آشنا ہے۔

معجزہ فطرت کے قوانین اصلیہ کا محافظ ہے فطرت اور کانشنس دونوں کا یہ تقاضا ہے کہ ہم خدا کی نسبت یہ خیال کریں کہ وہ ابتری و اختلال کو نہیں بلکہ امن و نظم اور ترتیب کو بالذات پسند کرتا ہے لیکن جب انسان خدا کے بخشے ہوئے اختیارات کے غلط اور بے موقع استعمال سے دُنیا کے امن و اِنتظام کو توڑتا ہے تو بسا اوقات ایسے خوارق ظہور پذیر ہوتے ہیں جو ہماری پیدا کی ہوئی ابتری کا علاج اور فطری امن و انتظام کے بحال کرنے کا سبب ہوں۔ اِس صورت میں عالم قوانین فطرت کی حفاظت کے لئے خوارق کا ظاہر کرنا بجائے خود ایک قانونِ فطرت ہے۔

ہم یہ جانتے ہیں کہ انسانی ارادہ کے ذریعہ سے قوانین فطرت کو توڑے بغیر ہم فطرت کے بعض کاموں میں تبدیلی کر سکتے ہیں۔ مثلاً جب کوئی سول سرجن کامیابی سے مریض کے جسم کی چیر پھاڑ کرتا ہے یا کوئی طبیب ادویات کے ذریعہ سے کسی بیماری کی رفتار کو روکتا ہے۔ اگرچہ بظاہر وہ مریض کے طبعی قوانین کے سلسلہ میں خلل ڈالتا ہے، جو اس کی مداخلت کی عدم موجودگی میں اپنا پُورا عمل کرتے لیکن اس پر بھی ڈاکٹر اور طبیب کی یہ مداخلت قوانینِ فطرت کے مخالف نہیں سمجھی جاتی، بلکہ اصلی اور حقیقی فطرت کی اعانت اور خدمت سمجھی جاتی ہے۔

معجزہ ایک اعلیٰ قانونِ قدرت ہے

خارجی فطرت میں ہمیں چار مختلف عالم نظر آتے ہیں جن میں سے ہر ایک اعلیٰ ادنیٰ پر مبنی اور اس سے ممیز ہے۔

۱- اوّل بظاہر بے ترتیب عالم، جس میں کیمیائی عناصر اور اُن کے مرکبات پائے جاتے ہیں یا جسے ہم مردہ مادہ کہتے ہیں، یہ عالم اپنے قوانین جرِ ثقیل اور جذب و اتصال وغیرہ کے ماتحت ہے۔

۲- اُس کے اوپر مرتب اور منتظم عالم (نباتات وغیرہ) ہے جس کی ساخت اُس پہلے بے ترتیب عالم سے ہوئی اور اس لحاظ سے یہ قوانین مادہ کے ماتحت ہے لیکن اس کے سوا اس میں فطرت کی ایسی پوشیدہ قوتیں اور شرائط پائی جاتی ہیں جو بے ترتیب عالم کو معلوم ہی نہیں، بنا بریں یہ اور قسم کے قوانین کے تابع ہے جن کا ادنیٰ طبقہ سے کچھ تعلق نہیں یعنی منظم زندگی کے قوانین۔

۳- اِن سے اوپر حیوانی زندگی ہے جس کی خاص صفات و شرائط نشوونما پرورش اور حرکت ارادیہ وغیرہ کے قوانین ہیں۔

۴- اور اس سے بالاتر انسان کی ذی عقل، مدرک، اخلاقی اور ترقی کن زندگی ہے جس کے قوانین پچھلے تینوں عالموں سے جداگانہ ہیں۔

عالموں کے اس سلسلہ کا ہر اعلیٰ طبقہ ادنیٰ طبقہ کے لحاظ سے فوق العادت اور اعجازی ہے، قدرت کے جو قوانین عالم جماد یا نبات میں دائر سائر ہیں وہ حیوانات میں نہیں اور جو حیوانات میں ہیں اس سے کہیں بڑھ کر عالم انسان میں پائے جاتے ہیں۔

اگر فرض کرو نباتات یا حیوانات میں ہماری باتیں سمجھنے کی قوت ہو اور ہم اُن کی دنیا میں جا کر اپنے انسانی کارنامے اور بنی آدم کے عجیب و غریب احوال اور وہ قوانینِ فطرت بیان کریں جو عالمِ انسان میں کارفرما ہیں تو یقیناً وہ اس ساری داستان کو خلافِ قانونِ فطرت قرار دے کر بھلا اسی طرح مذاق اُڑائیں گے جیسا کہ معجزات نہ ماننے والے معجزات کا اڑاتے ہیں کیونکہ جو قوانین اُن نباتات جمادات کے دائرہ وجود میں عمل کر رہے ہیں، انسان کے متعلق قوانینِ فطرت ان سے بہت زیادہ بلند اور رفیع واقع ہوئے ہیں جن کے احاطہ کی ادنیٰ طبقہ کی مخلوقات سے توقع کرنا سفاہت ہے۔

معجزہ انسان کو عالمِ بالا کی چمک دکھلاتا ہے،

آگے مذہب کی تعلیم یہ ہے کہ انسان، بے ترتیب، با ترتیب، حیوانی اور ذی عقل چاروں عالموں کے اوپر اور ان سے لطیف تر ایک اور عالم کا وجود تسلیم کرے یعنی خالص روحانی اور نورانی عالم جس کے چمکارے وقتاً فوقتاً ہم کو دکھائی دیتے رہتے ہیں۔

انسان چونکہ چوتھے عالم (ذی عقل) اور اس پانچویں عالم (روحانی) کی سرحد پر آباد ہے اس لئے اُس کا تعلق ایک طرف سے دونوں کے ساتھ ہے اعلیٰ اسی طرح اس کا ورثہ ہے جس طرح ادنیٰ، لیکن اعلیٰ کے ابھی صرف چمکارے ہی اس کو حاصل ہیں۔

معجزات کا بڑا مقصد یہ ہے کہ اُس مزاج اور روح کے خلاف ہم کو آگاہ کریں جو ان چمکاروں کو بے اعتبار سمجھتی اور ان کا انکار کرتی، اور ادنیٰ طبقہ ہی میں زندگی بسر کرنا پسند کرتی ہے۔

تمام نوامیسِ فطرت پر ہمارا احاطہ نہیں، اور نہ ہو سکتا ہے، ان پر [illegible] فروگذاشت یہ ہے کہ اُنہوں نے سارے نظامِ عالم کو چند نوامیسِ طبعیہ میں منحصر سمجھ لیا ہے جو مادّہ اور اس کی قوّت کے متعلق اُنہیں دریافت ہُوئے ہیں۔

باوجودیکہ سائنس کے بڑے بڑے اساتذہ یہ اعلان کر رہے ہیں کہ ہم کو ابھی تک کل قوانینِ قدرت پر تو کہاں، اُس کے کسی معتدبہ حِصّہ پر بھی احاطہ حاصل نہیں ہُوا لیکن اِس پر بھی جب کبھی کوئی چیز اُن کے محدود و معدود مدرکات سے باہر ہوتی ہے نہایت بیباکی اور ڈھٹائی سے اس کی تکذیب پر تیار ہو جاتے ہیں۔

فلتاتِ طبیعیہ حالانکہ ہم اگر ہم نوامیسِ طبیعیہ کے اسی نظام پر غور کریں جو مادیات سے متعلق ہے تو "فلتاتِ طبیعیہ" کا ایک مستقل باب ہے جس کی ہزاروں جزئیات کا عام سننِ طبیعیہ اور مقررہ قوانینِ فطرت سے علیحدہ ہونا ان قوانین کی یکسانیت اور انتظام کو سخت صدمہ پہنچانے والا ہے۔

دو تاریخی مثالیں اس موقعہ پر فلتاتِ طبیعیہ کی ایک دو تاریخی مثالیں ذکر کرتا ہوں جو اس خشک فلسفیانہ مضمون کے دوران میں نشاط اور دلچسپی پیدا کرنے کا موجب ہوں گی۔

ہنگری میں دو لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ دونوں کے تمام اعضاء مستقل اور الگ الگ تھے لیکن دونوں کے سرین (پچھاڑی) اس طرح ملی ہُوئی تھی کہ مخرجِ براز بالکل ایک تھا۔ اسی ایک راستہ سے ہر ایک قضاءِ حاجت کرتی تھی، پیشاب گاہ دُوسرے اعضا کی طرف جدا جدا تھی، اسی لئے جب ایک

کو پیشاب کی ضرورت لاحق ہوتی، تو دُوسری منقبض ہوتی، دُوسری حاجاتِ طبیعیہ میں بھی کشمکش ہوتی جو باہمی تنافر کا سبب بن جاتی تھی، عمر کے چھٹے سال دو میں سے ایک کے اعضا کسی مرض کی وجہ سے شل ہو گئے اور اسی حالت میں عمر بھر رہی لیکن دُوسری کے اعضاء پر اس کا کوئی اثر نہ تھا، بلوغ کی علامات دونوں میں بیک وقت ظاہر ہوئیں، جب بائیس سال کی عمر ہوئی تو ایک کو سخت بخار ہُوا اور اسی میں انتقال ہو گیا۔ دُوسری بھی اُس کے تین گھنٹہ بعد مر گئی اور دونوں کو اکٹھا دفن کیا گیا۔

ایک چینی لڑکا جس کی عمر ۱۲ برس کی تھی وہ اپنے سینہ پر دُوسرا بچّہ اُٹھائے ہوئے تھا۔ اس بچّہ کا سر اس کے سینہ کے اندر چھپا ہوا تھا، باقی دھڑ اس کے سینہ سے گھٹنوں تک لٹکا رہتا تھا، اس بچّہ میں کافی حس و شعور تھا، ذرا سا چھونے سے بھی متاثر ہوتا تھا۔ اور یہ اُٹھانے والا لڑکا بھی اُس بچّہ کے دُکھ سے دُکھ اُٹھاتا تھا۔

اس قسم کے سینکڑوں مشاہدات "انسائیکلو پیڈیا" میں جمع کئے گئے ہیں جن کو حکماء کی اصطلاح میں "فلتاتِ طبیعیہ" کہتے ہیں، ان کو دیکھ کر ایک عاقل مبصر اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ قوانینِ فطرت کا دائرہ اس قدر تنگ نہیں ہے جتنا کہ سائنس کے خام مدعی اُسے تنگ کرنا چاہتے ہیں۔

عالمِ ارواح یہ تو مادیات اور جسمانیات کا حال تھا لیکن اگر مادّہ کی سرحد سے ذرا قدم باہر نکالا جائے تو پھر ایک ایسا عالم سامنے آجاتا ہے جہاں ہماری وہ اَدھوری توجیہات بھی کچھ کام نہیں دیتیں جن سے ہم "فلتاتِ طبیعیہ" اور

"قوانین فطرت" کی تطبیق میں کام لیتے تھے۔

یہ عالم عالمِ ارواح ہے جس کی طاقتوں اور نوامیس کا حال یورپ کے مُلحدوں کو ابھی تھوڑے عرصہ سے کھلا ہے۔ یورپ و امریکہ کے بڑے بڑے فلاسفر جو مادّہ اور اس کی قوّت کے سوا کسی دوسری قوّت کا نام لینے والے کو وہم پرست او رپاگل کہتے تھے، خُدا کی شان کہ آج وہ ہی مشاہدات اور تجربیات متواترہ سے عاجز و مبہوت ہو کر رُوح اور اس کی عجیب غریب طاقتوں کے ثابت کرنے میں پیش پیش ہیں۔

عالمان مسمریزم "تھیو سافیکل سوسائٹی" اور "سوسائٹی فار سائیکیکل ریسرچ" وغیرہ بہت سے گروہ پیدا ہو گئے ہیں جنہوں نے رُوح کی ان طاقتوں پر تھوڑی بہت روشنی ڈالی ہے۔ اور اگرچہ یہ کام ابھی تک تکمیل کو نہیں پہنچا لیکن اس میں اب شک و شُبہ کی کوئی گنجائش نہیں رہی کہ نوامیس طبیعیہ مادیہ سے بالاتر اور عظیم تر اور بھی نوامیس ہیں جن کے سامنے مادہ اور اس کی قوتیں کچھ بھی وزن نہیں رکھتیں۔

رُوح کے متعلق چار نظریے فرانس کے مشہورِ آفاق امام فلکیات و طبیعیات کامل فلامریون نے "المجہول و المسائل الروحیہ" کے نام سے ایک کتاب لکھی جس کے کئی ایڈیشن چند روز میں ہاتھوں ہاتھ نکل گئے۔

فلسفہ حیہ کا یہ فاضل بہت سے مشاہدات اور قوانین و نوامیس پر غور و فکر کرنے کے بعد ان چار نظریات پر پہنچا۔

۱۔ رُوح موجُود ہے، اور جسم سے علیحدہ مُستقل وجُود رکھتی ہے۔

۲۔ روح ایسی خصُوصیات اور قوٰی اپنے اندر رکھتی ہے جن کی گہرائیوں تک علم ابھی تک رسائی نہیں پا سکا۔

۳۔ یہ ممکن ہے کہ رُوح بدُون مساعدت حواس کے بہت دُور کی چیزوں پر اپنا اثر ڈال سکے یا اُن کے اثر کو قبُول کر سکے۔

۴۔ آئندہ آنے والے واقعات و حوادث وقوع سے پہلے مقدر ہیں، اور ایسے اسباب کے ساتھ اُن کی تحدید ہو چکی ہے جو مستقبل میں اُن کو موجُود کریں گے، رُوح بسا اوقات اِن واقعات و حوادث پر اُن کے وقوع سے پہلے مطلع ہو جاتی ہے۔

ان چاروں نظریات کے ثابت کرنے میں فاضل موصُوف نے بہت مضبُوط براہین حسیہ سے کام لیا ہے جس کو سننے کے بعد ایک متعنت مادہ پرست کو بھی مجالِ انکار نہیں رہ سکتی۔

رُوحانی مناظر کا اِنکار جہل ہے اسی قسم کے دلائل و شواہد سے متاثر ہو کر مسٹر ہڈسن کو کہنا پڑا کہ "میں اپنے یا اوروں کے تجربوں سے ایسے واقعات کا پیش آنا ثابت کرنے کی کوشش میں اپنا وقت ضائع نہ کروں گا۔ اس کام کا وقت گزر چکا، مہذب دُنیا کو یہ واقعات ایسے معلوم ہیں کہ ثبوت کی ضرُورت نہیں۔ آج جو شخص روحانی مناظر کا انکار کرے وہ منکر نہیں محض جاہل ہے اور ایسے شخص کو روشن خیال بنانے کی کوشش کے بارآور ہونے کی کوئی اُمید نہیں۔"

اگرچہ عالم ارواح کے نوامیس جہتہ ابھی تک رازہائے سربستہ ہیں

اوراس کانظام ہمارے مادیات کے نظام طبعی سے کہیں زیادہ وسیع اور لطیف ہے۔ تاہم رُوحانی مناظر کا جو ذخیرہ یورپ کی سوسائٹیوں نے اپنی مستند رپورٹوں میں جمع کر دیا ہے وہ بھی بڑے بڑے ماہران طبعیات اور مدعیان ہمہ دانی کو حیرت زدہ اور خجل کرنے کے لئے کافی ہے۔ اور جس قدر "فلتات طبعیہ" کا وجود عام نوامیس طبعیہ اور قوانین مادیہ کے سلسلہ میں عجیب چیز ہے۔ اس سے کہیں بڑھ کر نظام رُوحانی کا "محیر العقول انکشاف" پرستاران زرِ طبعیہ کے ایوانوں میں زلزلہ ڈالنے والا ہے۔

ارواح مجردہ یا ایک لطیف نُورانی عالم کا وجود

رُوحانی قوتوں کی تحقیق کا جو سلسلہ جاری ہے وہ ابھی ختم نہیں ہوا۔ حال کے بڑے بڑے فلاسفر اس جانب ترقی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ رُوحانی نظام صرف ان ہی انسانی ارواح کے مجموعہ سے عبارت نہیں ہے جو انسانوں کے جسم کی تدبیر کرتی اور اس سے جُدا ہوتی رہتی ہیں بلکہ بہت ممکن ہے کہ اُن ارواح کے علاوہ، اور ارواح مجردہ یا کوئی لطیف نورانی مخلوق ایسی پائی جاتی ہو جن کا ان ارواح انسانی سے زیادہ قریب کا رشتہ ہو۔

مسٹر مارس اپنی معلومات کی بنا پر ارواحِ مجردہ کا صرف امکان تسلیم کرتے ہیں مگر فرنچ فیلسوف موسیو لوئی فگئے ایک لطیف استدلال سے ان کا وجود ثابت کرنے پر زور دیتا ہے چنانچہ لکھتا ہے کہ "ہمارے اردگرد کی زندہ مخلوق میں نباتات سے لے کر انسان تک دائماً اُوپر کو جانے والا سلسلہ ہے جو بتدریج کمال حاصل کرتا جاتا ہے۔ کائی اور دیگر بحری وئیدگیوں

کو جو نظام نباتی کی ابتدائی حالت ہے نقطۂ روانگی ٹھہرا کر ہم نباتی دُنیا کے کمال حاصل کرنے والے سلسلہ میں سے گزر جاتے ہیں اور ابتدائی حیوانات یعنی گھونگے اور دیگر نبات نما حیوانات تک پہنچ جاتے ہیں اور وہاں سے اعلیٰ تر حیوانات کے بے انتہا درجوں کو طے کرتے ہوئے انسانی قالب میں آجاتے ہیں۔ اس سیڑھی کا ہر ایک پایہ غالباً غیر محسوس ہے اور ان تغیرات و درجات کی ترتیب ایسی عمدہ ہے کہ اس نے درمیانی ہستیوں کے ایک غیر محدود سلسلے کو گھیرا ہوا ہے جس کا ایک کنارہ کائی ہے اور دوسرا کنارہ ہماری نوعِ انسانی اور باوجود اس کے ہم ممکن سمجھتے ہیں کہ آئندہ ہم میں اور خدا میں درمیانی مخلوق کا کوئی واسطہ حائل نہ ہو اور اس تدریجی ترقی کے سلسلہ میں انسان اور خدا کے مابین ایک بڑا غار خالی رہ گیا ہو۔ ہم ممکن سمجھتے ہیں کہ تمام نیچر میں چھوٹی سے چھوٹی نبات سے لے کر نوعِ انسانی تک تدریجی اور بیشمار درجات کی ترتیب ہو مگر انسان اور خدا کے درمیان صرف ایک ناپیدا کنار جنگل ہو! بے شبہ یہ ناممکن ہے اور اگر کبھی مذہب یا فلسفہ نے ایسی غلطی کی حمایت کی ہے تو اس کی وجہ صرف مظاہر قدرت کی ناواقفی ہے۔ اس میں شک کرنا ناممکن ہے کہ جس طرح نبات اور حیوان اور انسان کے مابین دیکھا جاتا ہے اسی طرح انسان اور خدا کے مابین ضرور درمیانی مخلوق کی بڑی تعداد ہے جس کی وساطت سے انسان اُس خدا تک پہنچتا ہے جو اس پہ اپنی غیر محدود طاقت اور جلال سے حکومت کر رہا ہے۔ غرض یہ تو ہم کو یقین ہے کہ ایسی درمیانی مخلوقات (یعنی جو انسان سے آگے لطافت کے تدریجی منازل طے کرتی ہوئی خدا تک پہنچتی ہے) موجود ہے۔ گو یہ ضرور ہے کہ وہ

ہم کو نظر نہیں آتی۔ لیکن اگر ہم ہر ایسی چیز کے وجود سے انکار کریں جس کو ہم دیکھ نہ سکیں، تو نہایت آسانی سے ہماری تکذیب ہو سکتی ہے۔ فرض کرو کہ کوئی علم مادیات کا عالم کسی تالاب سے ایک قطرہ پانی کا لے اور ایک جاہل کو دکھا کر کہے کہ یہ قطرہ جس میں تم کچھ نہیں دیکھتے ہو چھوٹے چھوٹے حیوانات اور نباتات سے بھرا ہوا ہے جو بعینہٖ عظیم حیوانات اور نباتات کی طرح زندہ رہتے ہیں پیدا ہوتے ہیں اور مرتے ہیں تو وہ جاہل فوراً سر پھیر دے گا اور کہنے والے کو دیوانہ سمجھے گا۔ لیکن اگر اس کی آنکھوں پر خوردبین رکھدی جائے اور وہ قطرہ کی تشخیص کرے تو اس کو اقرار کرنا پڑے گا کہ کہنے والا سچ کہتا تھا۔ کیونکہ اب اسی قطرہ میں جس کو وہ صاف سمجھتا تھا اُس کی آنکھ سائنس کی مدد پا کر چھوٹے پیمانہ پر تمام دُنیا کو موجود پائے گی۔

غرض جہاں ہم کچھ نہیں دیکھتے وہاں زندہ مخلوق کی بڑی تعداد موجود ہوتی ہے اور یہ محض سائنس ہی کے امکان میں ہے کہ اس بارہ میں عوام النّاس کی آنکھوں کو روشن کرے۔

ہم چاہتے ہیں کہ ہم بھی اس حکیم کی حیثیت اختیار کریں بیشک انسان اور خُدا کے درمیان طبقہ جہلار کو اور اندھے فلسفہ کو کچھ نہیں سوجھتا۔ لیکن اگر ہم جسمانی آنکھوں کی بجائے رُوحانی آنکھ سے کام لیں یعنی عقل، قیاسِ مساوات اور تعلیم کو استعمال کریں تو پُر اسرار مخلوق روشنی میں آجائے گی۔

اب اگر ایک ایسی مخلوق کا وجود تسلیم کر لیا جائے جو انسان اور خُدا کے درمیان واسطہ کا کام دے خواہ وُہ ملائکۃ اللہ ہوں یا ارواح مجردہ تو نظام عالم میں مادیات،

فلکیات طبیعیہ اور عالم ارواح انسانی کے نوامیس سے اوپر بہت سے دُوسرے نامعلوم نوامیس قدرت کا اقرار کرنا پڑے گا جن کی ابھی تک ہم کو ہوا بھی نہیں لگی۔ پھر کس قدر شوخ چشمی اور ڈھٹائی ہوگی کہ جو چیز ہمارے مادی علّت و معلول کے سلسلہ سے ذرا باہر ہو جائے ہم یہ کہہ کر اس کی تکذیب کر دیں کہ وُہ قانُونِ قدرت یا نوامیس فطریہ کے خلاف ہے۔

تمام نظام عالم قدرتِ الٰہیہ کے پنجہ میں ہے

اب ہمارے سامنے اِتنے سِلسلے ہیں:۔

(ا) نظام طبیعی مادی (ب) فلکیات طبیعیہ، (ج) نظام رُوحانی (د) نظام ملکوتی۔

اور ان سب کے اُوپر خود قدرتِ الٰہیہ کا وُہ زبردست پنجہ ہے جس کی گرفت سے ان میں سے ایک چیز بھی ایک سیکنڈ کے لئے باہر نہیں ہو سکتی ؎

اودست سُلطان ہر چہ خواہد آں کند
عالمے را در دمے ویراں کند

مذکورہ بالا نظامات میں سے کسی کی طاقت ہے کہ وُہ خُدا کے دستِ قدرت کو کسی حکیمانہ تصرف سے روک دے۔

ہم ابھی تک باوجود اس قدر ادعار علم و تحقیق کے الف (نظام طبیعی مادی) کے قوانین و نوامیس پر بھی پوری دسترس نہیں پا سکے جیسا کہ خود ماہرینِ طبیعیات کے اعتراف سے ثابت ہے۔ پھر ہم کو کیا حق حاصل ہے کہ جو چیز ہمارے زعم میں ان چند نوامیس طبیعیہ کے دائرہ سے اُونچی ہو اُسے جاہلانہ تکبر کے ساتھ ٹھکرا دیں۔

میں تو یہ کہتا ہوں کہ اگر فرض کیجے کہ ہمارا علم نظامِ طبیعی، نظامِ روحانی اور نظامِ ملکوتی کے تمام نوامیس پر بھی محیط ہو جاتا (اگرچہ ایسا نہیں ہے) تب بھی آگے بڑھ کر فاطرِ ہستی کی لامحدود قدرت کو ہم مقید نہیں کر سکتے تھے۔ چہ جائیکہ صرف طبیعیات کے دس بیس قوانین پر مطلع ہو کر یہ اعلان کر دیں کہ جو واقعہ ہمارے حلقۂ علم سے خارج ہوگا وہ واقعہ نہیں ہے۔

خوارق کے انکار کا سبب علمی کم مائیگی ہے

خوارقِ عادات یا معجزات و کرامات وغیرہ کا انکار فی الحقیقۃ ہماری اسی تنگ نظری اور علمی کم مائیگی کا نتیجہ ہے ؎

إِذَا لَمْ تَرَ الْهِلَالَ فَسَلِّمْ ۔ لِأُنَاسٍ رَأَوْهُ بِالْأَبْصَارِ[1]

خوارق کا ثبوت متواتر ہے

ہماری استدعا یہ ہے کہ "خوارق" کو جھٹلانے والے تھوڑی دیر کے لئے ٹھنڈے دل سے اپنے علم و تحقیق کی حد اور قدرت اور قوانینِ قدرت کی پہنائیوں پر غور کریں پھر یہ بھی دیکھیں کہ ان خوارق کا ثبوت ہر زمانہ میں ہر جگہ، ہر قوم کے ہاں اور ہر عقیدہ اور مذہب کے پیروؤں کے نزدیک کس قدر تواتر اور استفاضہ سے ثابت ہے تو ان شاء اللہ تعالےٰ اُن کی جرأت نہ ہوگی کہ وہ یک قلم خوارقِ عادات کے وجود یا امکان ہی سے انکار کر بیٹھیں۔

فادر ہل نے ٹھیک کہا ہے "دنیا کے تمام مذاہب میں خواہ کسی

[1] جب تم نے خود چاند نہیں دیکھا تو تم کو اُن لوگوں کے قول پر اعتماد کرنا چاہیئے جنہوں نے اپنی آنکھوں سے چاند دیکھا ہے

کی بنیاد فلسفیانہ اصول پر ہو یا الہامی تعلیم پر، معجزات اس کثرت سے اور اس اختلاف انواع سے مروی ہیں کہ سب کے لئے خاص اصول اور قوانین کی تلاش انسان کے لئے کم از کم اس وقت تک ناممکن ہے اور یہ بھی ضرور ہے کہ اکثر بلکہ تمام مذاہب میں ماننے والوں کی خوش اعتقادی یا طرزِ ادا کی وجہ سے بہت سے غلط واقعات بھی معجزات میں شامل ہو گئے ہوں گے۔ یا ایسے واقعات جو معمولی قواعد جسمانی کے مطابق ظہور پذیر ہوئے ہوں معجزہ کی شکل میں بیان کر دیئے گئے ہوں گے۔ مگر عقل یہ دعوٰی کبھی نہیں کر سکتی کہ تمام قوانینِ قدرت معلوم ہو چکے ہیں تاکہ جو واقعہ قوانینِ معلومہ کے مطابق حل نہ ہو سکے اس کو غلط کہہ دیں اور دوسری جانب مذہب یہ دعوٰی نہیں کرتا کہ تمام رطب و یابس اور تمام صحیح و غلط روایات کو یکساں سر آنکھوں پر رکھ لیا جائے بلکہ ایسے موقع پر عقل جو کام کیا کرتی ہے مذہب اس سے زیادہ احتیاط کے ساتھ چلنے کو کہتا ہے"۔

سچا مذہب قوانینِ فطرت کا وسیع النظر معلّم ہے

مذہب کو عقل سے ٹکرانے کی ضرورت نہیں اگر عقل قوانینِ قدرت کے احترام پر زور دیتی ہے تو مذہب عقل کے اس جذبہ کی قدر کرتا ہے۔

سچا اور مکمل مذہب فی الحقیقۃ قوانینِ فطرت اور سننِ الٰہیہ کا وسیع النظر معلّم ہے جو بار بار بتلاتا ہے کہ "سُنّۃ اللہ" کو کوئی طاقت تبدیل نہیں کر سکتی مگر ساتھ ہی متنبہ کرتا ہے کہ انسان کو سننِ الٰہیہ اور نوامیسِ فطرت کا جو علم دیا گیا ہے۔ بہت تھوڑا ہے وہ بسا اوقات اُن کے سمجھنے میں ٹھوکر کھاتا

ہے اور بہت دفعہ قوانینِ قدرت کے کسی اعلیٰ اور ارفع مظہر کو اپنی حد پرواز سے باہر دیکھ کر خلاف قانون قدرت سمجھ بیٹھتا ہے اور روزمرہ کے معمول کے خلاف جو بات سنتا ہے اُسے یہ کہہ کر رد کر دیتا ہے کہ یہ سنۃ اللہ کے خلاف ہے وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۔

سُنتہ اللہ کے غیر متبدل ہونے کا غلط مطلب نہ لو لیکن اگر سنۃ اللہ کے غیر متبدل ہونے کا یہی مطلب ہو تو دنیا کی تمام ترقیات کا دروازہ ہی بند ہو جائے دیکھو انسان نے ترقی کر کے حیوانی نظام کی جگہ اس سے کہیں زیادہ طاقتور جمادی سسٹم قائم کر دیا۔

ہزاروں سال کے بعد گھوڑوں، بیلوں، اونٹوں، ہاتھیوں کی جگہ بھاپ اور بجلی نے لی۔ اس کا یہ مطلب ہوگا کہ فاطرِ عالم نے دنیا کی عمر کا بہت ہی طویل حصّہ گزر جانے کے بعد دماغی اور عقلی قوتوں کا ایسا جدید نظام پیدا کیا، جو چشمِ فلک نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اور اختراع و ایجاد کے ایسے انوکھے اصُول کی طرف رہبری کی اور اس کے اسباب و رسائل فراہم کر دئیے جن کے نتائج کو اگر اب سے دو چار صدی پہلے کوئی ذکر کرتا تو خالص مجنون یا وہم پرست سمجھا جاتا تو کیا ایسے قدرتی عوامل اور موہوب قوی کو جو ان ایجادات بدیعہ اور دماغی ترکتازیوں کے اسباب قریبہ یا بعیدہ ہیں بے شمار قرون و ادوار گزر جانے کے بعد پیدا اور اکٹھا کر دینا سنۃ اللہ کی تبدیل و تحویل اور قانون قدرت کا نقض و ابطال ہے۔

مُعجزات وخوارق کے انکار کا اصلی راز مُعجزات یا خوارق کا اِنکار کرنے والے

خواہ زبان سے نہ کہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ بے علم و بے شعور مشین کی طرح گھومنے والے مادّہ کے سوا کسی ایسی ہستی کو عالم کی تخلیق و نظم میں دخل دینا گوارا نہیں کرتے جو مواقع و محال اور ازمنہ و امکنہ کے اختلاف و تفاوت کی قادرانہ و حکیمانہ رعایت کر سکے اور جب کبھی وہ کائنات کے اس باقاعدہ عظیم الشان محکم اور منتظم سلسلہ کو ایک علیم و حکیم، محیطِ کل اور قادرِ مطلق ہستی کی طرف منسوب کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور ناچار اُن کو ایسی بڑی مضبوط مشین کے چلانیوالے کا اقرار کرنا پڑ جاتا ہے تو پھر ان کی تمامتر کوشش یہ ہوتی ہے کہ کسی طرح اُس کو آزاد نہ رہنے دیں کہ وہ اپنی اعلیٰ قابلیت اور ماہرانہ موقع شناسی کو مشین کے گھمانے اور پرزوں کے ردّ و بدل میں اُن کی خواہش اور رائے کے خلاف استعمال کر سکے اور اس طور پر وہ ہمارے علم کو محدود اور ہمارے فہم کو ناقص یا نامکمل ثابت کر دے۔

خوارق کا قانون خود خوارق کے منکروں نے بنوایا لیکن انسان کی یہ جھُوٹی شیخی، تنگ نظری اور غیر محدود قوانین قدرت کی مغرورانہ تکذیب ہی وہ چیز ہے، جو قدرت کے اس عمل کو حق بجانب ثابت کرتی ہے کہ وہ گاہ بگاہ ایک ایسے نظام تکوین سے بھی دنیا کو روشناس کرے جو ہمارے سمجھے ہوئے قوانین اور محدود و منضبط کئے ہوئے نوامیس طبعیہ سے بالاتر ہو تا کہ اُن رعونت پسند گستاخوں کو بھی (جو معاذ اللہ قدرت نامتناہیہ کو اُس کے پیدا کئے ہوئے چند اسباب ظاہرہ کی زنجیروں میں جکڑ دینے کا خبط رکھتے ہیں)، طوعاً و کرہاً یقین کرنا پڑے کہ اُن سے اور ان کے ایتھر (مادہ) سے

اوپر کوئی اور غالب و قاہر ہستی بھی ہے جس نے تمام [illegible] اپنے ارادہ اور کامل اختیار سے وضع کئے ہیں اور وہ ہی ہر وقت اُن پر پوری طرح قابو یافتہ ہے۔

پس یک خقیقۂ ثابتہ کے منکر کو اس حقیقت کا منوا دینا جس کے انکار میں خسرانِ عظیم ہے اور عاجز و کم مایہ مخلوق کو متنبہ کرنا کہ وہ اپنی حد سے گزر کر خالق کی قدرتِ کاملہ اور علم محیط کا انکار نہ کر بیٹھے کیا یہ خود مین قانونِ قدرت نہیں ہے۔

اگر سچ پوچھو تو جن چیزوں کو خوارق عادات کہتے ہیں۔ اُن کا قانون خود خوارق کے منکروں نے بتوایا ہے جب یہ لوگ عام قوانین فطرت کی اعجوبہ کاری کو خود مقنن کی حکمتِ بالغہ، اختیار کامل اور شانِ خَلّاقٌ لِّمَا يَشَاءُ وَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ کی طرف منسوب کرنے میں بھی تردد کرنے لگے تو ضروری ہوا کہ ان قوانین کو "قوانینِ قدرت" ثابت کرنے کے لئے قدرت ہی کوئی سامان کرتی۔

چنانچہ ابتدائے آفرینش سے آج تک قدرة بے شمار خوارق ظاہر کرتی رہی جنہیں دیکھ کر خواہی نخواہی اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ جو فعل جن وسائط کے ذریعہ سے عموماً ہوتا رہتا ہے اُسے بلا واسطہ کرنے میں بھی قدرت کو کچھ تعجب نہیں ہوتا۔

خوارق کے ماننے سے قوانینِ طبیعیہ کا اعتبار زائل نہیں ہوتا

اس طرح کے خوارق جو بظاہر عام قوانین طبیعیہ کو توڑنے والے ہیں ہمارے دل سے ان عام قوانین کی عظمت اور اعتبار کو اسی طرح زائل نہیں ہونے دیتے جیسا کہ گردشِ انسانوں کے دلوں سے یہ علم کہ بہت دفعہ

ٹرینوں کا تصادم ہو جاتا ہے، یا پٹری اکھڑ جاتی ہے، یا پل ٹوٹ جاتے ہیں، ریلوے ٹرین کا اعتبار زائل نہیں کرتا کہ وہ اس میں سفر کرنا چھوڑ دیں۔

پس خوارق کی موجودگی میں بھی ہم علم قوانین طبیعیہ سے اسی طرح مستفید ہو سکتے ہیں جس طرح ہم ریل کے سفر سے باوجود مذکورہ بالا حوادث کے برابر متمتع ہوتے رہتے ہیں۔

خوارق کا وجود دماغی ترقی کا سبب ہے

خوارق کا وجود ہمارے علمی اور دماغی ترقیات کے راستہ میں کوئی رکاوٹ نہیں بلکہ ٹھیک ٹھیک کہا جائے تو شدیذِ فکر کے لئے مہمیز کا کام دیتا ہے اور اگر یہ ہی فرض کر لیا جائے کہ وہ آپ کی ارتقائی کوششوں کے راستہ میں حائل ہے تو افسوس یہ ہے کہ اس کا راستہ سے ہٹا دینا بھی آپ کے قبضہ میں نہیں۔

خوارق کی انبیاء کی طرف نسبت مُلحِدین کو زیادہ تکلیف دہ ہے

تماشہ یہ ہے کہ عام قوانین فطرت کی فضا میں جب بعض غیر معمولی واقعات حسبِ اتفاق پیش آ جاتے ہیں تو ہم ان کے ماننے والوں سے جنگ نہیں کرتے لیکن اسی کے مشابہ کوئی چیز جو روزمرہ کے عام معمول سے ذرا مستبعد ہو اگر کسی بڑے سے بڑے جلیل القدر پیغمبر کی طرف منسوب ہو جائے تو فوراً شکوک و شبہات کی لہر ہمارے دلوں میں دوڑنے لگتی ہے اور اس کی نفی کرنے کی ہر ممکن صورت پر ہم غور کرنے لگتے ہیں۔

فرانس کے مشہور و معروف فیلسوف کامل فلامرتوین نے اپنی کتاب "المجہول والمسائل الروحیہ" میں ایسی عورت کا ذکر کیا ہے جس کا ایک

پستان بائیں ران میں تھا۔ اور وہ بچہ کو اسی سے دودھ پلاتی تھی۔ یہ عورت ۱۸۲۷ء میں "پیرس" کی جمعیتہ فضلا کے روبرو پیش ہوئی۔

پھر ایسے مشاہدات بیان کئے ہیں کہ ایک مرد کے پیٹ سے تشریح کے بعد لڑکا نکلا جو اس مرد کا توام تھا۔ اسی کے جسم میں مدۃ العمر محبوس رہا، ڈاڑھی نکلی اور بوڑھا ہوا۔

اب فرض کیجئے کہ اسی طرح کے فلتات طبیعیہ کو اگر کوئی شخص یہ کہدے کہ فلاں پیغمبر کے اعجاز، فلاں ولی کی کرامت سے فلاں زمانہ میں ایسا ہوا تھا تو منکرین اعجاز کسی نہ کسی عنوان سے اس کی تردید پہ فوراً کمربستہ ہوجائینگے۔

جاپان میں قیامت خیز زلزلہ آیا، کسی ہی بستیاں تباہ ہوگئیں اور کتنی ہی مستحکم عمارتیں منہدم ہوگئیں۔

چند سال ہوئے ضلع ہردوئی میں بگولا اٹھا جس سے ایک جھیل کا پانی بالکل اُڑ گیا اور دوسری جگہ جھیل بن گئی۔ اسی طرح کے اوقات جو خوارق میں سے نہیں، صرف قلیل الوقوع ہیں۔ ہم سنتے ہیں اور ایک منٹ کے لئے بھی ان کو غلط نہیں سمجھتے۔

لیکن کیا قیامت ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کے وقت اگر معتبر سے معتبر راوی بھی یہ خبر دے کہ ایوان کسریٰ میں زلزلہ آیا، اس کے چودہ کنگرے گر پڑے یا دریائے ساوہ خشک ہوگیا یا فارس کی ہزار سالہ آگ بجھ گئی تو متشککین کو اس کے ماننے میں پس و پیش ہونے لگتا ہے!

خیال ہے کہ زلزلہ کا آنا، کسی بڑی سے بڑی عمارت کا شکستہ ہونا، دریا کا خشک ہوجانا اور آگ کا بجھنا ان میں سے کونسی چیز محال ہے، یہ چیزیں تو فی حد ذاتہ خوارق میں سے بھی نہیں۔ پھر اگر یہی چیزیں سب سے جلیل القدر، اور اولوالعزم پیغمبر کی تقرب و وجاہت ظاہر کرنے یا اس کے عظمت مآب مستقبل کی طرف اشارہ کرنے کے لئے حق تعالیٰ ظاہر فرماتا ہے تو تم کو کیوں تردّد ہونے لگتا ہے۔

روح کے متعلق یہ ثابت ہوچکا ہے کہ اس کے تاثیر و تاثر میں بعد مکانی یا زمانی خلل انداز نہیں ہوتا اور اس جوہر لطیف و نورانی کو اپنے عمل میں مسافت جسمانی کی کچھ پرواہ نہیں۔

پس اگر روح محمدی صلعم کی نورانیت عظیم نے حضرت آمنہ کے لئے مکہ سے بُصریٰ تک روشن کر دیا تو اس میں کیا اشکال ہے۔

کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ خداوند قادر و توانا، نظام تکوین اور قوانین طبیعیہ کے استعمال میں کوئی تصرف آپ کی اطلاع اور مشورہ کے بدون نہ کیا کرے (نعوذ باللہ)

اس کی امید آپ خدا سے تو کیا، اُس مسکین ایتھر سے بھی نہ رکھیں جو ہر قسم کے علم و شعور، قدرت اور ارادہ سے محروم ہے۔

خوارق کا ماننا وہم پرستی نہیں آپ خوارق و معجزات کے ماننے والوں کو "سادہ لوح" اور "وہم پرست" کہا کریں، لیکن تاریخی اوراق آپ کو بتلائینگے کہ اسی قسم کے "سادہ لوحوں" اور "وہم پرستوں" نے دنیا کو حکیمانہ حقائق

سے معمور اور وہم پرستیوں سے نفور کیا ہے۔ ان ہی وہم پرستوں میں ایسے ایسے عالی ہمت اور اولوالعزم انسان اُٹھے ہیں جنہوں نے بنی نوع انسان کی کایا پلٹ کر رکھ دی اور اوہام و تخیلات کا سارا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا۔

صداقت کے اعلان سے گھبرانا نہیں چاہیئے

بلا شبہ آج دُنیا کی فضا بہت کچھ بدل چکی ہے اور "خوارق" کا نام زبان پر لانا بڑی بہادری کا کام ہے۔ لیکن ایک صداقت کے ماننے اور اعلان کرنے میں آدمی کو گھبرانا نہیں چاہیئے۔ وہ وقت آنے والا ہے کہ یہی "خوارق و معجزات" کا مذاق اُڑانے والے اُن چیزوں کے ثابت کرنے کے درپے ہوں گے جن کو آج رد کر رہے ہیں۔

صداقت، ممکن ہے کہ اپنا صاف چہرہ دکھلانے میں کچھ تاخیر کرے لیکن وہ ضرور ایک دن ایسی طرح متجلّی ہوگی کہ دیکھنے والے اُس سے آنکھیں نہ چرا سکیں گے۔

انجام ہمیشہ صداقت کے ہاتھ ہے

دیکھو! دُنیا کے سب سے بڑے موحّد صلی اللہ علیہ وسلم نے جب نعرۂ توحید بلند کیا تو رُوئے زمین پر کوئی بھی ہمنوائی کرنے والا نہ تھا لیکن فضائے کعبہ سے توحید کا جو "صور" پھونکا گیا آج ہم مندروں اور کلیساؤں تک میں اس کی گونج محسوس کر رہے ہیں۔

آج جو اقوام و ملل دولت توحید سے تہیدست ہیں وہ بھی اندر ہی اندر اپنی محرومی اور تہیدستی کا ماتم کرتی ہیں اور موحدین کے رُوبرو شرم سے اُن کو سر اُٹھانا مشکل ہے۔

ہم کو یقین ہے کہ اسی طرح ایک دن پیغمبروں کے اعجاز اور اولیاء کی

کرامات کا انکار کرنے والے بھی اپنے اس جہل اور ضیق نظر پہ پشیمان ہونگے جس کا نام اُنہوں نے علم رکھ چھوڑا ہے اور جسے وہ سائنس کی بڑی بھاری عقیدت مندی سمجھتے ہیں۔ وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوٓا أَيَّ مُنقَلَبٍ يَنقَلِبُونَ

سائنس خوارق کی تسلیم کیلئے راستہ صاف کر رہی ہے

ہم نے احادیث صحیحہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد پڑھا تھا انی واللہ ابصر من ورائی کما ابصر من بین یدی یعنی میرا دیکھنا مواجہ پر موقوف نہیں بلکہ پیٹھ پیچھے کی چیزیں بھی مجھے ایسے ہی نظر آتی ہیں جیسے کہ سامنے کی۔

بہت سے متفلسفین اس کو قانون فطرت کے خلاف سمجھ کر درپے تاویل ہوگئے تھے لیکن حافظ ابن حجر وغیرہ محققین نے حدیث کو ظاہر پر محمول کر کے اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص اور خوارق عادات میں شمار کیا۔

آج ہم دیکھتے ہیں کہ ایک انگریز ماہر علم بصارت نے انسان کی جلد میں قوت باصرہ کے راز پر روشنی ڈالی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ انسان کے بدن کی جلد کے نیچے چھوٹے چھوٹے ذرات پائے جاتے ہیں جو سارے جسم میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ ذرے ننھی ننھی آنکھیں ہیں، ان میں اسی طرح تصویر اُتر آتی ہے جس طرح آنکھ کی پتلی میں اُترتی ہے، یہ خیال کہ انسان کی کھال بھی اسی طرح دیکھتی ہے جس طرح آنکھیں، کوئی نیا نہیں ہے، آپ جب کسی نابینا شخص کو بازار میں بھیڑ سے بچ کر گزرتے دیکھتے ہیں تو تعجب کرتے ہیں کہ یہ تو اندھا ہے اسے راستہ کس طرح سوجھتا ہے۔ انسان کی پیشانی کی جلد کے متعلق یہ خیال ہے کہ اس میں قوت باصرہ موجود ہے، یہ دماغ کو اسی طرح پیغام پہنچاتی ہے

ڈاکٹر فرگول کا بیان ہے کہ آج سے ہزاروں سال پیشتر آنکھوں کے بغیر پڑھنے کا ہنر اپنے کمال کو پہنچا ہُوا تھا اور عام طور پر رائج تھا، لیکن جب انسان کو یہ معلوم ہُوا کہ وُہ آنکھوں سے بھی وُہی کام لے سکتا ہے جو بدن کی جلد سے لیتا ہے تو اس نے جلد سے دیکھنے کا طریق ترک کر دیا اور بالآخر جلد سے دیکھنے کی قابلیت اس میں سے مفقود ہو گئی، اگر اس حس کو دوبارہ ترقی دی جائے تو تعجب نہیں ہے کہ اس کے ذریعہ سے اندھے بھی دیکھنے لگیں۔

بہر حال سائنس کی ترقی خوارق کی تفہیم میں بہت کچھ مدد دے رہی ہے اور اسی لئے ہم یہ اُمید رکھنے میں حق بجانب ہیں کہ کچھ عرصہ کے بعد انشاء اللہ تعالیٰ سائنس کے پجاری خوارق کی تسلیم کے لئے گردن جھکا دیں گے۔

ابھی چند روز پہلے جب یہ سُنتے تھے کہ رسُول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے درخت جھک گئے یا اُنہوں نے حضُور کو سلام کیا یا حضُور کے ایماء سے وُہ اپنی جگہ سے سرک گئے تو ملحدین ان قصوں کی "اساطیر الاولین" کہہ کر ہنسی اُڑاتے تھے، اور ان بیانات کو پُرانے مسلمانوں کی خوش اعتقادی یا وہم پرستی پر محمول کرتے تھے۔ لیکن آج ماہرین علم نباتات نے نباتاتی زندگی کے جو حیرت انگیز حالات ظاہر کئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ درخت اور پودے فی الواقع زندگی کے وُہ تمام حسیات و تاثرات اپنے اندر رکھتے ہیں جو ابھی تک ذی رُوح مخلوق کی خصوصیت سمجھے جاتے تھے۔ ہر شخص جو نباتاتی زندگی سے کچھ بھی واقفیت رکھتا ہے، جانتا ہے کہ پَودے اور پھُول بھی اپنی غذا کھاتے، اپنا پانی پیتے اور اپنی نیند سوتے ہیں۔ ان میں بھی جنسوں کا وصل و جفت ہوتا

ہے۔ ان کی بھی نسل چلتی ہے اور ان میں بھی بڑھاپا آتا ہے اور وہ بھی بالآخر موت کے چنگل میں پھنستے ہیں۔

لیکن بہُت کم لوگ یہ یقین کرنے کے لئے تیار ہوں گے کہ پودے دیکھنے اور سُننے کی بھی قدرت رکھتے ہیں۔ آپس میں بات چیت بھی کرتے ہیں، ان پر عشق و محبت کا وار چلتا ہے۔ رنج و غم ان کو بھی ستاتا ہے اور وُہ بھی ہماری طرح جذبات و حسیات سے تاثر پذیر ہوتے ہیں۔

آپ نے دیکھا ہو گا کہ بعض پودے اور پھُول محض ہاتھ لگا دینے سے سکڑ جاتے ہیں اور ذرا سے اشارے سے بند ہو جاتے ہیں، اسی ذکی الحسی کی وجہ سے ایک پودے کا نام ہی "چھوئی موئی" پڑ گیا ہے۔

یہ تو وُہ حالات ہیں کہ ہر انسان اپنی چشم عریاں سے دیکھ سکتا ہے لیکن آپ ہی کے ایک ہموطن ماہر سائنس یعنی "سر جگدیش چندر بوس" نے اپنی مدت العمر کے تجربات سے پودوں اور درختوں کے جو حالات اپنے ایجاد کردہ عجیب و غریب آلات کے ذریعہ معلوم کئے ہیں، ان سے علم نباتات میں حیرت انگیز انقلاب پیدا ہو گیا ہے۔

آپ تو پھُول میں سوائے رنگ و بُو کے اور کوئی رازِ فطرت نہیں پاتے لیکن آپ "سر جگدیش چندر بوس" کی جدید تصنیف کا اگر مطالعہ کریں جو پلانٹس آٹو گرافس اینڈ دیر ریویلیشن کے نام سے حال ہی میں شائع ہُوئی ہے تو آپ کو معلُوم ہو کہ اس ماہر فن نے پودوں پر کس کس قسم کے تجربات کر کے کیسے کیسے حیرت انگیز انکشافات کئے ہیں اور ان سے فطرت کے کیسے کیسے

رازہائے سربستہ معلوم ہوتے ہیں، ان حالات کے دیکھنے اور معلوم کرنے سے بے اختیار زبان پر یہ شعر جاری ہو جاتا ہے ؎

برگ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار
ہر ورقے دفترے ست معرفتِ کردگار

مختلف قسم کی ادویہ کا پودوں پر بعینہٖ وہی اثر مترتب ہوتا ہے جو انسان یا جانور پر ہوتا ہے یہ "کلوروفارم" پودے کو بھی اسی طرح بیہوش کر سکتا ہے جس طرح ہمیں آپ کو،

ایک ایسا آلہ "سر بوس" نے بنایا ہے جس سے پودے کی حالتِ طلب کا آپ بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔

سب سے زیادہ ذکی الحس پودہ "مائی موزہ" ہے کہ ایک ذرا سی بدلی چھا جانے سے وہ اونگھنے لگتا ہے اور شعاع آفتاب پڑنے سے فی الفور چاق و چوبند ہو جاتا ہے۔ حالتِ خواب و بیداری کے تجربے اس پودے پر خوب کئے جاتے ہیں۔

اس کے برخلاف "جھنگا پھول" کا پودہ ہے جو دریائے گنگا کے کنارے "بنگال" میں زیادہ ہوتا ہے، یہ دن کے وقت خواب استراحت میں رہتا ہے اور شب میں اپنی پوری بہار دکھاتا ہے، افریقہ میں ناریل کے ایسے درخت ہیں جو ساحل سمندر کی سخت اور تیز ہوا کی وجہ سے ایک طرف کو بالکل جھکے ہوئے ہوتے ہیں لیکن صبح کے وقت جب یہ ہوا نہیں چلتی یہ درخت بالکل سیدھے کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس وقت ان کے پھل توڑنا بڑا دشوار

کام ہے لیکن وقت مقررہ پر یہ سب پھر جھک جاتے ہیں اور دوسری صبح کو پھر اسی طرح سیدھے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

"بنگال" کے اُس "تاڑ" کے درخت کا حال تو اکثر لوگوں کو معلوم ہوگا جو کہ طلوع آفتاب کیساتھ بیدار ہوتا ہے اور تدریجاً زمین سے اٹھ کر سیدھا کھڑا ہو جاتا تھا، لیکن جُوں جُوں سورج ڈھلتا جاتا تھا یہ درخت بھی جھکنے لگتا تھا اور غروب آفتاب کے ساتھ یہ بھی سربسجود ہو جاتا تھا۔

کیا نباتات کے متعلق یہ جدید انکشافات اور سر بوس کی تصانیف پڑھ کر کسی انصاف پسند طالبِ حق کو یہ جرأت ہو سکتی ہے کہ "سیرۃ النبی" صلے اللہ علیہ وسلم کے اُن مستند و معتبر حقائق کی تکذیب کرے جو نباتات میں حس و شعور، ارادہ، نطق، اور جذبات محبت وغیرہ کی موجودگی پر دلالت کرتے ہیں

ہم اسلامی تاریخوں میں "یا ساریۃ الجبل" کا مشہور واقعہ پڑھتے تھے لیکن "وائرلیس" کی ایجاد سے پہلے ہمارے لئے یہ سمجھنا کس قدر مشکل تھا کہ شاید ایک روحانی "وائرلیس ٹیلیفون" کے ذریعہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آواز ساریہ رضی اللہ عنہ تک پہنچ گئی ہو۔

عالمگیر جنگ کے زمانہ میں ایک لاسلکی پیام ہیڈ کوارٹر سے لندن کو چلا راستہ میں بعض جرمن اُسے جذب کرنے لگے۔ اوپر سے ایک فرانسیسی طیارہ نے ان جذب کرنے والوں پر بم پھینکا اور جرمن اپنی سعی میں ناکام رہے۔

دیکھئے یہ مادی واقعہ اس روحانی واقعہ سے کس قدر مشابہت رکھتا ہے کہ عرش سے جو لاسلکی پیام سرزمین حجاز کو جا رہا ہے شیاطین اُس کو اُچکنا چاہتے

ہیں لیکن اوپر سے شہابِ ثاقب کا گولہ ان کا کام تمام کر دیتا ہے اور وہ ناکامیاب، و نامراد دھکیل دیئے جاتے ہیں۔

اس قسم کے ہزارہا سائنٹیفک شواہد و نظائر نے خوارق اور دیگر مشکل اور غامض مسائل کی تفہیم کے متعلق ہمارے کام کو بہت آسان کر دیا، اور قوانین قدرت کی نسبت اپنی تنگ نظری اور کم مائگی کی بنا پر جو غلطیاں ہم کر رہے تھے ان میں سے بہت سی اغلاط کی اصلاح کر دی ہے

اب قانون کا لفظ استعمال کرتے وقت ہم کو بڑی احتیاط کرنی پڑتی ہے اور کسی چیز کو روزمرہ کے معمول کے ذرا خلاف دیکھ کر جھٹ پٹ یہ دعوے نہیں کر سکتے کہ وہ قانونِ قدرت کے خلاف ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ "قانونِ قدرت" کے اس لفظ سے بھی ہم کو بہت کچھ دھوکا دیا گیا ہے۔ یہ لفظ رعب کرنے والا تو بہت ہے مگر ہم جس مضمون کو اس لفظ سے ادا کرنا چاہتے ہیں اُس کی یہ صحیح تعبیر نہیں، فی الحقیقت جس چیز کا نام ہم نے "قانونِ قدرت" رکھا ہے وہ "قانونِ عادت" ہے۔

قدرت اور عادت یہ دو لفظ ہیں جن کا فرق اُن کے سادہ مدلول ہی سے ہویدا ہے، ایک کام کی قدرت (یعنی کر سکنا) اور ایک اس کی عادت (یعنی کرتے رہنا) دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔

ہر انسان اپنے تئیں محسوس کرتا ہے کہ خورونوش، لباس، سواری اور معاشرت کے متعلق جو امور اُس کی عادت میں داخل ہیں وہ اُن کے خلاف پر بھی قادر ہے، گو اُن کے خلاف عمل کرنا اس کی عادت میں داخل نہیں، اسی طرح

جو لوگ خُدا کی ہستی اور اُس کی قدرت کے قائل ہیں اُن کو لامحالہ یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ خدا کی قدرت، ارادہ، عادت، یہ تینوں ایک دُوسرے سے بالکل متمیز ہیں۔ ضروری نہیں کہ جو کچھ خُدا کر سکتا ہے وہ سب کر ڈالے، اور جو کر ڈالے اُسی کو بار بار اور ہمیشہ کرتا رہے، خُدا کی قدرت اور عادت کو مترادف ثابت کرنے کی کوئی دلیل ہمارے پاس نہیں ہے بلکہ ایسے دلائل موجود ہیں جو قدرت اور عادت کے تفاوت کو بخوبی ظاہر کرتے ہیں۔

دیکھو! ہم اُس قادرِ مطلق کی یہ عادت برابر دیکھتے چلے آتے ہیں کہ وہ بچہ کو رحمِ مادر سے نکالتا ہے اور پھر بتدریج پرورش کرتا ہے چنانچہ ہم میں سے کسی نے نہیں دیکھا کہ کوئی جوان انسان یوں ہی آسمان سے گرا دیا گیا ہو یا زمین سے اُگ آیا ہو، مگر اس کے باوجود ہم یقین رکھتے ہیں کہ اس کی عادت مستمرہ کے خلاف رحم اور نطفہ کے توسط کے بدون انسان کو پیدا کرنا بھی خدا کی قدرت میں داخل ہے۔ آخر ابتداء آفرینش میں جب انسان پیدا کیا گیا تو یقیناً اس کی کیفیت اس متعارف طریقہ پیدائش سے بالکل علیحدہ تھی اور تمام اقوام و ملل کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس وقت ایک یا متعدد انسان بغیر الدوالی وسائل اور موجودہ قانونِ تناسل کے جوان جوان محض خُدا کی قدرت اور اس کے ارادہ سے پیدا ہو گئے۔

پس جو مذہب یہ تسلیم کرتا ہے، قطعاً حق نہیں رکھتا کہ وہ اس کے قادرِ مطلق کو ظاہری سلسلۂ اسباب میں ایسا جکڑ بند کر دے کہ خواہ کیسی ہی حکمت اور مصلحت کا اقتضاء ہو مگر وہ ایک منٹ کے لئے ان اسباب کے سلسلہ سے

علیحدہ ہو کر کوئی چھوٹے سے چھوٹا کام کرنے سے بھی مجبور اور عاجز ٹھہرے ؟

سبب و مسبب اور علت و معلول کے تمام سلاسل کو کسی ایسی حد پر ختم کرنا ضروری ہے جہاں خلاق عالم کا دست قدرت اسباب و وسائط کو چھوڑ کر براہ راست کسی چیز کو موجود کرتا ہے، پھر کیسے دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ہزاروں یا لاکھوں سال گذر جانے کے بعد حق سبحانہ وتعالیٰ میں جو لم یزل ولا یزل ہے، معاذ اللہ، وُہ زور قدرت باقی نہیں رہا جو اسباب سے الگ ہو کر اب کسی چھوٹی یا بڑی چیز کو ایجاد کر سکے۔

بلاشبہ اُس کے کمالات لازوال اور ہر قسم کے نقص و فتور سے بکلی منزہ ہیں اور اس کی قدرت میں یقیناً یہ داخل ہے کہ جب چاہے سبب کو بدون مسبب کے اور مسبب ا[illegible]بدون سبب کے پیدا کر دے مثلاً آگ موجود ہو اور نہ جلائے یا کوئی چیز جل جائے مگر آگ موجود نہ ہو۔

[illegible] شک آگ سے جلانا اس کی عام عادت ہے لیکن اگر کبھی کسی مصلحت سے اس عادت کے خلاف ظاہر ہو تو وُہ بھی تحت القدرۃ ہے۔

خرق عادت یعنی کبھی کبھی سلسلۂ اسباب سے علیحدہ ہو کر محض قدرتِ اسمٰو کے اظہار کے طور پر کوئی کام کرنا قدرت کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ ہاں عام عادت اور معمول کے خلاف ہو گا۔ لہٰذا اس کو قانون عادت کے خلاف کہنا صحیح ہو تو ہو مگر قانون قدرت کے خلاف قرار دینا اس لفظ کا غلط استعمال اور مغالطہ آمیز تعبیر ہے۔

قدرت اور عادت دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ اسباب سے مسبب کا

پیدا کرنا، خدا کی عادت ہے اور بلا سبب کے مسبب بنا دینا قدرت کا کام ہے اسباب کا سارا سلسلہ قدرت کا بنایا ہوا ہے وجہ یہ کہ قدرت اسباب کی بنائی ہوئی ہے اور اسی لئے قدرت تو اسباب پر حاکم ہو گی، لیکن اسباب معاذ اللہ قدرت کے پاؤں میں زنجیر نہیں ڈال سکتے۔

عادتِ عامہ و خاصہ

معجزہ خدا کی خاص عادت ہے

قدرت اور عادت کی اس تفریق کے وقت ایک اور بات بھی یاد رکھنی چاہیئے یعنی جیسا کہ ہم مشاہدہ کرتے ہیں عادت کی بھی دو قسمیں ہیں:۔

(۱) عادت مستمرہ عامہ (۲) عادت موقتہ خاصہ

عادت عامہ مستمرہ سے میری مُراد وُہ عادت ہے جس کا استعمال بکرات و مرات، جلد جلد اکثر اور بیشتر اوقات میں ہوتا رہتا ہے اور اس کے بالمقابل "عادت خاصہ موقتہ" وُہ ہو گی جس کا تجربہ گاہ بگاہ نادر مواقع میں ہُوا کرے۔

مثلاً ایک شخص کو ہم دیکھتے ہیں کہ بڑا نرم خو، حلیم الطبع اور بُردبار ہے، ہزار گالیاں سُننے اور اشتعال دلانے پر بھی اُسے غصہ نہیں آتا لیکن اس کے باوجود بارہا یہ بھی تجربہ کیا گیا ہے کہ جب کبھی مذہب پر حملہ ہو یا اُس کے سامنے پیغمبر علیہ السلام کی ادنیٰ سی توہین کی جائے اُس وقت غصہ سے بیتاب

ہوکر آپے سے باہر ہوجاتا ہے تو توہین کے وقت اس کی یہ سخت گیری اور درشتی اگرچہ اس کی عام عادت (بُردباری، عفو و درگزر) کے مخالف ہے لیکن وُہ بجائے خود اس کی ایک خاص اور مستقل عادت ہے جس کے ظہور کا موقع گاہ بگاہ اس کے اسباب مہیا ہونے پر ملتا رہتا ہے۔

یاد رکھو! جس چیز کا نام ہم معجزہ رکھتے ہیں وُہ بھی اللہ تعالیٰ کا ایک فعل ہے جو اس کی عام عادت کے گو خلاف ہو مگر عادت خاصہ کے خلاف نہیں ہوتا بلکہ اُس کے موافق ہوتا ہے، کیونکہ خاص اوقات میں مخصوص مصالح کی بنا پر عام عادت کو چھوڑ کر خوارق و معجزات کا ظاہر کرنا یہ بھی حق تعالیٰ کی خاص عادت ہے سلسلۂ اسباب و مسببات کا قائم رکھنا اگرچہ اس کی عام عادت ہے لیکن بار بار یہ بھی تجربہ ہو چکا ہے کہ جب اپنے سفراء اور مقربین کی تصدیق کرانا ہوتی ہے تو اُن کے ہاتھوں پر وہ غیر معمولی علامات ظاہر کرتا ہے جس سے دنیا سمجھ لے کہ بیشک یہ اس کے سفیر اور مقرب و معتمد ہیں جن کے دعوے کی تصدیق و تنویر کے لئے وُہ خلاف معمول چیزیں پیش کر کے ساری مخلوق کو اس کی مثل لانے سے عاجز کر دیتا ہے اور یہی ہونا بھی چاہیئے عقل اور فطرت کا فیصلہ بھی یہی ہے کہ خُدا اپنے خاص وفادار بندوں کے ساتھ وہ معاملہ کرے جو دُوسروں سے نہ کرے، کیا ایک گاؤں کے مکھیا یا نمبردار کے کہنے سے وائسرائے وہ کام کر سکتا ہے جو ایک صوبہ کے گورنر کے کہنے سے کرتا؟

ماں، باپ، بیوی، اولاد، احباب، اقارب، حکام، رعایا غرض ہر ایک کے ساتھ انسان کا معاملہ اور اس کی عادت جُداگانہ ہوتی ہے جو ثابت کرتی

ہے کہ یہ حاکم ہے یہ محکوم ہے، یہ باپ ہے، یہ لاڈلا بیٹا ہے، بسا اوقات جو بے تکلفی یا خلاف طبع امور کا تحمل آدمی اپنے مخلصوں اور دوستوں کی رعایت سے کر لیتا ہے وُہ ہرگز ساری دُنیا کے دباؤ سے نہیں کر سکتا۔ ایک استاد کا خاص خاص شاگردوں کے ساتھ جو معاملہ ہوتا ہے وُہ تمام طلبہ سے مستثنیٰ ہوتا ہے، ان سب صورتوں میں عام عادت سے علیحدہ معاملہ کرنا ہی قرین قیاس اور عقل و فطرۃ کے موافق ہے، تاکہ تفاوت مراتب اور اختلاف مدارج کے سمجھنے میں کوئی مغالطہ اور اشکال نہ رہے۔

اس امر کو ملحوظ رکھ کر میں یہ کہتا ہوں کہ معجزہ فطرت کا مقتضا ہے اس کے مخالف کیونکر ہو سکتا ہے۔ بلکہ اگر معجزات ظاہر نہ ہوں تو یہ حکمت کے خلاف ہوگا سفاہت ہوگی۔

جو لوگ خُدا کے یہاں وجیہ ہیں اپنی جان، اپنی آبرو ہتھیلی پر رکھ کر خُدا کے لئے کھڑے ہوتے ہیں اور خُدا ہی ان سے یہ دعویٰ کراتا ہے کہ "آج تمہاری سب کی نجات میرے اتباع میں منحصر ہے" ضروری ہے کہ اُن کی وجہ سے علم و عادت سے بالاتر کارنامے خُدا کی قدرت کے ظاہر ہوں جو کہ تمام دُنیا کو اپنی نظیر پیش کرنے سے تھکا دیں اور تمام مخلوق کو عاجز کر دیں، یہ ہی معنی ہیں معجزہ کے۔

یاد رکھیئے کہ "معجزہ" خُدا کا فعل ہوتا ہے۔ اس کو نبی کا سمجھنا سخت غلطی ہے۔

خدائی فعل انسانی افعال سے بداہۃً ممتاز ہوتا ہے بلاشبہ خُدائی فعل اور

بندوں کے اعمال میں نمایاں امتیاز ہوتا ہے۔ خدائی کام کی نقل بندہ اُتارتا ہے لیکن عاقل مبصر کو اصل اور نقل میں کبھی التباس بھی نہیں ہو سکتا۔

گلاب خدا کا بنایا ہوا ہے۔ اب تم بھی کاغذ وغیرہ کے پھول بناتے ہو تمہارے پھول پر پانی کا ایک چھینٹا پڑ جائے تو تمہاری صنعت کا سارا پول کھل جاتا ہے لیکن قدرتی پھول پر پانی گرتا ہے تو اس میں اور زیادہ صفائی اور تازگی محسوس ہوتی ہے۔

انسان جانداروں، درختوں، پھولوں کی تصویر کھینچ لیتا ہے، مگر مچھلی کی آنکھ، مکھی کا پر، مچھر کی ٹانگ، بلکہ ایک جَو کا دانہ تمام عالم مل کر بھی نہیں بنا سکتا۔ لاکھوں مجسمے، کروڑوں بیل بوٹے دنیا کے صناع بناتے ہیں، مگر مچھر کا ایک پر بنانے سے بالکل عاجز ہیں۔ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ (البقرۃ)

اسی کا نام خدائی فعل ہے اور جب ایسا فعل بدون توسط ان اسباب کے جو اس کی تکوین کے لئے متعارف ہیں، کسی مدعی نبوت کے ہاتھوں پر ظاہر ہو اس کا نام معجزہ ہو جاتا ہے۔

معجزہ کوئی فن نہیں

پس جب یہ ثابت ہوا کہ معجزہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہے جو بدون تعالمی اسباب کے ظہور پذیر ہو تو دوسرے خدائی کاموں کی طرح اس میں بھی کسی صانع کی صنعت کو دخل نہیں ہو سکے گا، بنابریں تنجیم، کہانت مسمریزم، سحر، شعبدہ بازی کی طرح معجزہ کوئی فن نہیں جو تعلیم و درس سے حاصل ہوتا ہو۔ یہ فنون سیکھنے سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ لیکن معجزہ میں نہ تعلیم و تعلم ہے۔ نہ انبیا کا کچھ اختیار اس میں چلتا ہے نہ معجزہ صادر کرنے کا کوئی خاص

ضابطہ اور قاعدہ ان کو سکھلایا جاتا ہے کہ جب چاہیں ویسا عمل کر کے ویسا ہی معجزہ دکھلا دیا کریں بلکہ جس طرح ہم قلم لے کر لکھتے ہیں اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ قلم لکھتا ہے اور فی الحقیقت اس کو لکھنے میں کوئی اختیار نہیں ہوتا یہی صورت معجزہ کی بھی ہے ایسا نہیں کہ انبیا جس وقت چاہیں مثلاً انگلیوں سے پانی کے چشمے جاری کر دیں بلکہ جس وقت اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ مقتضی ہوتی ہے جاری ہو سکتے ہیں، برخلاف فنون سحریہ وغیرہ کے جو تعلیم و تعلّم سے حاصل کئے جاتے ہیں ان پر جس وقت چاہیں قواعد مقررہ اور خاص خاص کی پابندی سے یکساں نتائج اور ایک ہی طرح کے آثار و کیفیات دکھلائے جا سکتے ہیں مگر آج تک مدعیان نبوت و اعجاز کی طرف سے کوئی درسگاہ معجزہ سیکھنے سکھانے کی نہ بنی، نہ کوئی قاعدہ اور ضابطہ ممہد ہوا، نہ کوئی کتاب تنجیم مسمریزم سحر کی طرح معجزات سکھلانے والی تصنیف کی گئی بلکہ وہ خدا کا فعل ہوتا ہے جو تمام دنیا کو تھکا دیتا ہے۔ اگر افعال میں سے ہے تو اس جیسے فعل سے دنیا عاجز ہے اور اگر اقوال میں سے ہے تو اس جیسے کلام سے تمام دنیا کے بولنے والے مجبور اور درماندہ ہیں، رسول کے اختیار یا قدرت کو بھی اس میں پورا دخل نہیں، اسی واسطے انبیاء سے جب معجزات طلب کئے گئے تو انہوں نے اللہ پر محول کیا، فرماتے ہیں۔

وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا
اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ
خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ۝ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا

اَوْتَاْتِیَ بِاللّٰہِ وَالْمَلٰٓئِکَۃِ قَبِیْلًا ۝ اَوْیَکُوْنَ لَکَ بَیْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰی فِی السَّمَآءِ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِیِّکَ حَتّٰی تُنَزِّلَ عَلَیْنَا کِتٰبًا نَّقْرَؤُہٗ ۝ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ کُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ۝

(اور وہ تم سے کہتے ہیں کہ ہم تو اس وقت تک تم پر ایمان نہیں لائیں گے کہ یا تو ہمارے لئے زمین سے کوئی چشمہ بہا نکالو یا کھجوروں انگوروں کا تمہارا کوئی باغ ہو اور اس کے بیچ میں تم بہت سی نہریں جاری کر دکھاؤ یا جیسا کہ تمہارا خیال ہے آسمان کے ٹکڑے ہم پر لا کر گراؤ۔ یا خدا اور فرشتوں کو ہمارے سامنے لا کھڑا کرو یا رہنے کے لئے تمہارا کوئی طلائی گھر ہو یا آسمان پر چڑھ جاؤ اور جب تک تم وہاں سے ایک کتاب اُتار کر نہ لاؤ کہ ہم آپ اُس کو پڑھ لیں، ہم تمہارے چڑھنے کو بھی باور کرنے والے نہیں۔ کہدو (اے محمد صلعم) کہ میں رسول تو ہوں مگر بشر رسول ہوں (خدا نہیں ہوں یعنی معجزہ تو بشر کا فعل نہیں ہے خدا کا فعل ہے۔ میرے قبضہ میں یہ نہیں کہ جو چاہو تمہیں دیدوں بلکہ جس قدر خدا میری تصدیق کی علامات کے طور پر کافی اور مناسب جانتا ہے ظاہر کرتا ہے۔)

معجزہ کچھ ایسے حالات کے ساتھ آتا ہے کہ اس میں شبہ کی گنجائش نہ رہے

جب موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو دعوت دی اور عصا کا معجزہ دکھایا اس کا جواب دینے کے لئے فرعون نے بڑے بڑے ساحروں کو جمع کیا

اور وہ بھی موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں اپنی لاٹھیاں اور رسیاں لے کر پہنچ گئے، وہ سمجھے ہوتے تھے کہ موسیٰ بھی ہمارے ہم پیشہ ساحر ہیں۔ اسی لئے کہا،

اِمَّآ اَنْ تُلْقِیَ وَاِمَّآ اَنْ نَّکُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِیْنَ ۝

(پہلے تم ڈالو گے یا ہم)

مگر موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ "تم پھینکو" جب اُنہوں نے اپنی لاٹھیاں اور رسیاں پھینکیں اور وہ چلتے ہوئے سانپ نظر آنے لگے (فَاَوْجَسَ فِیْ نَفْسِہٖ خِیْفَۃً مُّوْسٰی) موسیٰ علیہ السلام اپنے دل میں ڈرے حالانکہ اگر وہ بھی پیشہ ور ساحر ہوتے تو ڈر کی کوئی وجہ نہ تھی۔

شیخ اکبرؒ فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر یہ خوف کیوں طاری ہوا اور کیوں طاری کیا گیا؟ یعنی خوف کا منشا کیا تھا اور اس کے طاری کئے جانے میں کیا حکمت تھی؟ اگر کہا جائے کہ سانپوں کی صورت دیکھ کر ڈر گئے تو موسیٰ علیہ السلام جیسے پیغمبر کو ان لاٹھیوں اور رسیوں سے کوئی خوف نہیں ہو سکتا تھا۔ خصوصاً جب کہ اسی نوعیت کے اعلیٰ خوارق کا تجربہ بھی دو مرتبہ کر چکے تھے، پہاڑ پر جو واقعہ "القاء عصا" کا ہوا اُس پر "لاتخف" سن چکے تھے کیونکہ وہاں بھی خائف ہوئے وَلّٰی مُدْبِرًا وَّلَمْ یُعَقِّبْ جس کے جواب میں کہا گیا:

لَا تَخَفْ اِنِّیْ لَا یَخَافُ لَدَیَّ الْمُرْسَلُوْنَ

(اے موسیٰ مت ڈر یہاں انبیاء ڈرا نہیں کرتے)

پھر دوسری مرتبہ فرعون کے سامنے لاٹھی ڈال کر بھی دیکھ چکے تھے۔

شیخ فرماتے ہیں کہ پہلی دفعہ پہاڑ پر بشری خوف تھا جو کہ وہیں نکل چکا تھا، اب دوسری دفعہ جو خوف ساحرین کے مقابلہ میں طاری ہُوا، یہ اس وجہ سے کہ موسیٰ علیہ السلام جانتے تھے کہ میرے ساتھ میں کوئی طاقت اور قدرت نہیں، کہیں ساحرین کی اس شعبدہ بازی کے سامنے حق کا کلمہ پست نہ ہو جائے اور ہلکے دقوف لوگ ان جھوٹے کرشموں کو دیکھ کر فتنہ میں نہ پڑ جائیں چنانچہ جواب میں ارشاد ہُوا۔

لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى

(ڈرو مت تم ہی سر بلند ہو کر رہو گے)

یہ تو خوف کا منشا تھا آگے اس کی حکمت بیان فرماتے ہیں کہ جب ڈر گئے اور ڈرے ہُوئے آدمی پہ خوف اور گھبراہٹ کے جو آثار ہویدا ہوتے ہیں اُن کو محسوس کر کے ساحرین سمجھے کہ ہمارے پیشہ کا آدمی ہرگز نہیں۔ یا کم از کم اس کو کوئی ساحرانہ عمل ایسا معلوم نہیں جس سے ہمارے مقابلہ میں قلب کو مطمئن رکھ سکے۔

اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا ڈالا جو باذن اللہ تمام جادو کے سانپوں کو نگل گیا تو ساحرین نے یقین کر لیا کہ یہ سحر سے بالاتر کوئی اور حقیقت ہے۔ وُہ سب بے اختیار سجدے میں گر پڑے اور چلا اُٹھے کہ ہم بھی موسیٰ اور ہارون کے پروردگار پر ایمان لاتے ہیں۔ فرعون نے بہت کچھ دھمکیاں دیں اور خوفزدہ کرنا چاہا مگر ان کا جواب صرف یہ تھا۔

فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ اِنَّمَا تَقْضِىْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا
اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا وَمَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ
مِنَ السِّحْرِ وَاللّٰهُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى

(جو کچھ تجھے فیصلہ کرنا ہے کر گذر تو اس سے زیادہ نہیں کہ صرف اسی دُنیا کی (چند روزہ) زندگی کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ ہم تو اپنے (حی ولا یموت) پروردگار پہ ایمان لا چکے ہیں تاکہ وُہ ہماری خطائیں اور اُن ساحرانہ حرکتوں کو معاف فرمائے جو تو نے ہم سے زبردستی کرائیں اور اللہ سب سے بہتر اور ہمیشہ باقی رہنے والا ہے)۔

اور جو لوگ ایسی آیات بینات دیکھ کر بھی راہ حق پر نہ آئے اُن کا حال یہ تھا

وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا

(اُنہوں نے ہماری آیات کا انکار کیا۔ ظلم سے اور زیادتی سے حالانکہ اُن کے دلوں کو (سچائی کا) پُورا پُورا یقین حاصل تھا۔)

خود فرعون کو خطاب کر کے حضرت موسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں:

لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
بَصَآئِرَ وَاِنِّىْ لَاَظُنُّكَ يٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا

(تو خوب جانتا ہے کہ یہ آیات آسمان و زمین کے پروردگار کے سوا کسی نے نہیں اُتاریں اور فرعون بیشک میں تجھے سمجھتا ہوں کہ تو (اس علم کے باوجود) ہلاکت میں گر چکا ہے)

معجزہ خُدا کی طرف سے نبوّت کی فعلی تصدیق ہے | یہیں سے ہم اس نتیجہ پر

پہنچے ہیں کہ معجزہ فی الحقیقت حق تعالیٰ کی طرف سے نبوت کی عملی تصدیق ہے۔

جو شخص دعویٰ کرتا ہے کہ میں نبی ہوں یعنی حق تعالیٰ نے مجھ کو اپنے منصب سفارت پر سرفراز فرمایا ہے اور تمام بنی نوع میں سے مجھ کو اپنے فرامین و ہدایات پہنچانے کے لئے چھانٹ لیا ہے۔ نجاتِ ابدی سے بہرہ ور ہونا صرف میرے ہی اتباع میں منحصر ہے۔ میرے اتباع سے الگ ہو کر عذاب الٰہی سے نکلنے کی کوئی سبیل نہیں۔

یہ سب دعاوی خدا تعالیٰ کے سامنے، اُس کی زمین پر، اُس کے آسمان کے نیچے باوازِ بلند بار بار کرتا ہے اور یہ بھی کہتا ہے کہ اللہ جل شانہٗ میرے ہاتھوں اور زبان سے وہ چیزیں ظاہر فرمائے گا جو اس کی عام عادت کے خلاف ہوں گی اور دُنیا اُن کی مثال لانے سے عاجز ٹھہرے گی۔ پھر اسی کے موافق مشاہدہ بھی کیا جا رہا ہو تو یہ یقیناً خدا کی جانب سے اُس کے دعوے کی عملی تصدیق ہے اور خدا تعالیٰ چونکہ جھوٹی تصدیق نہیں کر سکتا لہٰذا نبی کا دعوےٰ معجزہ کے ظہور کے بعد سچا ثابت ہو جاتا ہے۔

اِسی لئے بلا خوف تردید یہ یقین رکھتے ہیں کہ حق تعالیٰ جو تمام سچائیوں کا سرچشمہ اور صداقتوں کا خزانہ ہے، کسی انسان کو یہ دسترس نہ دے گا کہ وہ نبوت کا جھوٹا دعویٰ کر کے برابر ایسے خوارقِ عادات دکھلاتا رہے کہ دُنیا اِس کے مقابلہ سے عاجز ہو جائے، ضرور ہے کہ خدا ایسے حالات بروئے کار لائیگا کہ اس کی طرف سے جھوٹے کی عملی تصدیق نہ ہونے پائے۔

فعلی تصدیق کی مثال | آپ جلسوں میں دیکھتے ہیں اور کونسلوں اور پارلیمنٹوں

کا حال سنتے ہیں کہ جب کسی مسئلہ، تجویز یا انتخاب پر بحث چھڑ جاتی ہے تو فریقین کی پوری زور آزمائی اور ردّ و کد کے بعد فیصلہ کا مدار اس پر ہوتا ہے کہ رائیں شمار کر لی جائیں۔ جس کے لئے شرکاء اجلاس سے ہاتھ اُٹھوائے جاتے ہیں، اور یہی ہاتھ اُٹھا دینا یا نہ اُٹھانا اس ریزولیوشن کی تصدیق و تائید یا تکذیب و تردید کے لئے کافی ہوتا ہے۔ زبان ہلانے کی قطعاً ضرورت نہیں ہوتی۔

ایک شخص کی نسبت پبلک جلسہ میں رائے لی جاتی ہے کہ آیا جمہور کو اس پر اعتماد ہے؟ اس پر ہاتھ اُٹھا دیئے جاتے ہیں۔ یہی اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ اُن سب کی رائے اِس شخص کے حق میں ہے۔ ہم دن رات سینکڑوں دفعہ اپنے ہاتھ کو اُوپر اُٹھائیں اس کو کسی چیز کے ثابت کرنے یا نہ کرنے میں کوئی دخل نہیں۔ لیکن یہی ہمارا ہاتھوں کی وضع طبعی اور ہیئت اصلی کے خلاف اوپر کو اُٹھا دینا جب کسی ریزولیوشن کی تسلیم و انکار یا کسی دعوے کی صحت و بطلان کی آزمائش کے موقعہ پر ہو تو غبی سے غبی انسان کو بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی، اس وقت کھڑے ہوئے ہاتھوں ہی کے شمار سے رایوں کا شمار کر لیا جاتا ہے اور پھر بڑے نازک اور عظیم الشان مسائل کے فیصلے ہاتھ کی اسی غیر طبعی حرکت پر بے چون و چرا ہو جاتے ہیں پس جس طرح ہاتھوں کا نیچے لٹکائے رکھنا آدمی کی عادت اور وضع طبعی کے موافق ہے اور اوپر کو اُٹھانا کبھی کبھی خاص ضرورت اور مصلحت سے ہوتا ہے اور یہی غیر طبعی وضع جب کسی ریزولیوشن پر ووٹ لینے کے اختیار کی جائے تو اس ریزولیوشن

یا دعوے کی بے شک وشبہ تصدیق وتائید کی جاتی ہے۔

ٹھیک اسی طرح حق تعالیٰ شانہ کا جو فعل عام سنن طبعیہ کے سلسلہ میں ظہور پذیر ہو وہ اس کی عام سُنّت اور عادت کہلاتی ہے اور جو اسباب سے علیحدہ ہو کر کسی خاص مصلحت اور حکمت کے اقتضاء سے ظاہر ہو وہ خرقِ عادت ہے۔

اور یہی خرق عادت جب کسی شخص کے دعوی نبوت اور تحدی کے بعد اس سے، یا اُس کے کہنے کے موافق صادر ہو یہ معجزہ ہے کہ جو من جانب اللہ اس کے دعوی کی فعلی تصدیق ہے۔

معجزہ، کرامت، ارہاص | لیکن اسی کے مشابہ کوئی خرق عادت اگر کسی نبی کے متعلق اس کے دعوی نبوت یعنی بعثت اور تحدی سے پہلے ظاہر ہو اُس کو "ارہاص" کہتے ہیں، اور اگر کسی غیر نبی کے ہاتھ پر اتباع نبی کی برکت سے اس قسم کے خارق عادات نشانات دکھلائے جائیں تو اس کا نام "کرامت" ہے

کرامت اور استدراج کا فرق | ہاں ایک چیز ان تینوں کے سوا اور ہے جس کو متکلمین کی زبان میں استدراج کہتے ہیں یعنی وہ خوارق عادات جو گاہ بگاہ کسی بدکار، گمراہ، فاسق یا کافر مشرک اور مکذب انبیاء کے ہاتھ سے ظاہر ہوتے ہیں اگرچہ یہ خوارق بھی صورۃً اُن خوارق سے مشابہ ہو سکتے ہیں جن کا نام ہم نے کرامات رکھا ہے لیکن سمجھنے والوں کے نزدیک ان دونوں میں ایسا ہی فرق ہے جیسا کہ ایک نجیب الطرفین مولود اور ایک ولد الزنا میں۔ کہ بظاہر دونوں بچے یکساں شکل وصورت رکھتے ہیں اور حسی طور پر دونوں ایک ہی طرح کی حرکت وعمل کا نتیجہ ہیں۔ مگر محض اس لئے کہ اُن میں سے ایک بچہ

فعل حرام کا نتیجہ اور دُوسرا عمل مشروع اور طیب کا ثمرہ ہے، ہم پہلے کے تولد کو مذموم وقابلِ نفرت اور دُوسرے کی ولادت کو محمود اور موجب مسرت وابتہاج سمجھتے ہیں۔

ٹھیک اسی طرح جو "خوارق عادات" اتباع رسُول اور خدائے واحد کی پرستش کا نتیجہ ہوں وہ "کرامات اولیا" کہلاتی ہیں جن کے مبارک ومحمود ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ اس کے برخلاف جو "خوارق" اتباع شیطان، عبادت غیر اللہ، فسق وفجور اور اخلاد الی الارض کے ثمرات ہوں۔ اُن کا نام "استدراج" اور "تصرف شیطانی" ہے۔ اور اسی جگہ سے ہمارا یہ خیال ہے کہ ہم صرف کرامات سے ولی کو نہیں پہچان سکتے بلکہ ولی سے کرامات کو پہچانتے ہیں اور یہ بڑے شکر کا مقام ہے کہ حق تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے ہم کو اس قسم کے فروق تلقین فرما کر التباس حق باطل سے محفوظ رکھا ہے۔ واللہ ولی التوفیق۔

اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اِتِّبَاعَہٗ
وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَہٗ
بِحُرْمَۃِ نَبِیِّکَ وَحَبِیْبِکَ سَیِّدِنَا
مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ
وَاٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ
وَسَلَّمَ

الٓرٰ کِتٰبٌ اُحْکِمَتْ اٰیٰتُہٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ

الرٰ، یہ ایک ایسی کتاب ہے کہ اسکی آیتیں محکم کی گئی ہیں پھر صاف صاف بیان کی گئی ہیں

اعجاز القرآن

بااضافہ رسالہ

۱: الروح فی القرآن

۲: المعراج فی القرآن

از تالیفات

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی

ناشر

ادارۂ اسلامیات ۱۹۰ انار کلی۔ لاہور

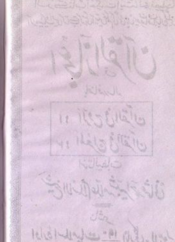
عرض ناشر

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ (۱۸۸۵ — ۱۹۴۹ء) برصغیر کی ان چند نامور ہستیوں میں سے ایک ہیں جن کی نمایاں ملی، علمی، سیاسی اور عظیم دینی خدمات، روشنی کے مینار کی حیثیت رکھتی ہیں۔ آپ شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کے خصوصی شاگردوں میں سے تھے، دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے اور وہیں ایک عرصہ تک تفسیر و حدیث کی درس و تدریس میں مشغول رہے۔ قیام پاکستان کی تحریک میں نمایاں خدمات انجام دیں، اور پاکستان بننے کے بعد اسلامی دستور اور اسلامی قوانین کے نفاذ کے لئے آخر العمر تک مقدور بھر کوشش کرتے رہے۔ حضرت علامہ دینی علوم پر گہری دسترس رکھتے تھے اور قرآن و حدیث کے ساتھ ساتھ عقلی علوم پر بھی گہری نظر رکھتے تھے، تفسیر عثمانی، فتح الملہم اور العقل و نقل اور مولانا کی دیگر تصانیف سے ان کے تدبر، غور و فکر اور علم کی گہرائی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ زیر نظر رسالہ "اعجاز القرآن" اپنے موضوع پر حضرت علامہؒ کی بہترین تصنیف ہے جو آپ کی خدمت میں پیش ہے۔ مزید افادہ کے لئے رسالہ کے آخر میں حضرت علامہؒ کے دو اور رسالوں "الروح فی القرآن" اور "المعراج فی القرآن" کا بھی اضافہ کر دیا گیا ہے۔ امید ہے کہ قدر دان حضرات اس پیش کش کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔

والسلام

ناشرین

ابناء محمد زکیؒ



فہرست مضامین اعجاز القرآن

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اعجاز القرآن

تمہید

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

امابعد

زمانہ کے حالات اسوقت مقتضی ہوئے کہ دارالعلوم دیوبند کے طلبہ کے ایسی تقاریر کا ایک سلسلہ شروع کیا جائے۔ جنہیں اسلام کے عام اصول و قواعد کی تحقیق اور قرآن کریم کی حکیمانہ تعلیم اور اس کی عظمت شان ظاہر کرنیوالی حقائق زیادہ سے زیادہ واضح، معقول، اور دلنشین پیرایہ میں بیان کی جائیں اور طلبہ کی ایک جماعت کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ یہاں سے جاکر اپنے ناواقف یا کم علم بھائیوں کے ایمان کی حفاظت اور منکرین یا مشککین پر خدا کی حجت تمام کرسکیں، اسی نیت سے اس ناچیز نے چند روز ہوئے کہ ایک سلسلہ بیانات کا شروع کیا اور چونکہ کچھ عرصہ سے آریوں کے شور و غوغا نے ملکی سطح میں تلاطم اور اسلامی حلقوں میں حمایت حق کا ہیجان پیدا کر رکھا ہے۔ اس لئے ان بیانات میں خصوصیت سے آریہ سماج کے اصول و خیالات مرعی رہے ہیں۔ تمام مباحث سے پہلے میں نے مناسب خیال کیا کہ قرآن کریم کے اعجاز اور کلام الٰہی ہونیکے

متعلق ایک مبسوط اور مفصل تقریر کردی جائے۔ جس کے بعد ایک انصاف پرست اور طالب حق کے لئے یہ گنجائش باقی نہ رہے کہ وہ قرآن کریم کی عظمت و جلالت سے انکار کرسکے یا اس کی روشنی کے قبول کرنے سے روگردانی کرے۔ اس بحث کے ضمن میں اور بھی کئی مفید اور اہم بحثیں آگئی ہیں اور ایسا ہونا ناگزیر تھا۔ اعجاز قرآن کی تحقیق اسی وقت حد تکمیل کو پہنچ سکتی تھی کہ اول اعجاز کی بحث ہو یعنی یہ کہ معجزہ کیا چیز ہے اس کی ضرورت کیا ہے۔ اس کا وجود قطرۃ (یا نیچر) کے خلاف تو نہیں، وہ دلیل نبوۃ کس طرح بن جاتا ہے۔ اور معجزہ جیسے فعلی ہوتا ہے قولی بھی ہوتا ہے؟ پھر یہ بتلانا ہوگا کہ وحی کیا چیز ہے اس کی ضرورت بندوں کو کیا ہے، اس میں تدریج ہوسکتی ہے یا نہیں، قرآن جسے ہم سب سے آخری وحی الٰہی اور کلام ربانی مانتے ہیں۔ اس کو ہم کیوں معجزہ کہتے ہیں۔ اور کس طرح کلام الٰہی اور وحی ربانی ماننے پر مجبور ہوئے ہیں؟ غرض یہ مضمون جب اپنے نزدیک مکمل ہوگیا اور بقدر کفایت اس کے سب اطراف و جوانب قبضہ میں آگئے تو بعض احباب کی قلمبند کی ہوئی یادداشتوں کو خاکسار نے ایک رسالہ کی صورت میں مرتب کردیا تاکہ غائبین کے حق میں بھی اس کا نفع عام ہو اور مضمون چھپ کر ضیاع سے محفوظ ہوجائے۔ آئندہ بھی اگر خدا نے توفیق دی تو یہی صورت اختیار کی جائے گی۔ جن لوگوں کو ان رسائل کے مطالعہ کا اتفاق ہو اُن سے میری درخواست ہے کہ وہ رسالہ کو ایک تقریر کی صورت میں دیکھیں اور مہربانی فرما کر اوّل سے آخر تک پڑھ جائیں۔ کیونکہ مضمون کا پورا لطف اور فائدہ اس کے بغیر حاصل نہ ہوگا۔ بعض مضامین جو بہت ہی خشک فلسفیانہ،

ہوتے ہیں خواہ ان کو کتنا ہی سہل عبارت میں ادا کیا جائے لیکن عام لوگوں کو ان کے پڑھنے میں پوری دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ ایسے معرکۃ الآرا مسائل کی تحقیق میں ناظرین کو اس طرح کے بعض مضامین سے اکتانا نہیں چاہیئے۔ بلکہ مؤلف کو ان کے ترک نہ کر سکنے میں معذور خیال کیجیے اور ہمت کر کے پوری کتاب کو پڑھ جایئے آخر لکھنے والے کی محنت سے تو پڑھنے والے کی محنت زیادہ نہ ہو گی۔ یہ ہی مضمون (**اعجاز القرآن**) جو آپ کے سامنے ہے اہل علم اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس کا ابتدائی حصہ کس قدر ضروری ہے جو کسی طرح حذف نہیں کیا جا سکتا تھا اور یہ کہ اس میں کتنے مشکل مسائل کو حل کیا گیا ہے۔ چونکہ اس کتاب کا موضوع بحث اعجاز القرآن ہے اس لئے اوّلاً مجھے چند ایسے اصول مبادی کے طور پر بیان کرنا ضروری ہیں جو قرآن کی عظمت اور اعجاز کے سمجھنے میں مدد دینے والے ہوں۔ لہٰذا وہ اگرچہ آپ کے نزدیک فی الحال اصل مبحث سے بے تعلق ہوں مگر میں ان ہی سے اپنی تقریر کا آغاز کرتا ہوں۔ وباللہ التوفیق۔

اصل اوّل

"کیوں" کا سوال کہیں نہ کہیں ختم کرنا ضروری ہے

کونات (سب جگت) میں جو جو واقعات و حوادث پیش آتے ہیں۔ ہر چیز پر یہ سوال کر سکتے ہیں کہ یہ کیوں ہوا مگر ہر شخص کو ناچار ایک جگہ پہنچ کر یہ سوال ختم کرنا پڑے گا۔

تشریح:۔ مثلاً لکڑی آگ میں ڈال دی اور آگ نے اس کو جلا دیا۔ تو سوال

ہو سکتا ہے کہ آگ نے اس کو کیوں جلا دیا؟ پانی آگ پر بہایا تو سوال ہو سکتا ہے کہ پانی نے آگ کو کیوں بجھا دیا؟ کسی نے زہر کھایا اور مر گیا تو سوال ہو سکتا ہے کہ زہر نے اس کو کیوں مارا؟ آم کے درخت پر صرف آم ہی کیوں لگتا ہے؟ یہ سوالات وہاں بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ جہاں آثار کا صدور ارادہ اور اختیار کے توسط سے نہ ہو جیسے آگ کا جلانا، زہر کا مار ڈالنا، آم کے درخت پر صرف آم ہی کا لگنا، آگ اور آم کے درخت اور زہر کے اختیار سے باہر ہے۔ لیکن اگر کہیں توسط ارادہ و اختیار بھی ہو، تو وہاں یہ سوال اور بھی زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔ جیسے کوئی کافر اسلام لے آئے یا مسلمان مرتد ہو جائے۔ والعیاذ باللہ منہ، تو سوال کر سکتے ہیں کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ غرض کہ ہر چیز (کیوں) سوال کے تحت میں آ سکتی ہے۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ کیا کہیں کیوں کا سلسلہ بند بھی ہوتا ہے یا نہیں؟ آؤ اس کی تفتیش ہم کسی ملحد یا مادہ پرست کو سامنے رکھ کر کریں۔ مثلاً ایک شخص طاعون کی بیماری سے فوت ہوا تو ہم دریافت کرتے ہیں کہ طاعون کیوں ہوا؟ جواب یہی ملے گا کہ زہریلے جراثیم کے پھیلنے سے پھر ہم دریافت کریں گے کہ جراثیم کیوں پھیلے کہا جائے گا کہ آب و ہوا کی خرابی سے؟ بس ابھی یا ایک دو کیوں کا جواب دیگر کیوں کا سلسلہ بند ہو جائے گا اور سنیئے آگ کیوں جلاتی ہے، اس لئے کہ اس میں حرارت مفرط ہے۔ حرارت مفرط آگ میں کیوں ہے، آگے کیوں کا سلسلہ بند ہو گیا اور اگر ساری دنیا کے فلاسفہ اور حکماء بھی جمع ہو جائیں گے۔ تو اس سے آگے کیوں کا جواب نہیں دے سکتے جو لوگ فاعل مختار کو چھوڑ کر صرف

مادہ کے قائل ہو گئے ہیں ان سے اور بھی ایک دو باتیں دریافت کر دجن اجزائے مادہ سے آفتاب بن گیا ان سے چاند کیوں نہیں بنا جن ذرات سے چاند متکوّن ہوا ان سے بجائے چاند کے سورج کا تکون کیوں نہیں ہوا۔ جن مواد سے تاروں کی کروی الشکل ہستیاں موجود ہوئیں ان مواد سے سنگریزے کیوں نہیں بن گئے۔ جن اجزاء سے پاؤں کے تلوے بنائے گئے ان سے سر کی کھوپڑی کیوں نہ بنی؟ ہاتھی کی روح میں جو طاقت ہے کہ وہ بڑی بڑی قوی چیزوں کو مسل ڈالتا ہے وہ چیونٹی روح میں کیوں نہ آئی، اور چیونٹی کی روح جو ذرا سے اشارے سے صفحۂ ہستی سے رخصت ہو جاتی ہے، اسقدر کمزور کیوں واقع ہوئی، شیر کی روح نے اسقدر قوت کیوں پائی کہ وہ بڑے بڑے عظیم الجثہ حیوانات کو چیر پھاڑ کر ان کے پرخچے اڑا دیتا ہے مقناطیس صرف لوہے کو کیوں کھینچتا ہے۔ گھاس کے تنکوں کو کیوں نہیں کھینچتا، لوہا اسقدر بھاری اور روئی اتنی ہلکی کیوں ہے۔ وقس علی ہذا۔ غرض کہ ارواح کی قوتوں اور مادہ کی استعدادوں اور خواص میں اسقدر تفاوت کیوں ہے۔ ان ہی چند مثالوں سے واضح ہو گیا کہ ہر چیز کی علت اور سبب کی تلاش اور کیوں کے جواب کا سلسلہ کوئی ہستی خواہ وہ خدا پرست ہو یا مادہ پرست ملحد ہو یا موحد زیادہ دور تک جاری نہیں رکھ سکتی بلکہ کسی نہ کسی درجہ پر یہ سلسلہ طوعاً و کرہاً خواہ مخواہ بند کرنا پڑے گا اور بند کرنے میں ملحد اور موحد دونوں برابر ہیں، البتہ فرق اگر ہے تو بند کرنے کے طریقہ میں ہے مادہ پرست سوالات مذکورہ کے جواب میں کہے گا کہ مادہ میں جیسی استعداد تھی ویسی صورت قبول کر لی جب یہ سوال کرو گے کہ مادہ میں استعداد کیوں مختلف تھی جواب یہ دیں گے کہ آگے سوال نہیں ہو سکتا آم کے درخت پر آم کے متعلق یہ تو

کہے گا کہ اس کی صورت نوعیہ کا اقتضاء یہ ہے اسی طرح سنکھیا کا مہلک ہونا بھی اس کی صورت نوعیہ پر محول ہے دیکھو بڑے بڑے دہریہ جب وہ ہیولیٰ کی استعداد اور مادہ کی قابلیت اور صورت نوعیہ کے اقتضاء پر پہنچے تو آگے بڑھنے سے ان کی بلند پروازی رک گئی اسیطرح موحد کا حال ہے کہ وہ بھی ایک خاص حد پر پہنچ کر اپنی پرواز کو ختم کر دیتا ہے۔

کیوں کے بند کرنے میں ملحد اور موحد کا فرق

البتہ اتنا فرق ہے کہ ملحد سے جب سوالات کرو گے تو مادہ، صورت نوعیہ ماروح کے خواص پر سوالات کو ختم کرے گا اور موحد کہیگا کہ جو چیزیں جن خواص و آثار کیساتھ موجود ہیں اللہ جل جلالہ کے علم ازلی محیط میں ان کا اسی طرح ہونا مناسب تھا، اگر مادہ پرست کہے کہ اللہ کے علم محیط میں یہ ہی کیوں مناسب تھا اس کا جواب یہ ہے کہ جب تم نے مادہ کی استعداد کے سامنے سر جھکا دیا تو اس میں کیا عیب ہے کہ ہم خدا تعالے کے علم کے سامنے سر جھکائیں؟۔ اگر تم صورت نوعیہ اور روح و مادہ کے سامنے سجدہ کر کے اور عاجز ہو کر سوالات کے سلسلہ کو بند کرنے کا حق رکھتے ہو تو ایک موحد کو کون روک سکتا ہے کہ وہ اپنے پیمانہ مہم کو تنگ اور قوۃ ادراک کو علم الٰہی کے روبرو حقیر و ناچیز سمجھ کر اس خدائے قدوس و برتر کے سامنے سجدہ کرے جس کو زمین و آسمان کی ہر چیز سجدہ کرتی ہے۔ جہاں تم نے سوال کا سلسلہ ختم کر دیا روح کی قوت اور مادہ کی استعداد پر وہاں میں کہوں گا کہ اس کو منتہی کرو اللہ جل جلالہ کے علم محیط

ازلی پر جس طرح مادہ، اور روح کے خواص کو تم ازلی کہتے ہو جس میں ارادہ اور اختیار کو کوئی دخل نہیں، اسی طرح خیال کر لو کہ اللہ تعالے کا علم محیط بھی ہمارے نزدیک بلکہ تمام اہل ملل کے نزدیک ازلی ہے، خدا کو یہ اختیار نہیں کہ وہ علم کو ایک منٹ کے لئے اپنے سے جدا کر کے جاہل رہ جائے (معاذ اللہ) خلاصہ یہ اختیار نہیں رکھتا کہ وہ اپنے کو خدا نہ رہنے دے۔

وَاِنَّ اِلٰی رَبِّکَ الْمُنْتَہٰی ہ	اور ہر چیز کی انتہا تیرے رب کی طرف ہے
لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَ	اس کے کاموں کی نسبت سوال نہیں کیا جا
ھُمْ یُسْئَلُوْنَ ہ	سکتا ہاں بندوں سے باز پرس ہو سکتی ہے۔
وَمَا اُوْتِیْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا ہ	اور تم کو تو صرف ایک ذرا سا علم دیا گیا ہے۔
سُبْحٰنَکَ لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا	پاک ہے تو اے پروردگار، جس قدر تو نے
مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّکَ اَنْتَ	بتلا دیا اس کے سوا ہم کچھ نہیں جانتے بیشک
الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ ہ	تو ہی ہے جاننے والا اور حکمت والا ہے۔
وفی الحدیث الصحیح فلینتہ	(جب خلانگ سوال کا سلسلہ پہنچے، تو چاہیے
وَلْیَسْتَعِذْ بِاللہِ	کہ آدمی رک جائے اور اللہ کی پناہ ڈھونڈے

اصل دوم

قدرۃ اور عادۃ میں فرق، عادۃ کے مراتب، خرقِ عادت کی حقیقت

جو لوگ خدا کی ہستی اور اس کے وجود کے قائل ہیں ناچار ان کو تسلیم کرنا پڑا ہے کہ اللہ کی ایک قدرت ہے اور ایک ارادہ اور ایک اس کی عادت

ہے اور یہ تینوں ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں، قدرت اور عادت میں بسا اوقات التباس ہو جاتا ہے، مثلاً عام طور پر ایسے امور کے متعلق جو سلسلہ اسباب و مسباب کے خلاف واقع ہوں کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ امر قانون قدرت کے خلاف ہے اور اہل الحاد اسی بہانہ سے بہت سے صحیح مسائل کو ماننے سے انکار کر دیتے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ کہنا ہی غلط ہے کہ یہ امر قانون قدرت کے خلاف ہے یہ لوگ اس لفظ کا غلط استعمال کرتے ہیں۔ اس وقت میرا روئے سخن دہریوں کیطرف نہیں آریوں کی طرف ہے اور آریہ بھی قانون قدرت کا لفظ بہت استعمال کیا کرتے ہیں لیکن خود بھی پرمیشور کو سرو شکتیمان (قادر مطلق) مانتے ہیں جیسا کہ ہم خدا کو قادر مطلق مانتے ہیں پس اگر وہ واقعی سرو شکتیمان اور قادر مطلق ہے تو اس کی قدرت میں یقیناً یہ داخل ہے کہ سبب کو بدون مسبب کے اور مسبب کو بدون سبب کے پیدا کر دے۔ مثلاً آگ موجود ہو مگر نہ جلاوے یا کوئی چیز جل جاوے مگر آگ موجود نہ ہو یا مثلاً ہم قادر مطلق کی عادت یہ دیکھتے ہیں کہ بچہ عورت کے رحم سے نکلتا ہے اور پھر بتدریج نشوونما پاتا ہے چنانچہ کسی نے نہیں دیکھا ہو گا کہ کوئی جوان انسان آسمان سے اترا ہو یا زمین سے اگ آیا ہو مگر اس عادۃ مستمرہ کے خلاف ماں کے رحم اور نطفہ کے توسط کے بدون انسان کو پیدا کرنا بھی اس سرو شکتیمان کی قدرت میں داخل ہے، کیونکہ ان کا مذہب یہ ہے کہ دلیل و نہار کی طرح یہ عالم بھی فنا ہو کر پیدا ہوتا رہتا ہے اور جیسے رات کے بعد دن اور دن کے بعد رات آتی ہے اسیطرح عالم کا سلسلہ فنا و بقا یکے بعد دیگرے جاری ہے

اور عالم کے فنا کے زمانے کو وہ پرلے "کا زمانہ کہتے ہیں اور اس وقت ان کے خیال کے موافق سارا عالم فنا ہو جاتا ہے اور سب کچھ مٹ مٹا کر خدا کی ذات میں سما جاتا ہے اور جیسا کہ رگوید میں تصریح ہے صرف پربرہم کی سامرتھ (خدا کی قدرت) باقی رہ جاتی ہے باقی سب کچھ نیست و نابود ہو جاتا ہے اور ایک مدت دراز تک اسی طرح عالم فنا میں پڑا رہتا ہے۔ اس کے بعد نئے سرے سے پھر پیدا ہو جاتا ہے۔ اب دنیا کا جو دور چل رہا ہے اس کا حساب سوامی دیانند نے معلوم کس بہی کھاتہ سے لگا کر یہ کہا ہے۔ کہ ایک ارب چھیانوے کروڑ کچھ لاکھ ہزار برس سے یہ دنیا موجود ہے اس سے پہلے غیر متناہی مرتبہ دنیا فنا اور پیدا ہوتی چلی آئی ہے اور موجودہ دور بھی اپنے وقت پر جب خدا چاہے گا فنا ہو جائے گا۔ اس عقیدہ کا رد اسوقت بہت نہیں۔ بلکہ میں یہ کہتا ہوں کہ جب دنیا پرلے کے بعد نئے سرے سے پیدا ہوتی ہے تو مختلف مخلوقات خصوصاً انسان کہاں سے آتے ہیں۔ سوامی دیانند لکھتے ہیں کہ پرلے کے بعد جو انسان پیدا ہوتے ہیں ان کی پیدائش کی کیفیت متعارف طریقہ سے بالکل علیحدہ ہے یعنی ہزاروں انسان بغیر ماں باپ کے جوان محض خدا کی قدرت اور اس کے ارادہ سے بدوں متعارف سلسلہ اسباب طبعیہ کے بن جاتے ہیں۔ اب جو مذہب یہ کہتا ہے وہ مذہب قطعاً یہ حق نہیں رکھتا کہ وہ اس کے بعد سرو شکتیمان کو اس ظاہری سلسلہ اسباب میں ایسا جکڑ بند کر دے کہ خواہ کیسی ہی حکمت اور مصلحت کا اقتضاء ہو مگر وہ ایک منٹ کے لئے ان اسباب کے سلسلہ سے الگ ہو کر کوئی چھوٹے سے چھوٹا کام کرنے سے بھی مجبور اور عاجز ٹھہرے۔

جب ان کے اعتراف کے مطابق پرلے کے بعد اس عادت مستمرہ کے برخلاف غیر متناہی دفعہ ایسا ہو چکا ہے اور ہوتا رہے گا تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جو خدا اب سے ایک ارب سال پہلے (پرلے کے بعد) قادر تھا کہ بدوں ماں باپ کے انسان کو پیدا اور بدوں اسباب کے مسببات کو موجود کر دے اب اس کی قدرت کو کس چیز نے سلب کر دیا کہ ایک یا دو ارب سال کے بعد ایسا نہ کر سکے۔ معلوم ہوا کہ خرق عادت یعنی کبھی کبھی سلسلہ اسباب سے علیحدہ ہو کر محض وسیع قدرت کے اظہار کے طور پر کوئی کام ایسا کرنا اس کی قدرت کے خلاف نہیں۔ ہاں عادت اور معمول کے خلاف ہوگا، لہذا اس کو قانون عادت کے خلاف کہنا صحیح ہو تو ہو مگر قانون قدرت کے خلاف قرار دینا اس لفظ کا غلط استعمال اور مغالطہ دینے والی تعبیر ہے مثلاً اہل اسلام کے عقیدہ کے موافق ابراہیم خلیل اللہ کو آگ میں ڈالا گیا اور وہ نہ جلے تو خدا کی اس عام عادت کے تو خلاف ہوا جو آگ کے متعلق ہے کہ وہ جلانے کا سبب ہے لیکن قدرت کے خلاف نہ ہوگا جس نے اس میں یہ خاصہ احراق ودیعت کیا ہے۔

آریوں کے چار رشیوں کے علاوہ کسی اور سے خدا کا ہمکلام ہونا قدرت کے خلاف نہیں البتہ عادت کے خلاف ہے

آریہ کہتے ہیں کہ ہر پرلے کے بعد چار ویدوں کا الہام چار معین اشخاص کو ہوتا ہے جن کے نام بھی لکھے ہیں۔ وایو، اگنی، انگرا، ادیتہ کہا جاتا ہے کہ یہ چار رشی ہیں گو تاریخ ایسے ممتاز انسانوں کا کوئی پتہ نہیں دیتی اور نہ ان کی کوئی

سوانح بتلا سکتی ہے بلکہ ان کو چار انسان بتانا بھی سوامی دیانند کی کوشش کا نتیجہ ہے جو ان ہی کے دائرہ اثر تک محدود ہے دوسرے بڑے بڑے فرقے ہنود کے اس تشریح دوسری طرح پر کرتے ہیں تاہم مجھے اس وقت اس سے بحث نہیں مجھے تو یہ کہنا ہے کہ آریہ سماج کے نزدیک ہر پرلے کے بعد ان ہی چار رشیوں پر چار ویدوں کا الہام جگ کی ابتدا میں ہوتا ہے بعد میں کوئی کتاب کسی پر نہیں اترتی اور ہر پرلے کے بعد وہی چار وید اترتے ہیں کہ جو پہلے اتر چکے ہیں ان میں بھی تغیر اور تبدل نہیں ہو سکتا میں کہتا ہوں کہ حق تعالیٰ ان ہی چار رشیوں سے ابتدائے آفرینش میں کلام کرتا ہے اور کسی سے نہیں کرتا۔ گویا خدا کا بندوں سے ہمکلام ہونا اس کی عام عادت نہیں بلکہ خاص عادت ہے جو خاص زمانہ میں مخصوص بندوں کی نسبت ظاہر ہوتی ہے حالانکہ خدا اس سے مجبور اور عاجز نہیں کہ اگر وہ چاہے تو کسی اور سے بھی کسی وقت کلام کرلے تو مجھے اس وقت یہ کہنا ہے کہ خود آریوں کے اصول کے موافق بھی دو چیزیں الگ الگ ہوئیں ایک قدرت۔ اور ایک عادت۔ اور یہ کہ عادت کے خلاف کوئی کام کرنا بھی قدرت سے خارج نہیں ہے پس اسباب سے مسبب کا پیدا کرنا خدا کی عادت ہے اور بلا سبب کے مسبب بنا دینا قدرۃ کا کام ہے۔ اسباب کا سارا سلسلہ قدرۃ کا بنایا ہوا ہے نہ یہ کہ قدرت اسباب کی بنائی ہوئی ہے دراس لئے قدرت تو اسباب پر حاکم ہوگی لیکن اسباب معاذ اللہ قدرت کے پاؤں میں کوئی زنجیر نہیں ڈال سکتے قرآن کریم نے بھی قدرت اور عادت میں فرق کیا ہے۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ

یہ تو اللہ کی قدرت اور ارادہ کا تفاوت ہوا۔ اب عادۃ کا بیان سنئے۔ فرماتے ہیں۔

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۝

یہی فطرت (نیچر) ہے جس پر خدا نے لوگوں کو پیدا کیا خدا کے (قانون) پیدائش کو کوئی بدل نہیں سکتا۔

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۝ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا ۝

خدا کی عادت میں تم ہرگز کوئی تبدیل و تغیر نہ پاؤ گے۔

سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ ۝

یہ خدا کی عادت ہے جو اپنے بندوں کے متعلق پہلے سے چلی آتی ہے۔

یہ غیر متبدل سنۃ اللہ عادۃ اللہ ہے بس معلوم ہوا کہ عادت اور قدرت میں فرق ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ کوئی شخص ہمیشہ عمامہ باندھنے کا عادی ہے یا کوئی ہمیشہ چاول کھاتا ہے۔ یہ تو اس کی عادت ہوگی مگر باوجود اس کے بھی وہ ٹوپی اوڑھنے یا روٹی کھانے پر قادر ہے اسی کا نام قدرت ہے ہر انسان اپنے اندر اس بات کو پاتا ہے۔ مثلاً لڑکا اپنے ناتوان باپ کو مار سکتا ہے (یہ اس کی قدرت ہے) مگر نہیں مارتا یہ اس کی عادت ہے۔

عادت عامہ و خاصہ

ہاں عادت میں بھی تفصیل ہے ایک عادت عام غیر موقت اور مستمر

ہوتی ہے ایسی عادت سے ہر خاص و عام واقف ہو جاتا ہے اسی کو نقل کیا جاتا ہے۔ مثلاً ایک طالب علم مدرسہ میں داخل ہوا اور اساتذہ کی عام عادت دیکھی تو وہ یہاں سے جاکر اسی عادت کو نقل کرے گا جو مدت قیام میں روزمرہ مشاہدہ کرتا رہا ہے دوسری عادت موقت یعنی خاص وقت کے ساتھ مخصوص ہوتی ہے اس کو عادت خاصہ کہنا چاہیئے مثلاً کوئی ہمیشہ روٹی کھاتا ہے مگر عید کے روز ہمیشہ چاول کھایا کرتا ہے پس جس شخص نے اس کو عید کے روز چاول کھاتے نہ دیکھا ہو وہ کہیگا کہ چاول کھانا اس کی عادت نہیں مگر جس نے دس بیس مرتبہ عید کی عادت بھی دیکھی ہے وہ کہیگا کہ روٹی کیطرح چاول کھانا بھی اس کی عادت میں داخل ہے ایک، عام مستمر عادت ہے دوسری خاص موقت۔ دونوں اپنے اپنے خیال اور تجربہ کے موافق درست کہتے ہیں۔ مگر دوسرے کا کہنا مطابق واقعہ ہے اس لئے کہ اس کو اس شخص کے تمام زمانے پر نظر ہے وہ جیسا عادت عامہ سے واقف ہے ویسا ہی عادت خاصہ سے بھی آگاہ ہے۔ یاد رکھو جس کا نام ہم معجزہ رکھتے ہیں وہ بھی ایک فعل اللہ تعالیٰ کا ہے جو اس کی عام عادت کے گو خلاف ہو مگر عادت خاصہ کے خلاف نہیں ہوتا بلکہ اس کے مطابق اور موافق ہوتا ہے کیونکہ خاص خاص اوقات اور خاص خاص مصلحتوں کے وقت عام عادت کے توسط کو چھوڑ کر محض قدرت سے خوارق اور معجزات کا ظاہر کرنا یہ بھی اللہ تعالیٰ کی خاص عادت ہے مثلاً ایک آدمی کو ہم نہایت متحمل مزاج۔ حلیم الطبع سمجھتے ہیں کہ ہزار گالیاں سننے پر بھی غصہ نہیں آتا، مگر اس کی طبیعت میں یہ بھی ہے کہ مذہب پر اگر کوئی حملہ کر دے تو باوجود اسقدر بردباری کے

غصہ سے بیتاب ہو کر آپے سے باہر ہو جاتا ہے کیا اس کی عادت نہیں سمجھی جائیگی اللہ تعالیٰ کی عام عادت ہے کہ اسباب سے مسببات کو پیدا کرتا ہے لیکن یہ بھی اس کی عادت ہے کہ جب اپنے مقربین (انبیاء کرام) کی تصدیق کرانا ہوتی ہے تو ان کے ہاتھوں پر وہ علامات ظاہر کرتا ہے جس سے لوگ سمجھیں کہ بیشک یہ اس کے مقربین اور معتمد خاص ہیں جن کے دعوٰی کی تصدیق کے لئے وہ خلاف معمول چیزیں پیش کر کے ساری مخلوقات کو اس کی مثل لانے سے عاجز کر دیتا ہے اور یہی ہونا بھی چاہیئے عقل اور فطرۃ کا اقتضا بھی یہی ہے کہ خدا اپنے خاص بندوں کے ساتھ وہ معاملہ کرے جو دوسروں سے نہ کرے کیا ایک گاؤں کے مکھیا یا نمبردار کے کہنے سے وائسرے وہ کام کر سکتا ہے جو کہ ایک صوبہ کے گورنر کے کہنے سے کرتا ہے؟ ماں، باپ، بیوی، احباب، اقارب، حکام، رعایا غرض ہر ایک کے ساتھ انسان کا معاملہ اور اس کی عادت جداگانہ ہوتی ہے جو ثابت کرتی ہے کہ یہ حاکم ہے یہ محکوم ہے، اور یہ باپ ہے، اور یہ لاڈلا بیٹا ہے۔ بسا اوقات جو بے تکلفی یا خلاف طبع امور کا تحمل آدمی اپنے مخلصوں اور دوستوں کی رعایت سے کر لیتا ہے وہ ہرگز ساری دنیا کے دباؤ سے نہیں کر سکتا۔ ایک استاد کا خاص خاص شاگردوں کے ساتھ جو معاملہ ہوتا ہے وہ تمام طلبہ سے مستثنٰے ہوتا ہے۔ ان سب چیزوں میں عام عادت سے علیحدہ معاملہ کرنا ہی قرین قیاس اور عقل و فطرۃ کے موافق ہے تاکہ قریب کا قریب اور بعید کا بعید ہونا لوگوں پر واضح ہو جائے اس امر کو ملحوظ رکھ کر میں یہ کہتا ہوں کہ معجزہ فطرۃ کا مقتضا ہے اسکے مخالف کیونکر ہو سکتا ہے بلکہ اگر معجزات ظاہر نہ ہوں تو یہ حکمت کے خلاف ہوگا۔

سفاہت ہوگی ؎

گر فرق مراتب نہ کنی زندیقی

جو لوگ خدا کے یہاں وجیہ ہیں، اپنی جان، اپنی آبرو، ہتھیلی پر رکھ کر خدا کے لئے کھڑے ہوتے ہیں اور خدا ہی ان سے یہ دعویٰ کراتا ہے کہ آج تمہاری سب کی نجات میرے اتباع میں منحصر ہے ضرورت ہے کہ ان کی وجہ سے عام عادت سے بالاتر کارنامے خدا کی قدرت کے ظاہر ہوں جو کہ تمام دنیا کو اپنی نظیر پیش کرنے سے تھکا دیں اور تمام مخلوق کو عاجز کر دیں یہی معنی ہیں معجزہ کے یاد رکھئے کہ معجزہ خدا کا فعل ہوتا ہے۔ اس کو نبی کا فعل سمجھنا سخت غلطی ہے۔

معجزہ خدا کا فعل اور اس کی خاص عادت ہے

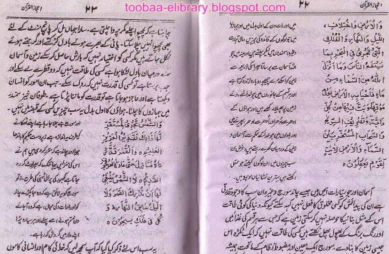
معجزہ قانون عادت عامہ کے خلاف اور عادت خاصہ کے موافق اللہ کا ایک فعل ہے جو کہ تمام مخلوق کو تھکا دینے اور عاجز کر دینے والا ہوتا ہے تاکہ تاکہ اللہ تعالیٰ سچے مدعی نبوت کا وہ رتبہ تمام جہان پر واضح کر دے جو کہ اس کے یہاں اسی کو حاصل ہے اور یہی حکمت کا اقتضا بھی ہے کیا میں اپنے بیٹے کے ساتھ جو عادت برتونگا وہی ایک عامی آدمی کے ساتھ بھی کرونگا؟ نہیں بلکہ جیسے تعلقات ہوتے ہیں ویسا ہی معاملہ ہوتا ہے پس ضروری ہے کہ اللہ کے ساتھ بھی جن کا جیسا تعلق ہو ویسا ہی ادھر سے معاملہ اور برتاؤ بھی ہو یہی معجزہ کی حقیقت ہے جس سے آجکل کے مادہ پرستوں کو اسقدر گھبرانے اور وحشت کھانیکی ضرورت نہیں۔

ہم نے خدا کو اس کے کاموں سے پہنچانا ہے

اس کے بعد ہمیں سوچنا چاہئے کہ وہ کیا چیز ہے جس نے ہم کو خدا کے ماننے پر مجبور کیا؟۔

(**جواب**) سو یہ بات ظاہر ہے کہ جب ہم کو مکونات میں مختلف افعال و آثار دیکھتے ہیں تو بعض ان میں سے ایسے ہیں جن کو ہم کسی سبب کی طرف منسوب کرتے ہیں چھت گری اور اس کے نیچے کوئی دب کر مر گیا۔ بجلی گری اور کوئی شخص جل گیا اور بعض ایسے ہیں جن کو کسی سبب کی طرف منسوب نہیں کر سکتے جیسے کسی پر بجلی گری، مگر نہیں مرا یا چھت گری مگر وہ زندہ نکلا اس قسم کے واقعات کو کسی چیز پر محول نہیں کرتے بلکہ کہتے ہیں کہ محض خدا کی قدرت سے ایسا ہوا کیونکہ یہاں بظاہر اسباب کا سلسلہ اسی واقعہ کے مخالف تھا۔ چاند سورج کو گہن لگتا ہے اس کا سبب بیان کیا جاتا ہے بارش برستی ہے اس کا سبب بیان کرتے ہیں لیکن اسباب کا سلسلہ ضرور کہیں نہ کہیں مجبوراً بند کیا جاتا ہے اور وہاں پہنچ کر اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ یہ چیزیں قدرتی ہیں غرض قدرتی چیزیں وہ کہلاتی ہیں جن کا بنانا تمام مخلوق کی قدرت سے باہر ہو اور جس کو دیکھ کر لامحالہ ایک قادر مطلق کا اقرار کرنا پڑتا ہے اسی لئے حق تعالیٰ نے ایسی اشیاء کے وجود سے اپنے وجود پر استدلال فرمایا ہے قرآن عزیز میں فرماتے ہیں:۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ — بلاشبہ آسمانوں کے اور زمین کے پیدا کرنے



وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝

میں اور رات دن کے اول بدل میں اور جہازوں میں جو لوگوں کے فائدہ کی چیزیں (مال تجارت وغیرہ) سمندروں میں لیکر چلتے ہیں اور مینہ میں جو اللہ آسمان سے برساتا پھر اسکی ذریعہ سے زمین کو اسکے مرے پیچھے دوبارہ زندہ کرتا ہے اور ہر قسم کے جانوروں میں جو خدا نے روئے زمین پر پھیلا رکھے ہیں اور ہواؤں کے ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر پھیرنے میں اور بادلوں میں جو خدا کے حکم سے آسمان و زمین کے درمیان گھرے رہتے ہیں (غرض ان سب چیزوں میں) ان لوگوں کیلئے جو عقل رکھتے ہیں بہترین نشانیاں موجود ہیں۔

آسمان اور جو سیارات اس میں ہیں جیسے چاند سورج وغیرہ ان سب کا وجود قدرتی ہے ان کی پیدائش کو کسی مخلوق کا فعل نہیں کہہ سکتے کیونکہ دنیا کی کوئی طاقت اس کے مثل بنانیکا حوصلہ نہیں کر سکتی زمین ہے کہ جس سے ہر قسم کی غذائیں اور رنگ برنگ کے پھول پھل نکلتے ہیں کسی کی طاقت نہیں کہ ایک ٹکڑہ اس جیسی زمین کا بنادے۔ سورج ایک معین اور مضبوط نظام کے ماتحت ہمیشہ دن کو نکلتا ہے شام کو غروب ہو جاتا ہے کسی کی کیا طاقت ہے کہ اس کو ایک منٹ یا ایک سکنڈ کیلئے روک لے۔ ہوا ہے کہ اس پر کسی کا قابو نہیں انسان

چاہتا ہے کہ پچھوا چلے مگر پروا چلتی ہے۔ سارا جہاں مل کر پانچ منٹ کے لئے بھی پچھوا نہیں چلا سکتا۔ پانی کے بھرے ہوئے بادل کڑکتے اور گرجتے ہوئے نکل جاتے ہیں مگر کسی کو اختیار نہیں کہ بارش حاصل کر سکے زمین و آسمان کے درمیان بادل اٹکا ہوا ہے کسی کی طاقت نہیں کہ دو قطرے لے سکے اور جب برستا ہے تو کسی کی قدرت نہیں کہ روک سکے۔ جب ان امور کو انسان دیکھتا ہے اور عاجز ہو جاتا ہے تو قدرت کو ماننا پڑتا ہے۔ طوفان خیز سمندر میں جہازوں کا چلنا۔ ہواؤں کا اول بدل یہ سب چیزیں کسی کے قبضہ میں نہیں۔

وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۝ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ ۝ لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ؕ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ۝

اور سورج ہے چلا جا رہا ہے اپنے ٹھکانے کیطرف یہ اندازہ ہے زبردست حکیم کا باندھا ہوا اور چاند ہے کہ مقرر کر دی ہیں ہم نے اس کی منزلیں یہاں تک کہ پھر لوٹ کر رہ جاتا ہے کھجور کی پرانی ٹہنی کی طرح نہ تو سورج کو یہ لائق ہے کہ وہ جا پکڑے چاند کو اور نہ رات کی مجال ہے کہ وہ آجائے دن ختم ہونے سے پہلے اور ہر سیارہ پڑا اپنے مدار میں گردش کر رہا ہے۔

یہ سب اس لئے ذکر کیا گیا کہ آپ سمجھ لیں کہ خلائی کام اور انسانی کاموں میں کس طرح تمیز ہوتی ہے خلائی کام وہ کہلاتا ہے کہ اس جیسا کرنے سے سب مخلوق عاجز ہو ازل و ابد کے انسانوں کو بلاؤ لیکن کوئی نہ کر سکے۔ یہی استدلال

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی کیا تھا۔ پہلے حیات اور ممات کے متعلق سوال کیا جب اس میں مخاطب (نمرود) کی عبادت دیکھی تو فرمایا۔ اِنَّ اللّٰہَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِیْ کَفَرَ۔ میرا رب ایک قاعدہ سے ایک ضابطہ سے شمس کو چلاتا ہے خدائی کام وہ کہلاتا ہے کہ دنیا میں کوئی طاقت اس کا مقابلہ نہ کر سکے۔

خدائی کام کی طرح خدائی کلام کو بھی سمجھنا چاہیئے

ٹھیک اسی طرح خدائی کلام وہ ہے کہ ساری دنیا اس جیسا کلام بنانے سے عاجز اور درماندہ ہو۔ ساری دنیا کو للکارا جائے، غیرتیں دلائی جائیں مقابلہ کے لئے کھڑا کیا جائے اور لوگ چاہیں کہ کسی طرح یہ روشنی بجھ جائے مگر پھر بھی ویسا کلام بنا کر نہ لا سکیں تو ہم سمجھیں گے کہ یہ خدا کا کلام ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح خدائی کاموں کو بندوں کے کاموں سے الگ کر کے پہچان سکتے ہیں۔ کیونکہ ان دونوں میں بیّن اور واضح فرق ہوتا ہے۔ گلاب خدا کا بنایا ہوا ہے۔ اب تم بھی کاغذ کے پھول بناتے ہو، مگر تمہارے پھول پر پانی کا ایک چھینٹا پڑ جاتا ہے تو آپ کی صنعت کا سارا پول کھل جاتا ہے۔ لیکن قدرتی پھول پر پانی گرتا ہے تو اس میں اور زیادہ صفائی اور تازگی محسوس ہوتی ہے۔

معجزہ کوئی فن نہیں

بلاشبہ خدائی کام اور بندوں کے کام میں نمایاں امتیاز ہوتا ہے، خدائی کام کی

نقل بندہ اتارتا ہے لیکن عاقل کو کبھی التباس بھی نہیں ہو سکتا۔ انسان جانداروں درختوں، پھولوں کی تصویر کھینچ لیتا ہے مگر ایک مچھلی کی آنکھ ایک مکھی کا پر ایک مچھر کی ٹانگ، بلکہ ایک جو کا دانہ تمام عالم مل کر بھی نہیں بنا سکتا لاکھوں مجسمے، کروڑوں بیل بوٹے دنیا کے صناع بناتے ہیں مگر مچھر کا ایک پر بنانے سے بالکل عاجز ہیں۔

لَنْ یَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ۝	کبھی نہیں ہو سکتا کہ وہ پیدا کر لیں ایک مکھی کو اگر چہ وہ سب کام کیلئے اکٹھے ہو جائیں۔
اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسْتَحْیٖۤ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۝	اللہ محجوب نہیں ہوتا اس سے کہ بیان کرے مثال مچھر کی اور اس سے بھی زیادہ مکتر اور حقیر چیز کی۔

اسی کا نام خدائی فعل ہے اور جب ایسا فعل بدوں ان اسباب کے جو کہ اس کے تکون کے لئے متعارف ہیں کسی مدعی نبوت کے ہاتھوں پر ظاہر ہو تو اسی کا نام معجزہ ہو جاتا ہے خواہ وہ جنس افعال سے ہو یا جنس اقوال سے اور جب کہ یہ ثابت ہوا کہ معجزہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہے جو بدون تعاطی اسباب کے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ تو دوسرے خدائی کاموں کی طرح اس میں بھی کسی صانع کی صنعت کو دخل نہ ہو سکے گا۔ پس تنجیم، کہانت مسمریزم، سحر شعبدہ کی طرح معجزہ کوئی فن نہیں ہے جو کہ تعلیم و تعلم سے حاصل ہوتا ہو۔ یہ فنون سیکھنے سکھانے سے حاصل ہو سکتے ہیں لیکن معجزہ میں نہ تعلیم و تعلم ہے نہ انبیاء کا کچھ اختیار اس میں چلتا ہے نہ معجزہ صادر کرنے کا کوئی خاص ضابطہ اور قاعدہ ان کو معلوم ہے کہ

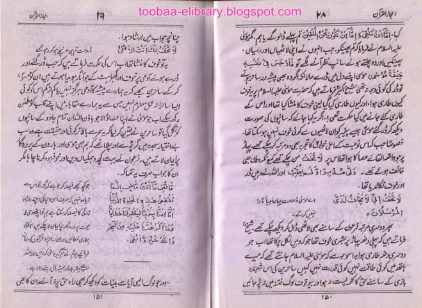
جب چاہیں ویسا ہی عمل کر کے ویسا ہی معجزہ دکھلا دیا کریں۔ بلکہ جس طرح ہم قلم لے کر لکھتے ہیں اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ قلم لکھتا ہے اور فی الحقیقت اس کو لکھنے میں کوئی اختیار نہیں ہوتا یہی صورت معجزہ کی بھی ہے۔ ایسا نہیں کہ انبیاء جس وقت چاہیں مثلاً انگلیوں سے پانی کے چشمے جاری کر سکیں۔ بلکہ جس وقت اللہ کی حکمت بالغہ مقتضی ہوتی ہے تو جاری ہو سکتی ہیں۔ برخلاف ان فنون کے جو تعلیم و تعلم سے حاصل کئے جاتے ہیں ان میں جس وقت چاہیں قواعد مقررہ اور خاص خاص اعمال کی پابندی سے یکساں نتائج اور ایک ہی طرح کے آثار و کیفیات دکھلائے جا سکتے ہیں مگر آج تک مدعیان نبوت و اعجاز کی طرف سے کوئی درسگاہ معجزہ سیکھنے سکھانے کی نہ بنی نہ کوئی قاعدہ اور ضابطہ منضبط ہوا۔ نہ کوئی کتاب تنجیم۔ مسمریزم کی طرح معجزات سکھلانیوالی تصنیف کی گئی بلکہ وہ خدا کا فعل ہے جو تمام دنیا کو تھکا دیتا ہے اگر وہ فعل ہے تو اس جیسے فعل سے دنیا عاجز ہے اور اگر اقوال میں سے ہے تو اس جیسے کلام سے تمام دنیا کے بولنے والے مجبور اور درماندہ ہیں، رسول کے اختیار یا قدرت کو بھی اس میں کوئی دخل نہیں اسی واسطے انبیاء سے جب معجزات طلب کئے گئے تو انہوں نے اللہ پر محول کیا فرماتے ہیں۔

وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى	اور وہ تم سے کہتے ہیں کہ ہم تو اس وقت تک
تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا	تم پر ایمان لانیوالے ہی نہیں کہ یا تو ہمارے
اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ	لئے زمین سے کوئی چشمہ بہا نکالو، یا کھجوروں
نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ	اور انگوروں کا تمہارا کوئی باغ ہو اور اسکے

خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ۝ اَوْ تُسْقِطَ	بیچ میں تم بہت سی نہریں جلدی کر دکھاؤ
السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا	یا جیسا تمہارا خیال ہے آسمان کے ٹکڑے
كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ	ہم پر لا گراؤ اور خدا اور فرشتوں کو ہمارے سامنے
وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ۝ اَوْ	لا کھڑا کر دو۔ یا رہنے کیلئے تمہارا طلائی گھر ہو
يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ	یا آسمان پر چڑھ جاؤ اور جب تک تم وہاں سے
زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي	ایک کتاب اتار کر نہ لاؤ کہ ہم آپ اس کو پڑھ بھی
السَّمَآءِ وَلَنْ نُّؤْمِنَ	لیں ہم تمہارے چڑھنے کو بھی باور کرنیوالے نہیں
لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ	کہدو (اے محمد صلعم) کہ میں رسول تو ہوں مگر بشر
عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ	رسول ہوں، خدا نہیں ہوں (یعنی معجزہ تو بشر کا
قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ	فعل نہیں ہے، خدا کا فعل ہے (میرے قبضہ
كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا	میں یہ نہیں کہ جو تم چاہو تمہیں دیدوں، بلکہ جس
رَّسُوْلًا ۝	قدر خدا میری تصدیق کی علامات کے طور پر کافی
	اور مناسب جانتا ہے ظاہر کرتا ہے۔)

معجزہ کچھ ایسے حالات کیساتھ آتا ہے کہ اس میں شبہ کی گنجائش نہیں رہتی

جب موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو دعوت دی اور معجزہ دکھلانیکے لئے عصا ڈالا اور وہ اژدہا بن گیا اس کا جواب دینے کے لئے فرعون نے بڑے بڑے ساحروں کو جمع کیا اور وہ بھی موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں اپنی لاٹھیاں اور رسیاں لے کر پہنچ گئے وہ سمجھے ہوئے تھے کہ موسیٰ بھی ہمارے ہم پیشہ ساحر ہیں اسی لئے



کہا۔ اِمَّآ اَنۡ تُلۡقِیَ وَ اِمَّآ اَنۡ نَّکُوۡنَ نَحۡنُ الۡمُلۡقِیۡنَ تم پہلے ڈالو گے یا ہم۔ مگر موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تم پھینکو۔ جب انہوں نے اپنی لاٹھیاں اور رسیاں، پھینکیں اور وہ چلتے ہوئے سانپ نظر آنے لگے تو فَاَوۡجَسَ فِیۡ نَفۡسِہٖ خِیۡفَۃً مُّوۡسٰی) موسیٰ اپنے دل میں ڈرے حالانکہ اگر وہ بھی پیشہ ور ساحر ہوتے تو ڈر کی کوئی وجہ نہ تھی شیخ اکبرؒ فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر یہ خوف کیوں طاری ہوا، اور کیوں طاری کیا گیا یعنی خوف کا منشا کیا تھا اور اس کے طاری کئے جانے میں کیا حکمت تھی؟۔ اگر یہ کہا جائے کہ سانپوں کی صورت دیکھ کر ڈر گئے موسیٰ جیسے پیغمبر کو ان لاٹھیوں سے کوئی خوف نہیں ہو سکتا تھا۔ خصوصًا جب کہ اس نوعیت کے اعلیٰ خوارق کا تجربہ بھی دو مرتبہ کر چکے تھے۔ پہاڑ پر جو واقعہ القائے عصا کا ہوا تھا اس پر لَا تَخَفۡ سن چکے تھے کیونکہ وہاں بھی خائف ہوگئے تھے۔ وَلّٰی مُدۡبِرًا وَّ لَمۡ یُعَقِّبۡ اور اللہ تعالیٰ نے ڈر اور خوف نکال دیا تھا۔

لَا تَخَفۡ اِنِّیۡ لَا یَخَافُ لَدَیَّ الۡمُرۡسَلُوۡنَ ۝ — اے موسیٰ ڈرو مت یہاں انبیاء ڈرا نہیں کرتے۔

پھر دوسری مرتبہ فرعون کے سامنے بھی لاٹھی ڈال کر دیکھ چکے تھے۔ شیخؒ فرماتے ہیں کہ پہلی دفعہ پہاڑ پر بشری خوف تھا جو کہ وہیں نکل چکا تھا اب جو دوسری دفعہ طاری ہوا یہ اس وجہ سے کہ موسیٰ علیہ السلام جانتے تھے کہ میرے ہاتھ میں کوئی طاقت نہیں کوئی قدرت نہیں کہیں ساحرین کی اس شعبدہ بازی کے سامنے حق کا کلمہ پست نہ ہو اور بیوقوف لوگ فتنہ میں نہ پڑ جائیں

چنانچہ جواب میں ارشاد ہوا۔

لَا تَخَفۡ اِنَّکَ اَنۡتَ الۡاَعۡلٰی — ڈرو مت تم ہی اونچے ہو کر رہو گے

یہ تو خوف کا منشا تھا اب اس کی حکمت فرماتے ہیں کہ جب ڈر گئے اور ڈرے ہوئے آدمی پر خوف اور گھبراہٹ کے جو آثار ہویدا ہوتے ہیں ان کو محسوس کر کے ساحرین سمجھے کہ یہ ہمارے پیشہ کا آدمی ہرگز نہیں یا کم از کم اس کو کوئی ایسا ساحرانہ عمل معلوم نہیں جس سے یہ ہمارے مقابلہ میں اپنے قلب کو مطمئن رکھ سکے اب جو موسیٰ نے اپنا عصا ڈالا جو باذن اللہ ان تمام جادو کے سانپوں کو نگل گیا تو ساحرین نے یقین کر لیا کہ یہ سحر سے بالاتر کوئی اور حقیقت ہے وہ سب بے اختیار سجدہ میں گر پڑے اور چلا اٹھے کہ ہم بھی موسیٰ اور ہارون کے پروردگار پر ایمان لاتے ہیں۔ فرعون نے بہت کچھ دھمکیاں دیں اور خوفزدہ کرنا چاہا مگر ان کا جواب صرف یہ تھا کہ۔

فَاقۡضِ مَاۤ اَنۡتَ قَاضٍ ؕ اِنَّمَا تَقۡضِیۡ ہٰذِہِ الۡحَیٰوۃَ الدُّنۡیَا ؕ اِنَّاۤ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِیَغۡفِرَ لَنَا خَطٰیٰنَا وَ مَاۤ اَکۡرَہۡتَنَا عَلَیۡہِ مِنَ السِّحۡرِ ؕ وَ اللّٰہُ خَیۡرٌ وَّ اَبۡقٰی ۔

جو کچھ تجھے فیصلہ کرنا ہے کر گزر تو اس سے زیادہ نہیں کر صرف اسی دنیا کی (چند روزہ) زندگی کا فیصلہ کر سکتا ہے ہم تو اپنے سچی لازوال پروردگار پر ایمان لا چکے ہیں۔ ہم کو ہماری خطائیں اور ان ساحرانہ حرکتوں کو معاف فرمائیے جو تم نے ہم سے زبردستی کرائیں اور اللہ سب سے بہتر ہے اور ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔

اور جو لوگ ایسی آیات بینات کو دیکھ کر بھی راہ حق پر نہ آسکے ان کا بھی

حال یہ تھا۔

وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا	انہوں نے ہماری آیات کا انکار کیا ظلم سے زیادتی سے حالانکہ ان کے دلوں کو سچائی کا پورا پورا یقین حاصل تھا۔

خود فرعون کو خطاب کر کے حضرت موسیٰؑ فرماتے ہیں۔

لَقَدْ عَلِمْتَ مَا أَنْزَلَ هٰؤُلَاءِ إِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ بَصَائِرَ وَإِنِّي لَأَظُنُّكَ يَا فِرْعَوْنُ مَثْبُورًا	تو خوب جانتا ہے کہ یہ آیات آسمان و زمین کے پروردگار کے سوا کسی نے نہیں اتاری اور فرعون بیشک میں تجھے سمجھتا ہوں کہ تو اس علم کے باوجود ہلاکت میں گر چکا ہے

معجزہ میں دعوئ نبوت کی شرط کیوں لگائی گئی

معجزہ میں دعویٰ کی شرط بھی کی گئی ہے یعنی نبوت کا دعویٰ بھی کرے اس کی وجہ یہ ہے کہ سب فرقے مانتے ہیں کہ خدا سب سے زیادہ سچا ہے۔ وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيلًا اور جھوٹ کے نقص سے اس کی ذات پاک ہے تو میں کہتا ہوں کہ جھوٹ کبھی تو اس طرح ہوتا ہے کہ ایک شخص خود خلاف واقع بات کہے اور کبھی اس طرح کہ جھوٹی بات جو دوسرے نے کہی ہے اس کی تصدیق کر دے پھر تصدیق بھی دو طرح سے ہوتی ہے کبھی زبان سے کبھی عمل سے اور یہ عملی تصدیق بسا اوقات قولی تصدیق سے بڑھ کر مؤثر ہوتی ہے جیسے ایک شخص بادشاہ کی مجلس میں یہ کہتا ہے کہ بادشاہ کو میرے ساتھ خاص الفت یا رعایت ہے میں اس کا

معتمد خاص ہوں جو میں کہوں گا بادشاہ ضرور تسلیم کرے گا اور یہ اس کے دعاوی بادشاہ مجلس میں خود سن رہا ہوں اس کے بعد وہ شخص اپنے دعوے کو ثابت کرنے کے لئے بادشاہ سے کہتا ہے کہ فلاں شخص کو خط لکھ دیجئے فلاں حاکم کو معزول کر دیجئے، فلاں امیدوار کو عہدہ دیدیجئے۔ پھر کہتا ہے کہ آپ ذرا کھڑے ہو جائیے، پھر کہتا ہے کہ آپ بیٹھ جائیے، اور بادشاہ بھی ازراہ مہربانی اپنے عام ضابطہ اور عادت کے خلاف اس کے کہنے کے موافق کرتا چلا جاتا ہے۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ بادشاہ نے اسکی قول کی عملی تصدیق کر دی جو کہ قولی تصدیق سے بہت بڑھ چڑھ کر ہے، اگر بادشاہ قول سے تصدیق کرتا تو شاید اتنا موثر نہ ہوتا۔ اتنی بات اس مثال میں ضرور ہے کہ بادشاہ ایک انسان ہے، وہ جھوٹی تصدیق بھی کر سکتا ہے۔ مگر اللہ جل شانہٗ کے یہاں جھوٹ اور کذب کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔

معجزہ نبوت کی فعلی تصدیق ہے

پس جو نبی دعویٰ کرتا ہے کہ میں نبی ہوں، اگر میری بات سنو گے مانو گے تو نجات ہے ورنہ عذاب مخلد میں گرفتار ہو جاؤ گے۔ نجات کا راستہ منحصر ہے میری متابعت میں۔ اور یہ دعویٰ اللہ کے سامنے کرتا ہے۔ اللہ کی زمین پر اور اس کے آسمان کے نیچے باآواز بلند کہتا ہے کہ میری متابعت کے بغیر کوئی راستہ نجات کا نہیں ہے۔ اور اس کی یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ اللہ جل شانہٗ میرے ہاتھوں اور زبان سے وہ چیزیں ظاہر فرمائے گا جو اسکی عام عادت کے خلاف ہوں گی اور دنیا ان کی مثال لانے سے عاجز ہو گی پھر

اس کے موافق مشاہدہ بھی کیا جارہا ہو تو یہ خدا کی جانب سے عملاً اسکے دعویٰ کی تصدیق ہے درحقیقت معجزہ نبی کے دعویٰ کی عملی تصدیق ہوتی ہے۔ اور اللہ چونکہ جھوٹی تصدیق نہیں کرسکتا۔ لہٰذا نبی کا دعویٰ معجزہ کے ظہور کے بعد سچا ثابت ہوجاتا ہے۔ اسی لئے ہم بلاخوف تردید یہ یقین رکھتے ہیں کہ خداوند قدوس جو کہ تمام سچائیوں کا سرچشمہ ہے کسی انسان کو یہ دسترس نہ دے گا کہ وہ نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرکے ایسے خوارق عادات دکھلائے کہ دنیا اس کے مقابلہ سے عاجز ٹھہرے جس کا جی چاہے اب بھی اس ضابطہ کا امتحان کردیکھے۔ ضرور ہے کہ خدا ایسے حالات بروئے کار لائے گا کہ اس کی طرف سے جھوٹے کی عملی تصدیق نہ ہونے پائے۔

فعلی تصدیق کی مثال

آپ جلسوں میں دیکھتے ہیں اور کونسلوں اور پارلیمنٹوں کا حال سنتے ہیں کہ جب کسی مسئلہ پر کسی تجویز پر کسی انتخاب پر بحث ہوجاتی ہے تو ایک طرف سے محرک اپنی تحریک پاس کرانے کیلئے حضار کے سامنے بسط سے دلائل بیان کرتا ہے اور دوسری طرف تردید کرنے والا اس کے تردیدی دلائل مفصلاً سامنے رکھتا ہے اس ردوکد کے بعد فیصلہ کی صورت یہ ہوتی ہے کہ رائے لیجائے جس کی صورت یہ ہے کہ ہاتھ اٹھوائے جاتے ہیں اور یہی ہاتھ اٹھا دینا یا نہ اٹھانا اس ریزولیوشن کی تصدیق و تائید یا تکذیب و تردید کیلئے کافی سمجھا جاتا ہے زبان ہلانے کی قطعاً ضرورت نہیں ہوتی ایک شخص کی

نسبت پبلک جلسہ میں رائے لیجاتی ہے کہ آیا اس پر جمہور کو اعتماد ہے ؟ اس پر ہاتھ اٹھادیے جاتے ہیں یہ ہی علامت ہوتی ہے اس بات کی کہ ان سب کی رائے اس شخص کے حق میں ہے ہم دن رات میں سینکڑوں دفعہ اپنے ہاتھ اوپر کو اٹھائیں اس کو کسی چیز کے ثابت کرنے یا نہ کرنے میں کوئی دخل نہیں۔ لیکن یہی ہمارا ہاتھوں کی وضع طبعی اور ہیئت اصلی کے خلاف اوپر کو اٹھادینا۔ جب کسی ریزولیوشن کی تسلیم و انکار یا کسی دعوی کی صحت و بطلان کی آزمایش کے موقعہ پر ہو تو کسی غبی سے غبی انسان کو بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی اس وقت ان کھڑے ہوئے ہاتھوں ہی کے شمار سے رایوں کا شمار کرلیا جاتا ہے اور پھر بڑے نازک اور عظیم الشان مسائل کے فیصلے ہاتھ کی اس غیر طبعی حرکت پر بیچون وچرا ہوجاتے ہیں پس جس طرح ہاتھوں کا نیچے لٹکائے رکھنا آدمی کی عام عادت اور وضع طبعی کے موافق ہے اور اوپر کو اٹھانا کبھی کبھی خاص ضرورت اور مصلحت سے ہوتا ہے اور یہی غیر طبعی وضع جب کسی ریزولیوشن پر ووٹ لینے کے وقت اختیار کی جائے تو اس ریزولیوشن یا دعوے کی بیشک و شبہ تصدیق و تائید سمجھی جاتی ہے ٹھیک اسی طرح حق تعالیٰ شانہٗ کا جو فعل سنن طبعیہ کے سلسلہ میں ظہور پذیر ہو وہ اس کی عام سنۃ اور عادت کہلاتی ہے اور جو اسباب سے علیحدہ ہوکر کسی خاص مصلحت اور حکمت کے اقتضاء سے ظاہر ہو وہ خرق عادت ہے اور یہی خرق عادت جب کسی شخص کے دعوی نبوۃ اور تحدّی کے بعد اُس سے یا اُس کے کہنے کے موافق صادر ہو یہ معجزہ ہے جو کہ من اللہ اس کے دعوی کی فعلی تصدیق ہے اور میں کہہ چکا ہوں کہ حق تعالےٰ کسی

جھوٹے کی قولاً یا فعلاً تصدیق نہیں کر سکتا لہٰذا ہم کو ایسے مدعی کے دعوے میں شک کرنے کا کوئی حق نہیں۔

وحی کی تعریف اور ضرورت

اللہ تعالیٰ کا خطاب کسی ایسے شخص سے جس کے دعوے نبوت کی تکذیب کے لئے کوئی صحیح علامت نہ پائی جاتی ہو اس کا نام وحی ہے، وحی اصولی طور پر قریب قریب یکساں ہے یعنی نفس فعل میں کوئی اختلاف نہیں، البتہ کل مشکک کے طور پر وحی کے مراتب اور درجات ہیں جب سے دنیا پیدا ہوگی اس وقت سے بندوں کو ہدایت کی ضرورت ہے یعنی انسان میں یہ معلوم کرنے کی ایک طبعی اور فطری خواہش ہے کہ کن خیالات اور اعمال سے اس کو اللہ کا قرب حاصل ہو سکتا ہے جیسے کہ انسان کو بھوک لگتی ہے غذا کی خواہش میں مضطر اور بیتاب ہو کر انتڑیاں سکڑنے لگتی ہیں۔ پیاس لگتی ہے۔ پانی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے زبان سوکھ جاتی ہے جس طرح حق تعالیٰ نے فطری طور پر بندہ کو بھوک یا پیاس لگائی اسی طرح ایک اور بھوک اور پیاس روحانی بھی لگا دی ہے جو وصول الی اللہ اور معرفت کی ہے اور یہ پیاس اور بھوک بھی فطری ہے مذاہب اور امکنہ و ازمنہ کا اختلاف اس فطرۃ پر کوئی اثر نہیں ڈال سکا مسلمان آریہ، ہندو، عیسائی، یہود، مجوس ایک چیز کی تلاش میں ہیں البتہ بعضوں کا راستہ غلط ہے مگر مقصد ایک ہے یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہدایت کی خواہش، سچائی کی تلاش، وصول الی اللہ، معرفت ربانی اور اللہ سے نزدیک

ہونے کی تمنا ایک چیز ہے جو کہ انسان کے لئے فطری اور طبعی امور میں سے ہے۔

وحی کی ضرورت سے انکار کرنیوالوں کی مثال

ہاں جب کبھی جیسا کہ آدمی بیمار ہو جاتا ہے تو بھوک پیاس جیسے فطری اور طبعی امور بھی اس سے کنارہ کر لیتے ہیں ٹھیک اسی طرح وہ ملاحدہ جو کہ دنیا کی زندگی اور لذات میں محو ہو چکے ہیں شاید اُن کو معرفت الٰہی کی بھوک اور روحانی پیاس نہیں رہتی ہے اور اسی لئے ایسے روحانی بیماروں کا وجود کسی خاص زمانہ یا مکان میں ایسی وبا کی کثرت ہماری فطری ہو چکے دعویٰ کو مخدوش نہیں کر سکتی

وحی کیطرف انسان کی احتیاج ضروری ہے

پس جس طرح حق تعالیٰ نے ہمارے جسمانی امور فطریہ کا انتظام کیا ہے۔ ہماری بھوک کیلئے غلہ زمین سے اگاتا ہے۔ پانی آسمان سے اُتارتا ہے ناممکن ہے کہ ہماری روحانی بھوک کیلئے کوئی انتظام نہ کرے بلکہ اُس کی رحمت کاملہ سے یقین ہے کہ جس طرح مادی حوائج و ضروریات کے لئے مادی سامان مہیا فرماتا ہے اُس سے زائد روحانی ضرورت کیلئے روحانی سامان ضرور مہیا کریگا۔ ظاہری پیاس کے بجھانے کیلئے جس طرح اُس نے پانی کے چشمے پیدا کئے ہیں۔ اسی طرح روحانی پیاس کے لئے روحانی چشمے ہونے چاہئیں اور وہ چشمے وحی الٰہی کے صاف اور شیریں چشمے ہیں اور اس بات کو آریہ سماج بھی مانتے ہیں اتنا فرق ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ جو کچھ سامان کرنا تھا وہ ابتدائے آفرینش ہی میں کیا جا

چکا ہے پھر بار بار اس میں تغیر و تبدیل یا تجدید اور تدریج کی ضرورت نہیں۔

نزولِ وحی میں تدریج

ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی عادت تکوینیات میں یہ ہے کہ وہ اگرچہ تمام اشیاء کو دفعۃً پیدا کرنے پر قادر ہے بتدریج ہی پیدا کرتا ہے۔

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ۔ اور کوئی چیز کیوں نہ ہو اس کے خزانے ہمارے پاس ہیں اور ہم اس کو اتارتے ہیں۔ ایک متعین اور جچی تلی مقدار میں۔

ہر چیز کو دفعۃً پیدا کرنا خدا کے لئے کچھ مشکل نہ تھا مگر ایسا نہیں کرتا۔ بلکہ درخت کا بیج ڈالو تو بتدریج ایک عرصہ کے بعد درخت بن جائیگا۔ زوجین کا قران ہوتا ہے مہینے گذرتے ہیں، مختلف اطوار و ادوار ہیں۔ بہت سے چکر ہیں تب بچہ بنتا ہے گو یکدم بنانے پر قادر تھا جس طرح تمام حیوانات کو پہلے بعد یکدم بناتا ہے اور اس کو ایسا امکان بھی نہ ہوتا لیکن عادت برخلاف ہے اب اگر کہو گے کہ یہ عادت کیوں ہے؟ تو ہم کہیں گے کہ مادہ میں استعداد ہی ایسی ہے پھر اگر کہو گے کہ ایسی استعداد کیوں ہے اس کا جواب گذر چکا ہے کہ ہر جگہ "کیوں" نہیں پوچھا جا سکتا بلکہ آخر میں ایک موحد یہی کہے گا کہ اللہ کے علم محیط میں یہی قرین مصلحت تھا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ کی عادت یہ معلوم ہوتی ہے کہ بہت سی اشیاء کو بتدریج بناتا ہے اور جن اشیاء کی نسبت ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ شاید دفعۃً پیدا ہو گئی ہوں جیسے چاند، سورج،

ستارے وغیرہ ان میں بھی باعتبار فیض رسانی اور دوسری اشیاء سے تعلق رکھنے کے تدریج اور تغیر و تجدید مشاہد ہے پس ہمارا خیال یہ ہے کہ جس طرح وقتاً فوقتاً ضرورت پیش آنے پر اللہ تعالیٰ بارش نازل کرتا رہتا ہے یہ نہیں کہ ایک ہی بارش ہمیشہ کی ضروریات کے لئے کافی ہو جائے پھر ضروری نہیں کہ ہر ایک بارش یکساں زمانہ تک کفایت کر سکے کبھی دو چار دس دن کے لئے روک تھام ہو جاتی ہے کبھی اتنی بارش ہوتی ہے کہ کئی ماہ تک ضرورت نہیں رہتی ٹھیک اسی طرح اقوام عالم کی ارواح و قلوب کی کھیتوں کو ابھارنے اور سرسبز کرنے کیلئے بھی اللہ تعالیٰ وحی و الہام کی بارش حسب ضروریات زمانہ اور حسب استعداد قلوب مختلف زمانوں میں کرتا رہا ہے کبھی تو وحی الٰہی کی بارش ایسے زور و شور کی ہوئی کہ قرنوں تک اس کی تری زمین سے نہ گئی اور کبھی تھوڑا سا ترشح کافی سمجھا گیا فَاِنْ لَّمْ یُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ۔ اسی طرح لگاتار چھوٹی بڑی بارشیں مختلف اقوام و ممالک پر ہوتی رہیں اور ہر ایک نے چھوٹی یا بڑی میعاد تک زمین والوں کی روحانی کھیتیوں کو سیراب کیا آخر ایک وقت آیا کہ خدا کی ساری زمین خشک اور پیاسی ہو گئی، ہدایت کے چشمے سوکھ گئے، چاروں طرف آگ برسنے لگی، بداعتقادیوں اور بداعمالیوں کی آندھیوں اور لو نے تمام روحانی کھیتیوں کو جھلس ڈالا۔ اس وقت بطحیٰ کے پہاڑوں سے ایک گھٹا اٹھی جو آخرکار ساری دنیا پر چھا گئی اور وحی الٰہی کی وہ موسلا دھار اور عالمگیر بارش ہوئی جس نے ایک مدت مدید تک دوسری بارش کی کوئی ضرورت باقی نہ چھوڑی۔ جبتک اس بارش کا کافی اثر باقی رہے گا۔ دوسری بارش نہ آئے گی۔ اسی

بارش کے پانی سے جو بڑے بڑے تالابوں اور نہروں میں جمع ہو گیا۔ وقتاً فوقتاً زمینوں کی آبپاشی ہوتی رہے گی۔ اور جب یہ پانی تمام ہو جائے گا۔ تو مخبر صادق کی خبر کے موافق یہ دنیا بھی ایک آخری سنبھالا لیکر داعی اجل کو لبیک کہے گی۔

أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمَاتٌ وَرَعْدٌ وَبَرْقٌ يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِم مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ وَاللَّهُ مُحِيطٌ بِالْكَافِرِينَ ۝ وفي الحديث قال رسول الله صلى الله عليه وسلم مثل ما بعثني الله به من الهدى والعلم كمثل الغيث الكثير اصاب ارضا فكانت منها طائفة طيبة قبلت الماء فانبتت الكلاء والعشب الكثير وكانت منها اجادب امسكت الماء فنفع الله بها الناس فشربوا وسقوا وزرعوا واصاب منها طائفة اخرى انما هي قيعان لا تمسك ماء ولا تنبت كلاء فذلك مثل من فقه في دين الله ونفعه ما بعثني الله به فعلم وعلم ومثل من لم يرفع بذلك رأسا ولم يقبل هدى الله الذي ارسلت به (متفق عليه)

یا ان منافقوں کا ایسا حال ہے، جیسے آسمانی بارش کہ اس میں اکٹھی طرح کے اندھیرے ہیں اور گرج اور بجلی موت کے ڈر سے مارے کڑک کے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونس لیتے ہیں، اور اللہ منکروں کو گھیرے ہوئے ہے اگر اس کی پکڑ سے کہیں نہیں نکل سکتے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے جو ہدایت اور علم دے کر مجھ کو خدا نے بھیجا ہے وہ ایک موسلا دھار بارش کی طرح ہے (جو خدا کی) زمین پر برسی پھر زمین کا ایک عمدہ (سیر حاصل) قطعہ تھا۔ جس نے بارش کے پانی کو قبول کر کے گھاس اور سبزہ اگایا۔ اور دوسرا قطعہ تھا (جہاں پیداوار کچھ کم نہیں ہوئی لیکن) اس نے پانی کو اپنے اندر روک رکھا جس سے لوگ منتفع ہوئے اور انہوں نے خود پیا اور جانوروں کو پلایا اور کھیتوں کو سیراب کیا (ان دونوں کے سوا) زمین کے ایک ایسے حصہ پر بھی بارش کا پانی پہنچا جو چٹیل اور شور تھی کہ نہ تو وہاں پانی رکتا ہے اور نہ گھاس اور سبزہ اگتا ہے تو سمجھ لو کہ پہلی مثال ہے اُس شخص کی جس نے دین کی سمجھ حاصل کی اور جو چیز خدا نے مجھ کو دی تھی اس نے اس کو نفع پہنچایا، اُس نے خود بھی وہ علم حاصل کیا اور دوسروں کو بھی سکھایا اور آخری مثال ہے اُس کی جس نے اس ہادی کی طرف گردن اٹھا کر دیکھا بھی نہیں اور نہ اس ہدایت کو قبول کیا جسے دے کر میں بھیجا گیا تھا۔

وحی کا تدریجی اور غیر تدریجی ہونا امکان میں داخل ہیں لیکن تدریجی ہونا عادت الٰہی کے موافق ہے

پہلے گذر چکا ہے کہ وحی اور الہام کی دو صورتیں ممکن ہیں یا بتدریج ہو یا دفعۃً پس ہمارے اصول کے موافق جب عدم محض سے دنیا کو پیدا کیا گیا اور آریوں کے نزدیک جب پرلے کے بعد دنیا موجود ہوئی اسیوقت سے آدمیوں کو الہام اور وحی کی ضرورت ہونی چاہیئے اس لئے کہ اُن کو اب زندگی بسر کرنی ہے اور معاش اور معاد کی درستی کے اسباب بہم پہنچانے ہیں جو بجز ایک ملہمانہ تعلیم کے متصور نہیں معرفت الٰہی کی روحانی پیاس جو ایک فطری امر ہے اور اپنے رب اور مالک حقیقی کو خوش رکھنے کی تمنا جس کا بیج بھی آدم کے قلوب میں ازل سے بکھیر دیا گیا ہے شروع ہی سے ایک ایسے صاف، شیریں اور روح پرور چشمہ کی تلاش میں ہے

جو تشنگان رضا مولیٰ کو سیراب اور ان کی روحانی کھیتیوں کو سرسبز شاداب کر سکے چنانچہ حق جل وعلا کی حکیمانہ رافت و رحمت ملاحظہ ہو کہ زمین کے آباد کرنے والے نے ابھی تک زمین پر قدم بھی نہیں رکھا تھا کہ پروردگار حقیقی نے اسے تمام ضروری چیزوں سے نام بنام واقف کر دیا۔

وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا اور آدم کو سب (چیزوں کے) نام بتا دیئے۔

بلاشبہ اگر ایسا نہ ہوتا تو بڑے تعجب کی بات تھی۔ جس خدائے رحمٰن نے ہماری پیدائش سے پیشتر ہماری مادی حوائج کا کافی انتظام کر دیا، زمین پیدا کی جس پر ہم کو بسنا اور کاروبار کرنا تھا اور اس کو ہر طرح کی غذاؤں اور اسباب زندگی کا ایک گودام بنا دیا چشمے اور دریا جاری کر دیئے، کنوؤں میں پانی کا ذخیرہ محفوظ کر دیا زندہ رہنے اور سانس لینے کے لئے تمام فضا میں ہوا پھیلا دی۔ آسمان کی مضبوط چھت میں کیسے درخشاں اور آنکھوں کی ذخیرہ کرنیوالی قندیلیں روشن کر دیں غرض علویات اور سفلیات کا ایسا انتظام قائم کیا کہ اس خاک کے پتلہ کو اپنی ضروریات میں اس سے نفع اٹھانا آسان ہو پھر کوئی وجہ نہ تھی کہ ایسا مہربان خدا ہماری روحی اور باطنی ضروریات کی طرف توجہ نہ فرماتا۔ اس نے ابتدا آفرینش سے ہی ہدایت کے چشمے جاری کئے، وحی اور الہام کی بارشیں وقتاً فوقتاً برسائیں اور جس جسوقت جس جسطرح اُس کے علم ازلی میں مناسب تھا روحانی زندگی کے سامان مہیا فرمائے پس اگر مختلف زمانوں میں مادی غذا کی تیاری کے لئے مختلف طرح کی بارشوں اور بادلوں کے اول بدل پر ہم کوئی اعتراض نہیں کر سکتے تو ہم کو اس کا بھی کچھ حق نہیں پہنچتا کہ ہم بہت سے انبیاء

مرسلین اور اُن کی شرائع کے ارسال و انزال پر کسی طرح کی حرف گیری کر سکیں۔ متعدد شرائع کے نزول میں جو تدریج و تغیر مرعی ہوتی ہے وہ شخص اکبر (عالم) کے حق میں اس سے زاید نہیں کہ ایک طبیب کسی بیمار کو کئی دن تک منضج پلانے کے بعد مسہل دینے لگے یا تنقیہ خاص کے بعد تنقیہ عام کا مشورہ دے کوئی عقلمند بھی اس وقت یہ نہ کہے گا کہ طبیب کے منضج پلانے میں کچھ غلطی یا بھول چوک ہو گئی تھی جس کی تلافی اس نے مسہل کے نسخہ سے کی ہے حقیقت یہ ہے کہ طبیب دانا مریض کی ہر ایک حالت کے مناسب دوا تجویز کرتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح سمجھ لو کہ وہ حکیم و علیم خدا بھی عالم کے مزاج اور تغیر احوال و عوارض کی رعایت سے کبھی جلد جلد اور کبھی بدیر اُس کے حالات کے مناسب نسخہ بدلتا رہتا ہے اور بعض اوقات کسی نسخہ کا استعمال بہت دیر تک قائم رکھتا ہے کیونکہ مریض کے حالات کا تغیر اس نسخہ کے اجزاء پر کوئی اثر نہیں ڈالتا یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ یہاں سوال امکان اور قدرت کا نہیں، بلکہ عادت الٰہی کا ہے اور یہ پہلے گذارش کیا جا چکا ہے کہ عادت سے اسکے خلاف قدرت رکھنے کی نفی نہیں ہوتی وحی کے مراتب کی تدریج اور تفاوت کو آپ ایک اور مثال سے بھی سمجھ سکتے ہیں۔ پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ جس طرح انسان کی ظاہری آنکھ مبصرات کے دائرہ میں اس وقت اپنا فعل کر سکتی ہے جب کہ اس کے اندر نور بصارت موجود ہو اور مبصر (یعنی جس چیز کو دیکھنا ہے) وہ بھی کسی قسم کی خارجی روشنی کے احاطہ میں ہو اگر اندرونی اور بیرونی روشنیوں سے کوئی ایک بھی مفقود ہو جائے تو آنکھ کے لئے دیکھنا ناممکن ہے ٹھیک اسی طرح

غیبیات اور امورِ معاد کا سمجھنا بھی دو روشنیوں پر موقوف ہے۔ ایک اندرونی جو عقل کی روشنی ہے دوسری بیرونی جس کو وحی کی روشنی سے تعبیر کیا جاتا ہے گویا عقلِ انسانی نہ تو بیکار ہی ہے اور نہ وحی سے مستغنی ہو سکتی ہے اس کے بعد لیل و نہار کے نظام پر غور کیجئے کہ سب میں جوں جوں تاریکی بڑھتی چلی جاتی ہے تو ستاروں کی چمک میں بھی تیزی آتی جاتی ہے تاریک کمروں میں لالٹین چراغ وغیرہ سے روشنی کا سامان کیا جاتا ہے جن کو قدرت کے فیض نے تاریک اوقات میں دنیا کے کاروبار جاری رہنے کے لئے میسّر کر دیا ہے ستاروں سے جہازوں سے چلنے چلانے میں مدد ملتی ہے اور خشکی اور تری میں لوگ ان کے ذریعہ سے وقت اور سمت کی تعیین کرتے ہیں۔

وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُونَ ○	اور لوگ ستاروں سے بھی راہ معلوم کرتے ہیں۔

گیس کے ہنڈوں اور بجلی کے قمقموں سے لوگوں کا کاروبار چلتا ہے جب صبح ہوتی ہے اور سورج نکلتا ہے تو تمام مختلف روشنی کے سامان نابود ہو کر ہزاروں آلاتِ روشنی کے بجائے تنہا ایک روشنی سورج کی کام دیتی ہے قدرت یہ بھی کر سکتی تھی کہ سورج کو ہمارے سر پر ہمیشہ کھڑا رکھتی مگر ایسا نہ کیا جس کی مصالح اور حکمتوں کا احصار خدا ہی کر سکتا ہے بہرحال اس سے اس قدر ضرور معلوم ہوا کہ ظاہری نور (روشنی) متدرج اور متفاوت ہو سکتی ہے اور اس تدریج اور تفاوت کے باوجود ایک ایسا مرتبہ بھی آ سکتا ہے جو تمام مدارج کو ختم کر کے صرف ایک ہی درجہ کو باقی رکھے جو کہ اپنے مستفیدین کو سب ستاروں اور چراغوں کی روشنی سے مستغنی کر دے اور سب چھوٹی بڑی روشنیاں اسی ایک روشنی میں محو اور

مدغم ہو جائیں پس اگر روحانی نور یعنی وحی اور الہام خداوندی میں بھی تدریج ہو اور آخر میں اس کا ایک درجہ ایسا بھی آ جائے جس کے بعد کوئی درجہ باقی نہ رہے تو اس میں کیا تعجب ہے حضورؐ نے فرمایا کہ مجھے پانچ چیزیں دی گئی ہیں جنہیں سے ایک یہ ہے کہ ہر ایک نبی صرف اپنی قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا۔ لیکن میں تمام آدمیوں کی طرف مبعوث ہوا ہوں۔

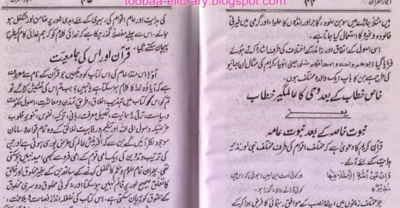
وحی میں باوجود اصولی اتفاق کے فروعی تفاوت

یہ بات فراموش نہ کیجائے کہ تمام انبیاء کے پاس اصول کے اعتبار سے ایک ہی چیز ہوتی ہے۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ	(لوگو) اس نے تمہارے دین کا وہی رستہ
نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا	ٹھہرایا ہے جس (پر چلنے) کا اس نے نوح
وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى	کو حکم دیا تھا اور (اے پیغمبر) تمہاری طرف
اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا	(بھی) ہم نے اسی راستہ کی وحی کی ہے اور جس
فِيْهِ۔	کا ہم نے ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو (بھی)

حکم دیا تھا کہ (اسی) دین کو قائم رکھنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا۔

البتہ مختلف انبیاء اور ان کی شرائع میں اصول کو بحالہا قائم رکھتے ہوئے ازمنہ اور امکنہ اور امرجہ کے اختلاف سے زوائد کا خفیف سا تغیر و تبدل ہو جاتا ہے اس کو یوں سمجھو کہ انسانوں کی عام غذا ہمیشہ ایک قسم کی ہے مثلاً روٹی یا چاول اور پانی لیکن زوائد اور فروع میں باعتبار اوقات و مواسم تغیر و تبدل کرتے رہتے



ہیں مثلاً جاڑے میں سوہن حلوہ، گاجر اور انڈوں کا حلوا، اور گرمی میں فیرنی فالودہ وغیرہ کا استعمال کیا جاتا ہے۔

اسی اصول کے اتفاق اور زوائد کے اختلاف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ابوهم واحد و امهاتهم شتی یعنی انبیاء کرام کی مثال ان بھائیو کی طرح ہے جن کا باپ ایک والدہ مختلف ہوں۔

خاص خطاب کے بعد وحی کا عالمگیر خطاب

یعنی

نبوت خاصہ کے بعد نبوت عامہ

قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ مختلف اقوام کی طرف مختلف نبی اور نذیر ہدایت کے لئے آئے۔

وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِیْهَا نَذِیْرٌ ۝ — اور کوئی امت ایسی نہیں (ہوئی) کہ اس میں کوئی ڈرانے والا نہ گذرا ہو۔

جو مختلف زمانوں میں اپنے منصب کے موافق رہنمائی کا فرض ادا کر کے چلے گئے ان سب کے بعد ایک ہادی اعظم اور منذر عام آیا جو کہ تمام مخلوق کے لئے ہادی ہے۔

لِیَکُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا — تاکہ تمام جہان کے (لوگوں کے) لئے (عذاب خدا) سے ڈرانے والا گذرا ہو۔

پس ضروری تھا کہ ایسے منذر عام کے پاس ایسی کتاب ہو جو کہ تمام لوگوں

کی ہدایت اور عام اقوام کی رہبری کے لئے ابدی طور پر ضامن اور متکفل ہو جائے۔ اس سے پہلے مفصلاً گذر چکا ہے کہ خدائی کلام کو کہ ہم خدائی کام کیطرح پہچان سکتے ہیں۔

قرآن اور اس کی جامعیت

آؤ! اس منذر عام کی اس کتاب کو دیکھیں جو قرآن کے نام سے معروف ہے کہ آیا وہ خدا کا کلام ہو سکتا ہے یا نہیں؟ جب تم اس کی تفتیش کرو گے تو تم کو اس کتاب میں تہذیب اخلاق، طریق تمدن و معاشرت، اصول حکومت و سیاست، ترقی روحانیت، تحصیل معرفت ربانی، تزکیہ نفوس، تنویر قلوب غرضیکہ وصول الی اللہ اور تنظیم و رفاہیت خلائق کے وہ تمام قواعد و سامان موجود نظر آئیں گے جن سے کہ آفرینش عالم کی غرض پوری ہوتی ہے اور جن کی ترتیب و تدوین کی ایک امی قوم کے امی فرد سے کبھی امید نہیں ہو سکتی تھی۔ پھر ان تمام علوم و حکم کا تکفل کرنے کے ساتھ جن کے بغیر مخلوق اور خالق کا تعلق صحیح طور پر قائم نہیں ہو سکتا اور نہ کوئی مخلوق دوسری مخلوق کے حقوق کو پہچان سکتی ہے۔ اس کتاب کی غلغلہ انداز فصاحت و بلاغت، جامع و موثر اور دلربا طرز بیان، دریا کا سا تموج اور روانی، سہل ممتنع سلاست اسالیب کلام کا تفنن اور اس کی لذت و حلاوت اور شہنشاہانہ شان و شکوہ یہ سب چیزیں ایسی ہیں جنہوں نے بڑی بلند آہنگی سے سارے جہان کو مقابلہ کا چیلنج دیدیا ہے جس وقت سے قرآن کے جمال جہاں آرانے غیب کی نقاب الٹی اور آدم کی اولاد کو اپنے سے روشناس کیا اس کا برابر یہی دعوے رہا کہ میں

خدائے قدوس کا کلام ہوں اور جس طرح خدا کی زمین جیسی زمین اور خدا کے سورج جیسا سورج اور خدا کے آسمان جیسا آسمان پیدا کرنے سے دنیا عاجز ہے اسی طرح خدا کے قرآن جیسا قرآن بنانے سے بھی دنیا عاجز رہے گی۔ قرآن کے مٹانے کی لوگ سازش کریں گے، مگر گانٹھیں گے، مقابلہ کے جوش میں کٹ مرینگے، اپنی مدد کے لئے دنیا کی بڑی بڑی طاقتوں کو دعوت دیں گے، کوئی حیلہ، کوئی تدبیر، کوئی داؤ پیچ اٹھا نہ رکھیں گے اپنے آپ کو اور دوسروں کو مصیبت میں ڈالیں گے۔ سارے نقصانات اور مصائب و دواہی کا تحمل ان کے لئے ممکن ہوگا مگر قرآن کی ایک چھوٹی سی سورۃ کا مثل بنالانا ممکن نہ ہوگا۔

نبی اُمی اور اسکا اعجاز قرآنی

پھر طرفہ یہ ہے کہ جو ہادی اس کتاب کو لایا اس نے نہ کسی درس گاہ میں تعلیم پائی نہ کسی لائبریری کا مطالعہ کیا، نہ کسی استاذ اور معلم کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا اور نہ اس کے گرد و پیش ایسے بیش بہا تعلیمات کا کوئی مواد موجود تھا بلکہ اس کی اور اس کی قوم کی وہ حالت تھی جس کو قرآن نے یوں ادا کیا۔

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ

وہ (خدا) ہی تو ہے جس نے (عرب کے) جاہلوں میں ان ہی میں سے (محمد کو) پیغمبر بنا کر بھیجا (کہ وہ) ان کو خدا کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے اور ان کو (کفر و شرک کی گندگی سے) پاک صاف کرتے اور ان کو

لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝

کتاب (الٰہی) اور عقل (کی باتیں) سکھاتے ہیں ورنہ (اس کے) پہلے تو یہ لوگ صریح گمراہی میں مبتلا تھے۔

نہ صرف یہ کہ قرآن نے اس کے اُمی ہونے کا اشارہ کیا بلکہ اُمی کا وصف اس کے لئے بمنزلہ ایک ممتاز لقب کے استعمال فرمایا، جس جگہ یہ فرمایا۔

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ۔

(ان سے ہماری مراد اس زمانہ کے وہ اہل کتاب تھے) جو (ہمارے ان) رسول نبی امی (محمد کی پیروی کرتے ہیں جن کی بشارت) کو اپنے ہاں توراۃ اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔

اور ایک موقع پر آپ کی نوشت و خواند کے متعلق ان لوگوں کے مجمع میں جن سے آپ کی چہل سالہ طویل زندگی کا کوئی معمولی واقعہ خصوصاً کہ وہ جس میں احتیاط غیروں کی ہو مستور نہ رہ سکتا تھا، صاف صاف اعلان کر دیا گیا۔

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝

نہ تو تم قرآن سے پہلے کوئی کتاب پڑھ سکتے تھے اور نہ اپنے داہنے ہاتھ سے لکھ سکتے تھے اگر ایسا ہوتا تو بیشک باطل پرستوں کو کچھ شک و شبہ کی گنجائش ہوتی۔

یہی نہیں کہ آپ رسمی نوشت و خواند سے بالکل الگ تھلگ رہے، بلکہ جو چیز بڑے سے بڑے متعصب و معاند کو بھی محو حیرت بنا دینے والی ہے وہ یہ ہے کہ آپ باوجود عرب کے نہایت ہی واجب التعظیم معزز و ممتاز خاندان میں سے ہونے کے اس فن شاعری سے بھی ناآشنا رہے جس ملک اس سرزمین کے بچے

اور چھوکریاں بھی طبعی سلیقہ کے موافق ید طولیٰ رکھتی تھیں کیا یہ عجیب بات نہیں کہ ایسے ملک کا جہاں کی زمین نباتات کی طرح شاعروں کو اگاتی تھی ایسا مایۂ ناز فرزند شعر گوئی سے کوئی علاقہ نہ رکھے، ایک شعر بھی اس کا عرب کے دواوین میں موجود نہ ہو، کسی مشاعرہ میں ایک قصیدہ بھی اس نے نہ پڑھا ہو جو یہی گمان کر لیا جائے کہ شاعری سے ترقی کرتے کرتے شاید وحی و الہام کا دعویٰ کر دیا ہوگا۔

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ

اور ہم نے ان (پیغمبر محمدؐ) کو شاعری نہیں سکھائی اور شاعری ان (کی شان کے) لائق بھی نہیں۔

پھر لائے تو پورے چالیس کے بعد ایک ایسا کلام لائے جو نہ قصیدہ ہے نہ غزل ہے نہ مرثیہ ہے نہ اس رنگ ڈھنگ کا کوئی کلام اُن کے یہاں موجود ہے نہ اس طرح کی کوئی تصنیف وہاں پائی جاتی ہے۔ بلکہ وہ آفتاب کی طرح مکانوں کو نہیں دلوں کو روشن کرنے والا کلام ہے وہ حکمت ہے، علم ہے، شفا ہے، برہان ہے، نور ہے، قانونِ ہدایت ہے خلاصہ یہ کہ خدا کے علم سے روشن کی ہوئی مشعل ہے جسے نہ کوئی ہوا کا جھونکا گل کر سکتا ہے نہ کوئی آندھی بجھا سکتی دنیا کے فصحا و بلغا نے اس اُمی کی لائی ہوئی کتاب کے سامنے سپر ڈال دی۔ بڑے بڑے شاعر ایسے بہک گئے کہ جس آدمی نے مدۃ العمر ایک شعر نہیں کہا تھا محض کلام سن کر اسے شاعر بتلانے لگے اس کا خارق عادت دیکھ کر سحر سے تعبیر کیا اور یہی چیز ان کے زعم میں تمام فوق العادۃ کارناموں کی حد تھی۔ اور بعض ان میں سے قرآن کی فصاحت کو سجدہ کرنے لگے قرآن کے علوم و قوانین نے ساری

دنیا کے قانون ردی کر دیئے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ حکمتوں اور تمدنوں کو لپیٹ کر ان کی جگہ لے لی۔ اور آخر کار اُمیوں کی جماعت کو دنیا کے مدعیان حکمت و تہذیب کا معلم بنا دیا۔

آپ کا اُمی ہونا تاریخ کی اجلی بدیہات میں سے ہے

کیا آج ساڑھے تیرہ سو برس کے بعد کوئی شخص جرأت بلکہ حماقت کریگا کہ آنحضرت صلعم کے اُمی ہونے کو یہ کہہ کر جھٹلانے لگے کہ شاید آپ نے بھی دنیا کے دوسرے مصنفین کی طرح مختلف علوم و فنون کی کتابیں پڑھی ہوں گی کسی میانجی کے پاس بیٹھے ہونگے کوئی کتب خانہ آپ کے مکان میں چھپا ہوگا۔

میں کہتا ہوں کہ وہ آیات جن میں آپ کا اُمی ہونا بیان کیا گیا ہے ایسی قوم کو سالہا سال تک شب و روز سنائی جاتی رہیں جن کی گودوں میں آپ بچپن سے پلے تھے اور آپ کی عمر کا کوئی معتدبہ عرصہ ان کی نگاہوں سے اوجھل نہ تھا۔ لیکن ایسی شدید عداوت اور غیظ و غضب اور آپ کی تکذیب و تردید پر اسقدر حریص ہونے کے باوجود کسی ایک آدمی نے بھی یہ شہادت نہ دی کہ آپ نے فلاں مدرسہ میں تعلیم پائی ہے یا فلاں استاذ کی خدمت اور ملازمت میں آپ اپنی مدت تک رہے ہیں۔ اگر کوئی آواز بھی ایسی اٹھی ہوتی تو ضرور آج تاریخ میں اس کا کچھ نشان ملتا۔ تاریخ کے صفحات جس طرح اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کھلے ہوئے تھے اس سے زائد آپ کے دشمنوں اور بدنام کرنے والوں کیلئے کشادہ تھے بلکہ آغاز اسلام میں جب کہ چند مظلوم اشخاص کے سوا کوئی بھی حضرت محمد صلعم کا کلمہ پڑھنے والا نہ تھا اور کفر و باطل کی ساری شیطانی طاقتیں آپ کے

نام ونشان کو صفحۂ ہستی سے معاذ اللہ مٹا دینے میں مشغول تھیں ان کے لئے ایسا پروپیگنڈا پھیلانے کا بڑا وسیع میدان موجود تھا اور وہ بخوبی اس کی اشاعت اطراف واکناف میں کر سکتے تھے کہ محمد صلعم، معاذ اللہ اپنے امی ثابت کرنیکے دعوئی میں جھوٹے ہیں انہوں نے فلاں کالج میں یا فلاں پروفیسر سے اتنے زمانہ تک ریگی تعلیم پائی ہے۔ پس جب کہ چودہ سو برس کی تاریخ کوئی ایسا بیان پیش کرنے سے خاموش ہے تو تاریخ کی عزت پر یہ ایک بڑا ہی ناپاک اور کینہ حملہ ہوگا کہ تعصب کے جوش میں محض اپنے توہمات کی بنا پر تاریخ کو جھوٹا ثابت کیا جائے اگر اسکندر رومی کی فاتحانہ ملک گیری۔ انوشیرواں کی عدل گستری، رستم کی شہرۂ آفاق طاقت وشجاعت، حاتم طائی کی سخاوت اور فیاضی کی تردید کردی جائے تو غالباً تاریخ وروایت کا فن اسقدر بے اعتبار نہ ہوگا جتنا کہ نبی عربی صلعم کے امی ہونیکی نفی سے ناقابلِ اعتبار ٹھہرتا ہے۔ کیونکہ یہ ایسا واقعہ ہے جس کا تواتر قرآن کے تواتر کی برابر ہے اس کا انکار صرف اس صورت میں ممکن ہوگا کہ ایک آدمی یہ ہی دعوے کر بیٹھے کہ محمد صلعم نامی کوئی انسان عرب میں پیدا ہی نہیں ہوئے۔ نہ انہوں نے یہ قرآن پڑھ کر لوگوں کو سنایا نہ دعویٰ پیغمبری کیا تو کیا آپ یہ پسند کریں گے کہ محض قرآن یا حامل قرآن کی عداوت کے جوش میں گذشتہ تمام مشہور ومتواتر واقعات کو بھی جھٹلانے لگیں جس کا خمیازہ نہ صرف مذہب اسلام کو بلکہ دنیا کے تمام مذہبوں اور قوموں خصوصاً اس مذہب کو اٹھانا پڑے گا جس کا وجود تاریخی زمانہ سے بھی بہت پہلے کا بتلایا جاتا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی شخص قرآن کی ضد میں اس درجہ جہالت پر اتر آئے گا کہ وہ نزول قرآن سے

پہلے نبی امی کا تعلیم یافتہ ہونا ثابت کرے حالانکہ وہ مشہور ضدی اور متمرد افراد بھی جنہوں نے کوئی امکانی صورت تکذیب قرآن کی اٹھا نہ رکھی تھی۔ تنگ اور کھسیانے ہوکر اس سے زائد نہ کہہ سکے کہ (انما یعلمہ بشر) (کوئی آدمی ان کو سکھا جاتا ہے) ایسا کوئی حوالہ بھی نہ دے سکے جس سے چالیس سال کی عمر تک ایکدن کیلئے بھی آپ کا کسی سے تعلیم پانا ثابت ہوتا بلکہ خود ان کا یہی قول اس کی دلیل ہے کہ رسول خدا صلعم کے امی ہونیکو وہ ایسی ناقابل انکار بداہت سمجھتے تھے کہ قرآن کے علوم ومعارف کو آپ کے گذشتہ مشہور ومعروف امیت سے تطبیق دینا ان کیلئے ممکن نہ تھا اس لئے وہ آپ کی جگہ کسی غیر معلوم بشر کو جو تعلیمیافتہ ہو اس قرآن کا اصل مصنف قرار دیتے تھے اس وقت شاید ان کو یہ خیال نہ رہا کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن سکھانیوالا بھی کوئی بشر ہی ہے تو کسی بشر کا مقابلہ کرنے اور اس کے کلام کا مثل لانے سے سارے جہان کی بشری اور غیر بشری طاقت عاجز نہیں رہ سکتی۔ بے شک قرآن حضرت محمد صلعم کا کلام نہیں ہے اور نہ آپ کے پاس ایسی کتاب تیار کر لینے کا کوئی طبعی سامان موجود تھا اور یہ بھی درست ہے کہ یہ قرآن ضرور آپ کو کسی اور نے پڑھایا ہے لیکن وہ پڑھانیوالا بشر نہیں تھا بلکہ وہ رب کریم تھا جو لایعقل نطفہ اور منجمد خون کو صاحب عقل وشعور انسان بنا دیتا ہے۔

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۝	پڑھو (اے محمد صلعم) اپنے رب کے نام سے جس
خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۔	نے پیدا کیا انسان کو جمے ہوئے خون سے۔

وہ جس طرح اپنی ذات وصفات میں اور اپنے کام میں بےمثیل اور یکتا ہے اسی

طرح اپنے کلام میں بھی بے نظیر و بے ہمتا ہے۔ مخلوق جس طرح اس کے کام کا معارضہ کرنے سے مجبور ہے۔ قرآن کے لانیوالے نے بڑے زور سے تحدی کی، ہر طرح لوگوں کو اس کلام کا مثل لانے کیلئے ابھارا، غیرتیں دلائیں، مقابلہ کیلئے بیدار کیا، جنجھوڑ جنجھوڑ کر اٹھایا، اور ایک ذراسی بات پر جو ان کے زعم میں بہت ہی آسان اور سہل الحصول ہونا چاہیئے تھی، اپنے کل دعاوی کے جھوٹ اور سچ ہونیکا فیصلہ چھوڑ دیا، لیکن مقابلہ کرنیوالوں نے لڑائیاں لڑیں، حاملین قرآن کے مٹانے اور تباہ کرنے کی سازشیں کیں۔ ان کے ذلیل اور رسوا کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہ چھوڑا، تاہم یہ حوصلہ کسی کو نہ ہو سکا کہ قرآن کی کسی چھوٹی سی سورۃ کے جواب میں چند جملے بنا کر قرآن کے عظیم الشان دعویٰ کو غلط یا پست کر دیتا (العیاذ باللہ)

قرآن نے کس طرح لوگوں کو عاجز کیا

جیسے ہم خدائی کاموں کو مصنوعات عالم میں غور کر کے بآسانی پہچان لیتے ہیں اسی طرح خدا کے کلام کے مقابلہ میں بہت سے شعراء کے کلاموں اور دنیا کے بڑے بڑے بولنے والوں کے نتائج افکار کو، ان کے شستہ و مہذب بیانوں کو، غلغلہ انداز خطبوں کو، معرکۃ الآراء لکچروں کو، عرق ریزی سے لکھی ہوئی تالیفات کو، ادبی اور علمی مصنفات کو سامنے رکھ کر ہم آسانی سے اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ یہ خدائی کلام ہے آدمیوں کا کلام نہیں پس جس کلام کے متعلق یہ دعویٰ ہمارے سامنے آتا ہے کہ خدائی کلام ہے اس میں ہم کو امور ذیل پر غور کرنا پڑے گا۔

خدائی کلام کے پرکھنے کی کسوٹی کیا ہے

(۱) مدعی نبوت جس کی زبان سے یہ ہم تک پہنچا اس کی کیسی حالت ہے؟ (۲) اس کی تعلیم کیسی ہے؟ (۳) کیا اس جیسا آدمی ایسا کلام بول سکتا ہے؟ (۴) کیا اس کے پاس ایسا سامان موجود ہے جس سے وہ ایسے بیش بہا علوم و مضامین ادا کر سکے؟ (۵) کیا حجاز میں کوئی علمی سامان موجود تھا؟

کیا قرآن اس کسوٹی پر پورا اُترتا ہے

پہلے سوال کے متعلق قرآن کے لانیوالے کی حالت جب ہم دیکھتے ہیں تو وہ ایک دیانتدار شریف النسب مگر ایک یتیم بچہ ہے۔ جس کے سر پر نہ باپ نے سایہ کیا نہ زیادہ دنوں تک آغوش مادری کی راحت اٹھائی، نہ اس کے پاس کوئی ثروت ہے نہ دولت، نہ اس کا گھرانہ کوئی علمی یا صنعتی گھرانہ ہے نہ اس کے پاس لڑکپن کے زمانہ یا جوانی بلکہ نبوت کے بعد بھی کوئی ظاہری علمی سامان ہے نہ اس کے وطن میں کوئی مدرسہ ہے نہ کوئی مکتب، نہ اس کے وطن میں علوم و فنون کا کسی قسم کا چرچا ہے بلکہ وہاں کسی کے کان علوم و فنون کے چرچے سے آشنا بھی نہیں۔ ہاں ان کے پاس اگر ہے تو صرف زبان ہے اور اس قدر طاقت لسانی اور قادر الکلامی ہے کہ وہ تمام جہان کو اپنے سامنے گونگا سمجھتے ہیں چنانچہ عرب کے ماسوا کا جو نام عجم رکھا تھا اس کی بھی یہی وجہ تھی کہ عجم کو قادر الکلام نہیں سمجھتے تھے اور اپنے مقابلہ میں سب کو ہیچ جانتے تھے بڑے بڑے بادشاہوں کے درباروں میں نہایت شان و شوکت کے

ساتھ بیدھڑک بولتے تھے معمولی اونٹ اور بکریاں چرانیوالا ایسا برجستہ کلام کہتے تھے کہ دوسروں کو بہت فکر و تامل کے بعد بھی ویسا کہنا مشکل تھا چند جملوں میں جذبات کو برانگیختہ کر دیتے، جب بولتے تو رعد کی طرح گرجتے۔ بجلی کی طرح کڑکتے بارش کی طرح برستے تھے اور تھوڑی سی دیر میں گھپے یا آب گھپے یا آتش کا سماں کھینچ دیتے تھے۔ غرض کر لے دیکھ ان کے پاس اگر کوئی چیز تھی تو صرف زبان تھی ویسے کوئی طریقہ باقاعدہ تصنیف نہ تھا، درسگاہیں نہ تھیں، کتب خانہ اور لائبریریاں نہ تھیں۔

اب سوچو کہ اگر ایسے ملک میں کوئی ذہین اور صاحب ثروت بھی ہو تو کیا مختلف علوم و فنون کا سیکھنا اس کے لئے عادۃً محال نہ ہوگا پھر جب اس کے ساتھ دوسرے قدرتی اسباب بھی ایسے جمع ہوں جن کے ہوتے ہوئے سیدھی سادی زندگی بسر کرنا اور معمولی کفاف بھی مہیا کرنا مشکل ہو جاوے جیسا کہ ولادت سے پہلے والد کا انتقال اور بحالت رضاعت والدہ کی وفات۔ پھر چچا کی پرورش میں چلے جانا اور اسی طرح چالیس برس کی عمر کو بے سروسامانی میں بسر کرنا، کبھی قلم کو ہاتھ بھی نہ لگانا نہ کسی استاد کے سامنے کتاب کھولنا ان سب علامتوں کو دیکھ کر عادۃ اللہ (جس کو آج کل کے لوگ قانون قدرت بھی کہتے ہیں) یہی بتلاتی ہے کہ ایسا شخص ابواب تہذیب و تمدن اور معارف الٰہیہ اور حقائق توحید ذاتی و صفاتی و افعالی اور علوم ہدایت امم و اقوام میں کوئی سیدھی بات بھی نہ کر سکے۔ چہ جائیکہ وہ ایسی کتاب لاجواب اور ایسی آیات بینات لوگوں کے سامنے پیش کرے جس کو دیکھ کر ارباب فنون اور علمائے متبحرین حیران رہ

جائیں۔ بلکہ دنیا کے بڑے بڑے عقلاء اور حکماء اس کی چوکھٹ پر سر دھننے لگیں اور جن و انس اس کا مثل پیش کرنے سے صریحاً عاجز و درماندہ ہو جائیں۔ جب ایسے حالات میں ایسا کلام ہم دیکھیں گے تو ضرور اس کو خدائی کلام کہنے پر از روئے عقل و انصاف و تجربہ مجبور ہو نگے دوسرا سوال بھی مذکورہ بالا بیان سے حل ہو گیا کہ جب ملکی اور قدرتی حالات ایسے ہوں جن کے ہوتے ہوئے ایک فارغ البال اور خوشحال آدمی بھی اکتساب علوم اور تحصیل فنون سے عاجز ہو تو ایک بےسرو سامان کے لیے ایسی اعلیٰ تعلیم کہاں سے میسر ہو سکتی تھی آپ کی سوانح سب کو معلوم ہے کہ طفولیت ہی میں یتیم ہوئے اور ہوش سنبھالنے کے بعد بعض ابواب معیشت اور دیگر افکار میں مبتلا ہو گئے ہاں پیدائشی طور پر جو بہت ہی شدید اور قوی داعیہ طلب حق اور معرفت الٰہیہ کا آپ کے قلب مبارک میں موجزن تھا اور جو سخت نفرت اور بغض آپ کو فطری طور پر رسوم شرکیہ اور فشار و منکرات سے تھا وہ آپ کو تبتل (انقطاع خلائق) اور یکسوئی اور عزلت گزینی کی طرف کرتا تھا چنانچہ آپ کبھی کبھی کئی کئی دن تک تمام انسانوں کے جوار سے علیحدہ ہو کر غاروں اور پہاڑوں میں خدائے وحدہ لاشریک لہ کو یاد کرتے اور اپنی کانشنس کے موافق اس کی عبادت کیا کرتے تھے جہاں انسان کا گذر تو کیا کوئی پرندہ بھی پر نہ مارتا تھا۔ تاریخ کی نہایت ہی معتبر اور محفوظ روایتیں جن سے بڑھ کر کوئی وثوق کی چیز تاریخ کے خزانہ میں نہیں مل سکتی۔ بتلاتی ہے کہ آپ حرا کی چوٹی پر (جسے جبل النور کہتے ہیں) کئی کئی دن تنہا رہ کر اس وحدہٗ لاشریک کی معرفت کی طرف قدم اٹھاتے تھے کوئی شخص ان چند ایام خلوت میں بھی یہ ثابت نہ کر سکا کہ آپ

کے پاس خفیہ طور پر کوئی معلم جاتا تھا اور وہ آپ کو کتاب پڑھاتا تھا۔ ایسے حالات میں نزول قرآن سے پہلے آپ کے تعلیم یافتہ ہونے کا ادعا کس قدر بے دلیل بات ہے قرآن نے صاف صاف اعلان کر دیا۔

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝	قرآن شریف سے پہلے نہ تو کوئی کتاب پڑھتا تھا، اپنے داہنے ہاتھ سے لکھتا تھا، اگر ایسا ہوتا تو البتہ اہل باطل شبہ میں پڑتے۔

نبوت سے پہلے ایک دفعہ بچپن میں اپنے چچا ابو طالب کے ہمراہ اور ایک مرتبہ جوانی میں دوسرے رفقاء کے ساتھ آپ کو شام کی طرف بغرض تجارت چند روز کے لئے سفر کا اتفاق ہوا۔ بحیرا راہب نے اسی سفر میں آپ کو دیکھا اور آثار رشد و فلاح اور علامات نبوت دیکھ کر حضورؐ کے تابناک مستقبل کے متعلق کچھ پیشین گوئی بھی کی لیکن جیسا کہ حافظ ابن تیمیہ نے لکھا ہے پڑھنا پڑھانا تو درکنار کوئی شخص تاریخ سے ایک شہادت بھی اس بات کی پیش نہیں کر سکتا کہ اس چند ساعت کی صحبت میں آپ نے ایک کلمہ اور ایک حرف بھی بحیرا یا کسی اور راہب یا قسیس سے سیکھا ہو اور اگر بالفرض ایسا ہوتا تو سب سے پہلے قافلہ والوں کو اور بحیرا کے متبعین کو اس کی خبر ہوتی اور وہ بڑے زور شور سے اپنی تاریخوں میں درج کرتے کہ محمد معاذ اللہ فلاں راہب کے شاگرد ہیں۔ حالانکہ صفحات میں اس کا کوئی نشان موجود نہیں۔ تیسرے سوال کے متعلق یہ کہنا ہے کہ اگر مدعی الہام ایسا ہو کہ اس نے باقاعدہ علوم و فنون کو حاصل کیا ہو اور اپنی سادہ زندگی میں اس کی فصاحت اور علمی قابلیت بھی مشہور ہو چکی ہو اور اس کے پاس

ایسا سامان موجود ہو جس کی وجہ سے وہ تصنیف و تالیف پر قادر ہو جائے۔ بعدہٗ وہ ایک نفیس کتاب کو لکھ کر اس کے الہامی ہونے کا دعویٰ کر دے تو شبہ کی گنجائش ہو سکتی ہے۔

کیا فیضی کی تفسیر اور سعدی کی گلستان کو معجزہ کہہ سکتے ہیں

آپ نے سنا ہو گا کہ قرآن کے مقابلہ میں بعض خوش فہم فیضی کی بے نقط تفسیر اور سعدی کی گلستان کو پیش کر کے یہ کہا کرتے ہیں کہ جس طرح ان دونوں کا جواب آج تک کوئی نہ دے سکا۔ اسی طرح اگر قرآن کا جواب بھی کسی نے نہ دیا تو وہ معجزہ کیونکر ہو سکیگا اور اگر وہ معجزہ ہے تو فیضی کی بے نقط تفسیر اور سعدی کی گلستان بھی معجزہ ہو گی۔

اس کا جواب

حالانکہ دنیا جانتی ہے کہ سعدی اور فیضی دونوں کے پاس سامان تعلیم و تالیف کس قدر موجود تھا۔ کتنے عرصہ تک انہوں نے تعلیم حاصل کی، برسوں مدرسوں میں پڑے رہے، راتوں کو جاگے، مدتوں محنتیں کیں، سالہا سال کی محنتوں اور دماغ سوزیوں کے بعد اگر بالفرض، فیضی یا حریری یا متنبی یا کوئی اور عربی میں، سعدی فارسی میں، ملٹن انگریزی میں، یا ہومر یونانی میں، یا کالیداس سنسکرت میں ایسے ہوئے کہ ان کا کلام دوسروں کے کلام سے فائق ہو گیا تو کوئی تعجب کی جگہ نہیں۔

خدا کے کلام معجزہ کی تعریف میں میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ وہ اسباب متعارفہ کے توسط کے بدون صادر ہونا چاہیئے، کیا ان لوگوں کی باقاعدہ تحصیل علوم۔

استادوں کے ساتھ طویل ملازمت، وہمنشینی، وسیع مطالعہ، مدتوں کی مشاقی اور جدو کد ان کے جاننے والوں سے مخفی ہے؟ اور کیا فائق کلام بولنے یا لکھنے کیلئے یہ ظاہری اسباب نہیں ہیں، اگر ہیں اور ضرور ہیں تو ان کے کلام کا فائق ہونا بلاسبب متعارف کے ظاہر نہ ہوا بلکہ اتنی خاک چھاننے اور مصیبت بھگتنے کے بعد اگر ان کا کلام ایسا نہ ہوتا تو خلافِ عادت ہونے کی وجہ سے موجب تعجب ہو سکتا تھا لہٰذا فیضی کی تفسیر کا ایک خاص صنعت بے نقط ہونے میں تفوق محل تعجب نہیں تعجب یہ ہے کہ جس نے کتاب اور کاغذ، قلم، دوات کو چالیس برس تک ہاتھ نہ لگایا نہ کسی درسگاہ میں قدم رکھا، اس نے وہ کتاب دنیا کے سامنے پیش کی کہ ہزاروں سعدی اور لاکھوں فیضی اس کے اوپر قربان ہو جانا اپنا فخر سمجھ اور سمجھتے ہیں اور سمجھتے رہیں گے بلکہ وہ اور ان سے زیادہ باکمال ہستیاں اپنی ہستی اور کمالات کا سرچشمہ بھی اسی نور مجسم اور اسی کتاب مقدس کو سمجھتے ہیں۔ دیکھو خود حضرت سعدی بوستان کے دیباچہ میں قرآن لانیوالے پیغمبر کی نسبت کیا فرماتے ہیں ۔ اشعار

خلافِ پیغمبر کسے رہ گزید ؛ ؛ — کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید
میندار سعدی کہ راہ صفا — تواں رفت جز بر پئے مصطفٰے
کلیمے کہ چرخ فلک طور اوست — ہمہ نورہا پرتو نور اوست
یتیمے کہ ناکردہ قرآں درست — کتب خانہ چند ملت بشست
بلند آسماں پیش قدرت خجل ؛ — تو مخلوق و آدم ہنوز آب و گل
تو اصل وجود آمدی از نخست — دگر ہرچہ موجود شد فرع تست

ندانم کدامیں سخن گویمت — کہ والاتری زانچہ من گویمت
ترا عز لولاک تمکیں بس است — ثنائے تو طٰہٰ و یٰسین بس است
چہ وصفت کند سعدی ناتمام — علیک الصلوٰۃ اے نبی والسلام

اور فیضی جس کو قرآن کے مخالف بطور ایک غیر مجروح گواہ کے پیش کرتے ہیں اپنی تفسیر کی ابتدا میں اس نبی امی کی کتاب کو خدائی کلام مانتے ہوئے اور اس کے سامنے تمام علوم وکتب کو (خواہ فیضی کی ہوں یا سعدی کی) ہیچ بلکہ محض دردسر قرار دیتے ہوئے کہتا ہے۔

العلوم کلھا صداع الاعلم — کلام اللہ کی معلومات کے علاوہ تمام علوم دردِ
کلام اللہ وکلام اللہ لا عد — سر ہیں اور کلام اللہ کے محامد کی کوئی تعداد
لمحامدہ ولا حد لمکارمہ — نہیں نہ اس کی مناقب کی کوئی انتہا ہے اس
ولا حصر لرسومہ ولا احصا — کی صداقت کے نشان غیر محصور اور اس کے علوم
لعلومہ وما علم کلام — بے شمار ہیں جو علوم کلام اللہ میں موجود ہیں ان
اللہ کلھا احد الا اللہ ورسولہ — سب پر سوائے خدا اور اس کے رسولؐ کے کسی کا
واولو العلم ما علموا — احاطہ نہیں تمام اہل علم کو جو کچھ ہاتھ آیا وہ ایک
الاعداد۔ — محدود حصہ ہے۔

پس جب فیضی اور سعدی بھی خود اپنے اقرار کے موافق اس نبی امی صلعم کے دبستان علم وحکمت میں ایسے ہیں جیسا کہ ایک شیرخوار بچہ سمندر کے کنارہ پر لیٹا ہوا ہاتھ پاؤں مار رہا ہو جس کے ہاتھوں کو کبھی کبھی ایک آدھ بوند پانی کی لگ جاتی ہو تو اب سعدی کی گلستان یا فیضی کے کلام کو کلام اللہ

کے مقابل لانا نہ صرف فیضی اور سعدی کا استہزا اور شاہد کی ضمیر کے خلاف شہادت دلانا ہے، بلکہ حد درجہ کی بے حیائی سے مدعی سست اور گواہ چست کے طور پر اپنے آپ کو ذلیل اور رسوا کرنا۔ علاوہ اس کے ایک بات اور بھی ہے وہ یہ کہ کیا فیضی اور سعدی نے یہ آواز بھی لگائی تھی کہ تمام دنیا مل کر میری کتاب کی مثال یا جزو مثال پیش کرے اور کیا پھر یہ دعویٰ بھی کیا کہ وہ ہرگز پیش نہ کر سکے گی کیا انہوں نے کسی ایک آدمی کو بھی اپنے مقابلہ کے لئے ابھارا، عار دلائی، مجبور کیا کہ وہ ناچار سامنے آئیں اور ایسے سامان مہیا کئے کہ انکو خواہی نخواہی کشاں کشاں سامنے آنا پڑتا اور وہ مجبور ہوتے کہ فیضی اور سعدی کے کلاموں کا معارضہ کریں اور فرض کرو کہ سعدی وغیرہ تحدی اور مبارزہ بھی کرتے اس پر بھی کوئی میدان میں نہ آتا تو یہ بھی عجز کی دلیل نہیں ہو سکتی تھی۔ کیونکہ ممکن تھا کہ دنیا ان کا مقابلہ کرنے میں کوئی عظیم نفع یا ترک کرنے میں کوئی عظیم نقصان نہ سمجھتی اور اس لئے اس دعویٰ سے بے التفاتی اور استغنا برتتی مگر برخلاف اس کے قرآن نے شروع ہی سے دعویٰ کیا کہ میرا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔ غیرت دلائی جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر اٹھایا۔ چابک مار مار کر معارضہ کے لئے کھڑا کیا۔

قرآن کی طرف سے مقابلہ کا پُرزور چیلنج

اور کہا کہ میرے جیسی ایک چھوٹی سی سورت سب مل کر بنا لاؤ اور اسی پر فیصلہ ہے اگر نہ لا سکو اور ہمارا دعویٰ یہ بھی ہے کہ کبھی نہ لا سکو گے تو پھر مجھے خدا کا کلام تسلیم کرو ورنہ اس ابدی عذاب سے ڈرو جو منکرین کے لئے

تیار ہے، اب دیکھئے کہ چیلنج کس زور کا تھا اور کتنے بھاری نفع یا نقصان کا سودا تھا کیا ایسی حالت میں کوئی کہہ سکتا ہے کہ لوگوں نے توجہ نہ کی ہو گی یا پوری ہمت اور قوت سے مقابلہ کے لئے نہ نکلے ہوں گے، حالانکہ تاریخ شاہد ہے کہ پوری توجہ اور پورا اعتنا کیا گیا کیسے کہا جائے کہ توجہ نہ کی گئی ہو گی، جب کہ آپ کے پیچھے پیچھے آدمی دوڑتا تھا کہ اے لوگو یہ مجنون ہے اس کی بات نہ سنو تاکہ آپ کا اثر کہیں جمنے نہ پائے آپ کی ہلاکت کی کوشش کی گئی آپ پر ہر قسم کے حملے کئے گئے، آپ کے قتال کے لئے بڑے بڑے انعاموں کا اعلان ہوا، اور جب آپ کا اثر برق رفتاری سے بڑھتا گیا اور آپ کی صداقت وحقانیت اور صبر و استقامت کو دیکھ کر ہزارہا نفوس آپ کے گرویدہ ہو گئے اور آپ کے حریفوں کے خاص خاص لوگ بھی ان سے ٹوٹ کر آپ کے حلقہ بگوش غلام بن گئے خاندان کے خاندان داخل اسلام ہونے لگے بعض بڑے بڑے متمول اور معزز لوگ عیش و عشرت چھوڑ کر آپ کے پاس پہنچے۔ پیارے پیارے بچوں اور عورتوں کو خیرباد کہہ کر فقیرانہ حالت میں نہایت بے سروسامانی کے ساتھ آپ کے قدموں میں آ پڑے اور سخت کٹھن اور خطرناک زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوئے کہ بشر سے اس کا تحمل سخت دشوار تھا تو آپ کے مخالفوں نے غیظ و غضب سے بیتاب ہو کر جنگ و جدال اور معرکہ آرائی شروع کر دی، تلواریں اٹھائی گئیں، صف آرائیاں ہوئیں۔ خون کی ندیاں بہائیں۔ جانیں گنوا دیں۔ خویشوں اور عزیزوں کے سر کٹوائے۔ مال و متاع کو برباد کیا تاکہ کسی نہ کسی طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مغلوب کر لیں، ادھر سے بہت سہل آسان طریقہ مغلوب بلکہ اثر کے کلیۃً معدوم

کرنیکا یہ بتایا گیا کہ صرف تین آیت کی برابر ایک چھوٹی سی سورت اسی شان کی لے آؤ جس شان میں قرآن تمہارے سامنے ہے تو ہم خود بخود تمام تحریک کو ختم کرکے اپنی جماعت بلکہ اپنے آپ کو بھی تمہارے حوالے کر دیں گے۔ پھر مقابلہ کی اس آسان اور سہل ترین تدبیر کے ساتھ اور بھی رنگارنگ سہولتیں بلکہ ہر ممکن آسانی بھی اُن کے لئے بہم پہنچادی۔ چنانچہ جب چیلنج دیا تو یہ کہا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں ان جیسے ایک اُمی کو منتخب کرو بلکہ سب کے سب مل کر جتنے فصیح و بلیغ تعلیم یافتہ قبائل ہیں سب جمع ہو جاؤ۔ اتنے پر بھی بس نہیں، تمام دنیا کے انسانوں کو بھی جمع کر لو۔ بلکہ انسانوں کے ساتھ دوسری مخلوق کو بھی شامل کرکے ایک سورۃ بنالاؤ تو نہ تلوار اٹھانے کی ضرورت ہو گی، نہ خون بہانے کی حاجت باقی رہے گی، نہ سلطنتیں اور سرداریاں تباہ ہوں گی، نہ سازشیں کرنا پڑیں گی اور ساری تدابیر اسی ایک سہل بات پر ختم ہو جائیں گی، پہلے گذر چکا ہے کہ وہ اس قدر بولنے والے تھے کہ بولنے میں اور زبان کی فصاحت میں اپنے سوا تمام دنیا کو گونگا سمجھتے تھے جو صاف دلیل ہے کہ ان کے پاس مقابلہ کے لئے اس سے بڑھ کر اور کوئی چیز آسان اور سہل نہ تھی مگر ان کی زبانیں گنگ ہو گئیں، دماغ مفلوج ہو گئے، جوارح معطل ہو گئے، لیکن اس سہل ترین اور فیصلہ کن مقابلہ کی تاب نہ لا سکے۔

لقلنا مثل ھذا کا جواب

کبھی کبھی زبان سے یہ بھی کہتے تھے :۔

لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ — اگر ہم چاہتے تو اس جیسا کلام کہدیتے

یعنی نہ ہم نے چاہا نہ کہا۔ مگر کیوں نہ چاہا، اس لئے کہ اپنی عزت اور آبرو اور قرآن کے سامنے اپنے عجز اور کمزوری کی پردہ پوشی صرف اسی صورت میں دیکھی اگر وہ جھوٹ موٹ کہدیتے کہ یہ ہمارا کلام قرآن جیسا ہے تو کہنے والے کی زباندانی اور فصاحت اور تصدیق کرنیوالوں کی سخن شناسی اور سخن فہمی پر ایسا سخت بدنما داغ لگتا کہ وہ کسی بزم سخن اور محفل ادب میں منہ دکھانے کے قابل نہ رہتے اور دنیا ان کا تمسخر اڑاتی اس وجہ سے یہ ہمت کسی نے نہیں کی بلکہ جب مضطر ہوئے تو یوں ٹالدیا کہ اگر ہم چاہتے تو کہہ دیتے مگر ہم نے چاہا ہی نہیں لیکن اس کا فیصلہ ہر عاقل خود بخود سابقہ واقعات کو ملحوظ رکھ کر کر سکتا ہے، کہ کیا انہوں نے چاہا یا نہیں چاہا۔

بھائیو! کیا یہ ممکن ہے کہ خود تمام مصیبتیں برداشت کریں اور دوسروں کو بھی ہر ایک مصیبت میں ڈالیں، قرآن پڑھنے والوں کے خلاف بادشاہوں کے پاس جاکر مدد مانگیں، ہر قسم کی سازشیں کریں لوگوں کو قرآن سننے سے روکیں اور خود اقرار کریں کہ اس آواز سے ہماری عورتیں اور بچے مفتون ہوئے جاتے ہیں قرآن ان کے مذہبوں پر ایسی کاری ضرب لگائے، ان کی سرداریوں کو خاک میں ملا دے، ان کے کبر و نخوت کے طلسم کو توڑ دے ان کی معبودوں کی حکومت میں زلزلہ ڈالدے، ان کے جتھے توڑ ڈالے، انکی قوتیں پراگندہ کر ڈالے، بھائی کو بھائی سے، باپ کو بیٹے سے، میاں کو بیوی سے، دوست کو دوست سے، غرض آدمی کو کل محبوب چیزوں سے چھڑا کر صرف اپنا ہی والہ و شیدا بنالے، مگر وہ برق زبانی اور شیوا بیانیوں کے مدعی زبانیں سی کر اور

لبوں کو بند کر کے چپ بیٹھے رہیں۔ اور باوجود ایسے مذاب البیان اور قادر الکلام ہونے کے دو چار جملے بنانے کی خواہش بھی نہ کریں۔

قرآن کسی ایک آدمی یا کمیٹی کا بنایا ہوا کلام نہیں

جب کوئی بات نہ بن پڑتی تھی اور قرآن کے علوم کو محمد اُمّی صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات سے تطبیق نہ دے سکتے تو کہتے انما یعلمہ بشر۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قرآن کوئی دوسرا آدمی تعلیم دیتا ہے اور یہ اشارا ایک شام کے نصرانی کی طرف تھا اس کا جواب بھی قرآن نے ایسا دیا کہ دنیا پر واضح ہو گیا کہ یہ مقولہ بھی نہایت بے بسی کی حالت میں ان سے صادر ہوا تھا۔

لِسَانُ الَّذِیْ یُلْحِدُوْنَ	یعنی یہ لوگ کجروی سے جس شخص کی طرف قرآن کی
اِلَیْهِ اَعْجَمِیٌّ وَّ هٰذَا لِسَانٌ	نسبت کرتے ہیں اس کی زبان عجمی ہے اور یہاں ایک اکوشن
عَرَبِیٌّ مُّبِیْنٌ ۝	اور فصیح زبان عربی کے مقابلہ کا چیلنج دیا جا رہا ہے۔

جس سے بڑے بڑے قریشی عرب جان چراتے ہیں وہ عجمی غلام اسے کیا جانے کبھی کبھی بالکل ہی بدحواس ہو کر کہہ اٹھتے تھے۔

اِنْ هٰذَاۤ اِلَّاۤ اِفْكُ ِۨ افْتَرٰىهُ	یہ قرآن اس کے سوا کچھ نہیں کہ (معاذ اللہ) محمد صلعم
وَ اَعَانَهٗ عَلَیْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ۝	کی افترا ساختہ گھڑت ہے) جس کی تصنیف میں دوسری
	جماعت نے اس کی مدد کی ہو۔

دیکھو کس قدر مذبوحی حرکات ہیں بے ساختہ زبانوں سے نکل جاتا ہے کہ ایک انسان سے ایسا کلام ممکن نہیں کہ بن پڑے۔ ہو نہ ہو یہ کمیٹی کا کام ہو گا۔

اس کا جواب بھی مسکت اور دندان شکن دیتے ہوئے فرمایا۔

فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّ زُوْرًا ۝	اے ایسا ظلم اور دن دہاڑے ایسا سفید جھوٹ۔

اگر بالفرض ہمارے پاس کمیٹی ہے تو تم اس سے زیادہ آدمیوں کی کمیٹی بنا سکتے ہو تم کو تو تمام جن و انس کی کمیٹی بنانے کی اجازت دی ہے۔ پھر جب تمام انسانوں کے جمع کرنے کی تم کو اجازت دی گئی تو تم ہم سے دعوی کیا تھا اس کمیٹی کے تمام افراد بھی اگر تمہیں معلوم ہوں مانگ لو جو تمہارے کہنے کے موافق ہمارے پاس ہے اسلئے کہ وہ بھی انسانوں میں داخل ہیں جن کے جمع کرنے کی تمکو مہلت دی گئی ہے باوجود اس قدر وسعت اور آسانی بہم پہنچانے کے بھی اگر مقابلہ کلام ایزدی کا نہ کر سکے اور نہ کر سکو گے اور یہ بھی مطالبہ نہ کیا کہ تم فلاں فلاں آدمی کو ہمارے ساتھ دیدو جن پر تمکو خیال ہے کہ وہ کمیٹی کے ارکان ہیں تو سمجھ لو کہ یہ محض شرارت اور ظلم اور دروغ بے فروغ ہو گا کہ قرآن کی تصنیف کسی مجہول الحال کمیٹی سے منسوب کرتے رہو۔

قرآن کسی ایک شخص یا کمیٹی کا کلام نہیں ہو سکتا

پھر کیا کسی کمیٹی کا پنچایتی کلام ایسا ہو سکتا ہے؟ آپ نے بڑے بڑے فصیح البیان اور عمدہ بولنے والے بھی دیکھے ہونگے کیا کوئی ایسا لکچرار آپ کی نظر میں ہے جو ہر ایک مضمون کے بیان پر یکساں بولنے کی قدرت کر سکتا ہو کوئی آدمی ہر مضمون کے بیان پر یکساں قدرت نہیں رکھ سکتا۔ بلکہ بڑے بڑے قصیدوں میں وہ ہی چار اشعار منتخب ہوتے ہیں اس لئے کہ کسی متکلم کو ہر مضمون

پر پوری قدرت نہیں ہوتی چنانچہ علمائے ادب کا اعتراف ہے کہ امراؤ القیس گھوڑوں کی تعریف اچھی کرتا ہے نابغہ خوف و خشیہ میں اعشیٰ شراب کی طلب اور تعریف میں زہیر رغبت در جار میں اچھا لکھتا ہے۔ جیسے نظامی و فردوسی رزم و بزم میں سعدی وعظ و پند میں تفوق رکھتا ہے۔ لیکن دوسرے فن میں جا کر ان کی ساری جولانیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ بوستان میں ایک جگہ جنگ کی کہانی آگئی وہیں سعدی کی زبان سست پڑگئی بوستان کے پانچویں باب میں اس حکایت کو دیکھ لو کہ نظامی اور فردوسی کے مقابلہ میں سعدی کا کلام کس قدر پھسپھسا ہے کیونکہ رزمیہ کلام لکھنا سعدی کا فن نہیں تھا کسی مشہور سے مشہور شاعر کا دیوان، یا کسی مسلم سے مسلم عالم اور حکیم کی کتاب کیف ما اتفق اُٹھا کر پڑھ جاؤ اول سے آخر تک یکساں زور قائم نہیں رہ سکتا۔

قرآن کو اول سے آخر تک دیکھ لو کس قدر مضامین مختلفہ کی رو ہے، جو کہ نہایت روانی، سلاست آب و تاب اور شان و شوکت سے بہ رہی ہے اور ہر مضمون کو کس قدر اور جزالت و فصاحت کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے کہیں معاشی کا بیان ہے۔ نکاح و طلاق کے قواعد کی تعلیم ہے۔ کہیں فرائض میت تقسیم کی جاتی ہے کبھی نماز روزہ کا وعظ ہے کبھی جہاد کا بیان ہے لڑائی کے نقشے کھینچے جاتے ہیں کہیں سنین ماضیہ کے تاریخی واقعات ہیں، کبھی دلوں کو رلانیوالی پند و نصائح بیان کی جاتی ہے کبھی بہشت کا تحفہ سامنے ہے، کبھی دوزخ کا عذاب یہ سب کچھ ہے مگر طرز بیان میں کوئی سستی نہیں کمزوری نہیں انحطاط نہیں ہر موقع پر اقرار کرنا پڑتا ہے کہ اس کے مقابلہ سے تمام جن و بشر عاجز ہیں اور ہر جگہ زبان

پر آتا ہے کہ ع کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

اول سے آخر تک ایک ہی اسلوب اور ایک ہی طرح کا زور اور ایک ہی رنگ ڈھنگ اور سارے کلام کی یہ یکسانیت ہی پتہ دے رہی ہے کہ یہ کسی مخلوق یا کمیٹی کا کلام نہیں بلکہ یہ اس کا کلام ہے جس کی صفات سب کی سب کامل، غیر متبدل، لازوال اور نقص و فتور سے منزہ ہیں۔

وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا	اور اگر (قرآن) خدا کے سوا کسی اور کے پاس سے (آیا) ہوتا تو ضرور اس میں بہت سا اختلاف پاتے۔

خدائی کلام سے خدائی شان ٹپکتی ہے

پھر دیکھو اول سے آخر تک تمام مضامین نہایت شوکت اور کبریا و عظمت بھرے الفاظ اور زور دار لہجہ میں ادا کئے گئے، اگر یہ کلام اس بشر کا ہوتا جس کی زبان سے ہم تک پہنچا تو اس کی مظلومیت اور دشمنوں کی اس پر مختلف چڑھائیاں تو سب کو معلوم ہیں، ناممکن تھا کہ اس کلام کے اندر کہیں نہ کہیں ظالموں کے سامنے، تملق۔ خوشامد، مداہنت، بیچارگی اور مرعوب ہونیکے آثار موجود ہوتے جن کا نام و نشان بھی قرآن میں اول سے آخر تک موجود نہیں۔ بلکہ جس زور و شور اور خدائی شوکت سے شروع ہوا اسی تزک و احتشام اور زور کے ساتھ ختم ہوا۔

اگر کسی نے قرآن کا معارضہ کیا ہوتا تو اس کا ضائع ہونا محال ہے

ممکن ہے کوئی یہ کہہ بیٹھے کہ شاید قرآن کی نظیر پیش کی گئی ہو مگر وہ باقی

نہ رہی ہو تو میں کہتا ہوں کہ ایک مظلوم اور بے یار و مددگار کا کلام تو اب تک برابر موجود ہے مگر عرب کے بڑے بڑے رئیسوں بلکہ دنیا کے تمام باطل مذاہب و ملل کی دلی تمنا جس کلام سے پوری ہو جاتی وہ باقی نہ رہے۔ کیا اسے عقل سلیم باور کر سکتی ہے؟ پھر جب کہ موافقوں سے تعداد کہیں زیادہ ہو رہے زمین پر دشمن پھیلے پڑے ہوں جو ہر آن ایسی چیز کے تجسس میں آغاز اسلام سے آج تک ہے جو قرآن کی اس دعوی کو ٹھنڈا کر دے۔ مسیلمہ کذاب نے قرآن کے سامنے منہ چڑایا تھا وہ تاریخ میں موجود ہے۔ باوجودیکہ وہ بہت زیادہ گندا اور بدبودار اور رکیک اور خلاف تہذیب کلام ہے مگر وہ بھی اب تک باقی ہے۔ یعنی

الم تر ان اللہ خلق النساء افراجا فنولجھن ایلاجا۔

مورخوں نے لفظ لفظ کو محفوظ رکھا۔ جب ایسے رکیک اور ناشائستہ کلام کو بھی ضائع نہ ہونے دیا تو کسی اچھے کلام کو اور وہ بھی ایسا اچھا جو لفرض محال قرآن سے بھی اعلیٰ اور برتر ہو کس طرح ضائع کیا جا سکتا تھا اگر قرآن سے بہتر فصیح اور بلیغ کلام ادبی لٹریچر سے گم ہو گیا تو قرآن کا یہ دوسرا اعجاز ہو گا کہ وہ اپنے سے غالب اور قوی کو بھی اس طرح فنا کر ڈالتا ہو کہ آج صفحہ ہستی پر کوئی اس کو زبان پر لانے والا بھی نہیں۔

عربی نہ جاننے والے کسطرح قرآن کی فصاحت کو پہچان سکتے ہیں

شاید کہو گے کہ ہم تو عربی نہیں جانتے ہماری سمجھ میں کس طرح قرآن کا اعجاز آئے، تو یاد رکھو کہ ہر فن میں اس کے اساتذہ اور ماہرین کے فیصلہ کے آگے سر جھکانا پڑتا ہے پھر عربی زبان آج بھی زندہ زبان ہے۔ سنسکرت کی

طرح مردہ نہیں، بیروت، مصر، قاہرہ وغیرہ میں اس وقت بھی بہت سے ایسے نصاریٰ اور یہود موجود ہیں جن کے مقابلہ میں بڑے بڑے ادیب قلم نہیں اٹھا سکتے۔ انہوں نے عربی زبان میں عجیب و غریب کتابیں لکھی ہیں اگر تم نہیں جانتے تو جاؤ ان ہی سے کہو کہ ایک سورۃ قرآن کے جواب میں بنا کر دیدیں وہ بھی اسلام کے دوست نہیں۔ بلکہ تم سے بڑھ چڑھ کر اس کے دشمن ہیں ہر ممکن سعی سے وہ اسلام کو مٹانا چاہتے ہیں مگر یہ حوصلہ آج تک نہ کسی فرد کو ہوا نہ کسی انجمن کو کہ قرآن کے چہاردہ صد سالہ چیلنج کو منظور کرتا وہ اسی میں اپنی لیاقت اور عزت سمجھتے ہیں کہ اس طرف کا قصد نہ کریں تم بھی لاکھوں روپیہ شدھی سبھاؤں پر صرف کر رہے ہو جس طرح عیسائی اپنے مشنوں پر کروڑوں روپیہ لگاتے ہیں بغداد کی آریہ سماج کو لکھو کہ وہ وہاں کے مشنوں کو یہ مشورہ دے کہ سب مل کر قرآن کے جواب میں چند سطر لکھ کر شائع کر دیں مگر ہاں بعد میں ان کی فضیحت اور رسوائی کا ذمہ دار تم کو ہونا پڑے گا اس سے بڑھ یہ ہے کہ کوئی مضمون قرآن ہی سے لیلو اور اسی قدر مزایا اور لطائف کی رعایت کے ساتھ اپنی عبارت میں اس کو ادا کر دو جس قدر مزایا اور لطائف قرآن کی عبارت میں مرعی ہیں۔ قرآن کے پیرو تمکو بتلادیں گے کہ چراغ مردہ کو نور آفتاب سے کیا نسبت ہے۔

قرآن کا اصلی اعجاز اسکے انتہائی درجہ کی بلیغ نظم و اسلوب میں ہے

نزول قرآن کے وقت بعض لوگوں نے یہ بھی کہا تھا کہ یہ سب مخترعات ہیں۔

وَيَقُولُونَ افْتَرَىٰ عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا

جواب یہ ہے کہ (قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهِ مُفْتَرَيَاتٍ) اچھا اگر ہدایت کی باتیں نہ سہی تو تم بھی ایسی ہی مفتریات یعنی گھڑی ہوئی باتیں ایسے طرز بیان میں لے آؤ۔ محض ایک شاعرانہ مضمون کے ادا میں بھی بہت بڑا فرق ہوتا ہے ایک ہی خیال ہے جسکو شاعر ایک رنگ سے ادا کرتا ہے دوسرا اسی میں ایسی لطافت پیدا کرتا ہے کہ پہلے شاعر کا کلام اس کے سامنے ہیچ معلوم ہونے لگتا ہے۔

ذوق الملک الشعراء ہے ایک غزل میں لکھتا ہے کہ

آنکھ سے آنکھ ہے لڑتی مجھے ڈر ہے دل کا ✦ کہیں یہ جائے نہ اس جنگ و جدل میں مارا

اس خیال کو دوسرا شاعر مکند رام جس کا نام بھی شاید کسی کو معلوم ہو ایسی لطافت کے ساتھ ادا کرتا ہے کہ سخن شناسوں کو ناچار اسی کے حق میں فیصلہ دینا پڑا۔ کہتا ہے کہ

دل کی نہیں تقصیر مکند آنکھیں ہیں ظالم ✦ یہ جا کے نہ لڑتیں وہ گرفتار نہ ہوتا

دیکھو ذوق کا کلام مکند رام کے مقابلہ میں کیسا پھیکا پڑ گیا ہے اسی طرح فردوسی نے کہا تھا۔

جہاں را بلندی و پستی توئی ✦ ندانم چہ آنچہ ہستی توئی

نظامی نے اس کے مقابلہ میں فرمایا ؛۔

پناہ بلندی و پستی توئی ✦ ہمہ نیستند آنچہ ہستی توئی

پہلے مصرعہ میں پناہ اور دوسرے میں نیستند نے نظامی کے شعر کو فردوسی

کے شعر سے بلیغ اور بہت صاف کر دیا۔ فردوسی نے لکھا تھا ؛۔

زہے بارگاہ زافراسیاب ✦ زمشرق بمغرب کشیدہ طناب

نظامی کہتے ہیں ؛۔

زہے بارگاہ کہ چوں آفتاب ✦ زمشرق بمغرب کشیدہ طناب

دیکھو چوں آفتاب نے شعر کو کیسا مبرہن اور لاجواب بنا دیا ہے اور زافراسیاب کی ذکی ضرورت بھی نہ رہی اُردو میں قمر کا شعر ہے ؛۔

مرض ہجر مرا خاک ہوا اچھا تم سے ✦ خود مسیحا ہوا جی لو رہیں بیمار آنکھیں

جو ہر نے اس مضمون کو کس قدر خوبی سے ادا کیا ہے ؛۔

آپ سے اپنا مداوا بھی نہیں ہو سکتا ✦ کیسے عیسیٰ ہو کر جب دیکھو ہیں بیمار آنکھیں

آنکھوں کے ساتھ لفظ دیکھو دیکھنے کے قابل ہے ناسخ کہتا ہے۔

شکل نظر نہیں پڑی آیا نہیں پیام بھی ✦ عمر ہوئی کہ ایک سی حالت چشم و گوش ہے

غالب نے اس کو کس قدر چست اور لطیف بنا دیا۔ کہتے ہیں ؛۔

نے مژدہ وصال نہ نظارہ جمال ✦ مدت ہوئی کہ آشتی چشم و گوش ہے

ذوق نے کہا تھا۔

ہزار لطف جو ہیں ہر ستم میں جان کیلئے ✦ ستم شریک ہوا لون آسمان کیلئے

کسی استاد نے اسی مضمون کو اس طرح لکھا ہے۔

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستم گاری میں ✦ کوئی معشوق ہے اس پردہ زنگاری میں

سخن شناس سمجھتا ہے کہ دوسرا شعر اول سے باعتبار بڑکی الفاظ و حسن ادا و خوبی ترکیب بالاتر ہے اور الفاظ معشوق و پردہ زنگاری نے اس کے لطف کو

دو بالا کر دیا ہے مومن خاں کہتے ہیں۔

خونبہا قاتل بے رحم سے مانگا کس نے — کہ فرشتے مجھے یاں داغ و درم دیتے ہیں

اس کے مقابلہ میں ذوق کا کلام ملاحظہ ہو۔

حق بھی ماہی بریاں کہ و بیران قضا — داغ دیتے ہیں اسے جس کو درم دیتے ہیں

ظاہر ہے کہ شعر اول میں داغ درم دینا اور خونبہا مانگنا محض ادعا ہے اور دوسرے شعر میں داغ دینا اور صاحب درم ہونا ثابت ہے، دیکھو یہاں داغ اور درم کا مضمون لیکر ایسی طرح ادا کیا کہ پہلے کی نسبت شعر نہایت بلیغ ہو گیا۔ یہ چند نمونے ہم نے اس لئے پیش کئے ہیں کہ یہ ثابت ہو سکے کہ بعض شاعرانہ تخیلات اور مفروض و مخترع مضامین کے ادا میں بھی ترکیب کی بندش اور الفاظ کی چستی اور روانی اور دیگر لطائف و مزایا کی رعایت سے کس قدر فرق اور تفاوت ہو جاتا ہے، پس ہم اجازت دیتے ہیں کہ آج بھی سارے فصیح و بلیغ مل کر ایک دو قصے کہانیاں ہی ایسی عبارت میں پیش کر دیں جو قرآن کی کسی چھوٹی سے چھوٹی سورۃ کے مقابلے میں لطیف تر اور فصیح تر ہو کیا اس قدر سہولتیں ادا کرنے کے بعد بھی اگر مقابلہ عاجز رہے تو یہ اس کی دلیل نہ ہوگی کہ یہ کلام دنیا کے خالق اور مالک کا ہے۔

خدائی کام سے توحید اور خدائی کلام سے رسالت کا ثبوت

میں نے کہا تھا کہ خدائی کام بندوں کے کام سے اس طرح ممتاز ہوتا ہے کہ بندوں کو اس جیسے کام پر کوئی دسترس نہیں ہوتی اسی طرح اللہ کا کلام بھی بندوں کے کام سے الگ پہچانا جاتا ہے کہ ویسا کلام بنانا بندوں کے اختیار اور قبضہ

میں نہیں ہوتا قرآن کریم نے دونوں مضامین پر ایک ہی آیت میں تنبیہ فرمایا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً وَأَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَندَادًا وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ۝	تم کو اور تمہارے اسلاف کو اور تمہارے لئے زمین کا فرش، آسمان کی چھت اور بادلوں کی بارش درختوں کے پھل جس پروردگار نے بنائے اسی کی عبادت کرو اور اس کا مثل مت قرار دو۔

یعنی جب خدا کے کاموں کا کوئی مثل نہیں لا سکتا تو خدا کو بھی بے مثل ماننا ضروری ہے اسی طرح خدائی کلام کا مثل لانے سے جب سب عاجز ہوں تو اس کو خدا ہی کا کلام یقین کرنا ضروری ہو اور اسی لئے جو بندہ اس کلام کو لایا ہے اس کی تصدیق بھی ہوئی چنانچہ فرماتے ہیں۔

وَإِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ ۖ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ۝	اور وہ جو ہم نے اپنے بندے (محمد) پر (قرآن) اتارا ہے اگر تمکو اس میں شک ہو اور یہ سمجھتے ہو کہ یہ کتاب خدا کی نہیں بلکہ آدمی کی بنائی ہوئی ہے اور اپنے اس دعوے میں سچے ہو تو اسی جیسی ایک سورۃ تم بھی بنا لاؤ اور اللہ کے سوا اپنے حمایتوں کو بھی بلا لو۔

ممکن ہے کہ کسی کو یہ خلجان رہے کہ خدائی کاموں کو ہم بظاہر کسی فاعل مختار سے صادر ہوتے نہیں دیکھتے بخلاف اس کے خدائی کلام کو ہم ایک ذی شعور اور با اختیار متکلم انسان کی زبان سے سنتے ہیں اسی لئے ہمارے لئے یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ



کلام خواہ کتنا ہی اعلیٰ وارفع ہو ہم اسے متکلم کی طرف منسوب کر دیں جس کی زبان سے ہمارے کانوں تک پہنچ رہا ہے۔ لیکن اس کا یہ شبہ محض سطحی ہے۔ غور کیجئے کہ اگر ایک چھ سات سال کا دیہاتی بچہ آپ کے سامنے آئے جس کو کسی نے گلستان یا بوستان کا ایک یا عرفی یا قاآنی کا ایک قصیدہ یا حافظ شیرازی کی ایک غزل یا کسی اور بڑے عالم یا حکیم یا شاعر یا خطیب کا کوئی منتخب کلام یاد کرا دیا ہو وہ آپ کے روبرو نہایت صاف و صحیح لب ولہجہ میں اسے زبانی ادا کر دے اور فرض کرو کہ آپ کو یہ تعین نہ ہو کہ اصل کلام کس کا ہے تو کیا واقعی اس صورت میں آپ محض اتنا دیکھ کر کہ یہ کلام اسی بچہ کے کام و دہن سے نکل رہا ہے یہ یقین کر لیں گے کہ بے شک یہ کلام اسی بچہ کا تصنیف کیا ہوا اور اسی کے دل و دماغ کا نتیجہ ہوں کہ ایسا کلام بنا سکوں اور اسکے ساری بستی والے بھی موافق اور مخالف گواہ ہوں کہ اس بچہ نے کبھی قبل ازیں ایسی اعلیٰ تعلیم اور صحبت نہیں پائی، جو ایسا کلام تصنیف کرنے پر قادر کرے، کیا آپ ان سب حالات کی موجودگی میں بھی برابر یہی کہتے چلے جائیں گے کہ نہیں یہ سب اسی کی تصنیف ہے، کیونکہ بچہ ذی شعور با اختیار، بولنے والا انسان ہے اور اسی کے حلقوم سے ہم یہ آواز سن رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ پہلے درجہ کا بلید، احمق، جاہل اور متعصب بھی اس کی جرأت نہ کرے گا۔ تو ثابت ہوا محض اس قدر دیکھ لینے سے کہ ایک کلام ایک شخص کے کام و دہن سے نکل رہا ہے یہ یقین نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کلام اسی کا ہے خصوصاً جب کہ وہ اپنے سے نفی بھی کر رہا ہو اور اس کا ایک جھوٹ بھی عمر بھر ثابت نہ ہوا ہو اور اس کے حالات زندگی بھی نفی کی تائید

کرتے ہوں اور خود اس شخص کے کلام کا بڑا بھاری ذخیرہ (احادیث) بھی محفوظ اور مدون ہو اور اس میں کا کوئی حصہ باوجود غایت درجہ کی فصاحت و بلاغت کے اس کلام کے کسی حصہ کی ہمسری نہ کر سکتا ہو اور ساری دنیا ویسا کلام پیش کرنے سے تھک چکی ہو اندریں حالات آپ ہی فیصلہ کریں کہ ایک ایماندار طالب حق کو کیا یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ:

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود — گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

لاریب اس کی یہی شان ہے۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُّوحٰى — بلکہ یہ (قرآن) جو پڑھ کر سناتے ہیں وحی (آسمانی) ہے جو ان پر نازل ہوتی ہے۔

اور بلاشبہ قرآن کا لانیوالا وہی نبی ہے جس کی نسبت سینکڑوں برس پہلے خبر دی گئی تھی کہ خدا اس کے منہ میں اپنا کلام ڈالے گا۔

نزول قرآن کیوقت نبی کی کیفیت

قرآن جس وقت اترتا تھا یا بالفاظ دیگر حبیب خدا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبان سے بولتا تھا اس وقت آپ کے حالات بھی عام تکلم اور خطاب کے حالات سے بالکل ممتاز اور جداگانہ ہوتے تھے کیونکہ بشری کالبد کو خدائی صفت کا مظہر بننا پڑتا تھا اور تمام روحانی قوتیں اور ملکوتی طاقتیں جو وحی الیہ میں فطرۃً ودیعت کی جاتی ہے اس مادی عالم سے یکسو ہو کر ملاء اعلیٰ اور عالم الغیب کی طرف سمٹ جاتی تھیں تو بشری خصائص اور ملکوتی قوی کے تجاذب اور



تصادم سے قدرتی طور پر ایسے وقت میں وہ آثار نبی موحی الیہ کے جسم پر طاری ہوتے چاہئیں جو عام حالات و اوقات سے مبائن ہوں چنانچہ سیرت نبوی اور احادیث کا مطالعہ کرنیوالوں سے یہ چیزیں پوشیدہ نہیں ہیں باقی تمام اوقات میں جو مکالمات و مخاطبات نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہوتے تھے ان میں ایسے آثار و علائم کا نام و نشان نہ تھا کیونکہ اس وقت ایک بشر کا کلام تھا جو اسی کی زبان سے ادا ہو رہا تھا۔ گو جن علوم و مطالب پر وہ کلام مشتمل ہوتا تھا۔ وہ کیسے ہی صادق اور عمیق بلکہ الہامی ہوں۔

قرآن کی تلاوت کا اثر خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر

جس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کی تلاوت فرماتے تھے یا کسی دوسرے سے سنتے تھے تو آپ خود بھی اس قدر متاثر نہ ہوتے تھے کہ خود اپنے کلام کو پڑھ کر اتنا متاثر ہونا عادۃً متصور نہیں آپکا چہرہ خوف سے متغیر ہو جاتا، آنکھیں بہنے لگتیں۔ گریہ طاری ہو جاتا راتوں کو جب کہ مخلوق بستر استراحت پر آرام کرتی تھی، آپ خدا کے سامنے کھڑے ہو کر قرآن پڑھتے حتٰی کہ پاؤں سوج جاتے اور قدموں کا ورم دیکھ کر لوگ رحم کھاتے اور آپ فرماتے اَفَلَا اَکُوْنُ عَبْدًا شَکُوْرًا ایک ہی آیت کو کئی کئی بار پڑھتے اور روتے تھے۔ غرض قرآن کا جو اثر آپ کی زبان سے سننے والے صحابہ قبول کرتے تھے اُن سے زائد آپ پر ہوتا تھا۔ ایک صاحب بصیرت جو خوفِ خدا کی ذراسی بھی رمق دل میں رکھتا ہو اتنی ہی بات سے قرآن کی نسبت ایمان لا سکتا ہے کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف نہیں

ہے اور نہ وہ کسی ایسے بشر یا کمیٹی کی تصنیف ہے جن کا نام اور حال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ساری عمر مخفی رکھا ہو۔

قرآن کا اثر سامعین پر کیا ہُوا

قرآن نے اس قوم پر کیا اثر ڈالا جس نے اسے نو بنو اور تازہ بتازہ پیغمبر صلعم کی زبان مبارک سے سنا تھا اس سوال کا جواب تاریخ کے ان درخشاں واقعات میں سے ہے جن کا اعتراف دوست اور دشمن ہر ایک کو کرنا پڑا ہے۔ دنیا نے جب سے جنم لیا، آسمان نے جب سے سایہ ڈالا، زمین نے جب سے اپنی پشت پر اولاد آدم کو اٹھا لیا، کبھی ایسا عظیم ایسا سریع، ایسا محیر العقول انقلاب چشم فلک نے نہیں دیکھا ہوگا۔ جیسا بے مثال انقلاب عرب کی حالت میں بلا واسطہ اور سارے ربع مسکون کی روحانی حالت میں بالواسطہ اس بے مثال خدا کے اتارے ہُوئے بے مثال قرآن کی بے مثال تعلیم سے نمودار ہُوا۔

صاحب آیاتِ بینات لکھتا ہے کہ قرآن حکیم ایک ایسے زمانہ میں اترا جبکہ دنیا ایک عجیب روحانی سکتے کی حالت میں تھی اور آپ ایسے ملک میں مبعوث ہُوئے جہاں اخلاقی تعلیم کا کچھ سامان نہ تھا اور ایسی قوم کی اصلاح آپ کے ذمہ کی گئی جو سوائے اوہام اور فاسد عقیدوں اور باطل خیالات اور غلط رایوں اور وحشیانہ اعمال اور بد اخلاقی اور نفاق اور جنگجوئی کے کسی قسم کی اخلاقی خوبی نہ رکھتے تھے مگر آپ کے الہامی بیان اور خدائی قوت نے ان پر ایسی عجیب غریب تاثیر کی کہ اس سے اُن کی تمام ظاہری و باطنی حالتیں بدل گئیں، برسوں کے بہکے ہُوئے خدا کی

راہ پر چل نکلے اور مدتوں کے سوتے ہوئے غفلت کی نیند سے چونک پڑے جو مشرک تھے وہ موحد ہو گئے، جو کافر تھے وہ ایمان لائے جو بت پرست تھے وہ بت شکن بن گئے جو گمراہ تھے وہ خدا کی راہ دکھاتے جاہلانہ حمیت اور وحشیانہ عصبیت کا ان میں نام نہ رہا، خاندانی جھگڑے اور پشتینی عداوتیں جاتی رہیں۔ دماغ نخوت و غرور سے خالی ہو گئے اور ان کے دل صبر و توکل حلم بردباری، زہد و پرہیزگاری اور جمیع اخلاقی صفات سے بھر گئے، آپ کی تعلیم و ہدایت نے ایک ایسا گروہ خدا پرست پاک طبیعت، راست باز، نیک دل لوگوں کا قائم کر دیا جن کی کوششوں سے شرک و بت پرستی کی آواز جو تمام جزیرہ نمائے عرب میں گونج رہی تھی بند ہو گئی اور اس کے بدلے ایک بیچوں و بیچگوں بے شبہ و بے نموں خدا کی منادی پھر گئی۔ بتوں نے عدم کا راستہ لیا۔ بت خانوں کا نشان مٹ گیا، آتش کدے ٹھنڈے پڑ گئے، تثلیث کا طلسم ٹوٹ گیا، اوہام پرستی کا باطل خیال باطل ہو گیا۔

جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ — حق ظاہر ہو گیا اور باطل مغلوب اور بلاشبہ
اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا — باطل مغلوب ہی ہو کر رہتا ہے۔

کیا اس سے اس امر کا مشاہدہ اور درخشاں ثبوت نہیں ملتا کہ آپ حقیقت میں سچے رسول اور خدا ہی کی طرف سے موید تھے ورنہ انسان کا کام نہ تھا کہ وہ ایسا انقلاب عظیم عرب کی روحانی اور اخلاقی عادت میں پیدا کر دیتا اور ایسے جنگجو ستم پیشہ لوگوں کو جو بات بات پر لڑتے اور جھگڑتے تھے، اخوت کے ایک رشتہ میں باندھ دیتا اور ان کی پشتینی عداوتوں اور کینوں سے ان کے دلوں

کو ایسا صاف کر دیتا کہ اس کا کچھ اثر باقی نہ رہتا، بلکہ دنیا میں ان کو اخلاق اور انسانیت کا نمونہ بنا دیتا۔ سرور کائنات صلعم کی ہدایت کی ایسی عجیب و غریب تاثیر اور ایسے حیرت انگیز نتائج کو دیکھ کر منکرین بھی اس بات کے معترف ہیں کہ درحقیقت یہ بات بشری قدرت سے خارج تھی جس کی وجہ تھا کہ کبھی کسی نے نہیں پائی، کوئی لکھتا ہے کہ قرآن ہی کی تعلیم کا یہ اثر ہے کہ عرب کے رہنے والے ایسے بدل گئے۔ جیسے کسی نے سحر کر دیا ہو متعصب سے متعصب عیسائیوں کا یہ اقرار ہے کہ دین مسیحی کی ابتدائے آنحضرت صلعم کے وقت تک کبھی حیوۃ روحانی ایسی برانگیختہ نہیں ہوئی تھی جیسی کہ اسلام کی تعلیم سے ہوئی۔

خدا نے جس سے کلام کیا یعنی اس پر اتارا اس کی فہم و اخلاق کا کیا حال تھا؟

اب قرآن کے کلام الٰہی ہو سکنے پر ایک اور طرف سے بھی غور کرو۔ وہ یہ کہ خداوند اکبر نے جس کی زبان سے کلام کیا اس کی فطرۃ کیسی تھی، پیدائشی طور پر اس نے دل و دماغ کیسا پایا تھا، فہم کے ساتھ، اخلاق کیسے تھے کس قسم کے ہوش و حواس تدبیر و تیقظ انسانی ملکات باطنی خصائل ظاہری شمائل پردہ سطور مخلوق ہوا تھا، دنیا کے چھوٹے چھوٹے راجہ اور سلاطین بھی باوجودیکہ وہ ہم ہی جیسی انسان ہیں، تھوڑی سے فانی عزت اور ناپائدار خودداری کے تخیل میں ہر کس و ناکس کو منہ نہیں لگاتے، نہ ہر ایک کو اپنی مسند قرب ہمنشینی پر جگہ دیتے ہیں نہ ہر ایک کو ہم کلامی کا شرف بخشتے ہیں نہ ہر ایک کی زبان سے بولتے اور

تقریر کرتے ہیں، مخصوص اشخاص ہوتے ہیں جن کو مجالست اور ہمکلامت اور ترجمانی کا حق دیا جاتا ہے یا بطور معتمد خاص یا قائم مقام خاص کے نامزد کرتے ہیں، ہر انگریز وائسرائے نہیں بنا دیا جاتا، ہر ترک پاشا نہیں ہوتا، ہر سویلین کا یہ درجہ نہیں کہ وائسرائے سے بلاواسطہ گفتگو کر سکے ٹھیک اسی طرح سمجھ لو کہ ہر ایک انسان خدا کا مکلم یا رسول اللہ یا نبی یا اس احکم الحاکمین کا نائب السلطنت بنائے جانے کے قابل نہیں۔

اَللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ ۔	خدا جس جگہ اپنی پیغمبری کی امانت سپرد کرتا ہے وہ اس جگہ کی محفوظ اور قابل اطمینان ہونے کو بھی خوب جانتا ہے۔

اس بات کا تفصیلاً ذکر کرنا کہ کس قسم کے نفوس حق تعالیٰ شانہ، کی ہمکلامی سے مشرف ہو سکتے ہیں میرے لئے مشکل ہے اور وقت بھی اجازت نہیں دیتا کہ میں ایسی لمبی بحث کو چھیڑوں اور اپنی بضاعت اور کفایت کے قدر اس کے متعلق کتاب العقل والنقل؎ میں عرض بھی کر چکا ہوں لیکن اجمالاً اس قدر گذارش کر دینا مناسب ہے کہ جو شخص منصب نبوت پر فائز کیا جائے۔ ضروری ہے کہ فطری طور پر اس کی دماغی قویٰ اور قلبی ملکات اور عام اخلاقی حالات تمام اقران سے اعلیٰ وارفع ہوں، فہم و دانش عزم و استقلال، صبر و ثبات خلوص نیت، ہمدردی خلائق، محنت، جفاکشی اور خدا کی اطاعت و وفاداری کے جذبہ سے اس کا ظاہر و باطن رنگا ہوا ہو۔ کوئی شخص یہ خیال نہیں کر سکتا کہ ان ملکات اور قویٰ کے فقدان کی صورت میں خدا کے

؎ یہ کتاب اب دوبارہ پاکستان میں زیر طبع ہے۔ ملنے کا پتہ ادارہ اسلامیات ۱۹۰ انارکلی لاہور

قادر و توانا جس کا علم ازلی تمام ما کان و ما یکون کو محیط ہے اپنی بھاری ذمہ داری اور نیابۃ الٰہیہ اور امانت عظیمہ کو کیف ما اتفق کسی معمولی انسان کے سپرد کر دیگا قرآن کے لانیوالے کی سیرت (لائف) کو جب ہم اس معیار پر کستے ہیں تو ہمکو ناگزیر اقرار کرنا پڑتا ہے کہ آج تک جتنے آدمیوں کی نسبت ملہم اور مکلم ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہے ان سب میں زیادہ اقدام واحق اور اس منصب جلیل کا باعتبار اپنے فوق العادۃ قوائے عقلیہ وعملیہ کے دنیا کا وہ سب سے بڑا انسان ہی ہو سکتا ہے جس کو ہم نبی اُمی اور پیغمبر عربی کے مشہور اور معروف لقب سے یاد کرتے ہیں فداہ وامی اللھم صلی علی سیدنا و مولانا محمد و آلہ و اصحابہ و بارک وسلم۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرۃ اور حالات زندگی اور حضور کی بعثت کا ایک ایک لمحہ ان ضخیم اور مستند کتابوں میں محفوظ ہے جن سے بڑھ کر روایت کے ہاتھ میں کوئی قابل اعتبار اور باوثوق ذخیرہ نہیں ہے آپ کے پیرؤں نے آپ کی سوانح زندگی اور تمامی اقوال و افعال اور حرکات و سکنات کو اس قدر اہتمام و استیعاب و دیانت، تیقظ اور شغف سے محفوظ رکھا کہ وہ ایک مستقل فن بن گیا بلکہ اس فن سے پھر کئی فن نکل آئے۔ غالباً کسی اُمت نے اپنی آسمانی کتاب کی بھی حفاظت اتنی نہ کی ہوگی۔ جس قدر اُمت محمدیہ نے اپنے پیغمبر کے حالات کی کی اور بیشک ایسے نبی کے حالات کی جواب دہی مذہب اور نہ منسوخ ہونے والا کلام لے کر آیا ایسی ہی حفاظت ہونا چاہیئے تھی تا مرور دھور کے بعد بھی کوئی شخص اس ہدایت کے قبول کرنے سے مُنہ نہ پھیر سکے جسے لیکر آپ تشریف لائے تھے اور یہ حیلہ نہ بنا سکے کہ ہم کو ملہم کے حالات ہی جب معلوم نہیں تو ہم کس طرح پورا پورا

اطمینان کر سکتے ہیں کہ خدا کا کلام لانے والا ویسی ہی عظمت وشان کا انسان تھا جو اس عہدہ جلیلہ کے لئے ضروری ہے۔ حدیث اور سیر کی بیشمار کتابوں کی تلخیص میں اس جگہ نہیں کر سکتا البتہ آنحضرت صلعم کے اعلیٰ فہم اور اعلیٰ اخلاق کے متعلق ایک دو چیزیں اپنے رسالہ الاسلام سے نقل کرتا ہوں جو اس موقع پر انشاء اللہ کفایت کریں گی۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوۃ اخلاقی وعقلی

عرب کی جہالت درشت مزاجی کو کون نہیں جانتا جس قوم میں ایسی جہالت ہو کہ کوئی کتاب اُن کے پاس آسمانی ہو نہ زمینی اور اُن کے اخلاق کا یہ حال کہ قتل وغارت وغیرہ ایک معمولی حرکت ہو۔ عقل و فہم کی یہ کیفیت کہ پتھروں کو اٹھا لائے اور پوجنے لگے اور گردن کشی کی یہ صورت کہ کبھی کسی بادشاہ کی اطاعت قبول نہ کریں جفاکشی کی یہ نوبت کہ ایسے ملک میں شاد وخرم زندگی گذار دیں، ایسے جاہلوں اور خود سروں کو راہ پر لانا ہی دشوار تھا چہ جائیکہ علم الہیات، علم عبادات، علم اخلاق، علم سیاست، مدن میں حکمار نامدار بنا دیا۔ یہاں تک کہ دنیا نے ان کی اور ان کے شاگردوں کی شاگردی کی ڈاکٹر گستاؤلیبان کہتا ہے ”اس پیغمبر اسلام، اس نبی اُمّی کی بھی ایک حیرت انگیز سرگذشت ہے جس کی آواز نے ایک قوم ناہنجار کو جو اس وقت تک کسی ملک گیر کے زیر حکومت نہیں آتی تھی رام کیا اور اس درجہ تک پہنچایا کہ اس نے عالم کی بڑی بڑی سلطنتوں کو زیرو زبر کر ڈالا اور اس وقت تک بھی وہی نبی اُمّی اپنی قبر کے اندر سے لاکھوں بندگانِ خدا کو کلمہ اسلام پر قائم رکھے ہوئے ہے اگر انصاف کرو تو آپ کے حسنِ اخلاق کا اندازہ کرنے کے لئے یہی کافی ہے کہ

آپ نہ کہیں کے بادشاہ تھے نہ بادشاہ کے گھرانہ میں پیدا ہوئے تھے نہ کچھ مال و دولت آپ نے جمع کر رکھا تھا، نہ باپ دادا نے کوئی اندوختہ میراث میں چھوڑا تھا، نہ آپ کے پاس تنخواہ دار فوج تھی، نہ اہل وطن آپ کے ہمراہ تھے، نہ قبیلہ والوں کو آپ کے مذہب سے ہمدردی تھی ایسی بیکسی اور بے بسی کی حالت میں آپ نے ان تند خو گنواروں کو ایک ایسی صدائے نامانوس سے مخاطب کیا کہ جس سے بڑھ کر اسوقت ساری دنیا میں کوئی مکروہ آواز نہ سمجھی جاتی تھی اور نہ ایسی صدا دینے والے سے زیادہ ان کے نزدیک کوئی ان کا دشمن اور بدخواہ سمجھا جا سکتا تھا یہ وہی لا الٰہ الا اللہ کی آواز تھی کہ جس نے دفعۃً تمام عرب میں تہلکہ ڈالدیا جس سے باطل معبودوں کی حکومت میں بھونچال آنا شروع ہو گیا اور جس کی چمک سے اس کفر و جہالت کی تاریکیوں میں بجلی سی کوند گئی گویا وہ ایک زور شور کی ہوا تھی جس کے چلتے ہی شرک و بت پرستی کے بادل چھٹ گئے اور آفتاب توحید ابر کے پردہ سے باہر نکل آیا یا ابابیل رحمت تھی جس کی بوچھار نے مخلوق پرستی کے سیاہ ہاتھیوں کے پرخچے اڑا دیئے اور خدا کے گھر کو ان کی زد سے بچا لیا۔ غرض کہ ایک ایسے بے یار و مددگار نے ایسی سخت قوم کو ایسی ظلمت کے زمانہ میں ایسے اجنبی مضمون کی طرف ابھارا اور تھوڑے عرصہ میں ان سب کو ایسا مسخر اور گرویدہ بنا لیا کہ جہاں آپ کا پسینہ گرے وہاں اپنا خون گرانے کے لئے تیار ہو گئے گھر بار کو ترک کر دیا، زن و فرزند سے بگاڑ لی، مال و دولت کو سنگریزوں سے حقیر سمجھا، اپنے بیگانوں سے آمادہ جنگ و پیکار ہوئے کسی کو آپ نے مارا، کسی کے ہاتھ سے آپ مارے گئے، پھر وہ چار روزہ ولولہ نہ تھا، بلکہ آپ کے بعد اسی

حالت پر استقلال کے ساتھ جمے رہے، یہاں تک کہ قیصر و کسریٰ کے تخت الٹ دیئے فارس و روم کو تہ و بالا کر دیا اور اس پر معاملات میں وہ شائستگی رہی کہ کسی لشکری نے سوائے مقابلہ جہاد کسی کی ایذا رسانی یا ہتک ناموس کو گوارا نہ کیا یہ تسخیر اخلاق بتلائیے اس سے پہلے یا اس کے بعد کسی سے ظاہر ہوئی ہے، یہ تو آپ کے اخلاق کی حالت تھی باقی آپ کی عقل و فہم کا نشان سب سے بڑا یہی ہے کہ آپ بذاتِ خود اُمّی محض جس ملک میں پیدا ہوئے، جہاں ہوش سنبھالا بلکہ ساری عمر گذاری علوم سے یک لخت خالی نہ وہاں علوم دینی کا پتہ نہ دُنیاوی کا نشان، پھر اس پر ایسا دین ایسا آئین ایسی کتاب لاجواب اور ایسی آیات بینات لائے کہ آج تک بڑے بڑے حکمار اس کا جواب نہیں لا سکے بلکہ بڑے بڑے مدعیان عقل و تہذیب نے اس کی داد دی، قرآن جیسا زندہ اور علمی معجزہ کسی پیغمبر کو دیا گیا جس کا مقابلہ کیا باعتبار فصاحت و بلاغت کے اور کیا باعتبار علوم و مضامین کے اور کیا باعتبار تحریف و تبدیل سے محفوظ رہنے کے دنیا کی کوئی کتاب نہیں کر سکتی اور دانشاء اللہ تعالیٰ کر سکے گی۔

قرآن کے حق میں ہم اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ خود قرآن تیرہ سو برس سے پکار پکار کر کہہ رہا ہے، یعنی یہ جس میں ہمت ہو وہ میرا جواب لکھدے مگر آج تک کسی کا حوصلہ نہ ہوا اور نہ ہو کہ اس کی ایک چھوٹی سی سورۃ کی مثال بھی پیش کر سکے اب میں اس کے سوا کیا کہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جیسا کہ اپنی عادت و اخلاق میں تمام انبیاء علیہم السلام سے فائق تھے ایسے ہی علوم کے بھی سارے مراتب آپ پر تمام کر دیئے گئے تھے۔ کیونکہ انبیاء سابقین میں نہ ایسا

اعجاز علمی کسی کو دیا گیا نہ ان کے اتباع میں کسی نے ان علوم کے دریا بہائے ہیں جو اہل اسلام نے بہائے ہیں اور جب کہ صفت علم تمام ان صفات کی خاتم ہے جو مربی عالم میں ہیں تو جس کا اعجاز علمی ہو گا گویا اس پر تمام کمالات علمی کا خاتمہ کر دیا جائے گا اور اسی کو ہمارے نزدیک خاتم الانبیاءؑ کہنا مناسب ہو گا اور چونکہ اس کا دین قیامت تک رہیگا اسلئے اسکی کتاب کا بھی تا قیامت باقی رہنا ضروری ٹھہرے گا۔

قرآن کریم کی حفاظت

پس جس طرح قرآن کی ہر ایک ادا انوکھی اور ہر ایک شان نرالی ہے ضروری ہوا کہ اس کی حفاظت بھی بالکل نرالے طریقہ اور نئے رنگ ڈھنگ سے ہو اور چونکہ وہ محض خدا کی کتاب ہی نہیں بلکہ اس کا کلام معجز ہے اس لئے نہ صرف اس کے مطالب اور علوم بلکہ اس کی عبارت اور الفاظ بھی تغیر و تبدیل سے مصئون و مامون رہے بظاہر یہ ایک ایسا مشکل اور اہم اور پر صعوبت مقصد تھا کہ اگر اس کا انصرام صرف ناتواں بندوں کی مرضی، ہمت، تدبیر اور انتظام کے حوالہ کر دیا جاتا اور ایک خاص قسم کی توفیق ربانی ان کی مدد نہ کرتی تو کسی طرح اسکا سرانجام آسان نہ تھا لیکن اس سے پہلے کہ بندے اس کی حفاظت کے سامان مکمل کرتے خود قرآن اتارنے والے نے بڑے موکد اور قطعی عنوان سے اس کا تکفل فرما لیا چنانچہ اسی وقت جب کہ کسی انسان کو یہ یقین کر لینے کیلئے بظاہر کچھ اسباب موجود نہ تھے کہ قرآن بھی معاذ اللہ کچھ زمانے کے بعد ویسے ہی غلط اور محرف ترجموں کی صورت میں باقی نہ رہجائے گا جس میں کہ توراۃ و انجیل موجود

ہیں صاف صاف اعلان فرمادیا گیا کہ:۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝	بیشک ہم ہی نے قرآن اتارا ہے اور بیشک ہم ہی اس کے نگہبان بھی ہیں۔

یہ وعدہ الٰہی ایسی صفائی اور حیرت انگیز ذرائع سے پورا ہو کر رہا جسے دیکھ کر بڑے بڑے متعصب اور مغرور مخالفوں کے سر بھی نیچے ہو گئے جس طرح قرآن کی بے نظیر فصاحت وبلاغت کے آفتاب نے لمبے چوڑے دعوے کرنیوالوں کی آنکھیں خیرہ کر دیں اسی طرح اس کی بے مدیل حفاظت و خدمت نے بھی ایک مرتبہ اور تاریخ کو اپنی مثال پیش کرنے سے عاجز کر دیا۔ ہر زمانے میں ایک جم غفیر علماء کا جن کی تعداد اللہ ہی کو معلوم ہے ایسا رہا کہ جس نے قرآن کے علوم ومطالب اور غیر منقضی عجائب کی حفاظت کی کاتبوں نے رسم الخط کی، قاریوں نے طرز ادا کی، حافظوں نے انکے الفاظ اور عبادت کی وہ حفاظت کی کہ نزول قرآن کے وقت سے آج تک ایک زبر یا زیر تبدیل نہ ہو سکا کسی نے قرآن کے رکوع گن لئے کسی نے آیتیں شمار کیں۔ کسی نے حروف کی تعداد بتلائی حتیٰ کہ بعض نے ایک ایک اعراب اور ایک ایک نقطہ کو شمار کر ڈالا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک سے آج تک کوئی لمحہ اور کوئی ساعت ایسی نہیں بتلائی جا سکتی جس میں ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد حفاظ قرآن کی موجود نہ ہو جنہوں نے کاغذ کے اوراق میں نہیں جو مٹ جانے اور جل جانے کا امکان رکھتے ہیں سیاہی کے نقوش میں نہیں جن کے محو اور مشکوک ہو سکنے کا احتمال ہے لکڑی اور لوہے کے صندوقوں میں نہیں جن کے کھوئے جانے یا ٹوٹ جانے کا اندیشہ

ہے بلکہ اپنے دلوں کے اوراق میں اور سینوں کے صندوقوں میں بڑی احتیاط اور خبرداری سے محفوظ رکھا۔

بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ۔	مگر جن لوگوں کو عقل دی گئی ہے انکے عقیدہ میں تو یہ قرآن ایسی کھلی کھلی آیتیں ہیں کہ کوئی منصف مزاج ان سے انکار نہیں کر سکتا۔

خیال کرو کہ آٹھ دس سال کا ہندوستانی بچہ جسے اپنی مادری زبان میں دو تین جزو کا رسالہ یاد کرانا دشوار ہے وہ ایک غیر ملکی زبان کی اتنی ضخیم کتاب کو جو متشابہات سے پر ہے کس طرح فرفر سنا دیتا ہے رمضان المبارک میں اسلامی مساجد کا وہ سین دیکھنے کے قابل ہے جب چھوٹے چھوٹے بچے اپنی ننھی آواز اور معصومانہ لہجہ میں قرآن شریف سنا کر سامعین کے دلوں کو وجد میں لے آتے ہیں پھر کسی مجلس میں ایک حافظ سے کوئی حروف چھوٹ جائے یا اعراب کی فروگذاشت ہو جائے تو چاروں طرف سے تصحیح کرنیوالے للکارتے ہیں یہ ممکن ہی نہیں کہ پڑھنے والے کو غلطی پر قائم رہنے دیں۔ ان حالات کو سامنے رکھ کر تاریخ سے دریافت کرو کہ کیا قرآن کے سوا کبھی دنیا میں کسی اور کتاب کی بھی اس قدر حفاظت اور خدمت ہوئی ہے، میں یقین کرتا ہوں کہ کتنا ہی بڑا نکتہ چینی کرنیوالا کیوں نہ ہو اس قدر انصاف کشی نہ کرے گا کہ وہ قرآن کی اس بے مثال حفاظت میں بھی شبہ اور کرنے لگے باقی ایسے سوفسطائیوں سے میرا خطاب نہیں جو محسوسات اور مشاہدات میں بھی لاادری کہنے سے دریغ نہ کریں۔

قرآن کریم کی تعلیم

قرآن کریم نے تمامی ابواب ہدایت کے متعلق جو کچھ تعلیم دی ہے اس کی پوری تفصیل کسی انسانی بیان میں کہاں سما سکتی ہے قرآنی علوم کا دریائے ناپیدا کنار کس کی مٹھی میں آ سکتا ہے اور کس کی طاقت ہے کہ وہ اس رب العزت کے سمندر کو ایک کوزہ میں بند کر سکے لیکن قرآن کے اعجازوں میں سے شاید یہ بھی ایک اعجاز ہے کہ وہ جس قدر مشکل ہے اسی قدر آسان بھی ہے جتنا طویل و عریض ہے اتنا ہی مختصر بھی ہے یعنی جس طرح وہ ایک بڑے سے بڑے روشن دماغ حکیم کا پیٹ حکمتوں سے بھر دیتا ہے اسی طرح ایک وحشی سے وحشی انسان کی پیاس بھی اپنے چشمۂ ہدایت سے بجھا سکتا ہے، میں اس وقت قرآن کے علوم و معارف کا تھوڑا سا اندازہ کرنے کے لئے بڑے بڑے کتب خانوں اور درسگاہوں کا حوالہ نہیں دیتا بلکہ ایک بہت ہی سہل طریقہ بتلاتا ہوں کہ مضامین روحانیت اور ابواب ہدایت میں سے جو مضمون اور باب چاہو لے لو اور جتنی کتابیں آسمانی ہونے کی مدعی ہیں ان میں صرف ایک باب سے متعلق جو تعلیمات ہیں ہر ایک مذہب والا انتخاب کر کے پیش کر دے انسانی کتابوں اور آراء سے کوئی اضافہ نہ کیا جائے۔ جو کچھ ہو آسمانی کتاب کے حوالے سے مع اصل عبارت کے ہو اور عبارت کا صحیح ترجمہ ملکی زبان میں کر دیا جائے اس کے بعد وہ سب تحریریں کسی ایک متفق علیہ حکم کے سامنے یا اگر یہ نہ ہو سکے تو عام پبلک کے روبرو پیش کر دی جائیں بیک نگاہ سب کے سامنے آنے سے دنیا خود فیصلہ کر

لے گی کہ کس کتاب کی تعلیم اس باب میں زیادہ جامع، زیادہ موثر، زیادہ مبرہن زیادہ قابل قبول ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ اس سے بڑھ کر آسان اور بے تکلف صورت تعلیمی موازنہ کی اور کوئی نہ ہو گی۔ ؏

بس ایک نگاہ پہ ٹھہرا ہے فیصلہ دل کا

قرآنِ کریم میں اللہ جل شانہٗ کے کمالات و صفات کا بیان اور ذکر اللہ کی کثرت

مولانا مولوی فیروز الدین صاحب ڈسکوٹی اپنے رسالہ میں لکھتے ہیں۔

"پھر ایک بڑی بھاری دلیل قرآن شریف کے کلام الٰہی ہونے کی یہ ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی صفات کاملہ کو نہایت اعلیٰ طور پر بیان کیا گیا ہے و کلام الٰہی کا خاصہ ہے کہ اس میں خالق کائنات کی تمام صفاتِ کاملہ بڑی شان و شوکت کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی عظمت و شان اور اس کی صفات کاملہ ایسے طور پر مذکور ہوتی ہیں کہ دنیا کی کوئی کتاب اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کاملہ ایسے ڈھنگ سے بیان ہوئی ہیں کہ اس خصوصیت میں دنیا کی کوئی کتاب اس کا مقابلہ ہرگز نہیں کر سکتی بات بات میں اللہ تعالیٰ عظمت و شان جھلکتی ہے اور اس کی الوہیت، ربوبیت، خالقیت، رحمانیت اور قدوسیت اعلیٰ سے اعلیٰ طور پر جلوہ گر ہوتی ہے۔ سارا کلام الٰہی اسماء حسنیٰ اور صفاتِ کاملہ رب العالمین سے بھرا پڑا ہے۔ چنانچہ قرآن شریف میں خدا تعالیٰ کا ذکر اور اس کا نام اس کثرت سے آتا ہے کہ دنیا کی کوئی کتاب

اس کے ساتھ مقابلہ نہیں کر سکتی۔ گویا قرآن شریف جا بجا خدا کا نام یاد کرنے کے لئے ایک بہانہ اور موقع ڈھونڈتا ہے۔ قرآن شریف کا کوئی صفحہ الٹاؤ اس کا کوئی حصہ پڑھو اس میں اللہ کا نام یا اس کی کسی اور صفت کا ذکر پاؤ گے، قرآن شریف میں صرف دعائیں اور خدا کی صفات ہی نہیں بلکہ اس میں تمام معاملات دینی و دنیوی اور قوانین قومی و ملکی بھی بیان کئے گئے ہیں باایں ہمہ اس میں اللہ تعالیٰ کا نام اور اس کے اسماء حسنیٰ جا بجا پائے جاتے ہیں ایسی جگہوں پر اور ایسے معاملات میں بھی جہاں انسان سے سخت دشوار ہے کہ اللہ کا نام لا سکے۔ قرآن میں اللہ کا لفظ ۶۶۶۶ دفعہ آیا ہے اور اس کے باقی اسماء حسنیٰ کا کچھ شمار نہیں اور جو ضمائر اللہ تعالیٰ کی طرف پھرتی ہیں ان کی گنتی بجز خدا کے کسی کو معلوم نہیں۔ تسبیحات اور تہلیلات اور دعاؤں وغیرہ کے موقعہ پر تو اللہ تعالیٰ کا نام آ ہی جاتا ہے لیکن معاملات اور تعزیرات کے موقعہ پر جس طرح قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ کا نام آیا ہے وہ صرف قرآن شریف ہی سے خصوصیت رکھتا ہے دنیا کی کوئی کتاب اس خصوصیت میں قرآن شریف سے مقابلہ نہیں کر سکتی توریت و انجیل وغیرہ کے صفحوں کے صفحے خدا کے ذکر اور اس کے نام سے خالی ہیں لیکن قرآن شریف کا کوئی صفحہ کوئی حصہ یاد الٰہی اور نام الٰہی سے خالی نہیں خدا تعالیٰ نے اس واقعہ اور اس معاملہ کا طرز بیان اور اسلوب ہی اس ڈھنگ پر ڈالا ہے کہ خواہ مخواہ اللہ تعالیٰ کا نام اور اس کا ذکر کہیں بیچ میں ضرور آ جاوے کوئی معاملہ، کوئی واقعہ، کوئی قصہ، ایسا نہیں جس میں بار بار اللہ تعالیٰ کا ذکر نہ آئے۔ قرآن شریف کے پڑھنے سے نہ صرف دینی احکام اور الٰہی شریعت سے

آگاہی ہوتی ہے بلکہ کلام ربانی سارے کا سارا یاد الٰہی سے پر ہے۔ صفحے الٹتے جاؤ اور خدا تعالیٰ کا نام بار بار پڑھتے جاؤ اور خدا تعالیٰ کا نام بار بار پاتے جاؤ یہی وجہ ہے کہ قرآن شریف کی تلاوت میں بھی کمال ثواب ہے کیونکہ وہ اسماء حسنیٰ سے پر اور درود اور ہر وظیفے کی بھی ایک مقدس کتاب ہے مثال کے طور پر ایک سورۃ طلاق کو لے لو سورۂ طلاق کے نام سے تو مفہوم ہوتا ہے کہ اس میں صرف عورتوں کے طلاق دینے کی بابت احکام و ہدایات ہونگی لیکن نہیں اس میں عبرت، وعظ، تذکیر اور خدا تعالیٰ کے مقدس ناموں کا وظیفہ بھی ہے چنانچہ اس چھوٹی سی سورۃ میں پچیس جگہ اللہ کا لفظ آیا ہے اور بہت سی ضمائر خدا کی طرف پھرتی ہیں باوجودیکہ اس سورت میں معاملہ طلاق کا ذکر ہے جس کو اگر کوئی اور شخص بیان کرتا تو شاید ایک دو جگہ بھی اللہ کا نام نہ لاتا اچھا ہر ایسی کتاب کا جو آسمانی کہی جاتی ہو۔ کیف ما اتفق ایک ایک صفحہ ہاتھ میں اٹھا لو اور شمار کر لو کہ اس صفحہ میں خدا کا نام کتنی جگہ اور کیسی عظمت و شان سے آیا ہے یہ موٹی سی بات ہے پتہ دیدے گی کہ کون سی کتاب آسمانی ہے جو کسی معاملہ میں ذرا سی دیر کے لیے اپنے پڑھنے والے کو خدا کی یاد سے غافل نہیں رہنے دیتی اور جو اس کا امکان بھی نہیں چھوڑتی کہ ہزار ہا سال تک کروڑوں انسان اگنی وغیرہ الفاظ سے جو بقول سوامی دیانند پرمیشور کے نام تھے آگ اور دوسرے عناصر وغیرہ سمجھ کر خدا کی جگہ ان ہی چیزوں کی عبادت (پوجا) کریں۔

قرآن کریم کی بے نظیر سلاست اور روانی

مولانا فیروز الدین فرماتے ہیں: " پھر ایک دلیل قرآن شریف کے کلام ربانی ہونے کی اس کی وہ لاثانی بندش اور بے نظیر روانی ہے جس پر آج تک ایک دنیا شیدا ہے کوئی عربی عبارت پڑھو اس کی بندش اور روانی معمولی قسم کی ہوگی لیکن قرآن شریف کی روانی اور سلاست اس قسم کی ہے کہ جو لوگ معنی نہیں جانتے جو لوگ عربی سے کچھ مس نہیں رکھتے وہ بھی اس کی روانی اور سلاست کو دیکھ کر شیفتہ اور حیران ہیں۔ خوش آواز قاری جب قرآن شریف کو ایک لحن مرغوب اور اسلوب خوش سے پڑھتا ہے تو دلوں میں زلزلہ اور روحوں میں ولولہ ڈال دیتا ہے عام قاری و حافظ جب قرآن شریف کو ایک جوش کے ساتھ پڑھتے ہیں تو کس قدر اثر قلب پر ہوتا ہے دنیا کے سردار حضرت رسول کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) جب اس کلام پاک کو پڑھتے ہوں گے تو سننے والوں کے دلوں پر کیا کچھ اثر پہنچتا ہوگا کلام الٰہی کے الفاظ واقعات کی زندہ تصویریں معلوم ہوتی ہوں گی جو سننے والے کے پیش نظر ہیں کسی شخص کی طاقت ہے کہ قرآن شریف کی سلاست اور روانی کی بابت کچھ بیان کر سکے وہ ایک وجدانی امر ہے اور وجدانیات کی لذت کو بجز چکھنے کے کس کو یارا ہے کہ معرض تحریر یا تقریر میں لا سکے۔ قرآن شریف کی عبارت پر جیسے پڑھے ہوئے مفتون ہیں ویسے ہی اَن پڑھ عاشق ہیں، یہی عبارت کی روانی اور دلوں پر عجیب اثر ڈالنے والی جادو بیانی کفار عرب کو اس بات کے کہنے پر مجبور کرتی تھی کہ:

اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ۝

(یہ (قرآن) تو بس (ایک قسم کا) جادو ہے جو (لوگوں سے) چلا آتا ہے اور بس تو کیا تم دیدہ و دانستہ جادو کی باتیں سننے کو آتے ہو)

تمام آسمانی کتابوں کے مدعی اسی طرح موازنہ کر لیں کہ ہر کتاب کی تھوڑی سی عبارت جس طرح پڑھی جاتی ہے کس اچھے فصیح اور صاف پڑھنے والے سے مجلس میں پڑھوا کر دیکھیں خود معلوم ہو جائے گا کہ قلوب کس سے زیادہ لذت اور اثر حاصل کرتے ہیں قرآن کریم عام اشعار کی طرح کلام منظوم نہیں لیکن اس نے نظم کی روح نکال کر نثر میں ڈال دی ہے، ایک بالکل ہی اچھوتا اسلوب عام نثر اور نظم کے درمیان اختیار کیا ہے کہ شاعر اور خطیب دونوں کی روحیں سو جان سے اس کی لطافت اور شوکت پر قربان ہوتی ہیں۔ قرآن کی ان حسی اور معنوی خوبیوں کو دیکھ کر بے ساختہ زبان پر آجاتا ہے کہ:

بہار عالم حسنش دل و جان تازہ میدارد
برنگ اصحاب صورت را ببو ارباب معنی را

قرآن میں ایک مضمون دوسرے سے مغلوب نہیں ہوتا

انسان چونکہ مخلوق ہے اور کمزور مخلوق ہے اسلئے جب اس پر کوئی حالت طاری ہوتی ہے تو اس کے مقابل والی حالت مضمحل اور مغلوب ہو جاتی ہے بڑے سے بڑا قادر الکلام لیکچرار جب غصہ میں بھرا ہوا مضمون بیان کرتا ہے تو عین اسی وقت ملاطفت اور مہربانی کی تقریر ویسے زور سے نہیں کر سکتا اسی

طرح شفقت و رحمت کے ساتھ اگر غضب و سخط کی بھی ضرورت ہو تو دونوں کا مساویانہ توازن قائم رکھنا ناممکن ہوجاتا ہے یہ صرف خداوند اکبر ہی کی ذات کا خاصہ ہے جسکی ایک صفت دوسری صفت کیلئے مزاحم نہیں ہوتی اور جس کو ایک شان دوسری شان سے مشغول نہیں کر سکتی کہ وہ ہر وقت وہر آن تمامی متقابل صفات کے ساتھ متصف ہے اسی لئے جب اس کے کلام کو ہم پڑھتے ہیں تو رحمت کے ساتھ غضب، وعدہ کے ساتھ وعید، تبشیر کے ساتھ انذار اور خوف کے ساتھ جب ترازو کے دو پلوں کی طرح ہمیں برابر نظر آتے ہیں۔ جن میں سے کوئی بھی دوسرے سے جھکا نہ ہو، عین غصہ کے وقت پیار اور پیار کے ساتھ غصہ اس طرح کہ ایک کا بیان دوسرے سے وزن میں گھٹنے نہ پائے یہ صرف اسی رب العلمین کے کلام میں دیکھا گیا ہے۔

قرآن میں غیبی خبریں

قرآن کے مضامین کے متعلق ایک اور ضروری چیز بیان کرنے سے رہ گئی اور وہ امم ماضیہ اور سنین گذشتہ کی ایسی مفصل اور درست خبریں اور واقعات مستقبلہ کے متعلق اس کی متعدد پیشن گوئیاں ہیں جو حرف بحرف صحیح ثابت ہوچکیں یہ نہیں کہ کاہنوں اور منجموں کے اٹکل پچو بیانات کی طرح سو میں ایک دو دفعہ تیر نشانہ پر جا لگا بلکہ قرآن نے جن واقعات کی خبر دی وہ صبح صادق کی روشنی کی طرح نور افزائے دیدہ بصیرت ہوئے۔ مثال کے طور پر آپ اس آیت کو لے لیجئے۔

الٓمّٓ غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ۔	قریب کے ملک (یعنی فارس) میں رومی (جو نصاری ہیں اہل فارس سے جو آتش پرست ہیں) مغلوب ہوگئے ہیں لیکن یہ لوگ اپنے مغلوب ہونے پیچھے عنقریب چند سال میں (پھر اہل فارس پر) غالب آجائیں گے۔

عجم پر روم کے غلبہ کے متعلق جو خبر بتنے زمانہ کی ساتھ مقید کر کے اس آیت میں دی گئی تھی وہ بلاکم وکاست پوری ہوئی اگر آپ قرآن کی پیشین گوئیوں کے متعلق مفصل دیکھنا چاہتے ہیں تو علمائے اس باب میں مستقل رسالے لکھے ہیں ان کا مطالعہ کیجئے میں نے تو صرف ایک نمونہ دکھلا دیا ہے۔ اخبار ماضیہ میں بعض کور چشم یہ کہہ دیتے ہیں کہ شاید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی سے پوچھ کر درج کر دیئے ہونگے حالانکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ آپ خود امی تھے آپ کی قوم امی تھی مادری زبان عربی کے سوا کوئی دوسری زبان آپ نے سیکھی نہیں تھی کسی عالم کی ملازمت وصحبت کا آپ کو موقعہ نہیں ملا جو اس قدر مفصل اور مستند واقعات اخذ کر سکتے اگر ایسا ہوتا تو وہ لوگ جن کے پیش نظر آپ کی زندگی کے تمام اطوار و ادوار تھے اور پھر ہر وقت ایسی چیزوں کا کھوج لگانے میں سرگرم تھے جو آپ کی تکذیب کا ذریعہ بنیں تئیس سال کی طویل مدت میں سب سے پہلی ایسی شہادتیں بہم پہنچا کر شائع کر دیتے، شاید اسی لئے قرآن پاک نے ایسے غیر نامی عن الدلیل احتمالات کا رد کرنا بھی ضروری نہ سمجھا صرف اس قدر تنبیہ کر دی کہ نبی امی صلعم

پچھلے واقعات بن دیکھے بیان کر رہے ہیں وہ اس کے سوا نہیں، کہ وحی الٰہی نے ان کو معلوم کرائے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں۔

تِلْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهَا إِلَيْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَا أَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا

(اے پیغمبر) یہ غیب کی چند خبریں ہیں جن کو وحی کے ذریعہ سے ہم تم کو پہنچاتے ہیں اس (قرآن کے نازل ہونے) سے پہلے نہ تو تم ہی ان کو جانتے تھے اور نہ تمہاری قوم کے لوگ۔

اور فرماتے ہیں۔

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ إِذْ قَضَيْنَا إِلَىٰ مُوسَى الْأَمْرَ وَمَا كُنْتَ مِنَ الشَّاهِدِينَ ۝ وَلٰكِنَّا أَنْشَأْنَا قُرُونًا فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِي أَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِنَا وَلٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِينَ ۝ وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّورِ إِذْ نَادَيْنَا وَلٰكِنْ رَحْمَةً

اور (اے پیغمبر) جس وقت ہم نے موسیٰؑ کو (رسالت کے) احکامات دیئے تو تم طور کی مغربی جانب (جہاں موسیٰؑ کو رسالت ملی تھی) موجود نہ تھے۔ (مگر بات یہ ہے کہ) ہم نے بہت سی اُمتیں نکال کھڑی کیں اور ان پر بہت سے قرن گذر گئے اور نہ تم مدین کے لوگوں میں رہے کہ تم ان کو ہماری آیتیں پڑھ کر سناتے تھے (اور یوں تم کو اس وقت کے حالات معلوم کرنے کا موقع ملا ہو) بلکہ ہم کو (تمہیں پیغمبر بنا کر) بھیجنا (منظور) تھا اور نہ اس وقت کہ ہم نے (موسیٰ کو)

مِنْ رَبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَا أَتَاهُمْ مِنْ نَذِيرٍ مِنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ

بلایا تھا تم طور کے (کسی) طرف موجود تھے (کہ تم نے وہ واقعات بچشم خود دیکھے ہوں بلکہ (یہ) تمہارے پروردگار کی (ایک) مہربانی ہے تاکہ تم ان لوگوں کو ڈراؤ جن کے پاس تم سے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں آیا۔ عجب نہیں (تمہارے ڈرانے سے) یہ لوگ نصیحت پکڑیں۔

اور فرماتے ہیں۔

ذٰلِكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ أَجْمَعُوا أَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُونَ

(اے پیغمبر) یہ چند غیب کی باتیں ہیں جن کو ہم وحی کے ذریعہ سے تمہیں معلوم کراتے ہیں (اور یہ تمہاری صداقت کی دلیل ہے)، ورنہ جس وقت یوسف کے بھائیوں نے اپنا مصمم ارادہ کر لیا تھا (کہ یوسف کو کنوئیں میں ڈال دیں) اور وہ ان کے ہلاکت کی) تدبیر کر رہے تھے تم تو ان کے پاس موجود نہ تھے (کہ یہ حالات تم کو بطور خود معلوم ہو جاتے)

اچھا واقعات گذشتہ میں آپ کے یہ احتمالات سہی لیکن مستقبل کے متعلق جو بکثرت خبریں دی گئیں اور ایک کی بھی کوئی تکذیب نہ کر سکا۔ ان میں بجز اس کے کہ اس عالم الغیب و الشہادت کی طرف نسبت کیا جائے اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

خاتمۂ کلام

میں اپنی تقریر اب ختم کرتا ہوں اور قرآن کریم کی تین بہت ہی چھوٹی

چھوٹی سورتیں (العصر، الکوثر، الاخلاص) پیش کر کے جو اخیر پارہ میں ہیں تمام مذاہب کو چیلنج دیتا ہوں کہ ان سورتوں میں سے کسی ایک کے مقابلہ میں کوئی پرانا یا نیا کلام سب مل کر لے آئیں جس میں ایسے مختصر اور جامع الفاظ میں اس طرح کے مضمون کو اسی قدر خوبیوں اور لطائف و مزایا کی رعایت کے ساتھ ادا کیا گیا ہو جتنا کہ ہم اہل اسلام بحول اللہ وقوۃ بوقت مقابلہ ہر دو کلام قرآن کریم کی اس سورت کی عبارت اور اسلوب میں بتلا سکتے ہیں اور اس کام کے لئے جتنی مدت اور مہلت معارضہ کرنے والے چاہیں وہ دی جا سکتی ہے اور ہر ایک معقول شرط منظور کی جا سکتی ہے لیجئے ساری بحثیں اور سارے مناظرے صرف ایک ذرا سی بات پر تمام ہوتے ہیں۔

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ	اس پر بھی اگر تم ایسا نہ کر سکو اور ہرگز نہ کر سکو گے تو تم کو ڈرنا چاہیئے اس آگ سے جس کا ایندھن آدمی ہیں اور پتھر جو تیار کی گئی ہے منکروں کے لئے۔

خاتمہ مضمون پر میں یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ میں نے اس تقریر میں صرف یہ کوشش کی ہے کہ ایک صاف اور سلیس اور معقول طریقہ سے قرآن کریم کا کلام الٰہی ہونا واضح کر دیا جائے مضمون کے دوسرے حصص جو شاید اس کے بعد شائع ہو سکیں، ان میں تفصیلاً بتلایا جائے گا کہ قرآن کریم کے متعلق مخالفین اسلام نے کیا کیا شکوک و شبہات پیش کئے ہیں اور ان کا

ازالہ کس طرح ہو سکتا ہے اُمید ہے کہ یہ سلسلہ مبلغین اور مناظرینِ اسلام اور طالبین حق و صدق کے لئے نافع ہو گا۔

ان ارید الا الاصلاح ما استطعت وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب

الرّاقِم

شبیر احمد عثمانی عفا اللہ عنہ

دار العلوم دیوبند ۔ ۴ر جمادی الاولیٰ ۱۳۴۲ھ

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۝ القرآن

ترجمہ: اور یہ لوگ آپ سے روح کے بارے میں پوچھتے ہیں

اَلرُّوحُ فِی القرآن

روح کیا ہے؟ اور قرآن کا
موقف اس سلسلہ میں کیا ہے؟

از

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ

ناشر

ادارہ اسلامیات ۱۹۰ انارکلی لاہور

الرُّوحُ فِی القُرآن

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۭ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ

اور یہ لوگ آپ سے روح کو پوچھتے ہیں۔ آپ فرما دیجئے کہ روح میرے رب کے حکم سے

رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ وَلَىِٕنْ

بنی ہے۔ اور تم کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔ اور اگر ہم چاہیں تو

شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ

جس قدر آپ پر وحی بھیجی ہے۔ سب سلب کر لیں۔ پھر اس کے لئے آپ

لَكَ بِهٖ عَلَيْنَا وَكِيْلًا ۝ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۭ

کو ہمارے مقابلہ میں کوئی حمایتی بھی نہ ملے۔ مگر آپ کے رب ہی کی رحمت ہے

اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا ۝ قُلْ لَّىِٕنِ اجْتَمَعَتِ

بیشک آپ پر اس کا بڑا فضل ہے۔ آپ فرما دیجئے اگر تمام انسان

الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓي اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ

اور جنات سب اس بات کے لئے جمع ہو جاویں کہ ایسا قرآن بنا لاویں تب

لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ۝

بھی ایسا نہ لا سکیں گے۔ اگرچہ ایک دوسرے کا مددگار بھی بن جاوے۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ

اور ہم نے لوگوں کے لئے اس قرآن میں ہر قسم کا عمدہ مضمون طرح طرح سے

فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ۝ وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ

بیان کیا ہے پھر بھی اکثر لوگ بے انکار کئے ہوئے نہ رہے۔ اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ

حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ۝ اَوْ تَكُوْنَ

ہم آپ پر ہرگز ایمان نہ لائیں گے یہاں تک کہ آپ ہمارے لئے زمین سے کوئی چشمہ

لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا

جاری کر دیں یا خاص آپ کیلئے کھجور اور انگوروں کا کوئی باغ ہو پھر اس باغ کے بیچ بیچ

تَفْجِيْرًا ۝ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَاۗءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا

میں جگہ جگہ بہت سی نہریں آپ جاری کر دیں۔ یا جیسا کہ آپ کہا کرتے ہیں آپ آسمان کے ٹکڑے

اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰۗىِٕكَةِ قَبِيْلًا ۝ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ

ہم پر گرا دیں یا آپ اللہ کو اور فرشتوں کو سامنے لا کھڑا کر دیں۔ یا آپ کے پاس کوئی سونے کا بنا

مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَاۗءِ ۭ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ

ہوا گھر ہو یا آپ آسمان پر چڑھ جائیں اور ہم تو آپ کے چڑھنے کو بھی کبھی باور نہ کریں گے

حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ۭ قُلْ سُبْحَانَ

جب تک کہ آپ ہمارے پاس ایک نوشتہ نہ لائیں جس کو ہم بھی پڑھ لیں۔ آپ فرما دیجئے کہ سبحان اللہ

رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ۝

میں بجز اس کے کہ آدمی ہوں پیغمبر ہوں اور کیا ہوں۔

ویسئلونک عن الروح (پ۱۵ ع۱۰)

اور سوال کرتے ہیں تجھ سے روح کی نسبت

یعنی روح انسانی کیا چیز ہے۔ اس کی ماہیت وحقیقت کیا ہے؟

یہ سوال صحیحین کی روایت کے موافق یہود مدینہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آزمانے کو کیا تھا اور "سیر" کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ میں "قریش" نے "یہود" سے یہ سوال کیا تھا۔ اسی لئے آیت کے "مکی" اور "مدنی" ہونے میں اختلاف ہے۔ ممکن ہے کہ نزول مکرر ہوا ہو، واللہ اعلم۔ یہاں اس سوال کے درج کرنے سے غالباً یہ مقصود ہوگا کہ جن چیزوں کے سمجھنے کی ان لوگوں کو ضرورت ہے۔ اُدھر سے تو اعراض کرتے ہیں اور غیر ضروری مسائل میں ازراہ تعنت وعناد جھگڑتے رہتے ہیں۔ ضرورت اس کی تھی کہ وحی قرآنی کی روح سے باطنی زندگی حاصل کرتے اور اس نسخہ شفا سے فائدہ اٹھاتے۔

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا (شوریٰ رکوع ۵)

يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ (نحل رکوع ۱)

مگر انہیں وہ راز کہاں اور معاندانہ بحثوں سے فرصت کہاں؟

روح کیا ہے۔ جوہر ہے یا عرض؟ مادی ہے یا مجرد؟ بسیط ہے یا مرکب؟ اس قسم کے غامض اور بے ضرورت مسائل کے سمجھنے پر نہ نجات موقوف ہے، نہ یہ بحثیں انبیا کے فرائض تبلیغ میں داخل ہیں۔ بڑے بڑے حکما اور فلاسفر آج تک خود "مادہ" کی حقیقت پر مطلع نہ ہو سکے۔ روح جو بہر حال مادہ سے کہیں

زیادہ لطیف وخفی ہے اس کی ماہیت وکنہ تک پہنچنے کی پھر کیا امید کی جا سکتی ہے۔ مشرکین مکہ کی جہالات اور یہود مدینہ کی اسرائیلیات کا مطالعہ کرنے والوں کو معلوم ہے کہ جو قوم موٹی موٹی باتوں اور نہایت واضح حقائق کو نہیں سمجھ سکتی وہ "روح" کے حقائق پر دسترس پانے کی کیا خاک استعداد واہلیت رکھتی ہوگی ؎

تو کارِ زمیں رانکو ساختی — کہ باآسماں نیز پر داختی

قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ۔

کہدے روح میرے رب کے حکم سے ہے۔

موضح القرآن میں ہے کہ حضرت کے آزمانے کو یہود نے پوچھا سو اللہ تعالیٰ نے (کھول کر) نہ بتایا کیونکہ ان کو سمجھنے کا حوصلہ نہ تھا۔ آگے پیغمبروں نے بھی مخلوق سے ایسی باریک باتیں نہیں کہیں، اتنا جاننا کافی ہے کہ اللہ کے حکم سے ایک چیز بدن میں آپڑی وہ جی اٹھا۔ جب نکل گئی وہ مر گیا۔ اھ

الفاظِ قرآنی کی سطح کے نیچے عمیق حقائق مستور ہیں

حق تعالیٰ کا کلام اپنے اندر عجیب وغریب اعجاز رکھتا ہے۔ روح کے متعلق یہاں جو کچھ فرمایا اس کا سطحی مضمون عوام اور قاصر الفہم یا کج رو معاندین کے لئے کافی ہے۔ لیکن اسی سطح کے نیچے، ان ہی مختصر الفاظ کی تہ میں روح کے متعلق وہ بصیرت افروز حقائق مستور ہیں جو بڑے سے بڑے عالی دماغ نکتہ رس فلسفی اور ایک عارفِ کامل کی راہ طلب وتحقیق وچراغ ہدایت کا

کام دیتی ہیں۔

"روح" کے متعلق عہد قدیم سے جو سلسلہ تحقیقات کا جاری ہے وہ آج تک ختم نہیں ہوا ہے اور نہ شاید ہو سکے "روح" کی اصلی کنہ و حقیقت تک پہنچنے کا دعوٰے تو بہت ہی مشکل ہے۔ کیونکہ ابھی تک کتنی ہی محسوسات ہیں جن کی کنہ و حقیقت معلوم کرنے سے ہم عاجز رہے ہیں۔ تاہم میرے نزدیک آیات قرآنیہ سے روح کے متعلق چند نظریات پر صاف روشنی پڑتی ہے۔

روح قرآنی کے متعلق چند نظریات

۱:۔ انسان میں اس مادی جسم کے علاوہ کوئی اور چیز موجود ہے۔ جسے "روح" کہتے ہیں۔ وہ "عالم امر" کی چیز ہے اور خدا کے حکم سے فائض ہوتی ہے۔

قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي (بنی اسرائیل)

خَلَقَهُ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ (آل عمران)

ثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ ۚ فَتَبَارَكَ اللَّهُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (المومنون)

إِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ إِذَا أَرَدْنَاهُ أَنْ نَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ (نحل)

۲:۔ روح کی صفات علم و شعور وغیرہ بتدریج کمال کو پہنچتی ہیں اور ارواح میں حصولِ کمال کے اعتبار سے بےحد تفاوت اور فرقِ مراتب ہے حتیٰ کہ خدا تعالیٰ کی تربیت سے ایک روح ایسے بلند اور اعلیٰ مقام پر پہنچ جاتی ہے جہاں دوسری ارواح کی قطعاً رسائی نہ ہو سکے جیسے روح محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت ہمارا اعتقاد ہے۔

محققین کہتے ہیں کہ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي میں امر کی اضافت رب کی طرف اور رب کی یائے متکلم کی طرف جس سے مراد نبی کریم صلعم ہیں اس طرف مشیر ہے کیونکہ امام راغبؒ کی تصریح کے موافق رب اُس ہستی کو کہتے ہیں جو کسی چیز کو بتدریج حدِ کمال تک پہنچائے جہاں تک پہنچنے کی اس میں استعداد پائی جاتی ہو۔ چنانچہ دیکھو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اعلیٰ و اکمل استعداد کے موافق اللہ نے آپ کو حسی و معنوی حیثیت سے کس قدر بلند مقام پر پہنچایا۔ آپ کو علوم و معارف سے بھری ہوئی وہ کتاب مرحمت فرمائی جس کی نسبت ارشاد فرماتے ہیں۔

قُلْ لَئِنِ اجْتَمَعَتِ الْإِنْسُ وَالْجِنُّ الآیۃ

اور حسی طور پر آپ کو شب معراج میں سدرۃ المنتہیٰ سے بھی اوپر لے گئے جہاں تک کسی نبی یا فرشتہ کو عروج میسر نہ ہوا تھا۔

۳:۔ مگر روح کے یہ کمالات ذاتی نہیں، وہاب حقیقی کے عطا کئے ہوئے اور محدود ہیں، چنانچہ وَمَا أُوتِيتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا سے معلوم ہوا کہ علم کسی اور کا دیا ہوا ہے۔ اور جو علم تم کو دیا گیا وہ سب دینے والے کے علم کے سامنے نہایت قلیل اور محدود ہے۔ قُلْ لَوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِكَلِمَاتِ رَبِّي لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ أَنْ تَنْفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّي وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهِ مَدَدًا (کہف) وَلَوْ أَنَّ مَا فِي الْأَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ أَقْلَامٌ وَالْبَحْرُ يَمُدُّهُ مِنْ بَعْدِهِ سَبْعَةُ أَبْحُرٍ مَا نَفِدَتْ كَلِمَاتُ اللَّهِ (لقمان)

اسی طرح آگے مشرکین کے قول لَنْ نُؤْمِنَ لَكَ حَتَّى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْأَرْضِ يَنْبُوعًا کے جواب میں قُلْ سُبْحَانَ رَبِّي هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا رَسُولًا۔ فرمانا اس کی دلیل ہے کہ علم کی طرح بشر کی قدرت بھی بہرحال محدود و مستعار ہے۔

۴: روحِ انسانی خواہ علم و قدرت صفات میں کتنی ہی ترقی کر جائے حتّٰی کہ اپنے تمام ہم جنسوں سے گوئے سبقت لیجائے پھر بھی اس کی صفات محدود رہتی ہیں۔ صفاتِ باری کی طرح لامحدود نہیں ہو جاتیں اور یہی بڑی دلیل اس کی ہے کہ روح خدا سے علیحدہ کوئی قدیم و غیر مخلوق ہستی نہیں ہو سکتی۔ ورنہ تحدید کہاں سے آئی۔

۵: کتنی ہی بڑی کامل روح ہو حق تعالیٰ کو یہ قدرت حاصل ہے کہ جب وقت چاہے اُس سے کمالات سلب کرلے گو اُس کے فضل و رحمت سے کبھی ایسا کرنے کی نوبت نہ آئے۔ یدل علیہ قولہ تعالیٰ وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهِ عَلَيْنَا وَكِيْلًا - إِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ - إِنَّ فَضْلَهُ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا۔ یہ چند اصول جو ہم نے بیان کئے اہلِ فہم کو نفسِ آیات میں ادنٰے تامل کرنے سے معلوم ہو سکتے ہیں۔ صرف "عالمِ امر" کا لفظ ہے جس کی مناسب تشریح ضروری ہے اور جس کے سمجھنے سے اُمید ہے کہ روح کی معرفت حاصل کرنے میں بہت مدد ملے گی۔

لفظِ امر کی تشریح اور امر و خلق کا فرق

لفظ امر قرآن میں بیسیوں جگہ وارد ہُوا ہے اور اس کے معنی میں علماء نے کافی کلام کیا ہے۔ لیکن ہماری غرض سورۂ اعراف کی آیت أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ کی طرف توجہ دلانا ہے جہاں "امر" کو "خلق" کے مقابل رکھا ہے جس سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ خدا کے یہاں دو مد بالکل علیحدہ علیحدہ ہیں ایک "امر" دوسرا "خلق"۔ دونوں میں کیا فرق ہے؟ اس کو ہم سیاقِ آیات سے بسہولت سمجھ سکتے

ہیں پہلے فرمایا إِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِيْ سِتَّةِ أَيَّامٍ یہ تو "خلق" ہُوا۔ درمیان میں "استوار علی العرش" کا ذکر کر کے جو شانِ حکمرانی کو ظاہر کرتا ہے فرمایا يُغْشِي اللَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهُ حَثِيْثًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۢ بِأَمْرِهٖ یعنی ان مخلوقات کو اک معیّن نظام پر چلاتے رہنا جسے تدبیر و تصریف کہہ سکتے ہیں، یہ "امر" ہُوا۔ اسی طرح سورۂ طلاق میں ارشاد ہے اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْأَرْضِ مِثْلَهُنَّ يَتَنَزَّلُ الْأَمْرُ بَيْنَهُنَّ۔ گویا دنیا کی مثال ایک بڑے کارخانے کی سمجھو جس میں مختلف قسم کی مشینیں لگی ہوں۔ کوئی کپڑا بن رہی ہے۔ کوئی آٹا پیس رہی ہے کوئی کتابیں چھاپتی ہے۔ کوئی شہر میں روشنی پہنچا رہی ہے۔ کسی سے پنکھے چل رہے ہیں وغیر ذلک۔

ہر ایک مشین میں بہت سے کل پرزے ہیں جو مشین کی غرض و غایت کا لحاظ کر کے ایک معیّن انداز سے ڈھالے جاتے اور لگائے جاتے ہیں۔ پھر سب پُرزے جوڑ کر مشین کو فٹ کیا جاتا ہے۔ جب تمام مشینیں فٹ ہو کر کھڑی ہو جاتی ہیں تب الیکٹرک (بجلی) کے خزانے سے ہر مشین کی طرف جُدا جُدا راستہ سے کرنٹ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ آن واحد میں ساکن و خاموش مشینیں اپنی اپنی ساخت کے موافق گھومنے اور کام کرنے لگ جاتی ہیں۔ بجلی ہر مشین اور ہر پُرزہ کو اُس کی مخصوص ساخت اور غرض کے مطابق گھماتی ہے حتّٰی کہ جو قلیل و کثیر کہربا روشنی کے لیمپوں اور قمقموں میں پہنچتی ہے۔ وہاں پہنچ کر اُن ہی قمقموں کی ہیئت اور رنگت اختیار کر لیتی ہے۔

"خلق" کیا ہے؟

اس مثال سے یہ بات واضح ہو گئی کہ مشین کا ڈھانچہ تیار کرنا اُس کے پرزوں کا ٹھیک اندازہ رکھنا، پھر فٹ کرنا ایک سلسلہ کے کام ہیں جس کی تکمیل کے بعد مشین کو چالو کرنے کے لئے ایک دوسری چیز بجلی یا اسٹیم اس کے خزانہ سے لانے کی ضرورت ہے اسی طرح سمجھ لو کہ حق تعالیٰ نے اوّل آسمان و زمین کی تمام مشینیں بنائیں جس کو "خلق" کہتے ہیں، ہر چھوٹا بڑا پرزہ ٹھیک اندازہ کیموافق تیار کیا جس کو "تقدیر" کہا گیا ہے قَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا۔ سب کل پرزوں کو جوڑ کر مشین کو فٹ کیا جسے "تصویر" اور "تسویہ" کہتے ہیں خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ اور فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ یہ سب افعال خلق کی مد میں تھے۔

"امر" کیا ہے؟

اب ضرورت تھی کہ جس مشین کو جس کام میں لگانا ہے۔ لگا دیا جائے مشین کو چالو کرنے کیلئے "امر الٰہی" کی بجلی چھوڑ دی گئی شاید اس کا تعلق اسم "باری" سے ہے اَلْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ وفی الحدیث فَلَقَ الْحَبَّةَ وَبَرَأَ النَّسَمَةَ وفی سورۃ الحدید مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ای النفوس کما ہو مروی عن ابن عباس وقتادۃ والحسن۔

غرض ادھر سے حکم ہوا "چل" فوراً چلنے لگی۔ اسی "امر الٰہی" کو فرمایا اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (یٰسین) دوسری جگہ نہایت وضاحت کیساتھ امر "کن" کو خلق جسد پر مرتب کرتے ہوئے ارشاد ہوا۔ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (آل عمران) بلکہ تتبع سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں "كُنْ فَيَكُوْنُ" کا مضمون

جتنے مواضع میں آیا، عموماً خلق اور ابداع کے ذکر کے بعد آیا ہے جس سے خیال گذرتا ہے کہ کلمہ "کن" کا خطاب "خلق" کے بعد تدبیر و تصرف وغیرہ کیلئے ہوتا ہوگا۔ واللہ اعلم۔

روح کا مبدء صفت کلام ہے

بہر حال میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ "امر" کے معنی یہاں "حکم" کے ہیں اور وہ حکم یہی ہے جسے لفظ "کن" سے تعبیر کیا گیا۔ اور "کن" جنس کلام سے ہے جو حق تعالیٰ کی صفت قدیمہ ہے جس طرح ہم اس کی تمامی صفات (مثلاً حیات، سمع، بصر وغیرہ) کو بلا کیف تسلیم کرتے ہیں۔ کلام اللہ اور کلمۃ اللہ کے متعلق بھی یہی مسلک رکھنا چاہیئے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ "روح" کیساتھ" اکثر جگہ قرآن میں "امر" کا لفظ استعمال ہوا ہے مثلاً قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ، وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا، يُلْقِي الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ، يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ۔ اور پہلے گذر چکا کہ "امر" عبارت ہے کلمہ "کن" سے یعنی وہ کلام انشائی جس سے مخلوقات کی تدبیر و تصریف اُس طریقہ پر کیجائے جس سے غرض ایجاد و تکوین مرتب ہو۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ "روح" کا مبدء حق تعالیٰ کی صفت قدیمہ کلام ہے جو صفت علم و حیات کے ماتحت ہے، شاید اسی حیثیت کا لحاظ کرتے ہوئے نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ میں اسی اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ کیونکہ "کلام" اور "امر" کی نسبت متکلم و امر سے صادر و معتد کی ہوتی ہے مخلوق و خالق کی نہیں ہوتی۔ اسی لئے اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ میں "امر" کو "خلق" کے مقابل رکھا، ہاں یہ امر "کن" باری تعالیٰ شانہٗ سے صادر ہو کر ممکن ہے کہ "جوہر مجرد" کے لباس میں یا ایک "ملک اکبر" اور "روح اعظم" کی صورت میں ظہور پکڑے

جسکا ذکر بعض آثار میں ہوا ہے اور جسے ہم کہربائیہ روحیہ کا خزانہ کہہ سکتے ہیں۔

گویا یہیں سے روح حیات کی لہریں دنیا کی ذوی الارواح پر تقسیم کی جاتی ہیں اور الارواح جنود مجندۃ کے بیشمار تاروں کا یہیں کنکشن ہوتا ہے۔ اب جو کرنٹ چھوٹی بڑی مشینوں کی طرف چھوڑا جاتا ہے وہ ہر مشین سے اسکی بناوٹ اور استعداد کیموافق کام لیتا اور اُس کی ساخت کے مناسب حرکت دیتا ہے۔ بلکہ جن لیمپوں اور قمقموں میں یہ بجلی پہنچتی ہے انہی کے مناسب رنگ و ہیئت اختیار کر لیتی ہے۔

روح کا مبدء صفت کلام ہے پھر وہ "جوہر مجرد" جسم لطیف کیونکر بن گئی؟

وہی یہ بات کہ "کن" (ہوجا)، کا حکم جو قسم کلام سے ہے، جوہر مجرد جسم نورانی لطیف کی شکل کیونکر اختیار کر سکتا ہے۔ اسے یوں سمجھ لو کہ تمام عقلاء اس پر متفق ہیں، کہ ہم خواب میں جو اشکال و صور دیکھتے ہیں بعض اوقات وہ محض ہمارے خیالات ہوتے ہیں جو دریا، پہاڑ، شیر، چیتے وغیرہ کی شکلوں میں نظر آتے ہیں۔

اب غور کرنے کا مقام ہے کہ خیالات جو اعراض ہیں اور دماغ کیساتھ قائم ہیں، وہ جواہر و اجسام کیونکر بن گئے۔ اور کس طرح اُن میں اجسام کے لوازم و خواص پیدا ہو گئے۔ یہاں تک کہ بعض مرتبہ خواب دیکھنے والے سے بیدار ہوتے کے بعد بھی یہ آثار و لوازم جدا نہیں ہوتے۔

خواب کی مثال سے مطلب کی تفہیم

فی الحقیقت خدا تعالیٰ نے ہر انسان کو خواب کے ذریعہ سے بڑی بھاری ہدایت کی ہے کہ جب ایک آدمی کی قوتِ مصورہ میں اُس نے اس قدر طاقت رکھی ہے کہ وہ اپنی بساط کیموافق غیر مجسم خیالات کو جسمی سانچہ میں ڈھال لے اور اُن میں وہی خواص و آثار باذن اللہ پیدا کر لے جو عالم بیداری میں اجسام سے وابستہ تھے۔ پھر تماشہ یہ ہے کہ وہ خیالات خواب دیکھنے والے کے دماغ سے ایک منٹ کو علیحدہ بھی نہیں ہوئے اُن کا ذہنی وجود بدستور قائم ہے، تو کیا اس حقیر سے نمونہ کو دیکھ کر ہم اتنا نہیں سمجھ سکتے کہ ممکن ہے، قادر مطلق اور مصور برحق جل و علا کا امر بے کیف (کن)، باوجود صفتِ قائمہ بذاتہ تعالیٰ ہونے کے کسی ایک یا متعدد صورتوں میں جلوہ گر ہو جائے۔ ان صورتوں کو ہم ارواح یا فرشتے یا کسی اور نام سے پکاریں۔

روح حادث ہے اور اسکا مبداء (امر رب) قدیم ہے

وہ ارواح و ملائکہ وغیرہ سب حادث ہوں اور امر الٰہی بحالہٖ قائم ہے۔ امکان و حدوث کے احکام و آثار ارواح وغیرہ تک محدود رہیں اور "امر الٰہی" اُن سے پاک و برتر ہو جیسے جو صورت خیالیہ بحالت خواب مثلاً آگ کی صورت میں نظر آتی ہے اس صورتِ ناریہ میں احراق، سوزش، گرمی وغیرہ سب آثار ہم محسوس کرتے ہیں۔ حالانکہ اسی آگ کا تصوّر سالہا سال بھی دماغوں میں رہے تو ہمیں ایک لمحہ کیلئے یہ آثار محسوس نہیں ہوتے۔

ظاہر اور مظہر کے احکام جُدا جُدا ہیں

پس کوئی شبہ نہیں کہ روح انسانی (خواہ جوہر مجرّد ہو یا جسم لطیف نورانی "امر ربی" کا مظہر ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ مظہر کے تمام احکام و آثار ظاہر پر جاری ہوں کما ہو القاہر واضح رہے کہ جو کچھ ہم نے لکھا اور جو مثالیں پیش کیں اُن سے مقصود محض تسہیل و تقریب الی الفہم ہے ورنہ ایسی کوئی مثال دستیاب نہیں ہو سکتی جو ان حقائق غیبیہ پر پوری طرح منطبق ہو۔

اے بروں از وہم و قیل و قال من خاک بر فرق من و تمثیل من

روح جوہر مجرد ہے یا جسم لطیف؟

رہا یہ مسئلہ روح جوہر مجرد ہے جیسا کہ اکثر حکمار قدیم اور صوفیہ کا مذہب ہے، یا جسم نورانی لطیف جیسا کہ جمہور اہلحدیث کی رائے ہے اس میں میرے نزدیک قول فیصل وہی ہے جو بقیۃ السلف بحر العلوم حضرت علامہ سید محمد انور شاہ صاحب اطال اللہ بقاءہ نے فرمایا کہ بالفاظ عارف جامیؒ یہاں تین چیزیں ہیں۔

(۱) وہ جواہر جن میں مادّہ اور کمیّت دونوں ہوں جیسے ہمارے "ابدان مادیہ"

(۲) وہ جواہر جن میں مادّہ نہیں صرف کمیّت ہے جنہیں صوفیہ "اجسام مثالیہ" کہتے ہیں۔

(۳) وہ جواہر جو مادّہ اور کمیّت دونوں سے خالی ہوں جن کو صوفیہ "ارواح" یا حکماء "جواہر مجردہ" کے نام سے پکارتے ہیں۔

پس جمہور اہل شرع جس کو "روح" کہتے ہیں وہ صوفیہ کے نزدیک "بدن مثالی"

سے موسوم ہے جو بدنِ مادی میں حلول کرتا ہے اور بدن مادی کی طرح آنکھ، ناک، ہاتھ، پاؤں وغیرہ اعضاء رکھتا ہے۔

رُوح کا بدن سے جُدا ہونا موت کو مستلزم نہیں

یہ روح بدن مادی سے کبھی جُدا ہو جاتی ہے اور اس جدائی کی حالت میں بھی ایک طرح کا مجہول الکیف علاقہ بدن کیساتھ قائم رکھتی ہے جس سے بدن پر حالتِ موت طاری نہیں ہونے پاتی۔ گویا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے قول کیموافق جو بغوی نے اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْأَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا کی تفسیر میں نقل کیا ہے اسوقت روح خود علیحدہ رہتی ہے مگر اس کی شعاع جسد میں پہنچکر ابقار حیات کا سبب بنتی ہے جیسے آفتاب لاکھوں میل سے بذریعہ شعاعوں کے زمین کو گرم رکھتا ہے یا جیسا کہ حال ہی میں فرانس کے محکمہ پرواز نے ہوا بازوں کے بغیر طیارے چلا کر خفیہ تجربے کئے ہیں اور تعجب خیز نتائج رونما ہوئے۔ اطلاع موصول ہوئی ہے کہ حال میں ایک خاص بم پھینکنے والا طیارہ بھیجا گیا تھا جس میں کوئی شخص سوار نہ تھا لیکن لاسلکی کے ذریعہ سے وہ منزلِ مقصود پر پہنچایا گیا۔ اس طیارہ میں بم بھر کر وہاں گرائے گئے اور پھر وہ مرکز میں واپس لایا گیا۔ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ لاسلکی کے ذریعہ سے ہوائی جہاز نے خود بخود جو کام کیا وہ ایسا ہی مکمل ہے جیسا کہ ہوا باز کی مدد سے عمل میں آتا۔

آجکل یورپ میں جو سوسائٹیاں روح کی تحقیقات کر رہی ہیں انہوں نے بعض ایسے مشاہدات بیان کئے ہیں جن میں روح جسم سے علیحدہ تھی اور روح کی ٹانگ پر حملہ کرنے کا اثر جسم مادی کی ٹانگ پر ظاہر ہوا۔

بہر حال اہل شرع جو "روح" ثابت کرتے ہیں صوفیہ کو اس کا انکار نہیں بلکہ وہ اس کے اوپر ایک اور روح مجرد مانتے ہیں جس میں استحالہ نہیں بلکہ اس روح مجرد کی بھی اگر کوئی اور "روح" ہو اور آخر میں کثرت کا سارا سلسلہ سمٹ کر "امر ربی" کی وحدت پر منتہی ہو جائے تو انکار کی ضرورت نہیں۔

شیخ فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ نے "منطق الطیر" میں کیا خوب فرمایا ؎

ہم زجملہ بیش وہم پیش از ہمہ — جملہ از خود دیدہ وخویش از ہمہ
جاں نہاں در جسم و او در جاں نہاد — اے نہاں اندر نہاں ای جانِ جاں

روح ہر چیز میں ہے اور ہر چیز کو ایک حیثیت سے زندہ یا مُردہ کہہ سکتے ہیں

مذکورہ بالا تقریر سے یہ نکلتا ہے کہ ہر چیز میں جو "کن" کی مخاطب ہوئی روح حیات پائی جاوے بیشک میں یہی سمجھتا ہوں کہ مخلوق کی ہر نوع کو اس کی استعداد کیموافق قوی یا ضعیف زندگی ملی ہے یعنی جس کام کیلئے وہ چیز پیدا کی گئی ڈھانچہ تیار کر کے اس کو حکم دینا "کن" (اس کام میں لگ جا) بس یہی اس کی روح حیات ہے۔ جتنک اور جس حد تک یہ اپنی غرض ایجاد کو پورا کریگی اسی حد تک زندہ سمجھی جائے گی، اور جس قدر اس سے بعید ہو کر معطل ہوتی جائے گی۔ اسی قدر موت سے نزدیک یا مردہ کہلائے گی۔

یہ مضمون بہت طویل اور محتاج بسط و تفصیل ہے۔ ہم نے اہل علم و فہم کیلئے اپنی بساط کیموافق کچھ اشارے کر دیئے ہیں۔ شاید قرآن مجید پر نکتہ چینی کرنیوالے ہما

اتنا سمجھ لیں کہ روح کے متعلق بھی قرآن حکیم میں وہ رموز و حقائق بیان ہوئے ہیں جنکا عشر عشیر دوسری آسمانی کتاب میں بیان نہیں ہوا۔ واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم وھو الملہم للصواب۔

کتبہ العبد الضعیف

شبیر احمد عثمانی دیوبندی عفا اللہ عنہ

جامعہ اسلامیہ ڈابھیل ضلع سورت شعبان ۱۳۵۰ھ

المعراج فی القرآن

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ

پاک ذات ہے جو لے گیا اپنے بندہ کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد

الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ

اقصٰی تک، جس کو گھیر رکھا ہے ہماری برکت نے، تاکہ دکھلائیں

لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ۝

اس کو کچھ اپنی قدرت کے نمونے، وہی ہے سننے والا دیکھنے والا

اسراء اور معراج کا فرق

علماء کی اصطلاح میں مکہ سے بیت المقدس تک کے سفر کو "اسرا" اور وہاں سے اوپر "سدرۃ المنتہیٰ" تک کی سیاحت کو "معراج" کہتے ہیں۔ اور بسا اوقات دونوں سفروں کے مجموعے کو ایک ہی لفظ "اسرا" یا "معراج" سے تعبیر کر دیا جاتا ہے۔ معراج کی احادیث تقریباً تیس صحابہ سے منقول ہیں جس میں "معراج" و "اسرا" کے واقعات بسط وتفصیل

سے بیان ہوئے ہیں۔

جمہور امت کا عقیدہ

جمہور سلف و خلف کا عقیدہ یہ ہے کہ حضور پُر نور کو حالتِ بیداری میں بجسدہ الشریف معراج ہوئی۔ صرف دو تین صحابہؓ و تابعین سے منقول ہے کہ واقعہ اسراء و معراج کو منام (نیند) کی حالت میں بطور ایک عجیب و غریب خواب کے مانتے تھے۔ چنانچہ اس سورت میں آگے چل کر جو لفظ "وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِي أَرَيْنَاكَ" آتا ہے اس سے یہ حضرات استدلال کرتے ہیں۔ سلف میں سے یہ کسی کا قول نہیں کہ معراج حالتِ بیداری میں محض روحانی طور پر ہوئی، جیسا کہ بعض حکماء و صوفیاء کے مذاق پر تجویز کیا جا سکتا ہے۔ روح المعانی میں ہے: "وَلَيْسَ مَعْنَى الْإِسْرَاءِ بِالرُّوحِ الذَّهَابُ يَقْظَةً كَالْإِنْسِلَاخِ الَّذِي ذَهَبَ إِلَيْهِ الصُّوفِيَّةُ وَالْحُكَمَاءُ فَإِنَّهُ وَإِنْ كَانَ خَارِقًا لِلْعَادَةِ وَمَحَلًّا لِلتَّعَجُّبِ أَيْضًا إِلَّا أَنَّهُ أَمْرٌ لَا تَعْرِفُهُ الْعَرَبُ وَلَمْ يَذْهَبْ إِلَيْهِ أَحَدٌ مِنَ السَّلَفِ" اھ بے شک ابن قیم نے "زاد المعاد" میں عائشہ صدیقہؓ، معاویہؓ اور حسن بصری رضی اللہ عنہم کے مسلک کی اس طرح توجیہ کی ہے۔ لیکن اس پر کوئی نقل پیش نہیں کی۔ محض ظن و تخمین سے کام لیا ہے۔ ابن اسحٰق وغیرہ نے جو الفاظ ان بزرگوں کے نقل کئے ہیں ان میں کہیں حالتِ بیداری کی تصریح نہیں، بہرحال قرآن کریم نے جس قدر اہتمام اور ممتاز و درخشاں عنوان

سے واقعہ اسراء کو ذکر فرمایا اور جس قدر جد و مستعدی سے مخالفین اس کے انکار و تکذیب پر تیار ہو کر میدان میں نکلے، حتیٰ کہ بعض موافقین کے قدم بھی لغزش کھانے لگے، یہ اس کی دلیل ہے کہ واقعہ کی نوعیت محض ایک عجیب و غریب خواب یا سیرِ روحانی کی نہ تھی۔ روحانی سیر و انکشافات کے رنگ میں آپ کے جو دعاوی بعثت سے رہے ہیں۔ دعوائے اسراء، کفار کے لئے کچھ اُن سے بڑھ کر تعجب خیز و حیرت انگیز نہ تھا جو خصوصی طور پر اس کو تکذیب و تردید اور استہزاء و تمسخر کا نشانہ بناتے اور لوگوں کو دعوت دیتے کہ آؤ آج مدعی نبوت کی ایک بالکل انوکھی بات سنو! نہ آپ کو خاص اس واقعہ کے اظہار پر اس قدر متفکر و مشوش ہونے کی ضرورت تھی جو بعض روایاتِ صحیحہ میں مذکور ہے۔ بعض احادیث میں صاف الفاظ ہیں: "ثُمَّ أَصْبَحْتُ بِمَكَّةَ" (پھر صبح کے وقت میں مکہ پہنچ گیا) اگر معراج محض کوئی روحانی کیفیت تھی تو آپ مکہ سے غائب ہی کہاں ہوئے؟ اور شداد بن اوس وغیرہ کی روایت کے موافق بعض صحابہؓ کا یہ دریافت کرنا کیا معنی رکھتا ہے کہ "رات میں نے قیام گاہ پر تلاش کیا، حضورؐ کہاں تشریف لے گئے تھے؟" ہمارے نزدیک "أَسْرَىٰ بِعَبْدِهِ" کے یہ معنیٰ لینا کہ خدا اپنے بندے کو خواب میں یا روحانی طور پر مکہ سے بیت المقدس لے گیا، اس کے مشابہ ہے کہ کوئی شخص "فَأَسْرِ بِعِبَادِي" کے یہ معنیٰ لینے لگے، کہ

"اے موسیٰ میرے بندوں (بنی اسرائیل) کو خواب میں یا محض روحانی طور پر مصر سے لے کر نکل جاؤ"، یا "سورۂ کہف" میں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات کے لیے جانا اور اُن کے ہمراہ سفر کرنا جس کے لیے کئی جگہ "فَانْطَلَقَا" کا لفظ آیا ہے اُس کا مطلب یہ لے لیا جائے کہ یہ سب کچھ محض خواب میں یا بطور روحانی سیر کے واقع ہُوا تھا۔ باقی لفظ "رُؤیا" جو قرآن میں آیا، اس کے متعلق ابنِ عباسؓ فرما چکے ہیں، "رُؤیا عَیْنٍ اُرِیَهَا رسول اللہ صلعم"۔ مفسرین نے کلام عرب سے اس کے شواہد پیش کیے ہیں کہ "رُؤیا" کا لفظ گاہ بگاہ مطلق رؤیت (دیکھنے) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر اس سے مراد یہی اسراء کا واقعہ ہے تو مطلق رؤیت کے معنی لیے جائیں، جو ظاہری آنکھوں سے ہُوئی۔ تاکہ ظواہر نصوص اور جمہور اُمّت کے عقیدہ کی مخالفت نہ ہو۔ ہاں شریک کی روایت میں بعض الفاظ ایسے ضرور آئے ہیں جن سے "اسراء" کا بحالت نوم واقع ہونا معلوم ہوتا ہے۔ مگر محدثین کا اتفاق ہے کہ شریک کا حافظہ خراب تھا۔ اس لیے بڑے بڑے حفاظِ حدیث کے مقابلے میں اُن کی روایت قابل استناد نہیں ہوسکتی۔ حافظ ابنِ حجرؒ نے فتح الباری کے آخر میں حدیث شریک کے اغلاط شمار کرائے ہیں اور یہ بھی بتلایا ہے کہ اِن کی روایت کا مطلب ایسا لیا جاسکتا ہے جو عام احادیث کے مخالف

نہ ہو۔ اس قسم کی تفاصیل ہم یہاں درج نہیں کرسکتے۔ شرح صحیح مسلم میں یہ مباحث پوری شرح و بسط سے درج کیے ہیں۔ یہاں صرف یہ بتلانا ہے کہ مذہب راجح یہی ہے کہ معراج و اسراء کا واقعہ حالت بیداری میں بجسدہ الشریف واقع ہُوا۔ ہاں اگر اس سے پہلے یا بعد میں خواب میں بھی اس طرح کے واقعات دکھلائے گئے ہُوں تو انکار کرنے کی ضرورت نہیں۔

معراج پر شبہ اور اس کا جواب

کہا جاتا ہے کہ ایک شب میں اتنی لمبی مسافت زمین و آسمان کی کیسے طے کی ہوگی یا کرۂ نار و زمہریر میں سے کیسے گزرے ہوں گے۔ یا اہل یورپ کے خیال کے موافق جب آسمانوں کا وجود ہی نہیں تو ایک آسمان سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے پر اس شان سے تشریف لے جانا جو روایات میں مذکور ہے کیسے قابل تسلیم ہوگا لیکن آج تک کوئی دلیل اس کی نہیں پیش کی گئی کہ آسمان واقع میں کوئی شے موجود نہیں۔ اگر ان لوگوں کا یہ دعویٰ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ یہ نیلگونی چیز جو ہم کو نظر آتی ہے۔ فی الحقیقت آسمان نہیں تب بھی اس کا کیا ثبوت ہے کہ اس نیلگونی رنگ کے اوپر آسمانوں کا وجود نہیں ہوسکتا۔ رہا ایک رات میں اتنا

طویل سفر طے کرنا تو تمام حکماء تسلیم کرتے ہیں کہ سرعتِ حرکت کے لئے کوئی حد نہیں ہے۔ اب سے سو برس پیشتر تو کسی کو یہ یقین بھی نہ آسکتا تھا کہ تین سو میل فی گھنٹہ چلنے والی موٹر تیار ہو جائے گی یا دس ہزار فٹ کی بلندی تک ہم ہوائی جہاز کے ذریعے پرواز کر سکیں گے۔ "اسٹیم" اور "قوت کہربائیہ" کے یہ کرشمے کس نے دیکھے تھے۔ کرۂ نار تو آجکل ایک لفظ بے معنیٰ ہے۔ ہاں اوپر جا کر ہوا کی سخت برودت وغیرہ کا مقابلہ کرنے والے آلات طیاروں میں لگا دیئے گئے ہیں جو اڑنے والوں کی زمہریر سے حفاظت کرتے ہیں۔ یہ تو مخلوق کی بنائی ہوئی مشینوں کا حال تھا۔ خالق کی بلا واسطہ بنائی ہوئی مشینوں کو دیکھتے ہیں تو عقل دنگ ہو جاتی ہے۔ زمین یا سورج چوبیس گھنٹوں میں کتنی مسافت طے کرتے ہیں۔ روشنی کی ایک شعاع ایک منٹ میں کہاں سے کہاں پہنچتی ہے۔ بادل کی بجلی مشرق میں چمکتی اور مغرب میں گرتی ہے اور اس سرعتِ سیر و سفر میں پہاڑ بھی سامنے آجائے تو پرِ کاہ کے برابر حقیقت نہیں سمجھتی۔ جس خدا نے یہ چیزیں پیدا کیں۔ وہ قادرِ مطلق اپنے حبیب صلعم کے براق میں ایسی برق رفتاری کی کلیں اور حفاظت و آسائش کے سامان نہ رکھ سکتا تھا۔ جس سے حضورؐ بڑی راحت و تکریم کے ساتھ چشم زدن میں ایک مقام سے دوسرے مقام کو منتقل

ہو سکیں؟ شاید اسی لئے واقعہ "اسراء" کا بیان "سبحان الذی" سے شروع فرمایا۔ جو لوگ کوتاہ نظری اور تنگ خیالی سے حق تعالیٰ کی لامحدود قدرت کو اپنے وہم و تخمین کی چہار دیواری میں محصور کرنا چاہتے ہیں۔ کچھ اپنی گستاخیوں اور ترک تازیوں پر شرمائیں۔

نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن
کہ جاہا سپر باید انداختن

بیت المقدس لے جانے کی حکمت

جس ملک میں مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) واقع ہے وہاں حق تعالیٰ نے بہت سی ظاہری اور باطنی برکات رکھی ہیں۔ مادی حیثیت سے چشمے، نہریں، غلے، پھل اور میووں کی افراط اور روحانی اعتبار سے دیکھا جائے تو کتنے انبیاء و رسل کا مسکن و مدفن اور ان کے فیوض و انوار کا سرچشمہ رہا ہے۔ شاید نبی کریم صلعم کو وہاں لے جانے میں یہ بھی اشارہ ہو گا کہ جو کمالات انبیائے بنی اسرائیل وغیرہ پر تقسیم ہوئے تھے آپؐ کی ذاتِ مقدس میں وہ سب جمع کر دیئے گئے۔ جو نعمتیں بنی اسرائیل پر مبذول ہوئی تھیں۔ اُن پر اب بنی اسمٰعیل کا قبضہ دلایا جانے والا ہے۔ کعبہ اور بیت المقدس دونوں کے انوار و برکات کی حامل ایک ہی اُمت ہونیوالی ہے۔ احادیث معراج میں تصریح ہے کہ بیت المقدس میں تمام انبیاءؑ

علیہ السلام نے سرورِ دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدار میں نماز پڑھی۔ گویا آپ کو جو سیادت و امامت انبیاء کا منصب دیا گیا تھا، اس کا نمونہ آپ کو اور آپ کے مقربینِ بارگاہ کو دکھلایا گیا۔ آخر آیت میں فرمایا "اصلی سننے اور دیکھنے والا خدا ہے۔" یعنی وہ جسے اپنی قدرت کے نشان دکھلانا چاہے دکھلا دیتا ہے۔ اُس نے اپنے حبیب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مناجات کو سُنا۔ اور احوالِ رفیعہ کو دیکھا۔ اور آپ کو آخر معراج شریف میں "ربی یبجہو" والی آنکھ سے وہ آیاتِ عظام دکھلائیں، جو آپ کی استعداد کامل اور شانِ رفیع کے مناسب تھیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

تمت بالخیر



عقل اور مذہب کے درمیان باہمی تعلق کے نازک مسئلہ پر سیر حاصل بحث

العقل والنقل

عقلِ سلیم، اور نقلِ صحیح میں اختلاف ممکن نہیں! اور کبھی عقل کی سلامتی یا نقل کی صحت میں قصور ہونے کی وجہ سے اختلاف نظر آئے تو فیصلہ کا صحیح طریقہ

از

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ

ناشر

ادارہ اسلامیات ۱۹۰۔ انارکلی۔ لاہور

قیمت

فہرست مضامین

(نوٹ) اصل کتاب میں اگرچہ عنوانات موجود نہیں ہیں، لیکن قارئین کی سہولت کے لئے کتاب میں مندرجہ مضامین کی فہرست ذیل میں دی جا رہی ہے۔

دیباچہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ۔ مذہب اسلام اور فلسفۂ یونان میں جب جنگ ہوئی تو مسلمانوں نے علم کلام کے زبردست ہتھیاروں سے اس کا قطعی فیصلہ کر دیا اور اسلام کو ایسے مضبوط فصیلوں اور دمدموں سے محفوظ کیا جن کے مقابلہ میں اعلیٰ سے اعلیٰ قلعہ شکن توپیں بھی اپنا کوئی اثر نہ دکھلا سکیں۔

یہ کہنا بالکل مبالغہ سے خالی ہے کہ متکلمین نے مذہب کی سطح پر قائم رہ کر حجت و استدلال کے متعلق جو کچھ اصول اور قواعد وضع کئے ان سے تمام باطل توہمات کی قلعی کھل گئی۔

فلسفۂ یونان کی ملمع سازیوں کا طلسم ٹوٹا معترضین کی ابلہ فریبیوں کا پردہ فاش ہوا اور قیامت تک کے لئے مخالفین کی نکتہ چینیوں کا سدباب کر دیا گیا۔ لیکن افسوس کہ ہمارے زمانہ کے بعض کوتاہ نظروں کی تسلی اس پر بھی نہ ہوئی اور وہ علم کلام کو آج کل کی ضروریات کے حق میں ناکافی ہی سمجھتے رہے۔

ابھی کچھ عرصہ ہوا یورپ سے یہ صدا اٹھی کہ علوم جدیدہ نے تمام مذاہب کی بنیادوں میں تزلزل پیدا کر دیا ہے اور مختلف ادیانِ عالم میں سے ایک مذہب بھی اس کے مقابلہ کی تاب نہیں لا سکا۔

جن لوگوں کو ہر بات کی تصدیق کے لیے یورپ کی وحی کا انتظار رہتا ہے۔ بے چون وچرا اس پر ایمان لے آئے اور ملک میں اس خیال کو اس قدر شہرت دی کہ اس سرے سے اس سرے تک جابجا یہی چرچا ہو گیا۔ علماء نے یہ دیکھ کر کہ عام لوگ مذہب سے بددل ہوئے جاتے ہیں اس کی تحقیق کی طرف توجہ کی مگر تفتیش کے بعد ثابت ہوا کہ اس دعویٰ میں واقفیت کا بہت ہی کم حصہ شامل ہے۔

○ اس میں شک نہیں کہ علماء سائنس نے مادیات اور طبعیات کے متعلق بہت سی جدید باتیں دریافت کیں۔ علم ہیئت (علم الافلاک) میں مفید بیانات کا اضافہ کیا۔ صنعت و دستکاری کے عجیب و غریب کرشمے دکھلائے۔ روشنی اور بجلی وغیرہ کے متعلق جدید تحقیقات سے عالم کو منور کر دیا لیکن انہوں نے یہ نہیں بتلایا کہ ان میں سے کون سی بات اسلام کے مخالف ہے یا کس چیز کے ثابت ہونے سے کسی اسلامی مسالہ پر نقص وارد کیا جا سکتا ہے۔

فرض کر لو کہ عناصر کی تعداد (۶۷) سے بھی کچھ زیادہ ہے۔ یہ بھی تسلیم کر لو کہ زمین ساکن نہیں متحرک ہے یہ بھی مان لو کہ کواکب سیارہ سات میں منحصر نہیں۔ مگر کیا اس سے توحید کے ثبوت میں کچھ خلل آیا۔ یا نبوت کا دعویٰ باطل ہو گیا کسی آیت قرآنی کی مخالفت ہوئی یا حدیث رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا انکار کیا گیا۔ جب ان میں سے کچھ بھی نہیں تو اب تم دیکھو کہ علوم جدیدہ نے اسلامی مسائل کے متعلق رداً یا قبولاً کس چیز کی زیادتی کی۔

اس کے جواب میں ان چند بوسیدہ اور پامال اعتراضات کے سوا کچھ نہیں کہا جاتا جو حدوث مادہ، معجزات اور حشر و نشر وغیرہ کے متعلق عام طور پر زبان زد ہیں اور جن کو ہمارے زمانے کے بعض آزاد خیال مؤلفین نے اردو زبان میں ذرا سلجھا کر تحریر کر دیا ہے لیکن جن لوگوں نے علم کلام کی تکمیل کو صرف شرح عقاید خیالی کے دائرہ میں محدود نہیں سمجھ رکھا وہ خوب جانتے ہیں کہ علماء اسلام نے کہاں تک ان تمام شبہات کا رکیک اور بیجان ہونا ثابت کیا ہے۔ اور کس خوبی اور بسط کے ساتھ ان اعتراضات کا رد لکھا ہے کاش میری اس تحریر کے پڑھنے والے ابن حزم ظاہریؒ کی ملل و نحل علامہ علاؤالدین علی طوسیؒ کی کتاب الذخیرہ۔ فاضل تفتازانیؒ کی شرح مقاصد۔ امام غزالیؒ کی تہافۃ الفلاسفہ اور محققین فن کی نادر تصنیفات کا مطالعہ کریں۔ جس سے اُن کے روبرو میرے اس بیان کی صداقت ظاہر ہو۔

اس بات کا کہہ دینا اس کے ثابت کرنے سے زیادہ آسان ہے کہ علوم جدیدہ کی روشنی میں تمام علوم قدیم ماند پڑ گئے اس کے مقابلہ میں متکلمین کی تحقیقات بالکل بیکار ثابت ہو گئیں اور اس کے دنیا میں آنے سے مذہب کو موت کا سامنا کرنا پڑا۔

کیا یہ دعویٰ کرنے والے ہم کو خاص ان مضامین کی ایک فہرست دے کر ممنون بنا سکتے ہیں جن کو اسلام اور متکلمین اسلام کے دلائل کے مخدوش بنانے میں کسی قسم کا دخل ہو اور جن کی صحت و سقم پر قدیم علم کلام نے بہت کافی طور پر بحث نہ کی ہو۔

ہماری ایسے لوگوں سے جو حال کے علماء کو جدید حملوں کی مدافعت سے عاجز بتلاتے ہیں یہ التجا ہے کہ وہ ضرور ہم کو ایسے مسائل کی مع ان کے دلائل کے ایک فرد تیار کر کے عنایت فرمائیں جن کا مقابلہ ہمارے بوڑھے اسلام سے نہ ہو سکا۔ اور آخر کار ہمارے سی۔ ایس۔ آئی بہادر کو اس کے ضعف اور پیرانہ سالی پر رحم کھا کر اس میں بہت کچھ اصلاح کرنے کی ضرورت پیش آئی تاکہ یہ ترمیم شدہ اسلام نوجوان یورپ کی نظروں میں وقیع اور باعظمت بن سکے بہر حال۔

اپنی جہالت کی وجہ سے جس کا جو جی چاہے کہے مگر انصاف یہ ہے کہ اسلامی عقائد کے متعلق متکلمین نے جس درجہ موشگافی۔ باریک بینی۔ اور فلسفیانہ نکتہ رسی سے کام لیا ہے اس نے ہمیشہ کے لئے ہم کو اندرونی اور بیرونی مخالفین اسلام کے پیچیدہ اعتراضات کے حل کرنے سے سبکدوش کر کے ان کا ممنون احسان بنا دیا اور میں جرأت کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اب بھی دنیا میں امام ابو الحسن اشعری اور ابو المنصور ماتریدی کے ایسے وکیل موجود ہیں جو اسلامی معتقدات کے متعلق ان تمام شبہات کا استیصال کرتے ہوئے جو کسی نئے سے نئے پیرایہ میں ظاہر کئے جائیں، قدیم علم کلام کے کامل و مکمل ہونے کا ثبوت دے سکیں۔

○ ہم نے اپنے ان دوستوں کو جو قدیم علم کلام کو اکثر ناقص بتلایا کرتے ہیں بارہا یہ بھی کہتے سنا ہے کہ قدیم علم کلام میں صرف عقائد اسلام کے متعلق بحث ہوتی تھی کیونکہ اس زمانے میں مخالفین نے اسلام پر جو اعتراض کئے

تھے عقاید ہی کے متعلق تھے لیکن آج کل تاریخی اخلاقی تمدنی ہر حیثیت سے مذہب کو جانچا جاتا ہے یورپ کے نزدیک کسی مذہب کے عقائد اس قدر قابلِ اعتراض نہیں جس قدر اس کے قانونی اور اخلاقی مسائل ہیں، ان کے نزدیک تعدد نکاح۔ طلاق۔ غلامی۔ جہاد کا کسی مذہب میں جائز ہونا اس مذہب کے باطل ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ اس بناء پر علم کلام میں اس قسم کے مسائل سے بھی بحث کرنا ضروری ہے اور یہ حصہ بالکل قدیم علم کلام میں موجود نہیں۔

ہمارے ان احباب کا یہ کہنا بالکل سچ ہے کہ قدیم علم کلام کا تعلق صرف عقائد سے ہے قانونی اور اخلاقی مسائل سے اس میں مطلقاً بحث نہیں کی گئی، لیکن متکلمین یہ نہ کرتے تو کیا کرتے علم کلام کا مقصد ہی عقائد تک محدود تھا قانونی اور اخلاقی مباحث کے لئے اس کی وضع ہی نہ تھی۔ ان چیزوں کے لئے دوسرے علوم کی حاجت تھی چنانچہ فن تصوف و اخلاق اور علم اسرار الدین نے اس ضرورت کو بھی رفع کیا اور اسلام کی تمام جزئیات نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، نکاح، طلاق، جنگ و جہاد کے مخفی اسرار اور حکمتوں کو نہایت تفصیل کے ساتھ ظاہر کر دیا۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی قیمتی تصنیفات اس وقت بھی کثرت سے موجود ہیں جن کے مطالعہ سے میرے اس بیان کی پوری تصدیق ہو سکتی ہے۔ اور اس عنوان کے ذیل میں جس سلسلہ مضامین کے لکھنے کا میں ارادہ کر رہا ہوں اس میں اس کا خیال رکھوں گا حسب موقع ان بیش بہا تصانیف سے مفید اقتباسات

حاصل کروں۔

بہرکیف علم کلام جس غرض کی تکمیل کے لئے مدوّن کیا گیا۔ میرے نزدیک اس نے اس میں پوری کامیابی حاصل کی اور اب میرا قصد ہے کہ میں اسلامی عقائد کے ہر باب کے متعلق بصورت رسائل عدیدہ یہ دکھلاؤں کہ علمائے اسلام نے اس کو تحقیق کی کس حد تک پہنچا کر چھوڑا ہے اور اب ہم کو اس میں کہاں تک ترمیم یا اصلاح کرنے کی ضرورت ہے لیکن مجھ کو اپنے اصلی مقصد کے شروع کرنے سے پہلے جیسا کہ چندان مقامات کا ذکر کر دینا ضروری ہے جنکے بغیر ہمارا مقصد کامل طور پر اور آسانی کے ساتھ دل نشین نہیں ہو سکتا اسی طرح بعض ان خطرناک غلطیوں پر مطلع کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جو اصول کے عام طور پر عام مسلمانوں میں تسلیم کر لی گئی ہیں اور جو آگے چل کر ہمارے ناظرین کو بعض اصلی مقاصد کے سمجھنے میں مزاحم ہو سکتی ہیں۔

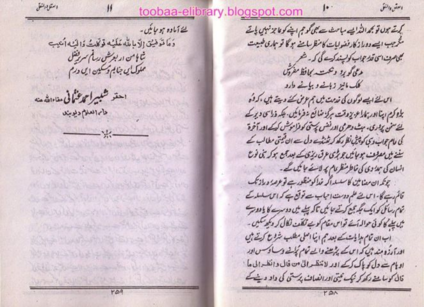
لیکن جس اہم کام اور طویل الذیل سلسلہ کا میں نے بیڑہ اٹھایا ہے اور جس کا آغاز بنام خدا آج اس رسالہ سے کیا جاتا ہے وہ اسی وقت انجام کو پہنچ سکتا ہے جب کہ اس مضمون کے پڑھنے والے کلمات خیر سے میری ہمت بڑھائیں اور خدا کی توفیق شامل حال رہے اور عجب نہیں کہ اگر اس ناچیز مضمون کا کوئی حصہ پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا تو پھر ہم کو قدیم و جدید ہیئت کے مسائل کے موازنہ کرنے کی بھی اپنے دسترس کے موافق جرأت ہو اور اگر زندگی ہے تو انشاءاللہ ہم علوم جدیدہ کے متعلق اپنی معلومات بڑھانے کی کوشش اور اس مقصد کی تکمیل کی ضرور فکر

کریں گے۔ شعر

در ہمیریم عذر ما بپذیر ہو اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

اس سے قبل کہ توحید، رسالت اور جزا و سزا وغیرہ اسلامی اصولوں میں سے ہر ایک اصول کی علیحدہ علیحدہ رسائل کے ذریعہ سے بلا شائبہ تعصب مفصل تحقیقات کی جائے اس ایک رسالہ میں چند ایسے امور کا ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے جو ان مباحث میں امداد دینے کے علاوہ اس موقع پر ایک خاص قسم کی دلچسپی سے خالی نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ امور درحقیقت ایسے قوانین ہوں گے جن کی صحت اُن محسوسات اور بدیہیات پر مبنی ہوگی جو ہر طرح سے قابلِ اطمینان ہیں۔ اور انہی سچے قوانین کی میزان سے ہم آئندہ چلکر اسلامی مسائل کی پوری جانچ کر سکیں گے۔ گویا یہ مقدمات ہمارے نزدیک ان اصول موضوعہ کے طور پر لکھے جائیں گے، جن کے سہارے ہمارے اکثر بیانات کی بنیادیں قائم ہوں گی۔

اب اگر کسی صاحب کو ان میں سے کوئی اصول مشتبہ یا غلط نظر آئے تو وہ بہت شوق کے ساتھ اپنے اعتراض کو ظاہر فرمائیں۔ لیکن اپنے کسی ایک دعوے کے ثبوت میں بھی چند کہنہ سال یوروپین کا نام لینے پر اکتفا نہ کریں۔ تاوقتیکہ اُن کے پاس ایسی ہی کوئی دلیل قطعی نہ ہو جیسا کہ ہم اپنے ہر ایک دعوے کے ساتھ ساتھ پیش کریں گے، یا جیسے دلائل تو یہ کا وہ ہم سے خود مطالبہ فرمانے کو تیار ہوں گے اور اگر وہ صاحب صرف چند جرمنی اور فرانسیسی مصنفین کے اقوال یاد کر لینے ہی کو علوم جدیدہ میں ماہر ہونا تصور



کرتے ہوں تو بحمد اللہ ایسے مباحث سے بھی گو ہم اپنے کو عاجز نہیں پاتے مگر جب ایسے دور از کار فضولیات کا منظر سامنے ہوگا تو ہماری طبیعت بھی صرف اسی قدر جواب کو پسند کرے گی کہ۔ شعر

مدعی گو برو و نکتہ بحافظ مفروش
کلک ما نیز زبانے و بیانے دارد

اس لئے ایسے لوگوں کی خدمت میں ہم عرض کئے دیتے ہیں، کہ وہ بلا کرم اپنا اور ہمارا عزیز وقت ہرگز ضائع نہ فرمائیں۔ بلکہ ذرا سی دیر کے لئے سخن پروری۔ ہٹ دھرمی اور نفس پرستی کو فراموش کرکے اور آخرۃ کی عام جواب دہی کو پیش نظر رکھ کر ٹھنڈے دل سے ان قیمتی مطالب کے سننے میں مصروف ہو جائیں جو بڑی عرق ریزی کے بعد جمع ہو کر بنی نوع انسان کی ہمدردی کی خاطر منظر عام پر لائے جائیں گے۔

چونکہ ان مضامین کا سلسلہ اگر خدا کو منظور ہے تو عرصۂ دراز تک قائم رہے گا۔ اس لئے علم دوست احباب سے توقع ہے کہ اس سلسلہ کے تمام رسائل کو ایک جگہ جمع کرتے جائیں تاکہ پہلے میں دوسرے کا یا دوسرے میں پہلے کا کوئی حوالہ آئے تو اس مقام کو بے تکلف نکال کر دیکھ سکیں۔

اب ان تمام ہدایات کے بعد ہم اپنا اصلی مطلب شروع کرتے ہیں اور آرزو مند ہیں کہ اس کے پڑھنے والے تمام پرانے وساوس اور اوہام سے دل کو پاک کرکے اور لا تنظر الی من قال وانظر الی ما قال کو سامنے رکھ کر نیک نیتی اور انصاف پرستی کی داد دینے کے

لئے آمادہ ہو جائیں۔

وَمَا تَوْفِيْقِیْ اِلَّا بِاللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْب

شاہا من ار بعرش رسانم سریر فضل
مملوک ایں جنابم و مسکین ایں درم

احقر شبیر احمد عثمانی عفاء اللہ عنہ
دار العلوم دیوبند

العقل والنقل

تمام اہل فہم کے نزدیک یہ مسلمات میں سے ہے کہ نقل صحیح یا عقل کامل کا اتباع انسان کے اولین فرائض میں سے ہے اور انہی دونوں کی اطاعت پر اس کے برگزیدہ کمالات اور حقیقی کامیابیوں کے حاصل ہونے کا انحصار ہے۔ پھر ہر چند کہ اہل تحقیق کے نزدیک ان دونوں حاکموں (عقل ونقل) میں کبھی نزاع اور خصومت بجز اس کے ممکن نہیں کہ یا نقل کی صحت مشکوک ہو یا عقل کی سلامتی میں کچھ نقصان اور فتور واقع ہو جائے۔ مگر جب کبھی کسی وجہ سے کسی موقع پر ان دونوں میں خلاف محسوس ہوتا ہے تو انسان کے خیالات میں سخت تزاحم اور تذبذب پیدا ہو جاتا ہے، اور دونوں جانبوں کی کھینچ تان سے اس کو یہ دشواری پیش آتی ہے کہ وُہ ان میں سے کس کے حکم کو قبول اور کس کو رد کرے اگر دونوں کی تعمیل کرنا چاہے تو اس کی کیا صورت ہو اور کسی ایک کو ترجیح دے تو کیونکر دے۔

اس لئے سب سے پہلے مگر سب سے مشکل منزل (جس کے طے کئے بغیر ہم اپنے اصلی مدعا تک نہیں پہنچ سکتے) یہ ہے کہ عقل ونقل کا یہ قدیم جھگڑا چکایا جائے جس کی بدولت پچھلے زمانہ میں سینکڑوں دانشمند آدمیوں کی قربانی ہو چکی ہے اور بہت سے بے قصور لوگ دار پر کھینچ دیئے گئے ہیں۔ جب کبھی مدعیان عقل نے قدم جمائے اہل نقل کے استیصال میں

تسمہ باقی لگا نہیں رکھا اور جب نقل کے بیوقوف پیرووں کا دور دورہ ہُوا تو انہوں نے بھی اپنے فریق مقابل کے حق میں سر قلم کرنے یا آگ میں جلا دینے سے کم کوئی سزا تجویز نہیں کی۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس اختلاف عقل ونقل کی اصلی حقیقت کیا ہے؟ کیا اس خوفناک نزاع میں کوئی صحیح صورت تطبیق کی ممکن ہے یا کسی اہل مذہب نے ان دونوں میں تطبیق دینے کی کوشش کی؟ کیا ان تطبیق دینے والوں میں سے کوئی ایک شخص بھی اپنی سعی میں کامیاب ہُوا؟

یہ وُہ سوالات ہیں جن پر غور کرنا ہر ایک مذہب والے کا فرض ہے اور اس وقت ہم انہی مہتم بالشان امور پر کامل طریقہ سے ایسے آسان پیرایہ میں بحث کریں گے جس میں عام، خاص، عالم، جاہل، اور ذکی، غبی سب مساوی طور پر حصّہ لیں۔

قدیم سے قدیم روایات پر عبور کرنے سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ عقل ونقل کی یہ نزاع اور باہمی کشمکش کسی ایک قوم، ایک ملک اور ایک ملت کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ انسانی آبادی کے ہر طبقہ اور ہر حصّہ میں دونوں قسم کی طبیعتیں ہمیشہ موجود رہی ہیں جو زمانہ کسی قوم کے حق میں اعلیٰ درجہ کی وحشت۔ بدویت اور عام تاریکی کا فرض کیا جائے اس میں بھی متمدن اقوام کی مانند دونوں طرح کے خیالات پائے جاتے ہیں۔ بعض لوگ اپنی عقل کے ایسے پابند اور خیالات کے ایسے محکوم ہوتے ہیں کہ جو چیز ان کی عقل وادراک سے خارج ہُو اس کو وُہ واقع میں موجود ہی

نہیں سمجھتے اور ان کے برخلاف بعضوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ جب وہ اپنے کسی نسبی بزرگ یا مذہبی مقتدا سے کوئی بات سُن لیں تو بے چون وچرا ان کے حکم کے سامنے گردن ڈال دیں بشرطیکہ اس مقتدا کے مقتدا ہونے پر ان کو پورا اعتماد حاصل ہو چکا ہو۔

اس کے بعد ان دونوں گروہوں میں طعن و تشنیع کا دروازہ کھل جاتا ہے پہلا گروہ دوسرے کو سادہ دل، کم عقل اور بیوقوف سمجھتا ہے اور دوسرا پہلے کو بے ادب، مغرور اور نافرمان قرار دیتا ہے۔ رفتہ رفتہ دونوں میں کینہ اور بغض کی آگ بھڑک اٹھتی ہے اور زبان و دل سے گزر کر ہاتھ پاؤں تک جنگ و جدل کی نوبت پہنچ جاتی ہے۔

یہ سب کچھ ہوتا ہے مگر اس پر بھی امر متنازع فیہ کا تصفیہ نہیں ہوتا۔ بلکہ طرفہ ماجرا یہ ہے کہ بسا اوقات ایک ہی شخص اور ایک ہی کتاب کے دو قول اس مسئلہ میں متناقض پہلو رکھتے ہیں۔ اور ہماری حیرت اور تعجب کی اس وقت کوئی انتہا نہیں رہتی جب ہم کو کسی ایک ایسی مذہبی کتاب میں جو کسی فرقہ کے نزدیک خطا و قصور سے بالکل پاک تسلیم کر لی گئی ہے۔ وہ متعارض کلام اس بارے میں نظر پڑتے ہیں۔ جب ہم موسیٰ علیہ السلام کی کتاب کی ورق گردانی کرتے ہیں تو امثال سلیمان کے تیسرے باب میں یہ عبارت لکھی ہوئی ملتی ہے۔

"اپنے سارے دل سے خداوند پر توکل کر، اور اپنی سمجھ پر تکیہ مت کر، اپنی ساری راہوں میں اس کا اقرار کر، وُہ تیری

رہنمائی کرے گا، اپنی نگاہ میں آپ کو دانش مند مت جان، خداوند سے ڈر، اور بدی سے باز رہ، یہ تیری ناف کے لئے صحت اور تیری ہڈیوں کے لئے تراوٹ ہے۔"

اور انہی امثال کے آٹھویں باب میں لکھا ہے کہ:۔

"کیا دانائی نہیں پکارتی اور کیا فہمید آواز بلند نہیں کرتی۔ وُہ سڑک کے پاس اونچے مقاموں کی چوٹیوں پر اور چوراہے کے چبوترے پر کھڑی ہوتی ہے وہ پھاٹکوں کے نزدیک شہر کے مدخل پر جہاں سے دروازوں میں داخل ہوتے ہیں چلاتی ہے کہ اے آدمیو میں تمہیں بُلاتی ہوں۔ اور بنی آدم کی طرف اپنی آواز اُٹھاتی ہوں۔ اے بیوقوفو! خرد کو سمجھو، اور اے جاہلو! سمجھنے والا دل پیدا کرو۔ سنو کہ میں لطیف مضمون کہتی ہوں۔ اور میرے لبوں سے جب وُہ کھلتے ہیں تو سچی باتیں نکلتی ہیں کہ میرا منہ سچ کہتا ہے! اور میرے لبوں کو شرارت سے نفرت ہے۔ میرے منہ کی ساری باتیں صداقت کی ہیں ان میں کچھ ٹیڑھا، ترچھا نہیں، وہ سب اس کے نزدیک جو دانش رکھتا ہے سیدھے ہیں اور ان کے خیال میں جو حقیقت شناس ہیں راست ہیں۔"

پاؤل رسول نے جو خط رومیوں کو لکھا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

"غرض میں اپنی عقل سے خدا کی شریعت اور جسم سے گناہ

کی بندگی کرتا ہوں[1]"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ خدا کی شریعت کا اتباع وہ اپنی عقل کے بھروسے پر کرتے تھے لیکن اس کے خلاف انہی پاؤل رسول نے جو خط کرنتھیوں کو تحریر کیا ہے اس کی عبارت یہ ہے :۔

"اور میری عبارت اور میرا وعظ انسانی حکمت کی دلفریب بات کے ساتھ نہیں لیکن رُوح اور قدرت کی دلیل کے ساتھ تھا تاکہ تمہارا ایمان نہ انسانی حکمت سے بلکہ خدا کی قدرت سے ثابت ہووے ہم کاملوں کے نزدیک حکمت کی بات بولتے ہیں، مگر اس جہان کی اور اس جہان کے فانی حاکموں کی حکمت نہیں بولتے۔ بلکہ ہم وُہ حکمت الٰہی بولتے ہیں، جو چھپی ہوئی ہے۔ یعنی وہ پوشیدہ حکمت جسے خدا نے زمانہ کے آگے ہماری بزرگی کے لئے مقرر کیا تھا[2]"

پھر اسی صفحہ پر لکھا ہے کہ :۔

"اب ہم نے نہ دنیا کی رُوح بلکہ وُہ روح جو خدا سے ہے پائی تاکہ ہم ان رازوں کو جو خدا نے ہمیں بخشے ہیں سمجھیں۔ اور ہم ان رازوں کو انسان کی سکھلائی باتوں سے نہیں بلکہ رُوح قدس کی سکھلائی ہوئی باتوں سے غرض رُوحانی چیزوں کو روحانی عبارت سے ملا کر بیان کرتے ہیں۔ مگر نفسانی آدمی

[1] دیکھو انجیل مطبوعہ کلکتہ ص ۲۰۹ [2] دیکھو انجیل مطبوعہ کلکتہ ص ۲۰۵

خدا کی روح کی باتوں کو قبول نہیں کرتا کہ اس کے نزدیک نادانی کی باتیں ہیں اور وُہ ان کو سمجھ نہیں سکتا کہ وہ روحانی طور سے بوجھی جاتی ہیں"

شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی دونوں قسم کے مضامین موجود ہیں۔ ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ لوگ درجات عقل کے موافق جنت میں داخل ہوں گے اور دوسری جگہ اهل الجنة بلہ (یعنی اکثر جنتی لوگ بیوقوف ہوں گے) بھی مشہور ہے۔

○ آپ کے بعد جو علماء اور حکماء آپ کی اُمت میں گزرے ان کے اقوال بھی اسی طرح بظاہر متعارض رہے اور امام غزالیؒ کے زمانہ تک غالباً بہت کم عالم ادھر متوجہ ہوئے جنہوں نے اس عقل و نقل کے اختلاف پر باضابطہ اور مکمل بحث کی ہو اور تمام شبہات کو رفع کر کے یہ دکھلایا ہو کہ اس اختلاف کا اصلی منشا کیا ہے۔ دونوں فریق کے استدلالات کس درجہ تک درست ہیں اور انبیاءؑ یا اکابر علماء کی کتابوں میں جو بظاہر اختلافات معلوم ہوتے ہیں جن کی طرف ہم نے بھی اشارہ کیا ہے۔ ان کے اجتماع اور تطبیق کی صحیح صورت کیا ہے۔

میرا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ امام غزالیؒ سے پہلے کوئی شخص عقل و نقل کی تطبیق کی صورت سمجھے ہوئے نہ تھا بلکہ یہ غرض ہے کہ ان سے پہلے اس مسئلہ کی خاص تشریح کرنے کی کوئی ضرورت پیش نہیں آئی۔ کیونکہ ہر ایک زمانہ کے حکماء انہی امور کے بیان میں زیادہ تاکید و تفصیل سے کام لیا کرتے

ہیں جن میں کسی قسم کے خفا اور مغالطہ کا اندیشہ ہو۔ یا وہ ایسے امراض ہوں جن کے اندر عام طبائع مبتلا پائی جائیں۔

تم خود اندازہ کر لو کہ والدین کی اطاعت اور اولاد پر ترحم اور شفقت۔ یہ دونوں چیزیں باوجودیکہ مذہبی ضرورت میں سے ہیں۔ مگر اوّل ——— ——— چونکہ ایک گونہ نفس کی خواہش کے خلاف اور دوسرے نہ تنہا انسان بلکہ تمام حیوانات کی اقتضارات طبیعہ میں سے ہے اس وجہ سے حکیم مطلق نے عقوق والدین کی خرابی اور ان کی اطاعت کی خوبی کو بکرّات و مرّات اور باجمال و تفصیل جس قدر مختلف عنوانوں سے تعلیم فرمایا ہے رحم علی الاولاد کے احکام میں اس کا عشر عشیر بھی نہیں۔

ٹھیک اسی طرح علمار سلف کے زمانہ میں چونکہ عام طور پر مذہبی روایات کا بدل ڈالنا کسی اہل مذہب کے نزدیک بھی روا نہ تھا۔ اس لیئے نہ عقل و نقل میں کثرت تزاحمات قائم ہوتے تھے۔ نہ علمار کو ان دونوں کے مقدمات فیصل کرنے کی نوبت آتی تھی۔ اور نہ اس کی حاجت سمجھی جائے گی کہ ان دونوں کی تطبیق کے اصول یا اختلاف کے اسباب بیان کیئے جائیں۔

اس کے بعد جوں جوں زمانہ گذرا فلسفیت اور الحاد کا رنگ غالب آیا معقول ناقصہ جزئیہ کی گرم بازاری ہوئی اور نقل کی قدر و منزلت گھٹی۔ ابھی قدر عقل و نقل کی منازعت بڑھتی گئی اور امام غزالیؒ کے زمانہ تک، اس کی ضرورت محسوس ہونے لگی کہ ان دونوں (عقل و نقل) کی موافقت و اتحاد کے واسطے کچھ آئین بتلائے جائیں اور ان میں سے ہر ایک کے

حدود کی تعیین وضاحت کے ساتھ کر دی جائے۔ چنانچہ امام غزالیؒ نے اس پر قلم اٹھایا اور انصاف یہ ہے کہ انہوں نے اپنے زمانہ کی ضروریات کے موافق اس مقصد کی پوری تکمیل کر دی۔

لیکن چونکہ علمار سلف کو اس تعیین و تفصیل کی حاجت پیش نہیں آئی تھی۔ اور علمار مابعد نے امام صاحب ممدوح کی تشریحات پر حوالہ کر دینے کو کافی سمجھا اس واسطے ان سے پہلے اور ان کے بعد اکثر ایسے ہی مبہم اور متعارض اقوال عقل و نقل کے بارے میں جمع ہوتے رہے۔ جس سے آج کل کے کوتاہ نظروں کو سادہ لوح عوام کے گمراہ کرنے کا خوب موقعہ ہاتھ آیا اور انہوں نے بزرگوں کے کلام کے وہ مختلف ٹکڑے جن کو امام غزالیؒ نے احیار العلوم وغیرہ میں عمدہ طور پر جمع کر کے دکھلا دیا تھا۔ جابجا اپنے استشہاد میں پیش کر کے سیدھی اور سچے مسلمانوں کو طریق حق سے ہٹانا چاہا۔ چنانچہ اب میں اس قسم کے اکثر کلام حکمار اور علمار اسلام کی کتابوں سے انتخاب کر کے ذیل میں نقل کرتا ہوں جن کو پڑھ کر ایک خالی الذہن آدمی سخت تحیر اور تذبذب میں پڑ جاتا ہے اور اس کے بعد امام غزالیؒ کی مفصل تقریر اُن کی متفرق تصانیف سے اقتباس کر کے ہدیہ ناظرین کروں گا جو اس حیرت اور پریشانی کو کافی حد تک مٹا سکیگی۔

البتہ یہ ضرور ہے کہ عقل و نقل کی جو مخالفت آج کل دیکھنے میں آ رہی ہے کہ عرصہ ہوا دونوں حکومتوں میں سفرا اٹھ چکے۔ اور اعلان جنگ ہو کر لگاتار معرکہ آرائی ہونے لگی۔ پھر لڑائی بھی باقاعدہ نہیں بلکہ زمانہ



حال کی عقل نے غدر پر کمربستہ ہو کر محض جابرانہ کارروائی شروع کر دی۔

چونکہ یہ بہار یا خزاں نہ امام غزالی نے دیکھی تھی اور نہ ان سے پہلے کسی اور نے۔ اس لئے اگر زمانہ حال کی بعض خصوصیات پر نظر کر کے امام غزالی کی تقریر میں بھی کوئی کمی ہو گی تو میں اس کو آزادانہ ظاہر کروں گا اور پھر کسی اور عالم کی تقریر اگر اُن کی تقریر سے زیادہ تسکین بخش سمجھی جائے گی تو اس کو سب سے اخیر میں درج کروں گا تاکہ ہمارے رسالہ کے وہ ناظرین بھی جن کے دلوں میں اس زمانہ کی اندیشہ ناک آزادی کا کوئی اثر ہو اوّل سے آخر تک تمام آراء کا موازنہ کر کے نیک دلی کے ساتھ سچائی اور راستی کو قبول کر سکیں۔ وللہ در من قال۔

دور عجبے گردش ایں دائرہ دارد ... وقتی است کہ گردوں بگزارد دوراں را
اکنوں اثر تربیت و مہر بر آں است ... تا صورت خرمہرہ دہد نطفہ کاں را
برخاستہ زیں شور زمیں چند بخارے ... یکسر بکفِ غول ہوا داد عناں را
سیمرغ خور و قوت پرواز مگس نیست ... بال و پر ایں ہیچداں ہمہ داں را

○ سب سے پیشتر ہم ان حامیانِ عقل کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ جو عام طور پر فلاسفہ اسلام یا حکماء اسلام کے لقب سے مشہور ہیں اور جن کی زندگی کا اکثر حصہ عقل کی پیروی میں صرف ہوا ہے۔ شیخ بو علی سینا اور ابن رشد اندلسی اس گروہ کے بہت بڑے امام گذرے ہیں۔ شیخ نے اشارات کے آخر میں ایک مستقل باب اس کے لئے منعقد کیا ہے کہ انبیاء اور اولیاء کے بہت سے علوم ممکن ہے کہ عقول متوسطہ کے مرتبہ سے بالاتر ہوں۔ وہ

درحقیقت صحیح ہوں مگر عام طور پر لوگ اُن کو سمجھ نہ سکیں۔ کیونکہ جو چیز انسان میں علوم اور ادراکات کی حاصل کرنے والی ہے وہ ایک لطیف چیز ہے جس کو روح سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور جب علم کے حاصل ہونے کا مبنیٰ وُہ ہی جزو لطیف ٹھہرا تو جس قدر جسم کی کثافت کو بذریعہ مجاہدات اور ریاضات کے زائل کیا جائے گا۔ اسی قدر روح کی لطافت میں ترقی ہو گی اور لطافت کے بڑھنے سے علوم میں یقیناً وسعت پیدا ہوتی جائے گی۔ چونکہ انبیاء اور اولیاء بھی ترک لذات اور کسر شہوات کے بعد جسمانی تعلقات سے بہت کچھ بیگانہ ہو جاتے ہیں اس لئے اگر ان کو بہت سی وہ باتیں معلوم ہوں جو ہم کو نہ ہوں تو یہ کوئی قابلِ استعجاب امر نہیں ہے اس کے بعد شیخ کہتا ہے۔

والعارفون المتنزھون	اور خدا کی معرفت رکھنے والے پاک بندے جس وقت
اذا وضع عنھم درن مقارنۃ	اُن سے جسمانی تعلق کا بار ہلکا کر دیا جاتا ہے اور
البدن وانفکوا عن الشواغل	دنیوی مشاغل سے وہ علیحدہ ہو جاتے ہیں، تو
خلصوا الی عالم القدس و	ان کی توجہ خاص طور پر عالم اقدس اور عالم سعادت
السعادۃ وانتقشوا بالکمال	کی طرف مبذول ہو جاتی ہے اور اعلیٰ درجہ کے کمال
الاعلیٰ وحصلت لھم اللذۃ	کے ساتھ موصوف اور بڑی لذت اٹھانے والے
العلیا وقد عرفتھا ولیس	ہوتے ہیں جیسا کہ تم پہلے معلوم کر چکے ہو۔ اور یہ
ھذہ الالتذاذ مفقودًا مع	نہیں کہ جب روح بدن میں ہو تو وُہ اس لذت سے
کل وجہ والنفس فی البدن	بالکل محروم رہیں۔ بلکہ ایسے لوگ جو خدا کی عظمت و
بل المنغمسون فی تامل الجبروت	جبروت کی فکر میں ڈوبے ہوئے اور جسمی شغلوں

المعرضون عن الشواغل یصیبون وھم فی ھذہ الابدان من ھذہ اللذۃ حظا وافرا قد یتمکن منھم فیشغلھم عن کل شی

اعراض کرنے والے ہیں وہ ان اجسام میں رہ کر بھی اس لذۃ سے اتنا بڑا حصہ پالیتے ہیں جو ان پر غالب آکر تمام اشیاء سے ان کو فارغ کر دیتا ہے۔

شرح اشارات محقق طوسی میں ہے۔

جل جناب الحق تعالیٰ ان یکون شریعۃ لکل وارد او یطلع علیہ الا واحد بعد واحد ولذالک فان ما یشتمل علیہ ھذا الفن ضحکۃ للمغفل وعبرۃ للمحصل فمن سمعہ فاشمأز عنہ۔ فلیتھم نفسہ لعلھا لا تناسبہ وکل میسر لما خلق لہ والمراد ذکر قلۃ الواصلین الی الحق والاشارۃ الی ان سبب انکار الجمھور للفن المذکور فی ھذا النمط ھو جھلھم بہ فان الناس اعداء ما جھلوا والی ان النوع من الکمال لیس مما

خدائے تعالیٰ کی جناب اس سے اعلیٰ اور ارفع ہے کہ ہر وارد اور صادر کی گذرگاہ بن جائے یا اس پر مخصوص افراد کے سوا کوئی مطلع ہو سکے اور اسی وجہ سے صوفیوں کا طریقہ غافل کے نزدیک مضحکہ خیز اور طالب کے واسطے عبرت انگیز طریقہ ہے تو جو ان کی باتوں کو سنکر ان سے اعراض کرے اُس کو چاہیئے کہ وہ اس بارے میں اپنے نفس کا قصور سمجھے کیونکہ اس کو ان سے مناسبت نہیں ہے۔ اور ہر شخص کے واسطے وہی بات آسان ہوتی ہے، جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ خدا رسیدہ لوگ بہت کم پائے جاتے ہیں اور اکثر لوگ باطنی طریقوں سے اس بنا پر انکار کرتے ہیں کہ وہ اس کو نہیں جانتے، آدمی ہمیشہ نامعلوم باتوں کا دشمن ہوتا ہے۔ پھر یہ کمال ہر ایک کو محض

یحصل بالاکتساب المحض بل انما یحتاج معد ذالک الی جوھر مناسب لہ بحسب الفطرۃ[1]

حاصل کرنے سے حاصل نہیں ہوتا تاوقتیکہ اس کا جوہر طبیعت فطرۃً اس کے مناسب نہ ہو۔

ان دونوں عبارتوں سے شیخ اور علامہ طوسی کا یہ مطلب ہے کہ اگر انبیاء اور اولیاء سے بعض ایسے امور منقول ہوں جو ہماری عقل کے دائرہ سے باہر ہیں تو ہم کو ان کی اس بنا پر تصدیق کرنا چاہیئے کہ ان کے نفوس بہیمیت کی ظلمات اور بشریت کی کدورت سے پاک صاف ہوتے ہیں اور ہم کو یہ سعادت حاصل نہیں ہوتی۔ لیکن شیخ کی اس تقریر سے اس کا کوئی جواب نہیں نکلا کہ اس صورت میں ہندوستان کے جوگی۔ نصاریٰ کے راہب اور پہلے زمانہ کے اشراقیوں کے تمام علوم کیوں قابلِ تسلیم نہیں ہیں۔ جبکہ روحانیت کی ترقی کا مدار تجرد اور ترک دنیا پر ہو تو ان لوگوں کا تجرد انبیاء اور اولیاءؑ کے تجرد سے کیوں کم ہے۔ بلکہ بظاہر یہ لوگ بہت زیادہ آدمیوں کی مجالست سے متنفر اور انسانی جذبات کے فنا کر دینے والے نظر آتے ہیں۔ چونکہ اس حیثیت سے شیخ کی تقریر بالکل ناقص ہے اس لئے اب ہم شیخ کو چھوڑ کر دوسرے علماء کے اقوال کا مختصر انتخاب درج ذیل کرتے ہیں۔

○ قاضی ابن رشد اندلسی جس نے امام غزالیؒ کی کتابوں کا رد لکھا ہے اور اہل یورپ مسلمانوں کا سب سے بڑا فلسفی خیال کرتے ہیں۔ ایک مقام پر لکھتا ہے کہ خدائے برحق نے اپنی سچی کتاب میں ہم کو جا بجا قیاس اور استدلال

[1] شرح اشارات طوسی مطبوعہ مصر ص ۳۹۰۔۱۲



کے طریقہ پر توجہ دلائی ہے اور ہر چیز کو عقل سے دریافت کرنے کے لئے آمادہ کیا ہے۔

واذا كانت هذه الشرائع حقا وداعية الى النظر المؤدي الى معرفة الحق فانا معشر المسلمين لنعلم على القطع انه لا يؤدي النظر البرهاني الى مخالفة ما ورد به الشرع فان الحق لا يضاد الحق[1]

اور جب یہ شریعت سچی ہے اور لوگوں کو اس غور و فکر کی طرف بلا رہی ہے جس سے خدا کی معرفت حاصل ہو تو ہم مسلمانوں کا قطعی یہ عقیدہ ہونا چاہیئے کہ دلیل اور برہان سے شریعت کے خلاف کبھی ثابت نہیں ہو سکتا (کیونکہ شریعت بھی سچی ہے اور دلیل بھی سچی)، اور ایک سچی بات دوسری سچی بات کے مخالف نہیں ہو سکتی۔

دوسرے موقعہ پر صوفیوں کے روحانی طریقہ کا ذکر کر کے لکھا ہے:۔

ونحن نقول ان هذه الطريقة ان سلمنا وجودها فانها ليست عامة للناس بما هم ناس ولو كانت هذه الطريقة هي المقصودة بالناس لبطلت طريقة النظر ولكان وجودها بالناس عبثا والقرآن كله انما دعا الى النظر والاعتبار وتنبيه على طرق النظر[2]

ہم کہتے ہیں کہ اس طریقہ کے وجود سے اگرچہ ہم کو انکار نہیں مگر اس میں شک نہیں کہ یہ طریقہ لوگوں میں عام نہیں ہو سکتا۔ پس اگر اسی طریقہ کا رواج پانا شریعت کا مقصود ہوتا تو فکر اور استدلال کا وجود بالکل باطل اور عبث قرار پاتا حالانکہ سارا قرآن قیاس اور استدلال کی طرف بلا رہا ہے اور نظر کے طریقوں پر متنبہ کر رہا ہے۔

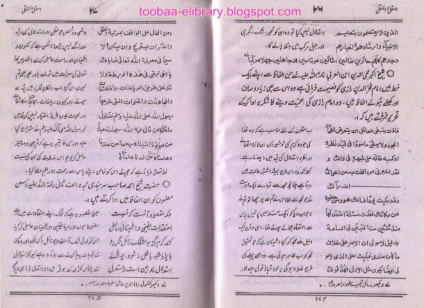
[1] دیکھو فلسفہ ابن رشد مطبوعہ مصر ص

[2] دیکھو فلسفہ ابن رشد مطبوعہ مصر ص

○ اس کے مقابلہ پر علامہ ابن تیمیہ رسالہ الفرقان میں لکھتے ہیں:۔

فمن جرب ما يقولونه (الانبياء) ويقوله غيرهم وجد الصواب معهم والخطاء مع مخالفيهم كما قال الرازي مع انه من اعظم الناس طعنا في الادلة السمعية حتى ابتدع قولا ما عرف به قائل مشهور غيره وهو انما تفيد اليقين ومع هذا فانه يقول لقد تاملت الطرق الكلامية والمناهج الفلسفية فما رأيتها تشفي عليلا وتروي غليلا ووجدت اقرب الطرق طريقة القرآن اقرأ في الاثبات اليه يصعد الكلم الطيب الرحمن على العرش استوى واقرأ في النفي ليس كمثله شيء ولا يحيطون به علما. ومن جرب مثل تجربتي عرف مثل معرفتي وايضا فمن اعتبر ما عند الطوا

تو جو شخص انبیاء علیہم السلام کے ارشادات اور لوگوں کے اقوال کا تجربہ کرے گا وہ یقیناً انبیا کو حق پر اور ان کے مخالفوں کو خطا پر پائے گا دیکھو رازی جو سب سے زیادہ سمعی روایات کو غیر معتبر ٹھہرانے والے ہیں یہاں تک کہ انہوں نے ایک ایسی بات کہی جو ان سے پہلے کسی نے بھی نہیں کہی تھی یعنی یہ کہ روایات سے کبھی یقین کا مرتبہ حاصل نہیں ہو سکتا اس رازی کو بھی یہ کہنا پڑا کہ میں نے فلسفہ اور علم کلام کے طریقوں میں بہت تامل کیا مگر ان کو ہرگز ایسا نہ پایا جو ایک مریض کو شفا بخشیں یا کسی پیاسے کو سیراب کر سکیں۔ ان تمام راستوں میں نزدیک تر راستہ قرآن کا ہے کہ ثبوت کی جانب میں ہم یہ آیتیں پڑھ لیتے ہیں الیہ یصعد الکلم الطیب الرحمن علی العرش استوی اور نفی میں لیس کمثلہ شیء اور لا یحیطون بہ علما۔ اور جو کوئی مجھ جیسا تجربہ کرے گا۔ وہ بھی میری طرح اس بات کو سمجھے گا۔ اور نیز جو شخص ان لوگوں کے اقوال میں غور کرے گا جنہوں نے انبیاء کی تعلیمات اور روایات سے



الذین لایعتصمون بتعلیم الانبیاء وارشادھم واخبارھم وجدتھم کلھم حائرین ضالین، شاکین مرتابین او جاھلین جھلا مرکبا۔

استدلال نہیں کیا تو وہ ان کو تحیر، شک، گمراہی اور جہل مرکب میں مبتلا پائے گا۔

○ شیخ اکبر محی الدین ابن العربی رحمۃ اللہ علیہ نے جن الفاظ سے اپنے ایک خط میں امام فخر الدین رازی کو نصیحت فرمائی ہے وہ اس سے بھی زیادہ صاف اور کھلے ہوئے الفاظ ہیں۔ وہ امام رازی کی اہمیت دینے کا شکریہ ادا کر کے تحریر فرماتے ہیں کہ:

فاذن ینبغی للعاقل ان یتعرض لنفحات الجود ولایبقی ماسوراً فی قید نظرہ او کسبہ فانہ علی شبھۃ فی ذالک ولقد اخبرنی من الفت بہ من اخوانک ـــــ امنہ مرآک وقد بکیت یوماً فسالک ھو ومن حضرہ عن بکائک فقلت مسئلۃ اعتقدتھا منذ ثلثین سنۃ فتبین لی الساعۃ بدلیل لاح لی ان الامر علی خلاف ماکان عندی فبکیت ولعل الذی لاح لی ایضاً یکون مثل الاول فھذا قولک

اب عقلمند کے لئے مناسب ہے کہ وہ خدا کی جود و کرم کی خوشبوؤں سے فائدہ اٹھائے اور نظر و استدلال کی قید میں نہ پھنسا رہے۔ کیونکہ وہ اس طرح ہمیشہ مشتبہ حالت میں رہتا ہے چنانچہ مجھ سے تمہارے ایک دوست نے جو مجھ سے ملا اس نے تم سے پوچھا تو تم نے یہ جواب دیا کہ ایک مسئلہ جس پر تیس برس سے اعتقاد جمائے بیٹھا تھا۔ اسی وقت ایک دلیل سے مجھ کو کیا اطمینان ہے کہ جو تحقیق مجھ کو اب ظاہر ہوئی ہے۔ وہ بھی پہلے کی طرح غلط ہوگی یہ خود تمہارا قول ہے اور

لہ دیکھو رسائل تیمیہ مطبوعہ مصر ص ۲۱۹۔

ومن المحال علی الواقف بمرتبۃ العقل والفکر ان یستریح وان یسکن ولا سیما فی معرفۃ اللہ تعالی فمالک یا اخی تبقی فی ھذہ الورطۃ ولا تدخل طریق الریاضات والمکاشفات والمجاھدات والخلوات التی شرعھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتنال مانال من قال فیہ اللہ سبحانہ عبداً من عبادنا اتیناہ رحمۃ من عندنا وعلمناہ من لدنا علماً

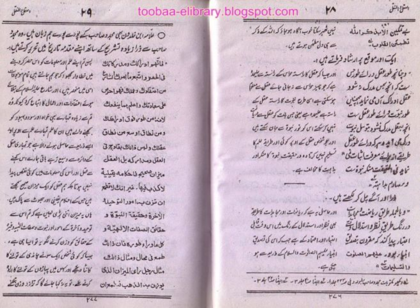
واقعی وہ شخص جو عقل اور استدلال کے مرتبہ سے آگے نہیں بڑھتا ناممکن ہے کہ سکون و اطمینان اور راحت حاصل کرلے بالخصوص خدا تعالیٰ کی معرفت میں تو اے برادر پھر بھی تم کیوں اس گرداب (نظر و فکر) میں پڑے ہوئے، اور کیوں ریاضات، مجاہدات، مکاشفات اور خلوات کا وہ طریقہ اختیار نہیں کرتے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشروع کیا ہے اور جس کا نتیجہ یہ ہے کہ تم بھی وہ چیز حاصل کرلو جو اس بندہ کو ملی جس کی نسبت خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے اس کو خاص اپنے پاس سے رحمت اور علم عطا کیا۔

○ حضرت شیخ احمد صاحب سرہندی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ اسی مضمون کو ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں:

بلکہ مقصود آنست کہ نسبت بمعتقدات یقینی و اطمینانی حاصل کند کہ ہرگز بہ تشکیک مشکک زائل نگردد و بایراد شبہ باطل نہ شود۔ چہ پائے استدلال چوبین است و مستدل

یعنی مقصود یہ ہے کہ لوگ اپنے اعتقادات میں ایسے مضبوط ہوں اور ایسا یقین اور اطمینان حاصل کریں جس کو کوئی شک ڈالنے والا زائل نہ کرسکے اور وہ کسی کے شبہات پیدا کرنے سے جاتا نہ رہے کیونکہ استدلال کے پاؤں لکڑی کے ہوتے ہیں اور مستدل ذرا سی دیر گا

لہ دیکھو کشکول بہاؤ الدین عاملی مطبوعہ مصر ص ۳۴۲۔



بے تمکین "الا بذکر اللہ تطمئن القلوب"[1]

نہیں ٹھہر سکتا خوب آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ کے ذکر سے ہی دل مطمئن ہوتے ہیں۔

ایک اور موقع پر ارشاد فرماتے ہیں:۔

"وچنانچہ طور عقل ورائے طور حس است کہ آنچہ بحس مدرک نشود عقل ادراک آں می نماید ہمچنیں طور نبوت ورائے طور عقل است آنچہ بعقل مدرک نشود بتوسل نبوت درک می آید و ہر کہ ورائے طور عقل طریقے از برائے معرفت اثبات نمی نماید فی الحقیقت منکر نبوۃ است و مصادم بداہت"[2]

اور جیسا کہ عقل کا راستہ حواس کے راستہ سے علیحدہ ہے کہ جو چیز حواس سے نہ جانی جائے عقل سے معلوم ہو سکتی ہے اسی طرح نبوت کا راستہ عقل کے راستہ سے علیحدہ ہے یعنی جس بات کو عقل سے دریافت نہیں کر سکتے اس کو نور نبوۃ سے جان سکتے ہیں اور جو شخص عقل کے اوپر کوئی اور طریقہ علم کا تسلیم نہیں کرتا وہ در حقیقت نبوۃ کا منکر اور بداہت کا مخالف ہے۔

اور اور آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

"و بالجملہ طریق ریاضت و مجاہدات در رنگ طریق نظر و استدلال وقتے اعتبار پیدا کند کہ مقرون بتصدیق انبیاء بود علیہم الصلوات والتسلیمات"[3]

اور حاصل یہ ہے کہ ریاضات اور مجاہدات کا طریقہ بھی نظر اور استدلال کے رنگ میں اس وقت قابل اعتبار اور اعتماد کے ہے جب کہ اس کی تصدیق انبیاء علیہم الصلوات والسلام کے ذریعہ سے ہو چکی ہے۔

[1] دیکھو مکتوبات مجدد صاحب مطبوعہ دہلی ص ۲۳۳ جلد ۱۔ [2] ایضاً ص ۱۲ جلد ۳۔ [3] ایضاً ص ۱۳ جلد ۳۔

○ علامہ ابن خلدون بھی مجدد صاحب کے پورے پورے ہم زبان ہیں، وہ مجدد صاحب سے ذرا زیادہ تشریح کے ساتھ اپنے مقدمہ تاریخ میں تحریر کرتے ہیں:۔

"فاتہموا ادراکک ومدرکاتک فی الحصر واتبعوا ما امرک الشارع بہ من اعتقادک وعملک فہو احرص علی سعادتک واعلم بما ینفعک لانہ من طور فوق ادراکک ومن نطاق اوسع من نطاق عقلک ولیس ذالک بقادح فی العقل ومدارکہ بل العقل میزان صحیح فاحکامہ یقینیۃ لا کذب فیہا۔ غیر انک لا تطمع ان تزن بہ امور التوحید والآخرۃ وحقیقۃ النبوۃ وحقائق الصفات الالہیۃ وکل ما وراء طورہ فان ذالک طمع فی محال ومثال ذالک مثال رجل رای المیزان الذی یوزن بہ الذہب فطمع ان

پس تم اپنے علم اور معلومات کو اس حصر کر دینے میں خطا وار سمجھو (کہ جو ہم جانتے ہیں تمام موجودات اسی میں منحصر ہیں)، اور شارع علیہ السلام کے بتلائے ہوئے اعتقادات اور اعمال کا اتباع کرو کیونکہ وہ تم سے زیادہ تمہارے بہی خواہ اور سود و بہبود کو سمجھنے والے ہیں ان کا علم تمہارے علم سے اوپر اور ایسے ذریعہ سے حاصل ہونے والا ہے جو تمہاری عقل کے دائرہ سے وسیع تر ہے باقی ہمارے اس کہنے سے عقل اور اس کی معلومات میں کوئی نقص پیدا نہیں ہوتا بلکہ ہم عقل کو ایک میزان صحیح سمجھتے ہیں جس کے احکام یقینی اور جھوٹ سے پاک ہیں۔ ہاں یہ میزان اتنی بڑی نہیں ہے کہ تم اس سے توحید و آخرۃ کے امور اور نبوت و صفات الٰہیہ وغیرہ کے حقائق کو وزن کرنے لگو یہ تو ایسا ہی ہے، جیسا کہ کوئی شخص ایک سونے چاندی کے تولنے کا کانٹا دیکھے اور اس میں پہاڑوں کے تولنے کا ارادہ کرنے لگے۔ تو یہ نہ کہا جائے گا کہ ترازو وزن کرنے

يزن به الجبال هذا الانيف لك على ان الميزان في احكامه غير صادق لكن العقل يقف عنده ولا يتعدى طوره حتى يكون له ان يحيط بالله وبصفاته فانه ذرة من ذرات الوجود الحاصل منه وتفطن في هذا الغلط من يقدم العقل على السمع في امثال هذه القضايا وقصور فهمه واضمحلال رايه فقد تبين لك الحق من ذالك[۱]

کے اعتبار سے درست نہیں ہے بلکہ یہ کہیں گے کہ ہر ایک میزان کے واسطے ایک حد ہے جس کے آگے وہ کام نہیں دے سکتی اسی طرح میزان عقل بھی ایک خاص موقع پر ٹھہر جاتی ہے اور یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ اس سے آگے بڑھ کر خدا کی ذات وصفات کا احاطہ کرے۔ کیونکہ جو عقل بھی وجود کے ان ذرات میں کا ایک ذرہ ہے جو خدا کی طرف سے فائض ہوتے ہیں۔ اسی جگہ سے تم ان لوگوں کی غلطی کم فہمی اور رائے کی کمزوری کو معلوم کر لو جو عقل کو اس قسم کے معاملات میں سمعیات پر ترجیح دیتے ہیں۔

دوسرے مقام میں لکھتے ہیں:۔

"وقد تنبه لذلك رئيسهم ابو على ابن سينا فقال في كتاب المبدأ والمعاد ان المعاد الروحاني واحواله مما يتوصل اليه بالبراهين العقلية والمقائيس لانه على نسبة طبيعية محفوظة ووتيرة واحدة - فلنا في البراهين عليه

اور رئیس الفلاسفہ بوعلی سینا نے بھی اس بات پر متنبہ ہو کر کتاب المبدأ والمعاد میں یہ کہہ دیا ہے کہ روح کو ملنے ثواب ہونے پر تو ہم دلائل اور قیاسات قائم کر سکتے ہیں کیونکہ ایسا ہونا مضبوط قانون طبعی اور ایک خاص طریقہ کے تحت میں داخل ہے تو اس کے اندر برہان سے ثابت کرنے کی گنجائش نکل سکتی ہے مگر جسمانی اعادہ اور جزا سزا کا محض استدلال

۱؎ دیکھو مقدمہ ابن خلدون مطبوعہ مصر ص ۳۹۳ ۱۲۔

سعة واما المعاد الجسماني واحواله فلا يمكن ادراكه بالبرهان لانه ليس على نسبة واحدة وقد بسطته لنا الشريعة الحقة المحمدية فلينظر فيها وليرجع في احواله اليها[۱]

سے جاننا ہرگز ممکن نہیں کیونکہ وہ کسی خاص نسبت اور قاعدے کے نیچے واقع نہیں ہے لیکن شریعت محمدیہ حقہ نے اس کی حالات تفصیل کے ساتھ بیان کر دیے ہیں جس کا جی چاہے اس کی طرف رجوع کر کے دیکھ لے۔

جو علوم نہ بذریعہ عقل کے بلکہ بذریعہ کشف کے معلوم ہوں ان کی بابت لکھتے ہیں:۔

"ثم هذا الكشف لا يكون صحيحا كاملا عندهم الا اذا كان ناشيا عن الاستقامة لان الكشف قد يحصل لصاحب الجوع والخلوة ——— كالسحرة والنصارى وغيرهم من المرتاضين وليس مرادنا الا الكشف الناشي عن الاستقامة ومثاله ان المرأة الصقيلة اذا كانت محدبة او مقعرة وحوذي بها جهة المرئي فانه يتشكل فيها معوجا على غير صورته وان كانت مسطحة تشكل فيها المرئي صحيحا.[۲]

پھر یہ کشف بھی صحیح اور کامل اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک کہ استقامت (یعنی شریعت کے احکام پر پورا پورا عمل) نہ ہو ورنہ یوں تو بہت سے ریاضت اور خلوت سے صفائی قلب حاصل کرنے والوں کو بھی کشف ہونے لگتا ہے جیسا کہ ساحر، نصاری اور ریاضت کرنے والے اور ان دونوں کی مثال ایسی سمجھو کہ ایک صاف آئینہ تو محدب اور مقعر (اونچا نیچا) ہو اس میں کسی چیز کا عکس بھی ٹیڑھا ترچھا پڑتا ہے اور ایک آئینہ مسطح (ہموار) ہو اس میں شکل بھی سیدھی اور صحیح صحیح دکھائی دے گی۔

۱؎ دیکھو مقدمہ ابن خلدون مصری ص ۴۵۳ ۱۲۔ ۲؎ دیکھو مقدمہ ابن خلدون مصری ص ۳۹۲ ۱۲۔

○ حضرت شیخ شہاب الدین صاحب سہروردی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:۔

"عقل اور استدلال کے طریقہ سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ ایسا یقینی نہیں ہوتا جس کا ازالہ نہ ہو سکے۔ تو گویا اس میں ایک قسم کا تردّد اور اضطراب رہتا ہے اور صوفیہ کرام کے علوم بالکل قطعی اور یقینی ہوتے ہیں۔ یعنی ناپائدار نہیں ہوتے۔ ان میں اگر کوئی شک و شبہ پیدا کرنا چاہے تو ہرگز پیدا نہیں ہو سکتا، کیونکہ وہ تو ایسا ہے کہ گویا اپنی آنکھوں سے ایک چیز دیکھ لی اور اپنے کانوں سے کوئی بات سن لی چنانچہ عوارف میں لکھتے ہیں:۔

"فما اضطراب الطبائع الاضرب من الجهل فقلوب الصوفية واعية لانهم زهدوا في الدنيا بعدما احكموا اساس التقوى فبالتقوى زكت نفوسهم وبالزهد صفت قلوبهم فلما عدموا شواغل الدنيا بتحقيق الزهد انفتحت مسامّ بواطنهم وسمعت آذان قلوبهم"[1]	تو یہ اضطراب اور تردّد جو طبیعتوں میں دیکھتے ہو یہ بھی جہل کی ایک قسم ہے۔ اس اعتبار سے صوفیوں کے قلوب بہت محفوظ ہوتے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے تقویٰ اور طہارت کی بنیاد کو مضبوط کر کے زہد اور ترک دنیا اختیار کیا۔ تو تقویٰ کی وجہ سے ان کے نفس پاک اور زہد کی وجہ سے دل صاف ہو گئے۔ اور جب دنیوی مشاغل کو انہوں نے فنا کر دیا تو ان کے باطن کے مسامات کھل گئے اور ان کے دل کے کان سننے لگے۔

○ متکلمین کی جماعت میں علامہ علاؤ الدین علی الطوسی (المتوفی ۸۸۷ھ) نے سلطان محمد فاتح کے حکم سے جو کتاب حکماء کے رد میں لکھی ہے۔ اس کے مقدمہ

[1] دیکھو عوارف المعارف مطبوعہ مصر ص ۲۱۔

میں یہ بتلایا ہے کہ ہماری عقل بہت سی اشیاء کی حقیقت دریافت کرنے سے قاصر رہتی ہے۔ بلکہ بڑے بڑے حکماء محسوسات کی ماہیت معلوم کرنے سے عاجز ہو جاتے ہیں تو ہم کو چند ایسے امور کے تسلیم کرنے میں کوئی عذر نہ ہونا چاہیئے۔ جن کی باریکیوں کو اگرچہ ہم نے خود نہیں سمجھا مگر خدا کے ایسے سچے رسولوں نے ہم کو ان کی خبر دی ہے جن کی صداقت پر سینکڑوں آیات بینات گواہی دے رہی ہیں

کیا ہماری آنکھوں نے ان تمام چیزوں کو دیکھ لیا ہے جن کو وہ دیکھ سکتی ہیں یا ہمارے کانوں نے ان تمام آوازوں کو سن لیا ہے جن کو وہ سن سکتے ہیں (یا ہمارے ہاتھوں نے تمام اُن چیزوں کو چھو لیا ہے جن کو وہ چھو سکتے ہیں۔ یا ہماری زبان نے تمام ان الفاظ کو ادا کر دیا ہے جن کو ہم ادا کر سکتے ہیں) پھر جب ہمارے ان حواس اور ان قوتوں نے اپنے مقدورات پر پورا پورا احاطہ نہیں کیا تو کیا وجہ ہے کہ ہمارے عقلی قوت کو اپنی ساری معلومات پر کامل تصرف اور قبضہ حاصل ہو جائے۔ یہاں تک کہ خدا کی ذات و صفات کے مسائل بھی اس کے قابو میں آجائیں اور حقائق اشیاء میں سے کوئی حقیقت ایسی نہ رہے جو اس کی دسترس سے اچھوتی ہو۔

ہم دیکھتے ہیں کہ پانی، آگ، مٹی وغیرہ جو اجسام جو ہر وقت ہم کو نظر آتے ہیں ان کی حقیقت کے دریافت کرنے میں بڑے بڑے فلاسفر متحیر ہیں، افلاطون کہتا ہے کہ یہ بسیط اجسام ہیں اور ارسطو کی جماعت کہتی ہے کہ نہیں ہیولیٰ اور صورت سے مرکب ہیں جو۔ دیمقراطیس کہتا ہے کہ یہ اجسام ایسے ذرات سے مرکب ہیں جو نہایت سخت ہونے کی وجہ سے قابل تقسیم نہیں ہیں۔ پھر

اجزاءِ جسم کے متناہی اور غیر متناہی ہونے کی حیثیت سے نظام کچھ کہتا ہے اور متکلمین کچھ۔ اسی طرح عقل اور نفس ناطقہ کے بارے میں ہر ایک کا مذہب جداگانہ ہے اور ایک جو دلیل قائم کرتا ہے دوسرا اس کو رد کر دیتا ہے۔ بھلا وہ نفس جو ہر وقت ہمارے پاس رہتا ہے اور وہ اجسام جو شب و روز ہمارے استعمال میں آتے ہیں جب اُن کی حقیقت معلوم کرنے میں ان اذکیاء کا یہ حال ہے تو غیب کے اسرار اور ملکوت کے دقائق تک ان کی رسائی کی۔ کیونکر اُمید ہو سکتی ہے۔ سوا اس کے کہ اللہ تعالیٰ کے صفات و افعال کی صحیح کیفیت کو وُہ ہی شخص سمجھے جس کی تائید خدا کی جانب سے کی گئی ہو۔ ایسا شخص اس کی اطلاع کرے جس کے مبعوث من اللہ ہونے پر ہزاروں علامات ظاہر ہو چکی ہوں ورنہ جو احمق نبوت کے انوار سے مستفید ہوئے بغیر محض اپنی عقل پر بھروسہ کرکے الٰہیات کی کُنہ تک پہنچنا چاہے گا اس کے اوہام یقیناً اس کی عقل سے سخت مزاحمت کریں گے اور اس کو وہمی اور عقلی چیزوں کے تمیز دینے میں ایسی دشواری پیش آئے گی۔ جس کے انسداد کی کوئی تدبیر اس کے پاس نہ ہو گی۔ ارسطو کا یہ قول نہایت انصاف پر مبنی ہے کہ الٰہیات کے مسائل میں دلائل سے یقین کا مرتبہ حاصل نہیں ہو سکتا۔

باقی بن حکمائے انبیاء کی تقلید کو چھوڑ کر ان مسائل میں انہماک پیدا کیا اس کی وجہ یہ ہوئی کہ خدا تعالیٰ نے ان کو فطرۃً ذہین بنایا تھا اور ان کی عقلوں میں ایک قسم کی تیزی پیدا کی تھی۔ جس کے ذریعہ سے انہوں نے ہندسہ اور حساب وغیرہ علوم میں ایسی کامل دستگاہ پیدا کر لی، کہ اس

اعتبار سے ان کی جس قدر تعظیم کی جاتی تھوڑی تھی۔ لیکن افسوس انہوں نے خدا کے اس انعام کا شکریہ ادا نہیں کیا۔ اور وہ اس کے پورے پورے مصداق بن گئے۔ ؎ اے روشنی طبع تو بر من بلا شدی

انہوں نے ایسے لق و دق میدان میں قدم رکھنے کی جرأت کی کہ جوان کی فہم و فراست کی سرحد سے بالکل خارج تھا۔ یہاں تک کہ وہ خود بے راہ ہوئے اور اوروں کو گمراہ کیا۔

اب اُن کے اس حال سے ہر ایک انسان کو چاہیئے کہ عبرت حاصل کرے اور کسی ایسے رسول کے اقوال پر جس کی راست بازی دلیلوں سے ثابت ہو چکی ہو بے چون و چرا اعتماد کرکے اپنے دل کو ان اضطرابات اور شکوک و اوہام سے رستگاری دے ۔ وَاللّٰہُ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۔[1]

○ اب یہاں پہنچکر ہم کو چاہیئے تھا کہ ہم قلم کی باگ امام غزالیؒ کی تقریر کی طرف پھیر دیتے جس کا حوالہ ہم بہت دور سے دیتے چلے آرہے ہیں کیونکہ اس وقت ہم حکماء اور متکلمین۔ صوفیہ اور مورخین سب کے کلاموں کے انتخاب سے فارغ ہو چکے ہیں اور ہماری تحریر کے پڑھنے والوں میں جو تحریک اس مسئلہ کی بابت ہم پیدا کرنا چاہتے تھے وہ بھی غالباً پیدا ہو چکی ہے۔ لیکن بڑی کوتاہی ہو گی اگر ہم اس موقع پر شاہ ولی اللہ صاحب جیسے یگانۂ عصر کو فراموش کر جائیں۔ ان کی نسبت مشہور ہے کہ متاخرین میں ان سے بڑھ کر کوئی اس مسئلہ (عقل و نقل) کا سمجھنے والا پیدا نہیں ہوا۔ اور نہ اس اخیر

[1] یہ سب تفصیل کتاب الذخیرہ مطبوعہ دائرۃ المعارف صفحہ ۲۰۹ میں مذکور ہے۔

دور میں ان سے زیادہ کسی نے شریعت کے اسرار اس قدر تفصیل کے ساتھ بیان کئے وہ اپنی مشہور کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں تحریر فرماتے ہیں۔ کہ

قد يظن ان الاحكام الشرعية غير متضمنة لشي من المصالح وانه ليس بين الاعمال وبين ماجعل الله جزاءً لها مناسبة وان مثل التكليف بالشرائع كمثل سيد اراد ان يختبر طاعة عبده فامره برفع حجر اولمس شجر مما لا فائدة فيه غير الختبار فلما اطاع او عصى جوزي جملة وهذا ظن فاسد تكذبه السنة واجماع القرون المشهود لها بالخير

کبھی یہ خیال کر لیا جاتا ہے کہ شریعت کے احکام عقلی مصالح پر مشتمل نہیں ہیں اور نہ اعمال میں اور انکی جزاء و سزا میں کوئی خاص مناسبت ملحوظ ہے اور یہ کہ انسان کو خدا کی جانب سے احکام شرعیہ کا مکلف بنانا ایسا ہے جیسا کوئی آقا اپنے غلام کی فرمانبرداری کا امتحان کرنا چاہے اور اس کو کسی پتھر کے اٹھا لانے یا کسی درخت کے چھونے یا کسی اور ایسے کام کا حکم کرے جس میں اس کی آزمائش کے سوا کوئی فائدہ نہ ہو اب اگر اس غلام نے اطاعت کی یا نہ کی تو اس کا ویسا ہی بدلہ دے دیا گیا۔ شریعت کی بابت یہ خیال بالکل فاسد ہے جس کی تکذیب سنت رسول اللہ اور قرون اولی کے اجماع نے کی ہے۔

پھر ایک ورق کے بعد یہ بھی لکھتے ہیں:۔

نعم كما اوجبت السنة هذه وانعقد عليه الاجماع فقد

ہاں جیسا کہ سنت اور اجماع سے یہ ثابت ہوا اسی طرح یہ بھی ثابت ہوا ہے کہ خدا کی طرف سے معین

لے دیکھو حجۃ اللہ البالغہ مطبوعہ مصر ص ۵۔

اوجبت ايضًا ان نزول القضاء بالايجاب والتحريم سبب عظيم في نفسه مع قطع النظر عن تلك المصالح لاثابة المطيع وعقاب العاصي وانه ليس الامر على ما ظن من ان حسن الاعمال وقبحها بمعنى استحقاق العامل الثواب والعذاب عقليان من كل وجه وان الشرع وظيفة الاخبار عن خواص الاعمال على ما هي عليه دون انشاء الايجاب والتحريم بمنزلة طبيب يصف خواص الادوية وانواع المرض فانه ظن فاسد تمجه السنة بادي الرأي

کسی چیز کے وجوب یا حرمت وغیرہ کے متعلق حکم کا نازل ہونا بھی مصالح عقلیہ سے قطع نظر کر کے نیکوں کو ثواب اور گنہگاروں کو عذاب دینے کا بڑا سبب ہے اور ایسا نہیں جیسا کہ بعضوں کا گمان ہے کہ اعمال کا حسن و قبح یعنی ان کے کرنے نہ کرنے پر عذاب و ثواب کا استحقاق محض عقل سے ثابت ہو سکتا ہو۔ باقی شریعت کا کام اس طبیب کی طرح جو دواؤں کے خواص اور مرض کے اقسام کو بیان کرتا ہے صرف یہ ہو کہ وہ اعمال کی واقعی خاصیتوں کو ظاہر کرے نہ یہ کہ وہ اپنی طرف سے کسی چیز کو واجب یا حرام بنائے۔ اس قسم کے خیالات بالکل فاسد ہیں۔ جن سے کھلے طور پر سنت رسول اللہ نفرت کرتی ہے۔

○ یہ تمام اقوال جو یہاں تک نقل کئے گئے ان مستند علماء کے اقوال ہیں جو بلحاظ اپنے فضل و کمال کے امت محمدیہ کے آفتاب اور ماہتاب شمار کئے گئے ہیں اور جن کی فضیلت خواہ کسی حیثیت سے ہو چار دانگ عالم میں تسلیم کی جا چکی ہے۔

لیکن ان متفرق اقوال اور پراگندہ مضامین سے ایک کم علم آدمی بجائے

لے دیکھو حجۃ اللہ البالغہ مطبوعہ مصر ص ۶۔

اس کے کہ کچھ فائدہ اٹھائے سخت پریشانی میں پڑ جاتا ہے اور وہ متعین نہیں کرسکتا کہ میں ان میں سے کس بات کو لوں اور کس کو چھوڑوں، اسی تذبذب کے وقت میں امام غزالیؒ آتے ہیں اور احیاء العلوم وغیرہ کے ذریعے سے اس کی دستگیری کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ گھبراؤ نہیں یہ سب باتیں درست ہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ کسی مذہب حق کے تمام احکام عقل کے مطابق ہیں اور یہ بھی ایک اعتبار سے صحیح ہے کہ نبوت اور ولایت کا مرتبہ عقل سے بالاتر ہے۔ یہ بھی غلط نہیں کہ ہر ایک علم عقل ہی کے ذریعے سے حاصل ہوسکتا ہے۔ اور اس کہنے میں بھی کچھ حرج نہیں کہ بعض علوم عقل کے سوا اور کسی طریقے سے بھی حاصل ہوجاتے ہیں۔ اس کو بھی ہم تسلیم کرتے ہیں کہ شریعت کے تمام احکام عقلی مصالح پر مبنی ہیں اور یہ کہنا بھی بیجا نہیں کہ محض عقلی مصالح کسی چیز کے فرض کرنے یا حرام کرنے کے لئے کافی نہیں۔

ممکن ہے کہ تمہاری کمزور طبیعت ان متضاد بیانات کو دیکھ کر گھبرا اٹھے اور تم ان پیچدار مقدمات کو کوئی منطقی طلسم سمجھنے لگو۔ مگر جو جامع مانع تقریر ہم عنقریب درج کریں گے اس کو پڑھ کر تمہاری تسلی ہوجائے گی۔ اور تم یقین کرلوگے کہ ان اقوال میں لفظی نزاع کے سوا کوئی حقیقی اختلاف سمجھنا ہمارے فہم کی تقصیر ہے۔

○ تم سب سے پہلے اس پر غور کرو کہ انسان کو قدرت نے دوسرے حیوانات سے کون سی امتیازی حالت عطا کی ہے کیا قدرت۔ ارادہ۔ خوف۔ رجا۔ شہوۃ۔ غضب یہ صفات جو انسان میں رکھی ہوئی ہیں اور حیوانات میں نہیں

ہیں؟ یا آنکھ۔ ناک۔ کان۔ زبان۔ دست و پا جو اعضاء انسان کو عنایت کئے گئے ہیں اوروں کو نہیں دیئے گئے؟ یا حس مشترک۔ خیال۔ وہم۔ حافظہ، وغیرہ حواس باطنہ جو انسان میں ودیعت کئے گئے ہیں۔ دوسروں کے حصہ میں نہیں آئے؟ تم یقیناً کہو گے کہ ان سب چیزوں کے اعتبار سے انسان کو کوئی فضیلت اور جانوروں پر حاصل نہیں ہے۔ بلکہ بسا اوقات بعض جانور ان بعض قوتوں میں انسان سے بڑھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ تو پھر وہ کیا خصوصیت ہے جس کی وجہ سے انسان کی شرافت جانوروں کے مقابلہ میں تسلیم کرلی گئی۔ اور وہ کیا علامات ہیں جو انسان کے روشن چہرہ کے امتیازی خط و خال ہیں۔

اس کے جواب میں ہم بجز ان دو چیزوں کے کسی کا نام نہیں لے سکتے جن کا اختصار علم اور ارادہ کے دو چھوٹے چھوٹے لفظ کرتے ہیں، اور جن کی تشریح میں ہم کو اپنے ناظرین کے وقت کا ایک معتدبہ حصہ لینا پڑے گا۔ علم سے ہماری مراد وہ علم ہے کہ جس کی بدولت دنیا اور آخرۃ کے حالات منکشف ہوتے ہیں اور وہ کائنات کے حقائق کو ان کی اصلی صورت میں ہمارے سامنے پیش کرتا ہو۔ اور ارادہ کے لفظ سے ہم نے اس ارادہ کا قصد کیا ہے۔ جو نفسانی خواہش کے اشارہ پر نہیں بلکہ علم کے اشارہ پر چلنے والا ہے۔ کیونکہ جو ارادہ قوۃ شہوانی کی تحریک سے پیدا ہوتا ہے وہ تو تمام حیوانات میں موجود ہے۔ ہر جاندار بھوک اور پیاس کے وقت دانہ پانی کی طلب میں دوڑتا ہے۔ شہوۃ کے غلبہ کے وقت اس کے فرو کرنے کا ارادہ کرتا ہے اپنے دشمن کے مقابلہ میں پوری طاقت اور زور آزمائی دکھلا

ہے۔ تو کیا ان سب حالتوں میں ارادہ نہیں پایا گیا۔ لیکن ہاں وہ ارادہ نہیں جو افراد انسانی کی خصوصیات میں سے ہے انسان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ شہوانی میلان کے خلاف بھی اگر اس کی عقل ہدایت کرے حرکت کر سکتا ہو، اور اپنے فعل و ترک میں جی چاہنے نہ چاہنے کا پابند نہ ہو۔

یہ ارادہ اور وہ علم جس کا ذکر پہلے ہوا۔ بزرگ ترین مخلوقات یعنی انسان کے ساتھ مختص ہیں۔ اور ان ہی دو نشانیوں سے انسان حیوانات سے اور بڑا آدمی بچوں سے باعتبار اپنے کمال کے پہچانا جاتا ہے۔ بچہ جب اپنی پیدائش کے مدارج طے کرتا ہوا رحم مادر سے باہر آتا ہے تو وہ نہ بھلے بُرے، نیک و بد اور نافع مضر کی تمیز رکھتا ہے اور نہ اس کا کوئی ارادہ کسی قانون عقلی کا تابع ہوتا ہے۔ اور جوں جوں اس کے قویٰ میں نشو و نما۔ اس کے علم میں ترقی اس کی معلومات میں وسعت ہوتی جاتی ہے اس قدر اس کے افعال و اعمال فہم و دانش کے قاعدوں میں منضبط ہوتے جاتے ہیں۔ اب اگر اس کا علم سچا ہے اور اس کی عقل نے جو فتوے نافذ کئے ہیں وہ صحیح ہیں تو اس کے سب عمل درست ہو سکتے ہیں۔ اور اگر اس کی عقل نے لغزش کھائی نافع کو مضر مضر کو نافع یا نیک کو بد، بد کو نیک سمجھ لیا تو ہرگز توقع نہیں کہ وہ اپنی حرکات و سکنات میں کج روی و غلطی سے محفوظ رہے اس صورت میں ہر انسان پر واجب ہے کہ وہ صحیح علم کے حامل ہونے کے ذرائع سوچے اور تازیست اپنے اندر اُن کے پیدا کرنے کی کوشش کرے۔

لیکن جس حد تک غور کیا گیا علم کی حقیقت اس سے زیادہ معلوم نہیں

ہوئی کہ کسی چیز کا نقشہ ایسی طرح ہماری عقل میں کھنچ جائے جیسا کہ آئینے میں کسی شے کی تصویر نظر آنے لگتی ہے۔ دیکھو اگر کوئی شخص ہماری نظر سے گذرا یا ایک شاندار مکان ہم نے کسی جگہ دیکھا اور کچھ دیر کے بعد ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ تو پھر ہم جب کبھی اس شخص یا اس مکان کو دیکھتے ہیں۔ فوراً شناخت کر لیتے ہیں کہ یہ وہی شخص اور وہی مکان ہے۔ اگر ہمارے پاس کوئی ایسا نقشہ جو اس مکان یا اس شخص پر پورا پورا منطبق ہو موجود نہ ہوتا تو وہ اور کون سا معیار تھا جس کے ذریعہ سے اتنی مدت کے بعد ہم کو یہ شناخت ہو گئی۔ اس سے صاف طور پر ثابت ہوتا ہے کہ آدمی کا ذہن (عقل) مثل ایک آئینہ کے ہے اور اس میں جو معلومات حاصل ہوتے ہیں۔ وہ اس عکس کی مانند ہیں جو کسی شے کے محاذات کے وقت آئینہ میں دکھائی دیتا ہے۔ اتنا فرق ہے کہ آئینہ میں صرف ان اشیاء کا عکس پڑتا ہے۔ جو آنکھوں سے نظر آنے کے قابل ہوں اور ذہن میں ہر قسم کی چیزیں منقش ہو جاتی ہیں۔ مثلاً کسی اسپیکر کی ایک لمبی چوڑی تقریر تم نے سنی اور اس کے مضامین کا خلاصہ تم نے اپنے ذہن میں ملحوظ رکھا تو اب جب کبھی کوئی شخص وہ تقریر کرے گا۔ تم فوراً سمجھ جاؤ گے کہ یہ بعینہٖ وہ مضامین ہیں جو فلاں اسپیکر نے بیان کئے تھے۔ اگر ان مضامین کا کوئی فوٹو تمہارے پاس نہیں تھا تو تم نے یہ کیسے جانا کہ وہ اور یہ تقریر ایک ہی ہیں۔ اس سے بدیہی طور پر معلوم ہوا کہ ہمارے ذہن میں ان مضامین کا کوئی خاکہ موجود تھا۔ حالانکہ ان ہی مضامین کا عکس اگر ہم آئینہ میں لینا چاہیں تو بالکل

ناممکن ہے۔

غرض آئینہ میں اور ذہن میں اتنا تفاوت ہے کہ ایک میں مخصوص چیزوں کا عکس آتا ہے اور دوسرے میں ہر چیز کا مگر دونوں میں اس قدر اشتراک ہے کہ اس میں بھی کسی چیز کی تصویر حاصل ہوتی ہے اور اس میں بھی اب اگر کوئی چیز آئینہ میں منعکس ہونے کے قابل ہو لیکن منعکس نہ ہو تو جہاں تک تتبعؔ اور استقراء سے معلوم ہوا اس کے پانچ وجوہات ہو سکتے ہیں۔ یا یہ کہ وہ جوہر (لوہا) جس سے آئینہ بنتا ہے اس نے ابھی تک صقیل ہو کر آئینہ کی صورت اختیار نہیں کی یا آئینہ بن چکا۔ مگر زنگ آلود ہو گیا۔ یا صاف و شفاف ہے مگر جس چیز کا عکس اس میں لینا چاہتے ہو وہ اس کے مقابل نہیں۔ یا مقابل بھی ہے مگر آئینہ کے اور اس شے کے بیچ میں کوئی دوسری شے حائل ہے یا عکس لینے والے کو یہ معلوم نہیں کہ اس صورت کا عکس کس جہت میں ہو کر لیا جا سکتا ہے۔ ان سب حالتوں میں اشیاء مطلوبہ کا عکس آئینہ میں نہیں آسکتا۔ اور اگر ان موانع میں سے کوئی مانع موجود نہ ہو تو پھر محال ہے کہ محسوسات کی صورت اس میں ظاہر نہ ہو۔

ٹھیک اسی طرح انسان کے قلب (عقل) کی حالت ہے کبھی تو ایسا ہوگا کہ خود قلب ابھی ناقص ہے اور انعکاس کی پوری قابلیت اس میں پیدا نہیں ہوئی۔ جیسا کہ شیر خوار بچہ کا قلب کہ وہ معقولات کے علم سے بالکل خالی ہوتا ہے۔ اور کبھی معاصی اور ناپاک افعال کے ارتکاب سے قلب پر ایک قسم کی کدورت اور ظلمت چھا جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے اس کی پوری جلا اور

صفائی باقی نہیں رہتی۔ اس لئے اس میں لطیف اور باریک چیزوں کا انعکاس نہیں ہوتا۔ اور خدا کی ذات و صفات اور غیب کے اسرار سے یہ قلب بالکل عاری رہتا ہے۔

اس قلب کے زنگ چھوڑانے کی اس کے سوا کوئی تدبیر نہیں کہ ہمہ تن خدا کی اطاعت کی طرف توجہ اور مقتضائے شہوات سے پورا پورا اعراض کرے اور مجاہدات کا وہ طریقہ اختیار کرے جو اس فن کے تجربہ کاروں نے ناجائز خواہشات کے استیصال کے واسطے تلقین کیا ہے۔ والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا۔ اور من عمل بما علم ورثہ اللہ علم مالم یعلم میں اسی راز کی طرف اشارہ ہے۔

لیکن کبھی آدمی کا قلب گناہوں کی آلائشوں سے پاک و صاف ہو گیا ہے اور پھر بھی اس میں علوم ذات و صفات اور حقائق اشیاء مرتسم نہیں ہوتیں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس کی توجہ ان چیزوں کی طرف کامل نہیں ہوتی بلکہ وہ آفاتِ نفس کے جاننے یا طرق معاش کے مہیا کرنے میں مثلاً مصروف ہوتا ہے تو وہ چیزیں جن کی طرف اس کے قلب کو توجہ نہیں ہے۔ اسی طرح منعکس نہیں ہو سکتیں جس طرح آئینہ میں وہ صورتیں جو اس کے محاذی نہ ہوں۔ ہاں قلب کبھی صاف بھی ہوتا ہے اور توجہ بھی کامل ہے مگر وہ فاسد عقائد جو تقلید یا حسن ظن کی بناء پر دل میں پہلے سے راسخ ہیں حقائق کے انعکاس کے لئے حجاب بن جاتے ہیں اور جیسا کہ اور شے مطلوب کے درمیان میں اگر کوئی شے حائل ہو جائے تو اس کا عکس اس میں نہیں پڑتا

ایسے ہی حجاب کے وقت ہماری عقل حقیقی علوم کے حاصل کرنے سے قاصر رہتی ہے اور کبھی علم کے یہ تمام سامان جمع ہوتے ہیں مگر جن حاصل شدہ علوم پر یہ علم متفرع ہوتا ہے ان میں مناسب ترتیب قائم کرنی ہم کو نہیں آتی اس لئے ہم علم سے محروم رہتے ہیں۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص اپنی گدی کے پیچھے کا حال آئینہ میں دیکھنا چاہے۔ اب اگر وہ آئینہ کو آنکھوں کے سامنے رکھتا ہے تو پیچھے کا حال اس میں کھل نہیں سکتا اور اگر پیچھے لیجاتا ہے تو گو انعکاس ہو جاتا ہے مگر آنکھیں اس عکس کو دیکھ نہیں سکتیں۔

اُس وقت یہ شخص باوجود تمام اسباب مہیا ہونے کے عکس کے دیکھنے سے اس لئے محروم ہے کہ اس کو اس عکس کے لینے کا طریقہ معلوم نہیں۔ اگر کوئی اس کو یہ بتلادے کہ ایک آئینہ پیچھے لیجاؤ اور ایک آئینہ اس آئینہ کے محاذات میں اس طرح سامنے رکھو کہ جو عکس اس آئینہ میں پڑے اسی عکس کا پرتو دوسرے آئینہ میں بھی آجائے تو اس طریقہ کے معلوم ہونے سے اس کی ساری مشکل حل ہو جائے گی۔ اور جو دقتیں اس عکس کے لینے میں وُہ اٹھارہا تھا وہ یک لخت جاتی رہیں گی۔

یہی حال بعینہٖ انسان کے قلب کا سمجھو اور یقین کر لو کہ یہی امور ہیں جو اکثر حقائق کی معرفت سے ہم کو بے بہرہ رکھتے ہیں۔ اگر یہ موانع نہ ہوں تو بیشک ہر قلب اس فیضِ علم کے حاصل کر لینے کی پوری قابلیت رکھتا ہے جو فیاضِ ازل کی طرف سے بغیر کسی بخل کے ہر وقت اور ہر آن جاری ہے۔

○ تو جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں مذہب کے احکام عقل کے مطابق ہوتے

ہیں ان کا یہ قول اس اعتبار سے بالکل صحیح ہے کہ ایک کامل اور صاف و شفاف عقل جس میں حقائق کے انعکاس کی سب شرائط موجود ہوں۔ ہرگز خدا کے حکم کے خلاف حکم نافذ نہیں کر سکتی اور جنہوں نے یہ کہا ہے کہ احکام خداوندی کو اپنی عقل کی میزان میں نہ تولو۔ ان کی غرض یہ ہے کہ ہماری زنگ آلود عقلوں میں خدائی اسرار کا انعکاس نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح جس فریق کا یہ خیال ہے کہ حقائق نبوت اور حقائق صفات الٰہیہ ہماری فہم و ادراک سے بالاتر ہیں وہ عام فہم اور ادراک کے لحاظ سے بالکل سچ کہتے ہیں اور جس شخص کا یہ قول ہے کہ نہیں یہ چیزیں بھی بذریعہ عقل انسانی کے دریافت ہو سکتی ہیں تو اس کا بدعا بھی غلط نہیں ہے۔ وہ بجا طور پر عقل انسانی اسی کو قرار دیتا ہے جس میں نفسانی کدورتیں اور آلائشیں نہ ہوں۔

غرض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد کہ لوگ درجات عقل کے موافق جنت میں جائیں گے اس پر محمول ہے کہ حقیقی عقل کو جس قدر ترقی ہوگی جنت کے دروازوں سے قرب ہوتا جائے گا۔ اور یہ مقولہ کہ اکثر اہل جنت بے عقل ہوں گے۔ اس میں وہ لوگ مراد ہیں جو دنیا کی کاموں میں متوجہ نہ ہونے کی وجہ سے ابلہ سمجھے جاتے ہیں اور علیکم بدین العجائز کا خطاب بھی انہیں سے ہے جن کے دماغ دقیق اسرار کے متحمل نہیں ہو سکتے۔

اب تم پھر ایک دفعہ ان متعارض اقوال کو یاد کرلو جن کے سلجھانے میں تم سخت پریشان تھے اور جن کی کوئی درست توجیہ تم سے بن نہ پڑتی تھی۔ اور اخیر میں امام صاحب کی اس زریں نصیحت کو خوب یاد رکھو۔

فلا غنا بالعقل عن السماع ولا غنا بالسماع عن العقل فالداعي الى محض التقليد مع عزل العقل بالكلية جاهل والمكتفي بمجرد العقل عن انوار القرآن والسنة مغرور فاياك ان تكون من الفريقين وكن جامعا بين الاصلين فان العلوم العقلية كالاغذية والعلوم الشرعية كالادوية والشخص المريض يستضر بالغذاء متى فاته الدواء فكذلك امراض القلوب لا يمكن علاجها الا بالادوية المستفادة من الشريعة وهي وظائف العبادات والاعمال التي ركبها الانبياء صلوات الله عليهم لاصلاح القلوب فمن لا يداوي قلبه المريض بمعالجات العبادة الشرعية واكتفى بالعلوم العقلية استضر بها كما يستضر المريض بالغذاء وظن من يظن

نہ عقل کو نقل سے استغنا اور نہ نقل عقل سے بے نیاز ہے جیسا کہ عقل کو معزول کر کے محض تقلید کیطرف جانے والا جاہل ہے اسیطرح وہ شخص بھی دھوکہ میں ہے جو قرآن و سنت کے انوار سے علیحدہ ہو کر صرف اپنی عقل پر بھروسہ کرے تو تم کو ان دونوں گروہوں میں سے کسی میں بھی داخل نہ ہونا چاہیئے بلکہ عقل و نقل کا جامع بننا چاہیئے۔ کیونکہ علوم عقلیہ عقل کی غذا و علوم شرعیہ اسکی دوائیں اور جو مریض دوا کا استعمال نہ کرے اسکو غذا کے استعمال سے نقصان پہنچ جاتا ہے۔ یہی حالت دل کے امراض کی ہے کہ انکا علاج شرعی دواؤں سے یعنی ان عبادات اور اعمال سے ہی ہو سکتا ہے جن کو انبیاء علیہم السلام نے اس کام کیلئے ترکیب دیا ہے پس جبکہ دل بیمار ہو اور طبیب شرعی کے بموجب اسکا معالجہ بھی نہ کرے اور علوم عقلیہ کو اپنے حق میں کافی سمجھے وہ اسی طرح ہلاک ہوگا جس طرح بیمار آدمی غذا سے ہلاک ہو جاتا ہے۔ اور جو لوگ یہ سمجھے علوم عقلیہ کو علوم شرعیہ کے خلاف تصور کرتے ہیں اور دونوں میں تطبیق کو محال سمجھتے ہیں۔ یہ ان کا خیال اس وجہ سے ہے کہ انکی بصیرت کی آنکھیں اندھی ہیں۔

ان العلوم العقلية مناقضة للعلوم الشرعية وان الجمع بينهما غير ممكن ظن صادر عن عمى في عين البصيرة

نعوذ بالله منه (خدا کی پناہ)

یہاں تک ہم نے امام غزالیؒ کی تقریر کا ماحصل نقل کر دیا۔ امام صاحب کی تقریر اگرچہ نہایت صاف نہایت سلیس۔ نہایت عام فہم اور نہایت پر اسرار ہے لیکن اس میں چند ایسے اقناعی مقدمات بھی ہیں جن کا انکار کر دینا ہمارے ایک بیباک حریف سے کچھ مستبعد نہیں ہے۔

ہم امام صاحب کے اس قابل قدر بیان کی بہت کچھ عزت کر سکتے ہیں لیکن ہمارا ایک ظاہر پرست اور آزاد منش مقابل اس پر نکتہ چینی کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اگر ہم ذہن میں صورتوں کا انعکاس تسلیم کر لیں تو جو شرائط آئینہ میں انعکاس کیواسطے قرار دی گئی ہیں ان سب کا ذہن میں پایا جانا کیوں ضروری ہے۔ یہ ہم نے مانا کہ ذہن میں اور آئینہ میں ایک حد تک مشابہت پائی جاتی ہے۔ مگر ان دونوں میں تفاوت بھی بے انتہا ہے، جس کا اعتراف تم بھی پہلے کر چکے ہو۔ اب ان تفاوت کی بنا پر بعض وہ شرطیں جو آئینہ میں ضروری ہیں حصول علم میں ضروری نہ ہوں، یا اس کے برعکس تو کیا مضائقہ ہے۔

اسکے سوا یہ بھی ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ اعمال بد کی مباشرت یا گناہوں کے ارتکاب سے قلب پر کسی قسم کی تاریکی آجاتی ہے۔ اول تو ہم اعمال کی تقسیم نیک و بد کی طرف تسلیم ہی نہیں کرتے۔ دوسرے معاصی میں ملوث ہونا بیشک قوت عملیہ کے شرارت یا فاسد ہونے کا نتیجہ ہے۔ لیکن قوت عملیہ کا اس اثر بد سے متاثر

ہونا بظاہر کوئی معنیٰ نہیں رکھتا۔ نیز بقول قاضی ابن رشد اندلسی کے قرآن پاک نے جا بجا قیاس اور نظر کے طریقوں پر متنبہ کیا ہے اور خود بھی مختلف مواقع میں استدلال سے کام لیا ہے۔ پس اگر شریعت کے احکام عقول عامہ سے بالاتر تھے تو قرآن نے ہم سب کو عقل سے کام لینے اور غور و فکر کرنے کی طرف کیوں توجہ دلائی اور بقول اس کے ہر ایک انسان کو ایسے احکام کا مکلف بنانا کیونکر صحیح ہوا جو اس کی سمجھ سے باہر تھے۔ حالانکہ انسان اپنے ذی عقل ہونے کی وجہ سے ہی تکلیف شرعی کا مستحق ہوا ہے۔

یہ اور اس قسم کے اور شبہات ہیں جن کو سن کر ہم صرف اتنا ہی کہنا چاہتے ہیں کہ۔ شعر

چو نشنوی سخن اہل دل مگو کہ خطاست	سخن شناس نئی دلبرا خطا اینجاست

اور بپاس خاطر معترض امام صاحب کے جادہ استدلال سے ہٹ کر ذرا آگے بڑھ کر اس زبردست فاضل کی تقریر کی طرف رجوع کرتے ہیں جس کی تصنیفات میں جتنا غور کر دا اتنا ہی اس کی وہبی دانشمندی اور صادق البیانی کا اعتراف لازم ہے۔ یہ وہ فاضل ہے کہ جسکو اگر ہم اپنے عہد کا شیخ اکبر امام غزالی اور شاہ ولی اللہ سب کچھ کہہ دیں تو بیجا نہیں۔ اور یہی وہ فاضل ہے جس نے علم کلام کی ایک ایسے انوکھے طرز میں بنا ڈالی جو (انشاء اللہ) قیامت تک کے واسطے پتھر کی لکیر ہے اور جس پر ہمارا ناز کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔

اسی فاضل نے جس کو عام طور پر مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے اپنی مختلف کتابوں میں جو مفید بیانات درج

کئے ہیں وہ اس مسئلہ عقل نقل میں ہماری بہت زیادہ مشکل کشائی کرتے ہیں اور اب ہم ذیل میں کچھ لکھیں گے وہ تمام تر انہی تصانیف سے ماخوذ ہوگا۔ شعر

مطرب ترانہ وگر از پردہ ساز کن	زیرا کہ حرف عشق نمیدار د انتہا

○ صحیفہ عالم کا وسیع مطالعہ کرنے سے یہ بات بخوبی روشن ہو چکی ہے کہ (بقول طبیعیین کے فطرت نے اور بخیال اہل مذاہب کے، خدائے مختار نے) دنیا کی کوئی چیز بیکار نہیں بنائی اور جوں جوں تحقیقات کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے دوں دوں ہر ایک چھوٹی بڑی چیز کے منافع ہم پر ظاہر ہوتے جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے کائنات کا ہر ہر جزو بیش قیمت حکمتوں کا مجموعہ ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ہر شے کا تعلق کسی نہ کسی ایسی ایک یا چند اغراض سے بھی ہوتا ہے جنکی کمی زیادتی پر اس شے کا کمال اور نقصان منحصر ہے اور جن کو ہم اس شئے کے اصلی اغراض کہہ سکتے ہیں مثلاً حیوانات میں گھوڑے کی مدح و ذم اور اس کا حسن و قبح رفتار پر موقوف ہے اگرچہ وہ گدھے کی طرح پالان بھی اٹھا سکتا ہے اور گائے بکری کی طرح اس کو ذبح کر کے کھا بھی سکتے ہیں۔ اور اس کا دودھ بھی پی سکتے ہیں۔ لیکن یہ اس کے دودھ کی افراط یا بدن کی فربہی، یا بار برداری کی طاقت اس کی قدر و قیمت میں اسی طرح کچھ زیادہ دخیل نہیں جس طرح گائے اور بھینس میں چونکہ مقصود اعظم دودھ گھی وغیرہ ہے اس لئے ان کی تیز رفتاری اور قدم بازی کا کوئی اثر ان کی بھلائی برائی پر نہیں پڑتا یا گلاب کے پھول کی حسن۔ خوبی اس کے رنگ و خوشبو سے ہے۔ ذائقہ سے کچھ بھی غرض نہیں ہوتی۔ یا آم کے ذائقہ سے سروکار ہے اس کے رنگ و خوشبو سے چنداں تعرض نہیں کیا جاتا۔ ایسے ہی کتاب سے اگرچہ ہم کسی وقت تکیہ کا

کا کام لے سکتے ہیں۔ لیکن غرض اصلی اس سے پڑھنا ہی ہوتا ہے۔ یا ضرورت کے وقت کپڑوں کو جلا کر کھانا پکا سکتے ہیں۔ مگر اہم مقصد ان سے یہی ہے کہ وہ آدمی کے بدن کی پردہ پوشی اور زینت کا سبب بنیں۔

غرض عالم کے تمام اجزاء پر نظر ڈالی جائے۔ ہر موقعہ پر یہی شان نظر آئے گی پھر ناممکن ہے کہ انسان جو ہمیشہ اپنے اشرف المخلوقات ہونے کا دعویٰ کیا کرتا ہے کسی ایسی غرض اعلیٰ اور مطلب اعظم سے خالی ہو جس کے ہونے نہ ہونے پر اس کی بھلائی برائی موقوف ہو اور جس کے ذریعہ سے وہ مدح و ستائش یا ہجو و مذمت کا مستحق سمجھا جائے۔

بیشک اس مقصد اعظم کے متعین کرنے میں ہم کو سخت دشواری پیش آئے گی لیکن ہم اس عقدہ کو خود اعضائے انسان کی بناوٹ اور اس کے قوٰی کی ترکیب سے حل کریں گے اور ہم یقین کرتے ہیں کہ خود انسان زبان حال سے اس مقصد کی جستجو میں ہماری رہنمائی کرے گا۔

ہم جب اس معجون مرکب (انسان) کی اندرونی و بیرونی حالتوں میں غور کرتے ہیں تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان پانچ چیزوں سے اس کی ترکیب عمل میں آئی ہے۔ عقل، یعنی قوۃ علمیہ۔ شوق یا خوف ارادہ اور اختیار قدرت اور طاقت۔ ہاتھ پاؤں آنکھ ناک وغیرہ اعضائے جسمانی چنانچہ جس قدر کام انسان کرتا ہے ان میں یہ پانچوں آلات اپنا اپنا عمل کرتے ہیں۔

فرض کرو کہ ایک شخص شب کے وقت ایک جنگل میں چلا جا رہا ہے اس نے دور سے اپنے راستہ پر کسی جانور کو دیکھا۔ جس کی نسبت کبھی تو اس کا خیال ہوتا ہے کہ

یہ شیر ہے اور کبھی سمجھتا ہے کہ کوئی بیل کھڑا ہے۔ اب فطرۃً انسان کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ اپنے نفع اور ضرر کے پہلوؤں کو سوچے۔ اگر اس پر ضرر کا پہلو متعین ہو گیا یعنی یہ کہ پھاڑ کھانے والا شیر ہے تو طبعاً اس پر ایک قسم کے خوف یا اجتناب کی کیفیت طاری ہو گی اور اس کی قدرت اور طاقت تحریک میں آئے گی۔ اور اگر اعضا جسمانی قابو میں ہوئے تو الٹے پاؤں وہاں سے بھاگنا شروع کر دے گا۔ اور اگر یہ شخص اس جانور کو شیر نہ سمجھتا یا شیر سمجھ کر ایذا پہنچانے والی چیز نہ تصور کرتا تو برابر اپنے شوق میں اُدھر بڑھتا چلا جاتا۔

اس سے یہ امر بدیہی طور پر ثابت ہوا کہ شوق اور خوف۔ ارادہ اور اختیار طاقت اور قدرت ہاتھ اور پاؤں وغیرہ (جن کے مجموعہ کو ہم قوت عملیہ سے تعبیر کرتے ہیں) سب کے سب عقل یعنی قوت علمیہ کے محکوم اور زیر فرمان ہیں۔ اور جب عقل مفرد (قوۃ علمیہ) کا کام نافع و مضر کی شناخت یا نیک و بد کی تمیز اور قوت عملیہ کا کام حسب اشارہ عقل کسی عمل کا وجود میں لانا ٹھہرا تو اول کی حکومت اور دوسرے کی محکومی کے لحاظ سے ان دونوں کے مجموعہ یعنی انسان کا کل کام یہ ہوا کہ وہ سوچ سمجھ کر مفید شاغل میں پڑے اور مضر کاموں سے بچے۔ اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ دنیا میں اعمال کی تقسیم نیک و بد یا نافع و مضر کی طرف ہو سکتی ہو۔ کیونکہ اگر عملی دنیا سے بھلے برے کا فرق بالکل اٹھا دیا جائے تو قوۃ علمیہ کے کارناموں کے لیے کوئی میدان ہاتھ نہ آئے گا جیسا کہ ہم ابھی بتلا چکے ہیں کہ قوۃ علمیہ صرف یہی کام کر سکتی ہے کہ مفید اور بہتر کاموں کا ناقص اور مضر کاموں سے انتخاب کرتی رہے اور قوت علمیہ کی اس کارگزاری کے لئے دو قسم کے اعمال کا اس کے سامنے پیش ہونا

ضروری ہے۔

اب چونکہ یہ ثابت ہوگیا کہ اعمال کی دو قسمیں کئے بغیر انسان کی خلقت ہی بیکار رہتی ہے تو اس کا بھی سراغ نکل آیا کہ تمام عالم ہمیشہ سے اس پر متفق کیوں ہے کہ اعمال دو طرح کے ہوتے ہیں: نیک اور بد یا دوسرے الفاظ میں نافع اور مضر یہانتک کہ جو ملحد کسی مذہب کے قائل نہیں وہ بھی افعال و اعمال کی اس بدیہی تفریق کو تسلیم کرتے ہیں۔

اب جو کچھ گفتگو باقی ہے وہ صرف اس میں ہے کہ اعمال میں نیک و بد اور نافع و مضر کی تعیین کس طور پر کی جائے یعنی یہ کس طرح معلوم ہو کہ یہ فعل اچھا ہے یا برا۔ اس سے راحت پہنچے گی۔ اس سے تکلیف لیکن خوش قسمتی سے جو تقریر مرقوم ہوئی اس سے اس سوال کا جواب بھی کافی حد تک نکل آیا۔ کیونکہ جب عقل یا تو دُ علیہ اس لیے پیدا ہوئی ہے کہ وہ بھلے اور برے یا مفید اور مضر اعمال میں امتیاز قائم کیا کرے۔ تو یقیناً قدرت نے اس میں اس امتیاز صحیح کا ملکہ ودیعت کیا ہوگا۔ اس وجہ سے یہی رائے مضبوط معلوم ہوتی ہے کہ عقل سلیم جس کام کا حکم کرے وہ نافع ہو اور جس سے وہ انکار یا گریز کرے اس میں کوئی مضرت ہو۔

یہاں سے اس کی بھی قوی امید ہوتی ہے کہ اگر خدا کی جانب سے بندوں کی ہدایت کے لئے کچھ احکام نازل ہوں (جن کے مجموعہ کو مذہب کہتے ہیں)، تو وہ بھی مو بمو عقل کے موافق ہوں ورنہ خدائے برتر کی دانائی اور متانت پر یہ الزام عائد ہوگا کہ اس نے عقل کو بھی ہمارے قویٰ پر حکومت عطا کی تاکہ وہ سب اس کے اشاروں پر کام کریں اور رسول کو بھی حاکم بنا کر بھیجا تاکہ اس کی اطاعت

کی جائے۔ اور ساتھ ہی دونوں کو متضاد بلکہ متناقض احکام بھی دیدیئے جن میں سے ایک کو قبول کرتے ہیں تو لازمی طور پر دوسرے سے سرتابی کرنی پڑتی ہے۔

غرض اب نہایت یا وثوق طریقے سے یہ طے ہوگیا کہ سچا مذہب وہی ہے جو عقل سلیم کے مطابق ہو۔ اور بقول قاضی ابن رشد کے ہر اس شخص کو جس کے پاس عقل سلیم موجود ہے اپنے عقل سے کام لینا اور نظر و فکر کے صحیح طریقوں میں غور کرنا چاہیئے۔

اور بیشک تمام قرآن اور تمام احادیث کا یہی منشاء ہے کہ وہ عقل کے دستور العمل کے موافق تعلیم دیں۔ اور ہر انسان کی عقل جب تک کہ وہ گرد و پیش کے خیالات سے متاثر نہ ہو اور جب تک کہ عقلی صحت کا زائل کر دینے والا کوئی مرض اس کو لاحق نہ ہو ان ہی سچے اعمال کی ہدایت کرے گی جن کے رواج دینے کے واسطے خدا کے صادق القول پیغمبر مبعوث ہوئے ہیں۔

لیکن ان تمام مراحل کے بعد بھی ہم کو جس مرحلہ کا طے کرنا ہنوز باقی ہے وہ یہ ہے کہ عقل کے ساتھ سلیم کی قید بڑھانے سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ بعض عقلیں غیر سلیم بھی ہوتی ہیں اور جب سلیم کے معنی تندرست کے قرار دیئے گئے ہیں تو غیر سلیم اس عقل کو کہیں گے جو مریض اور بیمار ہو۔

تو یہ ہم ابھی تک نہیں سمجھ سکے کہ تندرست (سلیم) عقل کونسی ہے اور بیمار کونسی۔ آیا عقل کو بھی کوئی مرض لگ سکتا ہے اور اگر بالفرض لگ سکتا ہے تو اس کا علاج کیا ہے؟ اس کے واسطے طبیب کون ہے؟ اور اس کے مرض کی علامات کیا ہیں؟

صرف یہی استفسارات ہیں جو باقی رہ گئے۔ اور ان ہی کے حل ہو جانے پر اس بحث کا خاتمہ بھی ہو سکتا ہے۔ مگر آپ کو ان سوالات کا جواب سننے سے پہلے چند مختصر امور کا ذہن نشین کر لینا ضروری ہے۔

(۱) اوّل یہ کہ جو کام ایسے آلات کے ذریعہ سے کیا جائے جن میں احساس اور ادراک نہ ہو تو اس کام کا نفع نقصان اُن آلات کی طرف منسوب نہیں ہوتا۔ بلکہ اس شخص سے تعلق رکھتا ہے جو ان آلات سے یہ کام لینے والا ہے مثلاً بڑھئی کے کام میں بسولہ آتا ہے اگر اس کی دھار جھڑ جائے یا لکھنے میں کاتب کے قلم کی نوک ٹوٹ جائے تو یہ سب بڑھئی اور کاتب کا نقصان سمجھا جائے گا بسولہ اور قلم کے حق میں نہ کوئی نفع متصور ہے نہ نقصان۔ کیونکہ نفع نقصان کا وجود درحقیقت راحت اور تکلیف سے وابستہ ہے اور راحت و تکلیف کو وہی اشیاء محسوس کر سکتے ہیں جن میں ادراک اور شعور ہو۔ بہرحال جب آلات کا نفع و ضرر اصل عامل کا نفع وضرر ٹھہرا تو قویٰ عملیہ کے کاموں میں جو کچھ نفع یا نقصان ہو گا وہ فی الواقع عقل اور روح کا ہو گا کیونکہ ادراک و شعور عقل و روح ہی کا خاصہ ہے اور سب قوتیں اس کے آگے بمنزلہ آلات کے ہیں جیسا کہ ہم ابھی تحقیق کر چکے ہیں۔

(۲) دوسری بات یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ قوۃ عقلیہ اور قوۃ عملیہ کے مابین قدرت نے کچھ ایسا مستحکم رابطہ پیدا کیا ہے کہ ان میں ہر ایک کے آثار دوسرے تک متعدی ہوتے ہیں۔ قوۃ عقلیہ کے جو آثار قوۃ عملیہ میں ظاہر ہوتے ہیں کچھ تو وہی ہیں جن کا تعلق صفت حکومت سے ہے یعنی تمام قویٰ عملیہ کا بمقتضائے محکومیت

عقل کے ایک اشارہ پر حرکت میں آجانا اور بعض آثار ایسے ہیں جن میں عقل کی اس حکومت کو کچھ بھی دخل نہیں۔ جیسے غصہ کے وقت چہرہ کا تمتمانا اور آنکھوں کا سرخ ہو جانا، یا خوف کے وقت جسم کا کانپنا اور رنگ کا اڑ جانا۔ ان حالتوں میں جب کسی اشتعال انگیز یا ہیبت ناک چیز کا ادراک عقل کو ہوا تو فوراً بلا ارادہ اور بلا اختیار غصہ یا خوف کے آثار جسم پر ظاہر ہو گئے۔ درآنحالیکہ حکومت کی حیثیت میں قصد اور اختیار کا پایا جانا ضروری تھا علیٰ ہذا القیاس قوۃ عملیہ کیطرف سے بھی جو اثر عقل و روح تک پہنچتا ہے دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک تو وہی بلحاظ محکومیت اور آلہ بننے کے قوۃ عملیہ کے تمام منافع اور مضار کا عقل کے واسطے ثابت ہونا دوسرے بعض کیفیات بدنی سے عقل و روح کا بے اختیار کلفت یا راحت اٹھانا چنانچہ میل کچیل اور بول و براز سے جو کچھ نفیس طبعوں کو کدورت یا بخار درد سر وغیرہ میں کلفت یا بدن کی صفائی کی لذت اور عافیت میں راحت ہوتی ہے وہ سب اسی قسم میں داخل ہے۔ اب جانبین سے ان نہائی تعلقات۔ تاثیر و تاثر اور فعل و انفعال کے سلسلہ کو دیکھ ہم کو قطعی طور پر یہ یقین ہو گیا کہ قوت عملیہ کے بعض اعمال قوۃ علیہ (یا عقل یا روح) کے حق میں مفید اور بعض مضر ہونگے۔ اور کوئی ایک فعل بھی قوت عملیہ کا اس نفع وضرر سے خالی نہ ہو گا۔

○ پس اگر کوئی ایسا کامل آدمی جس کی روح کی صحت اور عقل کی سلامتی، دلائل قویہ سے ثابت ہو چکی ہو اعمال کے حسن و قبح کے متعلق کچھ فتویٰ نافذ کرے اور ہم اپنی قوۃ عملیہ کی کارروائی اس کے خلاف پائیں تو ہم کو اطمینان کر لینا چاہیئے کہ ہماری قوۃ عملیہ معذرت یا بالفاظ دیگر مرض میں مبتلا ہے اور اسے تاثیر و تاثر کے

کے قانون کے موافق جو قوۃ علمیہ اور عقل کے درمیان ابھی ثابت ہو چکا ہے یہ کہنا پڑے گا کہ قوۃ علمیہ یعنی عقل بھی اپنی اصلی حالت پر نہیں ہے بلکہ بیماری میں پھنسی ہوئی ہے کیونکہ اگر عقل تندرستی کی حالت میں ہوتی اور پوری قوۃ کے ساتھ صحیح احکام نافذ کرتی تو قوۃ علمیہ جو ہر طرح سے اس کی محکوم اور زبردست ہے ہرگز اس کی عدول حکمی نہیں کر سکتی تھی۔

اس سے بھی زیادہ ضعف اور اضمحلال عقل کا اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب کہ وہ خود بھی کسی عمل کے فوائد یا نقصانات سے واقف ہو۔ اور شہوت کے غلبہ یا کسی نفع جزئی معجل سے متاثر ہو کر اپنے اصلی حکم کے خلاف قوت علمیہ سے عملدر آمد کرا دے۔ حتیٰ کہ عمل کی ممارست سے عقل ایسی پاگل بن جائے کہ اسی مرض کو صحت سمجھنے لگے۔ چنانچہ ہر زمانہ اور ہر قوم کے حالات کا تتبع کرنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں اکثر افراد اس قسم کے روحانی امراض میں مبتلا ہوتے ہیں۔ دور کیوں جاتے ہو۔ اپنے زمانہ ہی کا حال مشاہدہ کر لو کہ اکثر لوگ ایسی موٹی باتوں میں جن کے بھلے برے سے سب واقف ہیں۔ جان بوجھ کر خلاف عقل عملدر آمد رکھتے ہیں۔ اور خاص وہ امراض جو تپ دق کی طرح مریض کو بھی کم محسوس ہوتے ہیں ان کی تشخیص تو کوئی طبیب ہی کر سکے تو کر سکے۔ پھر اکثر ارواح کا یہ حال ہے کہ بچپن سے تا حیات ان علتوں میں گرفتار رہنے کی وجہ سے صحت کی لذت سے آشنا ہی نہیں ہوتیں۔ اور کینہ حسد۔ بخل۔ تکبر۔ خود پسندی وغیرہ امراض سے قطع نظر کر کے وہ عام امراض جن کو وبائی امراض کہنا چاہیے نہایت کثرت سے وقوع میں آتے رہتے ہیں۔

جس قوم کو چاہے دیکھ لیجئے کہ شادی۔ غمی۔ اور سوائے ان کے اور معاملات میں بھی ایسی ایسی قیود اور رسوم قبیحہ کے پابند ہیں کہ جن کے نقصانات کا دل و جان سے اقرار کیا جاتا ہے اسی طرح ہر فرقہ ایک جدا ہی عقائد پر دل جمائے بیٹھا ہے۔ اگر ان سارے فرقوں میں سے کسی ایک کو بھی حق پر قرار دیں تب بھی اکثر لوگ تو باطل پر ہی نکلیں گے۔

پھر اکثر اقوام کی بعض عادتیں ایسی خلاف عقل ہیں کہ جن کی قباحت تمام اہل مذاہب کے نزدیک مسلم ہے۔ ہندوستان کے رانگھڑ گوجر اور افغانستان کے کوہستانیوں اور عرب کے بدوؤں میں چوری قزاقی اس درجہ مروج ہوئی ہے کہ رواج کی رو سے ان کے خیال میں موجب طعن و تشنیع نہیں رہی۔ طوائف کی قوم میں زنا کی اس درجہ ترقی ہے کہ معیوب ہونے کے بجائے اس کو اپنا ہنر سمجھنے لگیں۔ بنیوں کی بزدلی اور بخل ضرب المثل ہو گیا ہے۔ اور دوسری بعض قوموں میں شراب نوشی بے پردگی اور ترک ناموس کی یہ نوبت پہنچی ہے کہ اس کے نتائج بد برابر دیکھتے ہیں مگر زبان پر نہیں لاتے۔ غرض مختصر لفظوں میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ آوہ کا آوہ بگڑا ہوا ہے جس کی اصلاح کی توقع بھی بہت کم ہو سکتی ہے۔

ایسی ابتر حالت میں جبکہ کوئی عقل بھی (الا ماشاء اللہ) مرض سے خالی نہیں ہے مجدد صاحبؒ نے اگر یہ فرمایا کہ نبوت کا راستہ عقل کے راستہ سے علیحدہ ہے تو ہمارے نزدیک بہت بجا فرمایا۔ کیونکہ بیمار کی طبیعت بسا اوقات ایسی اشیاء کی طرف راغب ہو جاتی ہے جو اس کے لیے مضر ہیں اور ان چیزوں سے

نفرت کرتی ہے جو فی الواقع اس کو طیبّا مرغوب ہیں بخار والا اکثر کھانے سے متنفر ہو جاتا ہے۔ اور دنبل کی کلن یا خارش کی نوچ میں انسان اپنے بدن کے تراشنے اور کھال کے نوچنے پر بے اختیار مائل ہوتا ہے۔ لیکن وہ نفرت اور یہ رغبت دونوں بے محل ہیں جس کا باعث یہی مرض ہوا ہے۔

اب اگر مجدد صاحب یا اور کوئی عالم یہ حکم صادر فرماتے کہ مذہب مرغوبات عقل سلیم کے مجموعہ کا نام ہے (اور در حقیقت ہے بھی ایسا ہی) تو ان مریض عقلوں کے واسطے آزادی یعنی مطلق العنانی کا اچھا خاصہ بہانہ ہاتھ آجاتا اور وہ ہرگز تندرست اور بیمار عقل میں تفریق قائم نہ رکھتیں۔ جس سے دنیا میں ایک فساد عظیم برپا ہو جاتا اور ہدایت کے بجائے گمراہی پھیلتی۔

بہر حال جبکہ اس امر کا باور کر لینا بالکل آسان ہو گیا کہ اکثر انسانی عقلیں مبتلائے امراض رہنے کی وجہ سے اس پر قادر نہیں ہیں کہ وہ تیقن اور اطمینان کے ساتھ تمام اخلاق و اعمال میں نیک کو بد سے اور مفید کو مضر سے تمیز دے سکیں تو ناچار اس بارے میں کسی ایسے طبیب حاذق کی طرف رجوع کرنا ضروری قرار پایا جس کی رائے کبھی غلطی نہ کرتی ہو۔ جو اپنے مریضوں پر پورا پورا رحم کھانے کے علاوہ تمام دواؤں کے خواص اور اوزان سے واقف ہو جس کو مختلف دواؤں اور غذاؤں کی تاثیرات کے باریک سے باریک فرق معلوم ہوں اور جس کی نظر موسموں کے اختلاف اور روح کی تراکیب پر کامل طور سے حاوی ہو۔

لیکن ایسا طبیب اس حکیم علی الاطلاق کے سوا کوئی نظر نہیں آتا۔ جس کے سہارے تمام عالم کی ہستی قائم ہے جس کی ذات ہر قسم کے عیوب اور امراض

سے پاک ہے اور جس کے وجود اور کمالات کو عنقریب ایک مستقل رسالہ میں ہم روشن دلائل سے ثابت کریں گے۔[1]

دنیا میں جس قدر ہادی آئے۔ جن مقدس بندوں نے اپنی نبوت کا سکہ جمایا جتنے سچے شریعتوں کے تبلیغ کرنے والے گزرے وہ سب کے سب اسی حکیم مطلق کے مطب کے نسخہ نویس اور تربیت یافتہ تھے۔ انہوں نے ہمیشہ اسی روحانی کالج کی اسناد و فضیلت لوگوں کو دکھلائیں اور اسی حکیم برحق کے عطا کیے ہوئے طلائی تمغے اور نشانات پیش کیے تاکہ اللہ کی مخلوق ماہر طبیبوں کو اشتہاری حکیموں سے جدا کر سکے۔ رہبر اور رہزن کے پہچاننے میں دھوکہ نہ لگے اور محافظوں کی جماعت پر لٹیروں کا اشتباہ نہ ہو۔

ہم جب نبوت کی ضرورت اور نبی کے تعین پر مبسوط بحث کریں گے اس وقت ان علامات کا تفصیلاً ذکر کریں گے جن سے کسی خاص شخص کی نسبت یہ دریافت ہو سکے کہ وہ خدائی مدرسہ کا اعلیٰ تعلیم یافتہ اور دنیا میں حکیم علی الاطلاق کی نیابت کا واقعی مستحق ہے۔

مگر اس موقع پر نہایت اختصار کے ساتھ صرف اتنا دکھانا چاہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے فیوضات اخذ کرنے اور اس کے علوم و کمالات کا مظہر بننے کے واسطے انسان میں عادۃً کن شرائط کی ضرورت ہے یا بالفاظ دیگر حق تعالیٰ کے مدرسہ میں طب روحانی کا حصول کس استعداد پر موقوف ہے۔

بلاشبہ اس قسم کے عمیق مباحث میں دخل دینے کا ہم کو کچھ استحقاق نہیں ہے اور جس وادی میں ہم قدم زن ہو۔ نہ کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس کو یا سانی قطع

[1] یہ رسالہ "اسلام کے بنیادی عقائد" کے نام سے طبع ہو چکا ہے۔

کر لینے کا خیال محض ہماری فکر کے خارج از حوصلہ بلند پروازی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ لیکن اس ناواقف مسافر کو راستہ کی مشکلات کی کیا پرواہ ہو سکتی ہے جس کی دستگیری کے واسطے ایک اعلیٰ درجہ کا مبصر اور تجربہ کار ہادی موجود ہو۔

ہم پہلے بھی جن تیرہ و تاریک راہوں کو طے کر کے اس مقام تک پہنچے ہیں ان میں کو گزرنا آسان نہ تھا اگر قاسمی تصنیفات ہمارے لیے مشعل راہ نہ ہوتیں اور اب بھی انشاء اللہ آپ دیکھیں گے کہ ان ہی کی روشنی میں منزل پیش آمدہ کے مہالک خطرات کا مقابلہ کرتے ہوئے ہم اپنے مقصد اعلیٰ پر صاف جا پہنچیں گے۔

وہ ذات بابرکات جس کی قوت قدسیہ نے شریعت صادقہ کے پیچ در پیچ اور نظری در نظری اسرار کو بھی بداہت کی حدود کے قریب لا رکھا ہے۔ اگرچہ وہ خود دنیا سے اٹھ گئے مگر ان کی قیامت تک نہ مٹنے والی یادگاریں ہماری رہنمائی کے واسطے زندہ جاوید ہیں۔

اس میں ہرگز مبالغہ نہیں کہ اگر حضرت مولانا محمد قاسم (روحی وارواحکم فداہ) کی بیش بہا کتابوں پر میری دسترس نہ ہوتی تو میں ہرگز اس طرح کے نازک مسائل پر بے خوف و خطر قلم اٹھانے کی جرأت نہ کر سکتا۔ اس لئے یہ سخت احسان فراموشی اور خیانت متصور ہوگی کہ میں کسی ایسے مضمون کو اپنی طرف منسوب کر کے جو در حقیقت حضرت مولانا مرحوم کی تصانیف سے اخذ کیا گیا ہو اپنی غیر واقعی عظمت و تفوق کا ثبوت پیش کر دوں۔ میں اس سے زیادہ اپنے کو خوش قسمت اور فائز المرام بنانے کی تمنا نہیں رکھتا کہ مولانا کے عالی مضامین

میرے پیرایہ بیان میں اس طرح ادا ہو جایا کریں کہ ان کی تعبیر میرے مدعا کے واسطے مفید اور صحیح ہو اور اپنے قصور فہم یا پریشانی تقریر کی وجہ سے دلائل کی تقریب ناتمام نہ رہے۔ چنانچہ اس وقت بھی جس بحث کا آغاز کیا جاتا ہے اس میں میرا صرف اسی قدر تصرف ہوگا۔

یہ بحث جس کی ابتداء سے آج ہماری تحریر کی دوبارہ ابتداء ہوئی ہے فی الحقیقت نبوۃ کی بحث ہے اور ہم کو ہٹ دھرمی اور ڈھینگا ڈھینگی سے نہیں بلکہ محض حق پژوہی اور انصاف کے ساتھ یہ دکھلانا ہے کہ وہ پر عظمت و جلال مفہوم جس کے لئے نبی، رسول، پیغمبر وغیرہ الفاظ وضع کئے گئے ہیں۔ کیا خارج میں واقعی طور پر اس کے کچھ افراد موجود ہیں یا وہ بھی منجملہ ان شاندار تخیلات کے ایک تخیل ہے جن کو مغلوب الوہم لوگوں کے دماغ فرصت اور تنہائی میں بیٹھ کر اختراع کرتے رہا کرتے ہیں۔

اس آخر احتمال کو سن کر جس سے شان نبوۃ میں سخت ملحدانہ گستاخی ہوتی ہے ہم کو اندیشہ ہے کہ شاید کوئی جوشیلے مسلمان ہمارے ایمان میں تردد پیدا کر کے ہم پر ہی نہ بگڑ بیٹھیں اسلئے ہم ایسے صاحبوں سے باادب عرض کرتے ہیں کہ وہ بجائے اس کے کہ اپنے قابل تعریف غصہ اور جوش کو ہم مسلمان ناقلین کے حق میں صرف کریں بہتر ہو کہ ان مطلق العنان دہریوں کی سرکوبی کے واسطے استعمال فرمائیں جن کی زبان سے ما یہلکنا الا الدھر اور ان ھی الا حیاتنا الدنیا وغیرہ الفاظ قرآن کریم میں نقل کئے گئے ہیں اور جن کی ایک بڑی بھاری تعداد آج کل یورپ میں زبان قال سے اور ہندوستان وغیرہ میں زبان حال سے یہ صدائیں لگا رہی ہے کہ خدا کا وجود محض ایک فرضی وجود ہے۔ نبوۃ و رسالہ صرع کی بیماری کے نام ہیں۔ اعاذ

کرامات اگلے زمانہ کی نظر بندیوں کے افسانے ہیں۔ اور وحی والہام کی حقیقت دیوانوں کی بڑسے کچھ زیادہ نہیں ہے۔

یہ لوگ صرف ایک عقل کے اور وہ بھی اپنی عقل کے مشورہ کو ماننا چاہتے ہیں اور ان کے مذہب میں جادہ عقل سے ایک انچ ادھر ادھر ہٹنا کفر و شرک یا کم از کم گناہ کبیرہ کے برابر ہے۔

نیز ایسا شخص جس کو کبھی کسی مشکل مسئلہ کے متعلق افہام و تفہیم کا موقع ملا ہوگا بشرطیکہ اس کے بیوقوف مخاطب کے مسلمات بھی بہت ہی تھوڑے سے ہوں اندازہ لگا سکتا ہے کہ ایک ایسے آزاد فرقہ کی بے قید شبہات سے جس کا ذکر اوپر ہوا عہدہ برآ ہونا کس قدر دشوار مرحلہ ہے اور یہ کہ ہمارے مولانا روحی فداہ ابی و امی، نے ان لامذہبوں کے مقابلہ میں کس درجہ ثبات و استقلال اور معقولیت سے کام لیا ہے۔

مولانا کا اس آزاد گروہ سے صرف ایک سوال ہے وہ یہ کہ تمام مخلوقات میں نیک و بد کا تفاوت۔ بھلے برے کا فرق اور اعلیٰ ادنیٰ کے امتیازی مدارج جو ہماری تمہاری سب کی عقل نے قائم کر رکھے ہیں اس کا معیار اور پیمانہ عقل کے پاس کیا ہے عقل نے جمادات سے حیوانات کو کیوں اچھا بتلایا ہے اور تمام حیوانات کے اعتبار سے انسان کو کیوں پسند فضیلت عطا کی ہے جہالت کے مقابلہ میں وہ علم کی ہمیشہ کیوں مداح رہا کرتی ہے۔ اور ہمت و شجاعت کے کارناموں کو وہ جبن و نامردی کے برخلاف کس وجہ سے سر بلند رکھنا چاہتی ہے۔ المختصر وجود کو عدم پر وجودیات کو عدمیات پر ہونے کو نہ ہونے پر استغنا کو

احتیاج پر اور راحت کو تکلیف پر کیوں ترجیح دیتی ہے۔ وہ کونسا نمونہ اس کے پاس ہے جس کے ساتھ مناسب و مشابہ ہونے اور نہ ہونے کی وجہ سے وہ مخلوقات میں سے ہر ایک چیز کو بھلا یا برا بنا دینے کا استحقاق رکھتی ہے۔

اگر تم ایک اچکن کا کپڑا کسی ہوشیار درزی کو قطع کرنے اور سینے کے لئے دو یا بازار جا کر کوئی عمدہ ٹوپی اور خوبصورت جوتی خریدنے کا ارادہ کرو۔ تو بیشک تم ان سب چیزوں کی حسن و خوبی اور موزونیت وغیر موزونیت کو اپنی ان آنکھوں سے دیکھ سکو گے جو قدرت کی طرف سے تم کو ایسے ہی کاموں کے لیے عنایت ہوتی ہیں لیکن اس دیکھنے کے اندر تم کو چند پیمانوں پر ان اشیاء کے مطابق کرنے کی ضرورت ہوگی۔ مثلاً اچکن کو تم اپنے بدن پر پہن کر اور جوتی کو پاؤں میں ڈال کر اور ٹوپی کو سر پر رکھ کر دیکھو گے۔ اگر ان میں سے کوئی چیز اپنے پیمانہ پر پوری نہ اترے بلکہ ڈھیلی یا تنگ رہے تو تم اس کو ناموزوں سمجھ کر مسترد کر دو گے اور اگر اتفاق سے کوئی چیز خاطر خواہ اپنے پیمانہ پر مطابق ہو گئی تو پھر خود خیال کر سکتے ہو کہ تم کہاں تک اس کی قدر دانی کے لیے تیار ہو گئے۔

○ ٹھیک اسی طرح عقل کے پاس بھی ہر نیک و بد کی تمیز کا کوئی پیمانہ اور بھلے برے کی شناخت کا کوئی معیار موجود ہونا چاہیئے کہ جس پر منطبق ہونے اور نہ ہونے سے وہ ہر ایک مخلوق کے حسن و قبح کے مراتب دریافت کر سکے۔

غالباً ہر عقل کے جذبہ فطرت میں جیسا کہ ہم عنقریب ثابت کریں گے۔ مخلوقات کے ماسوا ایک ایسی اعلیٰ ہستی کا ادراک موجود ہے جو عین وجود ہونے کی وجہ سے عدم و نیستی کا شائبہ اپنے اندر نہیں رکھتی اور اسی وجہ سے وہ ہر قسم

کی احتیاجات سے بے نیاز ہے۔ وہ حی ہے۔ عالم ہے قادر ہے۔ متکلم ہے۔ ارادہ اور اختیار رکھتا ہے۔ غرض کہ تمام ہی عمدہ صفات کے جامع اور ہر طرح کے عیب وقصور سے بری ہے۔

اب جس حد تک عقل اپنی رسائی اور صفائی کے موافق کسی مخلوق کو اس ایک چیز سے مناسب پاتی ہے اسی حد تک اس کو اعلیٰ اور افضل جانتی ہے اور جو چیز اس سے بعید المناسبۃ ہوتی ہے وتنا ہی عقل اس کو پستی کی جانب ڈھکیلتی جاتی ہے۔ مثلاً:۔

وہ عقل کے مرتبہ شناسی کا معیار (جسکو دوسرے الفاظ میں ہم خدائی عزوجل کہتے ہیں) چونکہ وجود ہی وجود ہے عدم کا اس میں اصلاً اختلاط نہیں اسی واسطے ہماری عقل موجودات کو ہمیشہ معدومات پر ترجیح دیتی ہے۔ پھر موجودات میں بھی جس شے میں خدائی صفات کا کم وبیش ظہور دیکھتی ہے۔ اسی حیثیت سے اس کی تفوق کو ان اشیاء کے مقابلہ میں تسلیم کرانے لگتی ہے جن میں وہ صفات نہ پائے جاتے ہوں۔

دیکھو چونکہ ہم یہ جانتے ہیں کہ خداوند کریم زندہ ہے بیجان نہیں اور اس باب میں ہم نے دیکھا کہ آدمی اور جانور خدا تعالیٰ سے زیادہ مناسبت رکھتے ہیں مٹی۔ پانی۔ ہوا۔ آگ۔ شجر۔ حجر وغیرہ نہیں رکھتے تو ہم نے جان لیا کہ حیوانات کا رتبہ جمادات سے اونچا ہے۔ اس کے بعد خیال کیا کہ خداوند کریم عالم ہے جاہل نہیں اور ہر انسان باقی جانداروں سے علم وعقل میں ممتاز ہے تو ثابت ہوا کہ انسان جملہ حیوانات میں اشرف وافضل ہے۔ پھر انسان بھی علم واخلاق اور

احوال واعمال میں متفاوت اور کم وبیش ہیں تو جو کوئی علم میں زیادہ ہو اور اخلاق مثل قدرت۔ سخاوت۔ حلم۔ عفو وغیرہ کے جو خدائے تعالیٰ کے اخلاق ہیں رکھتا ہو وہ بلاشبہ اپنے اقران سے فائق شمار کیا جائے گا۔

بہرکیف جس چیز کو بھی عقل بھلا یا برا کہتی ہے اس کو ابتداءً یا بالآخر اسے ایک نمونہ اور معیار پر مطابق کر کے دیکھتی ہے۔ البتہ چونکہ باہم عقلوں میں تیزی اور صفائی اور توجہ کے اعتبار سے بے انتہا فرق ہے اسی لیے اس مطابقت اور مناسبت کے معلوم کرنے میں بھی بے حد تفاوت ہونا چاہیئے۔

○ اب تم خیال کرو کہ دنیا کی سب چیزیں ارواح ہوں یا اجسام۔ اخلاق ہوں یا اعمال معانی ہوں یا الفاظ باوجودیکہ خدائے برتر سے ایک قسم کی مناسبت رکھتے ہیں۔ کیونکہ سب کی اصل وہ ہی خالق بے نیاز ہے اور سب کا وجود اسی کے وجود کا پرتو ہے۔ لیکن پھر بھی اس مناسبت میں مخلوقات کے اندر زمین و آسمان کا تفاوت ہے۔

ارواح کو بسبب اپنی لطافت کے جو قرب ومناسبت جناب باری عز اسمہٗ سے حاصل ہے وہ ہرگز اجسام کثیفہ کو نہیں اور اجسام میں بھی مثلاً آگ ہوا سے لطیف ہے اور ہوا پانی سے اور پانی مٹی سے۔ تو اسی ترتیب سے ان میں سے ہر ایک کو خدا تعالیٰ شانہٗ کے ساتھ ایک طرح کا قرب ومناسبت حاصل ہوگا۔ اور شاید اسی قرب وبعد کا اثر ہے کہ لطیف چیزوں سے باوجود اس نزاکت کے وہ کارہائے نمایاں بن پڑتے ہیں کہ کثیف سے ہرگز نہیں ہو سکتے برق ایک پلک جھپکنے میں آسمان سے زمین پر آتی اور پھر آسمان پر



اڑ جاتی ہے اور اس سرعت سیر و سفر میں پہاڑ بھی اگر سامنے آجائے تو اس کی بھی ذرہ برابر حقیقت نہیں سمجھتی۔ شعاعِ شمس و قمر کا یہ حال ہے کہ سرعتِ برق بھی اس کے سامنے گرد ہے کہاں زمین کہاں چوتھا آسمان۔ خیال کرتے ہوئے دیر لگتی ہے پر اس کو یہاں تک آتے دیر نہیں لگتی۔

علیٰ ہذا القیاس اپنی نگاہ کو دیکھو اور آوازوں کی تیز روی اور خیال و گمان کی رسائی کو سوچو جتنی لطافت بڑھتی جائے گی۔ اسی قدر زور اور قدرت زیادہ ہوگی۔ جس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ لطیف چیزیں اپنے قرب و مناسبت کی بدولت خدا تعالیٰ کے فیضانِ کمالات سے وہ حصہ لیتی ہیں جو بعید المناسبتہ اشیاء کو نہیں مل سکتا۔ اور اس کی نظیر ظاہر میں بالکل اس طرح ہے کہ شمع کا نور اس کے آس پاس کی چیزوں کو بہت زیادہ منور کرتا ہے لیکن دور کی چیزیں اس سے اتنی روشن نہیں ہوتیں۔

پس اگر وہ اخلاق حمیدہ حق تعالیٰ شانہٗ کی ذات بابرکات میں موجود ہیں قلیل کثیر کسی فرد بشر کے نصیب ہو جائیں تو بے شک بہ نسبت ان افراد کے جن میں یہ اخلاق نہیں اس شخص کو حق تعالیٰ سے بمقدار مطابقت اخلاق کے قرب روحانی ہوگا۔ اور جو عنایات خاصہ خدائے کریم کی اس کے حال پر مبذول ہوں گی اوروں کو میسر نہ ہو سکیں گی۔

○ آپ عنقریب بوضاحت و تفصیل یہ معلوم کریں گے کہ جیسے زمین و آسمان میں چار طرف نور آفتاب کا ظہور ہے۔ اور اسی کے ذریعہ سے آپ سرخ و سفید کا امتیاز اور خوبصورت و بدصورت کا فرق قائم کرتے ہیں اور ہر صحن اور ہر ایوان

ہر جگہ اور ہر مکان میں جُدا جُدا قطع سے وہ ہی جلوہ گری کئے ہوئے ہے ایسے ہی تمام کائنات کا وجود خداوند حقیقی کے نور وجود کی پرتوافشانی کا نتیجہ ہے۔ تو جس طرح آفتاب عالمتاب کو باایں ہمہ عموم فیض، قلعی دار آئینہ اور آتشی شیشے کے ساتھ وہ خصوصیت خاصہ حاصل ہے کہ دوسرے اجسام کے ساتھ نہیں۔

(دیکھو۔ آتشی شیشے میں سوائے روشنی کے آفتاب کی جانب سے ایک خاص حرارت اور آتشی اثر کی بھی آمد ہے اور باقی اجسام کو جو وہیں اس کے پاس ہی رکھے ہوں اس تاثیر کی مطلق خبر نہیں۔ یا آئینہ قلعی دار میں آفتاب کی روشنی کا اس قدر اظہار ہے کہ در صورتیکہ دوسرے اجسام آفتاب سے فیضیاب ہو کر خود ہی روشن ہو جاتے ہیں یہ خود بھی سورج کی طرح چمک اٹھتا ہے اور جو اجسام اس کے بالمقابل ہوں ان پر بھی اپنا پرتو ڈالتا ہے۔)

اسی طرح فیض خداوندی کو بھی عام و خاص سمجھنا چاہیئے۔ کہ یہ فرق بجز فرق مناسبت اور فرق قابلیت کے اور کیا ہوگا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ جیسے آفتاب کو آئینہ یا پتھر سب برابر و یکساں ہیں ایسے ہی خدائے بے نیاز کو بھی تمام مخلوقات برابر ہیں کسی سے بخل نہیں۔ البتہ مخلوقات کی قابلیت اور مناسبت بے انتہا مختلف ہے۔

تو جو لوگ صاف باطن ہیں اور اپنے بنی نوع سے ایسے ممتاز ہیں جیسے آئینہ لوہے سے یعنی جیسے آئینہ دراصل وہ ہی لوہا ہے جو میل کچیل کے دور ہو جانے کے باعث صاف و شفاف آئینہ بن گیا ہے ایسے ہی وہ لوگ بھی مثل

اور بنی آدم کے وہ ہی حقیقت اور روح انسانی رکھتے ہیں۔ مگر اتنا فرق ہے کہ ان کی ارواح بوجہ نہ ہونے آلائشوں اور کدورتوں کے جو بسبب تعلقات پنہانی کے ہوتی ہیں پاک و صاف ہیں وہ لوگ عجب نہیں کہ بہ نسبت اپنے بنی نوع کے زیادہ معزز و ممتاز ہوں اور بعضے ایسے فیض ان کو خدا کی طرف سے پہنچتے ہوں کہ ہم کو تم کو ان کی اطلاع بھی نہ ہو۔ یعنی ہم تم بذات خود ان فیوضات سے محروم رہیں۔ گو ان ہی پاک دل لوگوں کے واسطہ سے جن کے قلوب پر اول و فیض وارد ہوتے ہیں صرف اسقدر بہرہ یاب ہو جائیں جس قدر در و دیوار آئینہ منور سے یا سیاہ و سبز وغیرہ اشیاء جو جلنے کے قابل ہوں آتشی شیشے سے۔

عرض ہو سکتا ہے کہ جیسے آفتاب کے مقابلہ کے وقت آتشی شیشہ یا آئینہ قلعی دار کے باطن میں آفتاب کی طرف سے ایک فیض ایسی طرح آتا ہے کہ بظاہر آتا ہوا کچھ معلوم نہیں ہوتا اور پھر اس کے حاصل ہو جانے کے بعد وہ دونوں بھی بقدر طاقت اپنی فیض رسانی میں مطلق بخل و دریغ روا نہیں رکھتے بلکہ ہر اس چیز کو جو ان کے سامنے آتی ہے اپنے حلقہ اثر میں داخل کرنے کے واسطے تیار رہتے ہیں۔

○ ایسے ہی کیا عجب ہے کہ بعض بنی آدم کے دلوں پر جن کے دل جسمانی کثافتوں اور نفسانی کدورتوں سے پاک و صاف ہیں ایسی حرارت محبت خداوندی نازل ہوتی ہو کہ اوروں کو اس کی خبر بھی نہ ہو اور وہ خود آتشی شیشے کی مانند اس کو پی جائیں اور تحمل کر جائیں لیکن دوسروں کے دلوں میں آگ لگا کر اور ان کی ساری کدورتوں کو سوخت کر کے ایسا پاک و صاف کر دیں جیسا

لوہے کو جلا کر صاف و شفاف آئینہ بنا لیا جاتا ہے۔ اور پھر اس نور الہی سے جو مثل آئینہ کے خاص ان کے دلوں پر اترتا ہے اور اترتا ہوا معلوم نہیں ہوتا اور ان کا ظاہر مثل در و دیوار کے اور باطن مثل اس آئینہ کے جو خود آفتاب کے مقابل نہ ہو مگر اس آئینہ کے مقابل ہو جو آفتاب کے مقابل ہے بکمال آب و تاب جگمگا اٹھے۔ یعنی ان کا فیض ان لوگوں کو جو ان کی طرف صدق دل سے متوجہ ہوتے ہیں ظاہر و باطن میں ایسا مالا مال کر دے کہ کدورت کا نام و نشان باقی نہ رکھے اور عمدہ اعمال اور برگزیدہ اخلاق سے ان کا اندرون و بیرون بخوبی آراستہ ہو جائے۔

ہماری خواہش اس وقت اپنے دوستوں سے اس کے سوا کچھ نہیں کہ خدائے عزوجل میں (جو کہ مخزن کمالات ہے) اور چند انسانوں میں فقط ایک ایسے ہی خاص طرح کے تعلق کو مستبعد نہ سمجھیں جیسا کہ انہوں نے آتشی شیشے وغیرہ کا آفتاب کے ساتھ مشاہدہ کیا ہے۔

اگر ان کو خالق و مخلوق کے درمیان اس قسم کے پوشیدہ تعلقات کے ممکن التسلیم ہونے میں تامل نہ رہا (اور غالباً نہ رہا ہوگا) تو پھر ہم بہت ہی تھوڑے سے غور و فکر کے بعد اُن خصوصیات کو طے کر سکیں گے جن سے کسی ایک یا چند معین اشخاص کی صداقت پر جو کبھی اس تعلق کے مدعی رہے ہوں کافی استدلال ہو سکتا ہو۔ لیکن

○ ہم ابھی تک تو اسی ورطہ حیرت میں پڑے ہوئے ہیں کہ مثلاً دوپہر کا وقت ہے آفتاب ٹھیک نصف النہار پر ہے۔ کنکریاں، سنگریزے، درخت کی

شاعیں۔ زمین کے ریت سمندر کا پانی اور لوہے کے کالے کالے ٹکڑے غرض دنیا کی سینکڑوں ہزاروں چیزیں اس کے سامنے پڑی ہوئی ہیں۔ سورج کی روشنی میں ہر ایک شے ان میں سے الگ الگ دکھائی دیتی ہے۔ اور ہر ایک میں دھوپ کی کچھ نہ کچھ گرمی بھی محسوس ہو رہی ہے۔ لیکن ان ہی مختلف الانواع اشیاء کے بیچ میں اور ان ہی کالے سیاہ آہن پاروں کے قریب ایک شخص بیٹھا ہے جس کے ایک ہاتھ میں آتشی شیشہ اور دوسرے میں کوئی سیاہ یا سبز چادر ہے اور جب وہ اپنے شیشے کو سورج کے روبرو کر کے چادر کو اس کے مقابلہ پر لاتا ہے تو اسی وقت چادر میں آگ سلگ کر دھواں اٹھنے لگتا ہے۔ اور جب شیشے کو سورج کے یا چادر کو شیشے کے سامنے سے سرکا دیتا ہے تو وہ تاثیر آتشیں باقی نہیں رہتی۔

یہ سارا تعجب انگیز ماجرا جب ہم ایک انتہا سے انتہا جاہل اور متعصب آدمی سے کہتے ہیں تو وہ بغیر کسی استعجاب کے اس کو تسلیم کرنے لگتا ہے لیکن باوجود اس کے وہ بہت افسوس ناک بیباکی کے ساتھ محال سمجھ کر تمسخر اڑانے کو جائز رکھتا ہے جب ہم اس سے یہ کہتے ہیں کہ ایک خشک اور بے آب وگیاہ ریگستان میں جہاں پر بہت سے ایسے مختلف المذہب مختلف الطبائع اور مختلف الالوان لوگ جمع تھے جن کے پتھریلے معبودوں کی مانند سخت وسیاہ دلوں پر آفتاب کمالات کی شعاعیں بھی اپنا گہرا اثر نہ ڈالتی تھیں۔ جن کے تہ بر تہ مادی کثافتوں کے نیچے ان کی لطیف روحانیت نے اپنے کو چھپا رکھا تھا۔ اور جن کی جہالت آمیز حرکتوں اور ضالّانہ

بدمستیوں سے دنیا کی اخلاقی مرقع کی اصلی صورت ایسی بگڑ گئی تھی کہ پہچانی نہ جا سکتی تھی۔

وہاں پر ایک ایسا صفا کیش اور روشن ضمیر انسان ظاہر ہوا جس کے قلب میں فطری طور پر کمالات الٰہی سے استفادہ کرنے کی پوری استعداد ودیعت کی گئی تھی۔ اور جس نے ہوش سنبھالتے ہی بغیر کسی ظاہری معلم کے تمام گرد وپیش کے خیالات سے علیحدہ ہو کر ایسی روش اختیار کی جو سیدھے معبود حقیقی تک پہنچانے والی تھی۔ اس پاکیزہ سرشت انسان کو اپنے جبلی اخلاق اور برگزیدہ ملکات کی بدولت جو وہ بطن مادر سے اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس منبع الکمالات خالق سے ایک خاص الخاص نزدیکی اور مناسبت قائم ہو گئی اور جس وقت وہ خدا کا پاک طینت بندہ تمام فانی تعلقات کو فراموش کئے ہوئے دل سے طلب صادق کے ساتھ خدائے ذوالجلال کی جناب میں متوجہ ہو کر بیٹھا تو نہ معلوم کس غیر محسوس راستے سے ایک ایسی گرم روشنی اس کے قلب کی تہ میں اتری کہ پھر جو دل بھی سامنے آیا اس کی ساری کدورتوں اور آلائشوں کو جلا کر کندن بنا دیا۔

کیا کوئی عقل وانصاف کا حامی ان دونوں واقعوں میں جو ہم نے ذکر کئے مادیت اور روحانیت کے فرق کے سوا اور کوئی فرق ہم کو ایسا بتلا سکتا ہے جس سے ایک واقعہ تو ہمارے احمق مخاطب کے نزدیک قابل تسلیم ٹھہرا اور دوسرے کی محال اور ناممکن سمجھ کر ہنسی اڑائی گئی۔

بلاشبہ آتشی شیشے اور آفتاب کی مثال ایک جسمانی مثال ہے جس

گو ہم کسی روحانی مسئلہ کے استدلال میں بقاعدہ منطق پیش نہیں کر سکتے لیکن آپ اطمینان رکھیں کہ نہ ہم نے اس کو اپنا استدلال بنانا چاہا ہے اور نہ فی الحقیقت ہم کو بنانے کی ضرورت ہے۔

ہم اوائل تحریر میں بتلا چکے کہ ہماری غرض اصلی اس موقع پر صرف اس قدر ہے کہ آپ خدائے بزرگ کے اور اس کے بندوں کے مابین ایک ایسے مخصوص تعلق کے ممکن ہونے سے انکار نہ فرمائیں جس کے ساتھ حضرت رب العزت کے بعض افادات خاصہ وابستہ ہوں پس اگر آپ اس قسم کے تعلق کو ناممکن اور محال سمجھیں گے تو در حقیقت مدعی آپ ہوں گے اور استدلال و برہان سے کسی بات کا ثابت کرنا بھی بحیثیت مدعی ہونے کے آپ ہی کا منصب ہوگا کیونکہ یہ بدیہی قاعدہ ہے کہ اگر کسی چیز کے وجود و عدم کے ہونے نہ ہونے کے متعلق نزاع ہو تو اس میں مدعی وجود کا ماننے والا سمجھا جاتا ہے اور بخلاف اس کے اگر گفتگو کسی چیز کے امکان و امتناع (ہو سکنے اور نہ ہو سکنے) میں ہے تو اب مدعی وہ شخص ہے جو اس کو ناممکن اور ممتنع سمجھے۔

اس اعتبار سے اگر میں بغیر کسی مزید توضیح کے یہ کہہ دیتا کہ بعض نبی آدم اور خدائے عزوجل میں بعض ایسے تعلقات ممکن ہیں جو اس کے اور بنی نوع میں نہ پائے جاتے ہوں تو مجھ سے کسی قسم کے مطالبہ دلیل کا استحقاق نہ تھا۔ بلکہ مجھ کو حق تھا کہ میں اپنے ان مخالفوں سے جو ایسے تعلقات کو محال کہتے ہوں حجۃ طلب کروں۔ لیکن میں نے مناظرہ کے پہلو سے درگزر کر کے محض تقریب الی الفہم اور تسکین خاطر اور رفع اضطراب کے لیے ایک

محسوس و مشاہد نظیر بھی اپنے مدعا کی تبرعاً پیش کر دی تاکہ جو لوگ مادیات و محسوسات کے دائرہ سے ایک قدم باہر نکالنے کے خوگر نہیں ہیں وہ بھی ان غیر محسوس تعلقات کی نوعیت سے فی الجملہ واقفیت حاصل کر سکیں۔

یہ ایک اتفاق اور بہت ہی فائدہ مند بات ہوئی کہ جب ہم خالق و مخلوق کی ان پنہانی تعلقات پر بحث کر رہے تھے اور نظیروں اور مثالوں کے ذریعہ سے ان کو دلنشین کرتے جاتے تھے تو اس کے ضمن میں ہم کو چند ایسے اصول و اسباب کے سراغ لگانے کا بھی موقع مل گیا جن پر یہ تعلقات واقع میں متفرع ہوتے ہیں کیونکہ ہم نے یہ جان لیا کہ ان تعلقات خاصہ کی بنا اس قرب و مناسبت پر ہے جو کسی انسان کو خدا تعالیٰ سے اپنی روحی لطافت میں کامل ہو اخلاق حمیدہ سے متصف ہونے کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے اور اس لئے ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ جو شخص ان اعلیٰ اوصاف کے ساتھ موصوف راستی کا حامی اور کمینہ اخلاق و ذمائم سے محترز ہوگا اس کو بعید نہیں کہ بسبب قرب روحانی کے خدائے عزوجل کی جانب سے اندرونی طور پر اس قسم کے افاضات خاصہ ہوتے ہوں جو اس کے دوسرے بنی نوع کو نہ ہوں۔ خدائے اقدس نے اپنے کمالات کا اس کو آئینہ بنا لیا ہو اور اسی بشان مرآتیت کی وجہ سے اس کے دل میں خدا تعالیٰ کے نہایت غامض اور دقیق مافی الضمیر بھی منعکس ہو جاتے ہیں۔

اگر فرض کر و کہ ہم کو دنیا میں کسی معتبر ذریعہ سے ایسے ایک یا چار آدمیوں کے وجود کا پتہ لگ گیا جن میں یہ صفات اعلیٰ اور اکمل حیثیت کے اندر پائے جائیں تو یقیناً یہی لوگ ہماری ان بیمار عقلوں کے درد کا درمان بن سکیں گے

جن کے مرض کا مفصل تذکرہ ہم پیچھے ذکر کر چکے ہیں اور جن کی نسبت ہم نے کہا تھا کہ وہ مبتلائے امراض رہنے کی وجہ سے اپنے نیک و بد اور نافع و مضر میں اسی طرح صحیح تفریق نہیں کر سکتے جس طرح ایک بیمار آدمی بخار کی وجہ سے عمدہ عمدہ کھانوں کو برا سمجھنے لگتا ہے جو اس کو طبعاً مرغوب ہیں اور دنبل کی گلن یا خارش کی نوچ میں اپنے بدن کے تراشنے اور کھال کی نوچنے پر بے اختیار مائل ہو جاتا ہے۔ حالانکہ وہ حالت صحت میں اس حرکت کو ہرگز عزیز نہیں رکھتا تھا۔

یہ اس خدائے بے نیاز کا بہت بڑا احسان ہے کہ میں نے جس مقصد کے ثابت کرنے کے واسطے چلنا شروع کیا تھا یہاں پہنچ کر میں نے اس کو پا لیا اور حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر کے آغاز سے انجام تک حسب ذیل نتائج برآمدہ ہوئے۔

(۱) افعال انسانی میں نیک و بد کی تقسیم ہر فرد بشر کو خواہ وہ کوئی مذہبی آدمی ہو یا دہری ماننا ضروری ہے۔

(۲) عقل سلیم جس کام کو اچھا یا برا بتلائے وہ ویسا ہی ہوتا ہے اور شریعت کے احکام بھی عقل سلیم کے مطابق ہوتے ہیں۔

(۳) عقل اور قوۃ عملیہ میں ایسا ربط خاص ہے کہ ان میں سے ہر ایک کا اثر دوسرے تک پہنچتا ہے اور حرکات ناشائستہ اور افعال ذمیمہ کا کسی شخص سے سرزد ہونا اس کی دلیل ہے کہ اس کی قوت علمیہ (عقل) مریض یا کمزور ہے۔

(۴) عقل سقیم (مریض) جس شے کو نافع یا مضر بتلائے اس پر اطمینان

نہیں ہو سکتا اس بارہ میں عقل سلیم درکار ہے۔

(۵) ہر ایک چیز کے حسن و قبح سے کما حقہ خدا تعالیٰ ہی واقف ہو سکتا ہے۔ یا وہ شخص جس کو خدا تعالیٰ محض اپنے فضل و عنایت سے جس حد تک واقف کر دے۔

(۶) خدا تعالیٰ کے فیوض و عنایات خاصہ سے ہر ایک انسان بقدر اپنے قرب و مناسبت کے مستفید ہوتا ہے۔

(۷) جس قدر کوئی عقل لطیف یعنی نفسانی آلائشوں اور مادی کثافتوں سے پاک و صاف ہو کر اعلیٰ سے اعلیٰ اخلاق کے ساتھ مزین ہو گی اسی قدر اس کو خدائے عزوجل سے قرب و تعلق حاصل ہو گا اور ایسی ہی عقلوں کو ہم عقول سلیمہ کے نام سے یاد کرنے کے مستحق ہوں گے۔

ان صاف و صریح مگر مہتم بالشان نتائج کے سمجھ لینے کے بعد صرف یہ ہی نفع نہیں ہوا کہ ہم اپنے ایک خاص مقصد میں بقدر ضرورت کامیاب ہو گئے بلکہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر پر جو کچھ نکتہ چینیاں پہلے کی گئیں تھیں ان میں سے اکثر کا جواب بھی ضمناً اسی بیان سے نکل آیا۔ چنانچہ جن ناظرین کو امام ممدوح کی تقریر اور اس کے متعلق شبہات یاد ہونگے وہ خود ہماری پوری تقریر پر مکرر نظر ڈال کر امید ہے کہ ہر ایک شبہ کا جواب دریافت کر لیں گے

○ البتہ سر سید کے اس اعتراض کا کوئی جواب ہماری مضمون میں ابھی تک نہیں آیا کہ جب عموماً لوگوں کی عقلیں مبتلائے امراض رہنے کی وجہ سے صحیح و فاسد اور نیک و بد میں تمیز نہیں کر سکتیں اور نہ وہ ہر ایک بھلے برے کے

پہچاننے کے واسطے کافی ہیں تو ہمکو خدا تعالی کی جانب سے احکام شرعیہ کا مکلف بنانا کیونکر صحیح ہوا حالانکہ انسان اپنے ذیعقل ہونے ہی کی وجہ سے تمام حیوانات کے برخلاف شرعیات کا مخاطب قرار دیا گیا ہے۔

اس کا جواب مختصراً تو صرف اتنا ہی ہے کہ شریعت نے جن چیزوں کے سمجھنے یا کرنے کی جس حد تک تکلیف دی ہے ان میں سے کوئی چیز بھی ہمارے احاطۂ قدرت سے خارج نہیں ہے اور ہمارے ذی عقل ہونے اور اپنے ابنائے جنس سے ممتاز بننے کا یہ نفع کافی ہے کہ ہم خدا کی خدائی اور رسول کی رسالت پر مطلع ہو کر اپنے جملہ ارادات اور حرکات و سکنات کی باگ ان دونوں کے ہاتھ میں دیدیں۔ اور اجمالاً یہ جان لیں کہ جن دونوں کی صداقت کا ہم کو یقین ہو چکا ہے وہ بلاشبہ ہمارے کامل خیرخواہ اور کامل حکمت والے ہیں۔ اور ان کی ہر ایک چھوٹی سی چھوٹی تعلیم پر کاربند ہونا ہمارے لئے فلاح و سوز مندی سے خالی نہیں ہے۔

اگرچہ ہم ان کل احکام کی یا ان میں سے بعض کی تفصیلی حکمتوں اور مصالح پر مطلع نہ ہو سکے ہوں۔ اور یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ ایک ماہر ڈاکٹر جب کسی دوا یا غذا کے متعلق مفید یا مضر ہونے کا فتوی دیتا ہے تو ہم خواہ اس چیز کے خواص و کیفیات بلکہ نام سے بھی صحیح اور پر آشنا نہ ہوں اور خواہ جس کے استعمال کا وہ حکم دیتا ہے اس سے نفرت اور جس سے وہ منع کرتا ہے اس کی طرف رغبت بھی ہو مگر ڈاکٹر کی تجربہ کاری اور بہی خواہی پر اعتماد کر کے جس کو ہم نے محض ایک کمزور اور ضعیف گمان کے ساتھ تسلیم کر رکھا ہے۔ ہم اس دوا یا غذا

کے استعمال کی نسبت اپنا سابق رویہ بدل ڈالتے ہیں اور اس تبدیلی کے وقت بچاری عقل کی ایک بھی نہیں سنتے بلکہ یوں تاویل کر کے تسلی کر لیتے ہیں کہ عاقلوں کی پیروی بھی در حقیقت عقل کی ہی پیروی ہے تو اس حیثیت سے گویا ہم نے عقل کے اشارہ کے بغیر کوئی جنبش نہیں کی۔

یہی حال بعینہ مذہب و شریعت کا ہے۔ لیکن ہم کو تعجب کے ساتھ افسوس ہوتا ہے کہ سرسید نے ایک نرالی منطق سے اور عجیب گول مول الفاظ میں لوگوں کے دلوں سے ہمارے اس صحیح خیال کو مٹانا یا کم از کم سست کر دینا چاہا ہے جس جگہ وہ یہ لکھتے ہیں کہ:۔

"ہمارا یہ اصول نہایت سچا ہوا ہے کہ انسان صرف بسبب عقل کے جو اس میں ہے مکلف ہوا ہے پس جس بات پر وہ مکلف ہو گا ضرور ہے کہ فہم انسانی سے خارج نہ ہو ورنہ معلول کا وجود بغیر علت کے لازم آتا ہے جو محال و ممتنع ہے پس جن اخلاق کے پکڑنے اور چھوڑنے پر انسان مکلف ہے وہ ضرور عقل انسانی سے خارج نہیں"

(تہذیب الاخلاق جلد دوم مطبوعہ لاہور۔ مضمون کانشنس ص۱۲۳)

میرا یہ سوال سرسید سے یہ کہ جس عقل کو وہ تکلیف شرعی کے واسطے علت قرار دیتے ہیں اس سے کیا مراد ہے۔ آیا فقط قوۃ ادراک کا انسان میں موجود ہونا یا اس سے ہر ہر چیز کو تفصیلاً جاننا۔ اگر پہلی صورت اختیار کی جائے تو بعض احکام و اخلاق کے فوائد و علل پر مطلع نہ ہونے سے علت و معلول

میں جدائی کس طرح لازم آئی اور اگر خدانخواستہ سرسید نے دوسری شق کو لیا ہے تو میں تسلیم نہیں کرتا کہ جو علت تکلیف کی سرسید نے قرار دی ہے وہ صحیح ہے اور آپ حیرت کریں گے جب یہ سنیں گے کہ میں اس شق کو تسلیم نہیں کرتا خود سرسید بھی اس کے اعتراف کرنے پر تیار نہیں ہیں۔ چنانچہ اسی مضمون کے دوسرے حصہ میں وہ لکھتے ہیں۔

اس بیان سے جو ظاہرا بالکل سیدھا اور صاف ہے اور کچھ اور پیچ اس میں کچھ نہیں ہے اتنی بات ثابت ہوتی ہے کہ کانشنس فی نفسہ کوئی چیز نہیں ہے اور نہ وہ کسی مذہب کا اصل اصول قرار پانے کے لائق ہے اور نہ وہ فی حد ذات رہنما ہونے کے مستحق ہے۔ ہاں بلاشبہ سچے اصول پر انسان کی طبیعت تربیت پا جائے یا سچے خیالات سے اس کی طبیعت موثر ہو جاوے اور طبیعت سچائی کے مطابق حالت پیدا کر لے تب وہ حالت طبیعت یعنی کانشنس انسان کا رہنما ہوتا ہے۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔ (ایضاً تہذیب الاخلاق صفحہ ۱۱)

ہاں یہ سچ ہے کہ قانون قدرت پر غور اور فکر کرنے سے وہ صحیح اخلاق جو انسان کی طبیعت کو ایسی حالت پر کر دیں جو کبھی دھوکہ نہ دے دریافت کر سکتے ہیں مگر کب جب کہ انسان کی معلومات کو ایک کافی ترقی اور قوانین قدرت پر اور ان مختلف قویٰ کے اوپر جو اس کے بانی نے انسان میں رکھے ہیں ایک معتدبہ آگاہی

حاصل ہو تمام انسان ان وقائق پر نہیں پہنچ سکتے اور جو پہنچ سکتے ہیں وہ معدودے چند کے سوا نہیں ہو سکتے اور وہ بھی نہ اپنی عمر میں بلکہ پشتوں در پشتوں اور صدیوں در صدیوں میں پس اس لئے تاکہ اس قادر مطلق کی حکمت بیکار نہ رہے ضرور ہوا ہے کہ وقتاً فوقتاً ملک اور زمانہ کی حالت کے لحاظ سے ایسے ہادی پیدا کئے جائیں جنہیں خلقی ایسا مادہ دیا گیا ہو اور جو اعتبار اپنی فطرت کے ان سچے اخلاق کے بیان کا مخزن ہو۔" ایضاً ص ۱۳۳

ان دونوں عبارتوں سے بھی اور ان کے اور بعض تصریحات سے بھی یہ ثابت ہو گیا کہ جملہ احکام شرعیہ کے لم اور علت کو سمجھ لینا گو مطلق عقل انسانی سے خارج نہیں ہے۔ لیکن ہر عقل شخصی کا یہ منصب بھی نہیں کہ ہر ایک حکم کی حقیقت اور کنہ کے سمجھ لینے کا وہ دعویٰ کر بیٹھے۔ تو سرسید کے اصول کے موافق سوال یہ ہے کہ سوائے ان معدودے چند انسانوں کے جو وقائق شریعت سے خبردار ہوں (جیسا کہ سرسید بزعم خود تھے) اور لوگوں کو جو ایسے نہیں ہیں مکلف بنانا کیوں کر صحیح ہوا حالانکہ جن باتوں کے کرنے یا چھوڑنے پر ان کو برانگیختہ کیا جاتا ہے وہ ان کی عقل شخصی سے یقیناً خارج ہیں۔

پس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا کہ ہم گرفتاران ہوا و ہوس اور مریضان عقل اور اک ان ارباب عقول سلیمہ کو جن کے کچھ کچھ اوصاف ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں اطبائے روحانی سمجھ کر اپنے لئے کم از کم اسی طرح موت دائمی اور ہلاکت ابدی سے نجات دلانے والا تصور کر لیں جیسا کہ ایک جاہل بیمار جو بغرض تداوی

اہل سنت والجماعت ان کے ساتھ متفق ہیں۔

اختلافی مسائل میں عدم تشدد

اور یہی وجہ تھی کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے عہد مبارک میں کوئی صحابیؓ دوسرے پر مسائل اجتہادیہ میں اختلاف رکھنے کی وجہ سے ملامت یا طعن وتشنیع نہیں کرتا تھا اور تضلیل یا تبدیع تو کجا ایک کی طرف سے دوسرے کی تاثیم بھی نہ ہوتی تھی بلکہ ایسے اختلافات کو توسع اور رحمت جان کر ایک دوسرے کے ساتھ نہایت رواداری کا برتاؤ کرتے تھے خود احناف کی کتابوں میں بجز ایسی صورتوں کے جس میں فساد صلوۃ کا مظنہ غالب ہو اقتداء حنفی کی شافعی کے پیچھے اور شافعی کی حنفی کے پیچھے جائز رکھی گئی ہے اور بعض بعض مسائل ہیں جہاں فقہائے نے اُن کو شرعاً رخصت اور تیسیر کی ضرورت محسوس ہوئی ہے دوسرے آئمہ کی آراء کو معمول بہا بنایا گیا ہے۔ کیونکہ کسی خاص امام کی تقلید کے لازمی معنی اگرچہ اس امام کے مذہب کو صواب اور راجح کہنا ہے لیکن پھر بھی احتمال خطا کا اعتراف اور دوسرے امام کے اجتہاد کے متعلق احتمال ثواب کی تصریح موجود ہے، اگر خاص خاص شرعی مصالح جن کا ادراک فقہاء کرسکتے ہیں۔ اس طرف داعی ہوں کہ بعض مسائل ہیں دوسرے ائمہ کے مذاہب پر فتویٰ دیا جائے تو آخر پھر اس احتمال خطا و ثواب سے فائدہ اٹھانے کا اور کون سا موقعہ ہے۔

مذاہب اربعہ حق ہیں

اس لئے یہ خوب محفوظ رکھنا چاہیئے کہ باوجودیکہ حق عنداللہ کے اعتبار

سے ہر ایک مسئلہ میں کوئی ایک ہی مجتہد و مصیب ہوتا ہے لیکن عملاً سب حق پر ہیں یعنی حق تعالیٰ شانہٗ نے یہ وسعت دی ہے کہ یہ مجتہد اپنے اجتہاد کے اوپر عمل کرے اگرچہ اس کا اجتہاد باوجود پوری کوشش کے ٹھیک نشانہ پر نہ بیٹھا ہو۔ تمثیلاً یوں سمجھو کہ کعبہ نفس الامر میں ایک معین مکان کا نام ہے اور اسی کا استقبال شریعت نے نماز میں ضروری قرار دیا ہے فول وجھك شطر المسجد الحرام لیکن جس وقت سمت کعبہ ٹھیک معلوم نہ ہو تو بعد تحری کے جو سمت معین ہو اُسی کا استقبال قبول صلوۃ کے لئے کافی سمجھا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ ہماری تحری جس طرف ہو ضروری نہیں کہ نفس الامر میں خانہ کعبہ بھی اسی طرف منتقل ہو جائے پس یہ خدا کی رحمت اور انعام ہے کہ اگرچہ واقع میں مستقبل قبلہ وہی شخص ہے جس کا رُخ ٹھیک کعبہ کی طرف ہو مگر تاہم دوسری طرف منہ کرنے والوں کو بھی توسعاً اور حکماً مستقبل کعبہ تسلیم کر لیا گیا ہے تو باعتبار کعبہ نفس الامری اور حکم اولی کے تو فقط ایک ہی شخص مصیب ہے اور سب مخطی لیکن باعتبار قبول صلوۃ اور امتثال امر ثانی کے سب مصیب ہیں۔ یہی مطلب ہے، حدیث اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اہتدیتم کا اگر وہ صحیح طور پر ثابت ہو جائے اور نیز حضرت الشیخ الاجل محدث گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے اس عبارت کا جو سبیل الرشاد صفحہ ۳۲ میں ہے۔

پس ہر چند کہ عنداللہ کل اختلاف میں حق واحد ہوتا ہے مگر عمل میں سب حق ہوتے ہیں الخ اور یہی محمل ہے حضرت امام ابو حنیفہؒ کے اس اشارہ " کل مجتہد مصیب والحق عنداللہ واحد" اور امام ابو یوسفؒ کے اس کلام کا "کل مجتہد مصیب

کے لیے وہ بذات خود بغیر کسی قسم کی فیس اور مالی معاوضہ کے دور دراز کے تعلقات جتلا کر چلا جائے گا۔

اب اس ساری جد وجہد اور دوا دوش میں اگر کچھ بیماروں کی شفا اس کے ہاتھ سے مقدر ہے تو وہ اس کی اولین کامیابی کا باعث ہوگی۔ اور جوں جوں کہ یہ سلسلہ ترقی کرتا جائے گا اسی قدر اس کی عزت اور مقبولیت کو چار چاند لگتے جائیں گے۔ انتہا یہ ہے کہ وہ کچھ زمانہ کے بعد شہرت عامہ کے اس درجہ پر پہنچ جائے گا کہ مریضوں کو اس کے یہاں پہنچنے کے لئے استدلال اور غور وفکر کی ضرورت باقی نہ رہیگی اور عوام کے محاورات میں شفاء وصحت تو اس کے معالجانہ کوششوں کی طرف اور موت وہلاکت خالی بخت واتفاق یا مشیت ایزدی کی طرف منسوب ہونے لگے گی۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ دوسرے طبیبوں کی مقبولیت کا معیار ہی اب اس کی تسلیم وتصدیق قرار پا جائیں گے۔

بعینہ اسی پر اطبائے روحانی (انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام) کے حالات کو قیاس کرو جب وہ عالم کی ہدایت واصلاح کے لئے مبعوث ہوتے ہیں تو سب سے اوّل وہ اپنے من اللہ بشیر ونذیر ہونے کا نہایت زور شور اور تحدی کے ساتھ دعویٰ کرتے ہیں۔ اور اپنی دعوت وتبلیغ کا غلغلہ اہل وعیال اور خویش واقارب سے شروع کر کے مشارق ومغارب میں ڈال دیتے ہیں۔ جس کو سن کر کچھ لوگ تو ان کے سابق چالیس سالہ زہد وریاضت پاک وصاف اخلاق۔ دیانت وراستبازی اعراض عن المال والجاہ شرافت حسب ونسب اور روشن خوارق یا آیات بینات وغیرہ امور کی وجہ سے اور

بہت سے محض از راہ امتحان وتفتیش ہی فطرۃً ان کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ اور بہت سے وہ خوش قسمت ہیں کہ خود انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اپنی قوت قلبیہ اور ہمت باطنی کے زور سے باذن اللہ ان کو اپنی طرف جذب کر لیتے ہیں اور اسی اثناء میں جب یہ لوگ روحانی امراض سے یکایک شفایاب ہوتے لگتے ہیں اور ان کے دلوں کی تاریکی دور ہو کر جمال خداوندی کا عکس ان میں پڑنے لگتا ہے تو وہ اپنے ہادی کی نسبت فوراً چلا اٹھتے ہیں کہ:۔

مَا هٰذَا بَشَرًا اِنْ هٰذَا اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ۔

اس وقت ان مریضوں کو بھلا چنگا دیکھ کر اور ان کے حالات سابقہ میں ایسا انقلاب عظیم پا کر اوروں کے دل بھی للچانے لگتے ہیں اور ان کو ان کی صحت کی بحالی پر رشک آنے لگتا ہے پھر تو مخلوق خدا فوج در فوج اور جوق در جوق ہو کر اس پاک بندے کے گرد جمع ہو جاتی ہے اور اپنے اپنے امراض کا مرافعہ اس کی طرف کرتی ہے۔ اور جیسے جیسے کہ یہ سلسلہ وسیع ہوتا جاتا ہے اندھوں کی آنکھیں کھلتی جاتی ہیں اور غافلوں کو عبرت حاصل کرنے کا موقع ہاتھ آتا رہتا ہے اس کے بعد اس کے طبیب حاذق (یا نبی مرسل) سمجھنے کے واسطے نہ کسی استدلال کی ضرورت رہتی ہے اور نہ اس میں بہت زیادہ تدقیق اور غور وخوض کو کام فرمانے کی۔

○ الغرض جس وقت طبیب حاذق (نبی) کی شناخت کے لئے انسان کو اپنے دماغ پر کچھ زور ڈالنے کی ضرورت تھی اس وقت تو چند قدرتی اسباب کی بنا پر یہ شناخت بغیر زور ڈالے ہی حاصل ہو گی اور جب کہ اس کے حذاقت

کے نتائج متشکل ہو کر گویا آنکھوں کے سامنے نمودار ہو گئے ہیں تو اس بحث میں کد و کاوش کی مطلقاً حاجت ہی باقی نہیں رہی ہر شخص ان محسوس و مشاہد نتائج کو دیکھ کر اسی طرح اس کے طبیب حاذق (نبی) ہونے کا یقین کر سکتا ہے جیسا کہ کسی گھر کے صحن میں دھوپ نکلی ہوئی دیکھ کر آسمان پر آفتاب کے نکلنے کا۔

اور اس بدیہی بلکہ اجلی البدیہیات کے سمجھنے کے واسطے انسان میں ذرا سی عقل بھی خواہ وہ کتنی ہی علیل کیوں نہ ہو کفایت کرتی ہے۔ بشرطیکہ وہ اس سے کام لینے کی کوشش کرے اور حق کے دیکھنے سے جو اس کو چمکنا چاہتا ہے بالکل آنکھیں بند نہ کرے۔ اور جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں ارباب عقول سقیمہ سے یہ مطلب ہمارا ہرگز نہیں ہے کہ ان میں کسی موٹی اور روشن سی روشن بات کے سمجھنے کی بھی قابلیت باقی نہ رہی ہو اور محسوسات کی ادراک کی استعداد بھی ان سے سلب کر لی گئی ہو۔

تم خود خیال کرو کہ کسی تجربہ کار طبیب کے ہاتھ پر تپ کہنہ کے پانچ چار مریض دجو زندگانی سے مایوس ہو چکے ہوں، شفایاب ہو جائیں تو گھر گھر میں اس کا چرچا پھیل جاتا ہے اور دور دراز شہروں کے مایوس العلاج بیمار اس کی طرف رجوع کرنے لگتے ہیں اب اگر فرض کرو کہ ایک طبیب کے دست شفا سے کوئی بستی کی بستی یا ملک کا ملک تپ کہنہ سے صحت یاب ہو جائے تو اس کی طرف لوگوں کی توجہ کیا کسی منطقی استدلال کے محتاج رہے گی۔

○ مثلاً سرخیل اطبائے روحانی جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم جیسا کہ ہم نے

اپنے رسالہ الاسلام[1] میں نہایت مفصل بیان کیا ہے اور یہاں پر مختصراً ہم اپنے زمانہ کے ایک (اصطلاحی) روشن خیال مؤلف کے الفاظ میں لکھتے ہیں) ایک ایسے زمانہ میں پیدا ہوئے جبکہ دنیا ایک عجیب روحانی سکتے کی حالت میں تھی۔ اور آپ ایسے ملک میں مبعوث ہوئے جہاں اخلاق تعلیم کا کچھ سامان نہ تھا اور ایسی قوم کی اصلاح آپ کے ذمہ کی گئی جو سوائے اوہام اور فاسد عقیدوں اور باطل خیالات اور غلط رایوں اور وحشیانہ اعمال اور بد اخلاق اور نفاق اور جنگ جوئی کے کسی قسم کی اخلاق خوبی نہ رکھتے تھے مگر آپ کے الہامی بیان اور خدائی قوت نے ان پر ایسی عجیب و غریب تاثیر کی کہ اس سے ان کی تمام ظاہری و باطنی حالتیں بدل گئیں برسوں کے بہکے ہوئے خدا کی راہ پر چل نکلے اور مدتوں کے سوتے ہوئے غفلت کی نیند سے چونک پڑے جو مشرک تھے وہ موحد ہو گئے جو کافر تھے ایمان لائے جو بت پرست تھے وہ بت شکن بن گئے جو گمراہ تھے وہ خدائی راہ دکھانے لگے۔ جاہلانہ حمیت اور وحشیانہ عصبیت کا ان میں نام نہ رہا۔ خاندانی جھگڑے اور پشتینی عداوتیں جاتی رہیں دماغ غرور و نخوت سے خالی ہو گئے اور ان کے دل صبر و توکل۔ حلم و بردباری۔ زہد و پرہیزگاری اور جمیع اخلاقی صفات سے بھر گئے۔ آپ کی تعلیم و ہدایت نے ایک ایسا گروہ خدا پرست پاک طبیعت راستباز نیک دل لوگوں کا قائم کر دیا۔ جن کی کوششوں سے شرک و بت پرستی کی آواز جو تمام جزیرہ نمائے عرب میں گونج رہی تھی بند ہو گئی اور اس کے بدلے ایک بیچون و بیچگون بے شبہ دبے نموں خدا کی منادی پھر گئی۔ بتوں نے عدم کا راستہ لیا۔ بت خانوں کا نشان مٹ گیا آتشکدے

[1] یہ رسالہ آپ ادارہ اسلامیات لاہور انارکلی سے طلب فرما سکتے ہیں۔

ٹھنڈے پڑگئے تثلیث کا طلسم ٹوٹ گیا اوہام پرستی کا باطل خیال باطل ہوگیا

جاء الحق وزھق الباطل	حق نکل آیا اور باطل مغلوب ہوا بلاشبہ باطل مغلوب
ان الباطل کان زھوقاً	ہی ہوکر رہتا ہے۔

کیا اس سے اس امر کا مشاہدہ اور درخشاں ثبوت نہیں ملتا کہ آپ حقیقت میں سچے رسول (طبیب حاذق)، اور خدا ہی کی طرف سے مؤید تھے ورنہ انسان کا کام نہ تھا کہ وہ ایسا انقلاب عظیم عرب کی روحانی اور اخلاقی حالت میں پیدا کردیتا اور ایسے جنگ جو ستم پیشہ لوگوں کو جو بات بات پر لڑتے اور جھگڑتے تھے۔ اخوۃ کے ایک رشتہ میں باندھ دیتا اور ان کی پشتینی علاوتوں اور کینوں سے ان کے دلوں کو ایسا صاف کردیتا کہ اس کا کچھ اثر باقی نہ رہتا بلکہ دنیا میں اخلاق اور انسانیت کا نمونہ بنادیتا۔

سرورِ کائنات صلے اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کی ایسی عجیب وغریب تاثر اور ایسی حیرت انگیز نتائج کو دیکھ کر منکرین بھی اس بات کے معترف ہیں کہ درحقیقت یہ بات بشری قدرت سے خارج تھی چنانچہ کوئی ان میں سے کہتا ہے کہ "وہ پیام جو آپ لائے وہ ایک سچا اور حقیقی پیام تھا جسکا مخرج وہی ہستی تھی جس کی تھاہ کبھی کسی نے نہیں پائی" کوئی لکھتا ہے "قرآن ہی کی تعلیم کا یہ اثر ہے کہ عرب کے رہنے والے ایسے بدل گئے جیسے کسی نے سحر کردیا ہو" متعصب سے متعصب عیسائیوں میں سے سخت سے سخت متعصب یہ اقرار کرتا ہے کہ "دین مسیحی کی ابتداء سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت تک کبھی حیاتِ روحانی ایسی برانگیختہ نہیں ہوتی تھی جیسی کہ اسلام کی تعلیم سے ہوئی"

کچھ کیا ایسی واشگاف ثبوتوں اور کھلی کھلی دلیلوں کے بعد بھی کوئی محروم البصیرۃ ایسا نکلے گا جو باوجودیکہ اپنے کو مریض سمجھتا ہو اور کسی نباض اور ماہر طبیب کی طرف رجوع کرنے کا خواہش مند بھی ہو۔ لیکن طبیب عرب (نہیں بلکہ طبیب عرب وعجم) کے ان چمکتے ہوئے کارناموں سے منہ پھیر لے۔ اور اس کی تجویز اور تشخیص کے سامنے (جو لاریب خدا ہی کی تجویز وتشخیص ہے) بے چون وچرا اور بے ریب وتردد گردن نہ ڈالدے اور کم از کم تجربہ ہی کے طور پر اس کے بتلائے ہوئے تدابیر ومعالجات و پرہیز پر چند روز عمل کرکے نہ دیکھے۔

○ ایسے ہی کور باطنوں کی نسبت (جو ابھی تک اس طرح کی بدیہی صداقت کے تسلیم کے واسطے نہایت پیچیدہ اور دور از کار مسائل ودلائل کی تلاش میں فضول سرگرداں رہ کر عمرِ عزیز ضائع کر رہے ہیں اور دن سے زیادہ روشن واقعات کی طرف آنکھ نہیں اٹھاتے)، عارف باللہ حضرت شیخ محی الدین ابن العربی قدس اللہ سرہٗ ارشاد فرماتے ہیں کہ:۔

"ہمارے نزدیک سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ انسان (ہر بات میں)، خدا کو چھوڑ کر محض اپنی نظر وفکر کی ہی تقلید کرے حالانکہ وہ جانتا ہے کہ اس کی یہ فکر بھی خود اس ذات کی طرح ایک امر حادث اور مخلوق ہے اور ان قوی میں سے ایک قوۃ ہے خدائے تعالیٰ نے انسان کے اندر ودیعت کی ہیں۔ (اُسے معلوم ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے قوۃ مفکرہ کو عقل انسانی کے واسطے ایک خادم بنایا ہے (لیکن اس پر بھی)، عقل خود اس کی (خادم بن کر) پیچھے ہو لیتی ہے۔

باوجودیکہ وہ یہ بھی جانتی ہے کہ وہ قوۃ مفکرہ جو کچھ اس کو عطا کرتی ہے وہ اس میں اپنے حدود مرتبہ سے ذرا بھی تجاوز نہیں کر سکتے اور اس سے عاجز ہے کہ کسی دوسری قوۃ کی سرحد میں قدم رکھ سکتے مثلاً قوۃ حافظہ یا مصورہ کا کام اس سے نکل سکے یا قوت متخیلہ کے قائم مقام بن سکے یا حواس خمسہ (لمس طعم شم۔ سمع۔ بصر) میں سے وہ کسی ایک کے فرائض کو انجام دے سکے۔

○ یہ سب کچھ ہے اور قوت مفکرہ کی محدود اختیارات کی یہ تنگی بھی سب کو معلوم ہے۔ مگر اس پر بھی یہ کس قدر حیرت انگیز بات ہے کہ عقل انسانی اپنے پروردگار کی معرفت کے بارہ میں اسی فکر ناقص کی تقلید پر اڑی ہوئی ہے اور اس کا پروردگار خود جو کچھ اپنی کتاب میں اور اپنے رسول کی زبانی اپنی نسبت بیان فرماتا ہے اس کی تقلید سے برابر کتراتی ہے۔

عالم میں جو غلطیاں مختلف طرح کی پھیلی ہوئی ہیں یہ عقل کی یہ غلطی ان سب میں عجیب تر ہے اور تماشہ ہے کہ سوائے ان معدود لوگوں کے جن کی بصیرت کی آنکھیں خدا تعالیٰ نے روشن کر دی ہیں ہر صاحب فکر اسی عام غلط کاری میں مبتلا ہے۔ ہاں ارباب بصیرت خوب جانتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ نے ہر چیز کی ایک خاص فطرت بنائی ہے اور اسی خاص فطرت کے اعتبار سے اس شے کی عمل و حرکت کی حد بندی کر دی ہے (مثلاً قوت سامعہ (یا کانوں) کی فطرت مسموعات (آوازوں) کے ادراک سے تجاوز نہیں کر سکتی۔ اور عقل انسانی فقط اسی حلقہ میں اس کی محتاج اور آوازوں کی شناخت حروف کے قطع و برید۔ الفاظ کے تغیرات اور لغات کی تقسیم میں اُس سے امداد کی طالب ہے۔ چنانچہ عقل

انسانی قوۃ سامعہ ہی کے ذریعہ سے پرندوں کے چہچہے۔ ہواؤں کی سائیں سائیں کواڑوں کی چوں چوں۔ پانی کی خرخر۔ انسان کی چیخ وپکار اور دوسرے جانوروں کی بولیوں میں تفریق کرتی ہے ورنہ عقل انسانی میں بجائے خود یہ قدرت کہاں کہ بغیر توسط سمع کے ان چیزوں کے باہمی امتیازات کو قایم رکھ سکے۔

اسی طرح قوۃ باصرہ (آنکھوں) کو خیال کرو کہ اس کا دائرہ عمل محض مبصرات (دکھائی دینے کے قابل چیزوں) تک محدود ہے یعنی عقل کو اس کی امداد کے بغیر سبزی کو زردی سے اور زردی کو سفیدی سے اور سفیدی کو سیاہی سے اور اسی طرح ہر ایک رنگ کو دوسرے رنگ سے جدا کرنا عادۃً ممکن نہیں ہے۔ اور یہی حال ان دونوں کے ماسوا دوسری ان تمام قوتوں کا ہے جو حواس کے نام سے مشہور ہیں۔ اور نیز قوت خیالیہ کا جس کو اپنی کارگزاری میں حواس خمسہ کی احتیاج ہے۔ کیونکہ تخیل فقط ان چیزوں کے ساتھ ہی متعلق ہو سکتا ہے جو حواس کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہیں علیٰ ہذا القیاس قوۃ حافظہ اگر خیال کی حاصل کی ہوئی اشیا کو روک نہ رکھے تو خیال کے خزانہ میں کچھ بھی باقی نہ رہے اس حیثیت سے جیسا کہ وہ حواس خمسہ کا محتاج ہے۔ ایسے ہی قوۃ حافظہ سے بھی بے نیاز نہیں۔ پھر قوت حافظہ کو بہت سے ایسے مواقع پیش آتے جو اس کے اور خیال کے درمیان حائل ہو کر قوت حافظہ کی ضعف اور اس سے امور کثیرہ کے فوت ہونے کا باعث بن جاتے ہیں۔ اس لیے ایک قوۃ مذکرہ کی حاجت ہوتی۔ قوت حافظہ کی مددگار بن کر اس کو وہ باتیں یاد دلا دیا کرے جن سے ذہول ہو گیا ہو۔

ان سب کے بعد قوت مفکرہ خیال کی طرف متوجہ ہوتی ہے تاکہ قوۃ مصورہ کے توسط سے خیال کے حاصل کردہ امور کو اس طور پر ترکیب دے کہ اس سے کسی دعوی کے متعلق ایسی دلیل پیدا ہو جاوے جس کی انتہا ان محسوسات اور بدیہات پر ہوتی ہو جو آدمی کی جبلہ میں مرکوز ہیں اس طرح سے جب فکر دلیل کو ایک اچھی طرح صورت پر قائم کر دیتا ہے تو اب عقل انسانی اس بنی بنائی چیز کو لے کر دعوی پر منطبق کر دیتی ہے۔

لیکن وہاں سے یہاں تک پہنچنے میں جتنی قوتوں کو کچھ بھی دخل رہا ان میں سے کوئی ایسی نہیں جس کے کام میں بہت سے موانع اور بہت قسم کی غلطیوں کا مساغ نہ ہو اور جس کیلئے کسی ایسے معیار کی ضرورت نہ پڑے جو صحیح کو فاسد سے اور مغز کو پوست سے جدا کر سکے۔

پس تم غور کرو کہ عقل فی ذاتہ کس قدر جاہل کیسی بے بس اور دوسری قوتوں کی کتنی حاجتمند ہے اور ان قوتوں میں سے ہر ایک کو جو اغلاط پیش آتے ہیں اور جہاں تک کہ اس کے دائرہ عمل کی تحدید کی گئی وہ بھی سب پر روشن ہو چکی لیکن اس پر بھی جب اس کو کوئی بات اس مخدوش اور پر خطر طریق سے بہت سی ٹھوکریں کھا کر حاصل ہوتی ہے اور اس کے مقابلہ میں دوسری جانب خود خداوند رب العزۃ کوئی خبر دیتا ہے تو یہ کہہ کر وہ خدا کی بتلائی ہوئی بات کو ٹال دیتی ہے کہ میرا غور و فکر اس کو رد کر چکا ہے۔

اللہ اکبر یہ عقل خدا تعالی کے مرتبہ سے کس قدر جاہل ہے کہ اس نے اپنے فکر ناقص کی تقلید میں خدا تعالی پر جرح کرنے کو آسان سمجھا۔ حالانکہ تم پہلے

سمجھ چکے ہو کہ عقل کے پاس بجائے خود کسی طرح کا اور کسی شے کا بھی علم موجود نہیں اس کا کام محض حواس خمسہ۔ قوۃ خیالیہ۔ قوۃ مصورہ اور علی ہذا القیاس دوسری قوتوں کی عطا کئے ہوئے علوم کو قبول کرنا ہے تو ایسی حالت میں اس کے لیے نہایت ہی مناسب تھا کہ وہ بجائے قوت فکریہ وغیرہ اپنے خدام کے سامنے دست سوال دراز کرنے اور ان کے عطایا قبول کرنے کے اپنے آقا۔ رب العزۃ کے روبرو ہاتھ پھیلاتے اور اسی کی بخششوں کو لے کر سر اور آنکھوں پر رکھتے۔

اور جب کہ اسے معلوم ہے کہ اس کا فکر خیال کا مقلد ہے اور خیال حواس خمسہ کا اور اس کے ساتھ ہی اس کو اپنی امداد کے لیے قوۃ حافظہ اور ذکرہ کی بھی حاجت ہے اور یہ بھی علم ہے کہ یہ تمام قوی اپنی اپنی سرحد فطرۃ اور دائرہ عمل سے باہر ایک قدم نہیں رکھ سکتے (مثلاً خوبصورت بدصورت کے ادراک میں کانوں سے کام نہیں چل سکتا اور آوازوں کے بُرے بھلے کو آنکھیں نہیں سمجھ سکتیں خوشبو اور بدبو کا امتیاز زبان کے حدود عمل سے خارج ہے اور تلخ و شیریں کی تفریق سے ناک کو کوئی سروکار نہیں اور علی ہذا القیاس خود عقل کو اپنی ذات کے اعتبار سے ان چند ضروریات کی سوا جن کا علم فطرۃً ہوتا ہے اور کوئی چیز معلوم نہیں، تو بھلا تمام قوتوں کے اس طرح کی تنگ میدانی اور بیچارگی کے باوجود بھی کیا وجہ ہے کہ ہماری عقل اس شخص کے قول کو قبول نہیں کرتی جو انسان میں قوۃ مفکرہ کے سوا ایک اور ایسی قوت کا قائل ہے جس کے احکام قوۃ مفکرہ کے احکام سے بالاتر ہوں اور

جس کو ان طریقوں کے استعمال کرنے سے جو اس فن کے تجربہ کاروں نے لکھے ہیں بموہبت الٰہی اہل اللہ، ملائکہ، انبیاء اور اولیاء کاملین اپنے اندر پاتے ہیں اور کل کتب سماویہ جس کے وجود کی خبر دینے میں بآواز دہل ناطق ہیں۔

○ اس لئے تم کو چاہیئے کہ اخبار الٰہیہ کے ماننے میں اپنے عقول ناقصہ سقیمہ کی کچھ پرواہ نہ کرو اور مخلوق کے مقابلہ میں خالق کی تقلید کو بہتر سمجھو کیونکہ کثیر التعداد انبیاء و اولیائؑ نے انہیں چیزوں کو قبول کیا اور انہیں پر وہ ایمان لائے۔ اور انہیں کی تصدیق کی۔ اور ہمیشہ وہ اسی کو پسند کرتے رہے کہ اپنے رب کی معرفت میں خود اسی کی تقلید کرنا اپنے اوہام و افکار کی تقلید سے اولیٰ و انفع ہے۔ پھر اور عقلمند بن کر اخبار الٰہیہ سے انکار کرنے والے تجھ کو کیا ہوا کہ خدا کے بارے میں تو خود خدا کی اور اس کے برگزیدہ بندوں کی نہیں سنتا اور اپنے خیالات کے پیچھے پڑا پریشان ہو رہا ہے؟؟

دیکھو جب یا ایھا الذین آمنوا آمنوا کے سننے والوں کو یہ معلوم ہوا کہ علاوہ اس ایمان کے جو دلائل و افکار سے ہم کو حاصل ہو چکا کوئی دوسرا ایمان بھی مطلوب ہے تو انہوں نے معاً ریاضت خلوۃ اور مجاہدہ کا طریق اختیار کیا اور خدا کو فراموش کرانیوالے تعلقات کو یک لخت منقطع کر کے دنیا میں رہ کر ہی وہ دنیا سے الگ ہو بیٹھے۔ اور دل کو سب جھگڑوں سے خالی اور قلب کو شوائب افکار سے پاک کر کے خالص خدا کی طرف متوجہ ہوئے۔ کیونکہ انبیاءؑ و مرسلین سے یہ ہی راستہ ان کو معلوم ہوا تھا اور انہوں نے سن رکھا تھا کہ بندہ جب سارے دل سے خدا کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو حق تعالیٰ بھی اس پر اپنی

مہربانی اور رحمت کا سایہ ڈالتا ہے اور اپنے دامن عطوفت میں لے لیتا ہے اس سے انہوں نے سمجھ لیا کہ خدا کی طرف جانے والوں کے لئے فکر کے راستے سے یہ راستہ زیادہ نزدیک ہے کیونکہ خود خداوند رب العزت نے اپنے رسول کی زبان سے یہ منادی کرادی کہ جو کوئی ہماری طرف لپک کر آتا ہے ہم اس کی طرف دوڑ کر جاتے ہیں۔ اور یہ کہ نہ آسمان میں نہ زمین میں۔ بلکہ فقط قلب مومن میں یہ وسعت ہے کہ وہ ہماری عظمت و جلال کا تحمل کر سکے۔

اس بناء پر یہ لوگ اپنے سارے دل سے خدا کی بارگاہ میں متوجہ ہوئے اور تمام قوی و افکار کے دھندوں کو چھوڑ دیا۔ اسوقت خدا تعالیٰ نے اپنے نور و علم صادق کی ایک روشنی ان کے دلوں پر ڈالدی۔ اور ان کو خالص اپنا ہی والا و شیدا بنالیا۔ پھر کیا تھا۔ نظر و فکر کی وہ ساری کمزوریاں کافور ہو گئیں اور خالق اکبر کے ارشادات و قوانین کے سامنے انہوں نے اپنی عقلوں کے تیار کیئے ہوئے قانون کو بھلا دیا۔ آہ

○ تم خود سوچو اور انصاف کرو کہ اگر ہر کس و ناکس اپنی عقل شخصی کے بنائے ہوئے قانون پر چلنے کا مجاز کر دیا جائے جیسا کہ آزاد خیالی کے مدعی آج کل چاہتے ہیں تو دنیا میں کیا کچھ خرابطہ ہو اور ہزاروں لاکھوں تراشیدہ قوانین کی کشمکش میں (جو ہر گروہ اپنے پیمانۂ فکر اور اندازۂ فہم کے موافق تیار کر سکتا ہے) لوگوں کی زندگی کیا کچھ دشوار ہو جائے۔

بہت سے لوگ یہ کہتے ہیں کہ جب عقل و نقل میں مزاحمت واقع ہوا کرے اس وقت ہم کو یہ اختیار رہنا چاہیئے کہ ہم عقل کے احکام کو نقل صحیح

کی تسلیم سے مقدم سمجھیں کیونکہ نقل کے ماننے کا اصل ذریعہ یہی عقل ہی ہے تو خدانخواستہ عقل کو بے اعتبار ٹھہرانے کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم عقل و نقل دونوں کی طرف سے بدگمان ہو گئے ہیں۔

لیکن اس شبہ کا جواب آپ کو ہماری تقریر سابق سے بوجہ احسن معلوم ہو چکا ہے کیونکہ ہم مدلل طور پر بتلا چکے ہیں کہ عقل سلیم و نقل صحیح میں تعارض ہو ہی نہیں سکتا ہاں اگر عقل کی سلامتی یا نقل کی صحت مخدوش ہو جائے تو بیشک ایسا ہونا ممکن ہے مگر اس وقت ہمارا پہلا فرض یہ ہوگا کہ یا تو اپنی عقل کو مرض سے چھڑانے اور سلامتی پر لانے کی کوشش کریں اور یا نقل کے ثبوت کے واسطے کوئی قابل وثوق ذریعہ بہم پہنچائیں۔ وہو منہ خوط القتاد۔

اس جواب کی پوری تفصیل شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ نے اپنی بیش بہا اور ضخیم کتاب* بیان موافقۃ صریح المعقول لصحیح المنقول میں لکھی ہے جس کے جستہ جستہ اقتباسات بھی ہم باوجود قصد کے تطویل کے خیال سے قلم انداز کر کے آخر میں یہ گزارش کرتے ہیں کہ:۔

جو کچھ ہم نے اس مضمون میں یہاں تک بیان کیا ہے اس کا یہ منشا ہرگز نہیں کہ فکر و استدلال ایک محض عبث اور لغو چیز ہے یا اس سے تعرض کرنا کوئی شرعی گناہ ہے لیکن ہاں کسی فرد بشر کے واسطے ہم یہ جائز نہیں رکھتے کہ وہ اپنی عقل شخصی اور فکر ناقص کو اصل اصول ٹھہرا کر انبیاء علیہم السلام کے پاک و

* یہ کتاب اہل مصر نے منہاج السنۃ کے حاشیہ پر طبع کی ہے۔

صاف صحیح و صادق اور بلند و برتر تعلیمات کو زبردستی ان پر منطبق کرنے کی کوشش کرے جس پر اکثر اوقات اس کا ضمیر بھی خود اندر سے نفرین کر رہا ہو۔ اس کے برخلاف نہایت ضروری ہے کہ انسان خدا اور اس کے رسولوں کے ارشادات کو اصل قرار دے کر اپنی عقلی معلومات کو ان کے تابع بنا رے اور جو کچھ وہ فرمائیں اس کو اپنے امراض روحانی کے حق میں اکسیر شفا تصور کر کے سمعاً و طاعۃً کہتا ہوا بلا حجت و تکرار سر اور آنکھوں پر رکھے۔

والذین یحاجون فی اللہ من بعد ما استجیب لہ حجتہم داحضۃ عند ربہم و علیہم غضب و لہم عذاب شدید۔	اور جو لوگ اللہ کے بارہ میں نبی سے جھگڑا کرتے ہیں جبکہ لوگ اسکی بات قبول کر چکے تو ان کی حجت باطل ہے اور ان پر خدا تعالیٰ کا غضب ہے اور ان کیلئے سخت عذاب ہے۔

تنبیہ:۔ جو کچھ ہم نے اس رسالہ میں اپنے نزدیک اختصار جامع اور متانت و معقولیت کے ساتھ لکھا ہے اس کا زیادہ تر زور (جیسا کہ ناظرین محسوس فرمائیں گے) عقل کی صحت و سلامتی پر رہا ہے۔ لیکن نقل کی صحت و ضعف کے قواعد و شرائط وغیرہ سے یہاں مطلقاً بحث نہیں کی گئی جس کے واسطے اول تو علم اصول حدیث کی کتابوں کا مطالعہ انشاء اللہ تعالیٰ کافی ہوگا اور اگر وقت نے مساعدت اور قادر مطلق نے امداد فرمائی تو ہم ایک مستقل رسالہ اس موضوع کے متعلق بھی لکھ کر اہل ملک کے روبرو پیش کریں گے جس میں مولانا عبد اللہ العمادی کے رسالہ علم الحدیث پر بھی مبسوط تبصرہ کیا جاوے گا۔

وما ذالك على الله بعزيز و اخر دعوانا ان الحمد لله رب العٰلمين۔

الراقم

شبیر احمد عثمانی۔ عفا اللہ عنہ

دار العلوم دیوبند

۲۲ ربیع الثانی ۱۳۳۳ھ

تمت بالخیر

یہ کتاب اور علمائے دیوبند کی دیگر تصانیف کے لئے

رسائلِ ثلاثہ

شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

کے تین اہم رسائل کا مجموعہ

① ـــــ ھدیۂ سنیہ

② ـــــ تحقیق الخطبہ

③ ـــــ سجود الشمس

ادارہ اسلامیات انارکلی لاہور

فہرس

اس مجموعہ میں درج ذیل رسائل شامل ہیں

عرضِ ناشر

شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی تحریر فرمودہ تین کتابیں اعجاز القرآن، العقل و النقل اور اسلام کے بنیادی عقائد مع اسلام اور معجزات اس سے قبل ادارہ اسلامیات کی جانب سے طبع ہو چکی ہیں۔ جن کو دینی اور علمی حلقوں نے بہت سراہا ہے۔ اب ادارہ کی جانب سے حضرت علامہ کے مزید تین اہم رسالے زیرِ نظر مجموعہ میں یکجا صورت میں پیش کئے جا رہے ہیں۔ یہ رسالے اگرچہ صفحات کے اعتبار سے بہت مختصر ہیں۔ لیکن علمی مواد کے اعتبار سے بہت طویل اور جامع ہیں۔ ان رسالوں میں حضرت مولانا علیہ الرحمۃ نے بعض اہم اور نازک مسائل پر قلم اٹھایا ہے اور بڑی خوبصورتی اور دلآویز انداز سے ان مسائل میں علمائے حق کا صحیح موقف واضح کیا ہے۔ اُمید ہے کہ پڑھے لکھے حضرات حضرت مولانا کے ان رسائل سے بھرپور فائدہ اٹھائیں گے۔

والسلام

دعائے خیر کے طلب گار

کارکنانِ ادارہ

فہرست مضامین مجموعہ رسائل ثلثہ

فہرست مضامین ھدیہ سنیہ

فہرست مضامین تحقیق الخطبہ

فہرست مضامین سجود الشمس

ہدیۂ سنیہ

یعنی

مذاہب اربعہ کے درمیان اختلاف کی حقیقت اور جنت و دوزخ کی حقیقت سے متعلق بعض اہم سوالات کے شافی جوابات

از

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ

ناشر

ادارہ اسلامیات ۱۹۰ انارکلی لاہور

ھدیہ سنیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

تمہید

"دار العلوم دیوبند کے ایک ذی استعداد فہیم فیضیافتہ نے حضرت مولانا مولوی شبیر احمد صاحب مدظلہ مدرس دار العلوم دیوبند کی خدمت میں دو شبہے تحقیق کی غرض سے پیش کئے تھے۔ حضرت مولانا ممدوح نے باوجود کثرت مشاغل محققانہ جواب تحریر فرمایا۔ چونکہ اس قسم کے شبہات علمی دنیا میں اکثر پیش آتے رہتے ہیں اور حضرت مولانا ممدوح نے جس تحقیق اور جدت سے جواب تحریر فرمایا ہے وہ مفید اور حقائق علیہ سے معمور ہونے کے باوجود حسن بیان میں بھی اپنی نظیر آپ ہی ہے۔ اس لئے اہل علم کی خدمت میں ان سوالات و جوابات دونوں کو بطور ایک نادر تحفے کے پیش کیا جاتا ہے۔ اُمید ہے کہ اہل علم اسکو بہت پسند فرماویں گے۔ ہماری دعا ہے کہ قادر مطلق مولانا کے علمی فیوض کے اس سلسلہ کو تا قیام قیامت قائم رکھ کر تشنگان علم کو سیراب فرماتا رہے۔ امین"

سوالات

مجمع الحسنات والکمالات مخدومنا المکرم حضرت استاذی صاحب
قبلہ دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ طالب الخیر بعافیت ہے چونکہ خاکسار خدمت عالی میں کبھی ارسال عریضہ نہ کرسکنے کی وجہ سے سخت نادم ہے اس لئے اولاً نہایت معذرانہ لہجہ میں اپنی سابقہ غفلت وتساہل کی معافی کی درخواست ان الفاظ میں پیش کرتا ہے کہ "قلم عفو بر گناہم کش" اور بعد ازیں حسب ذیل مسائل کی جانب آنجناب کی توجہ منعطف کرنا چاہتا ہے امید کہ بلحاظ شفقت استادانہ میرے خلجان و انتشار کو زائل کرنے کی تکلیف گوارا فرمائیں گے۔

حقیقت اور بطلان اور مذاہب اربعہ

(١) حقیقت اور بطلان واقعی اعتبار معتبر پر مبنی نہیں ہے۔ اور امور واقعیہ کے وجودات اور اعدام لحاظ لاحظ کے تابع نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حیثیات اعتباریہ مبطل یا مغیر حقائق نفس الامری نہیں ہو سکتے۔ اس اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے جب مذاہب ائمہ اربعہ کی حقیقت پر غور کرتا ہوں، جس کو ہر خاص و عام میں شہرت کا فخر حاصل ہے۔ تو عقل نارسا اور اک حقیقت سے قاصر ہو جاتی ہے۔ کیونکہ ان مذاہب میں باہم بعض ایسے مسائل نظر آتے ہیں

جن میں کم از کم نسبت تضاد کی پائی جاتی ہے۔ اور یہ مسلم الثبوت امر ہے کہ "الضدان لایجتمعان" پس ان مذاہب کو حق تسلیم کرنے پر عالم واقع میں اجتماع اضداد حالت واحدہ میں لازم آتا ہے۔ جس کا بطلان ابدہ البدیہات سے ہے اور یہ بھی ظاہر ہے جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ حقائق واقعیہ پر حیثیات زائدہ کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا پس ان کے حق ہونے کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔

جنت اور دوزخ کو تمثیلی اشیاء سمجھنا

(۲) ایک وہ شخص ہے جو دوزخ و جنّت پر تو ایمان رکھتا ہے۔ مگر جو امور قرآن شریف و کتب احادیث میں جنت کے متعلق مذکور ہیں ان کو صرف تمثیلات پر محمول کرتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ چونکہ دنیاوی نقطہ نظر سے وہ انتہائی انعامات تھے اس لئے ان کو بیان کر کے اس امر کی جانب اشارہ کر دیا گیا ہے۔ کہ اہل جنت کے لئے جنت میں تمام آرام و آسائش کی چیزیں مہیا کی گئی ہیں۔ ورنہ جنت کی حقیقت نہ کسی کو معلوم ہوئی اور نہ ہو سکتی ہے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں کہ "لا عین رأت و لا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر" الغرض اس سے ثابت ہو گیا کہ "رؤیت، سماعت، خطور بالبال" خلاصہ یہ کہ کسی ذریعہ سے جنّت کی حقیقت کسی پر منکشف نہ ہو سکی۔

بعینہ یہی خیال اس شخص کا جہنم کے متعلق بھی ہے۔ پس یہ خیالات کہاں تک صحیح ہیں اور شرعاً اس شخص کا کیا حکم ہے۔

جواب

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

برادر محترم سلمکم اللہ تعالیٰ۔ بعد سلام مسنون آنکہ۔ آپ کا عنایت نامہ پہنچا۔ حق تعالیٰ شانہ، مجھ کو اور آپ کو اور تمام مسلمانوں کو اپنی رضا کی توفیق عطا فرمائے جن مسائل کی بابت آپ نے دریافت فرمایا ہے مجھ کو حیرت ہے کہ باوجودیکہ وہاں ماشاء اللہ بہت سے اہل علم اور اہل علم کے فیض یافتہ موجود ہیں جو بفضلہ تعالیٰ مشکل سے مشکل مسائل کو مجھ سے زیادہ زور اور قوت کے ساتھ حل کرنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ آپ ان سے مشافہۃً بہت جلد اور بسہولت اس قدر اطمینان حاصل کر سکتے تھے۔ جو شاید میرے متعدد خطوط سے بھی حاصل نہ ہو سکے۔ پھر آپ نے مجھ کو خط لکھنے کی زحمت کیوں اٹھائی۔ سالہا سال آپ دیوبند میں رہ چکے ہیں۔ میری حالت سے بھی بہر حال واقف ہیں کہ میری بیچدانی اور لاابالی پن حد سے زیادہ گذرا ہوا ہے۔ اس لئے کبھی کبھی یہ خیال ہوا کہ آپ کا خط یہاں کسی عالم جید کا حوالہ کر دوں تاکہ وہ آپ کی تسکین کر دے۔ لیکن یہ خیال کر کے کہ یہاں سے جانے کے بعد یہ آپکی پہلی عنایت ہے دل گوارا نہیں کرتا کہ کچھ بھی جواب نہ لکھا جائے۔ لہٰذا جس طرح ان مسائل کو میں اب تک سمجھے ہوئے ہوں مختصراً قلمبند کر کے آپ کی خدمت میں روانہ کرتا ہوں۔ اگر شفا ہو جائے تو حق تعالیٰ کا شکریہ ادا کیجئے اور بصورت دیگر مناسب ہو گا کہ دوسرے علمائے متبحرین سے رجوع کیا جائے۔

پہلا مسئلہ ۔ یعنی مذاہب اربعہ کی حقیقت کے متعلق جو کچھ بندہ نے اہل السنۃ والجماعت کی کتابوں کا مطالعہ کر کے اب تک منقح کیا ہے ۔ اُس کو پیش کروں گا فان یك صوابا فمن اللہ سبحانہ وتعالیٰ وان یك خطا فمنی ومن الشیطان ولاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم لا الہ غیرہ ولاخیر الا خیرہٗ

پہلے سوال کا جواب

سب سے پہلے یہ عرض کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے سوال اوّل میں غور و تنقیح کے بعد دو جزو نکلتے ہیں ۔

(۱) کسی چیز کا حق یا باطل ہونا اعتبار معتبر و لحاظ لاحظ پر مبنی نہیں ہو سکتا اور حیثیات زائدہ اعتباریہ حقائق واقعیہ کے لئے مبطل یا مغیر نہیں ہو سکتی

(۲) مذاہب ائمہ اربعہ واقع میں سب حق ہیں حالانکہ ان مذاہب میں بہت سے ایسے مسائل ہیں جو باہم متضاد ہیں مثلاً سب سے بڑا تضاد یہ ہے کہ ایک چیز کو ایک امام واجب یا فرض قرار دیتے ہیں اور دوسرے اس کو مکروہ تحریمی یا حرام وعلی ہذا القیاس تو اضداد کا اجتماع ایک ہی چیز کے اندر اور ایک ہی وقت میں کیسے حق ہو سکتا ہے اور اگر ان میں باہم حیثیات کا فرق نکالا جائے تو وہ بحکم مقدمہ اولیٰ صحیح نہیں ۔

آپ کے یہ دونوں دعوے تشریح طلب ہیں الفاظ ایسے مجمل اور ذوالوجوہ اختیار کئے گئے ہیں کہ جن سے کئی معنے کا احتمال ہوتا ہے پس جب تک ہر ایک لفظ کی کماحقہ تشریح اور محتملات عبارت میں سے بعض کی

تعیین نہ ہو جائے کچھ رائے زنی کرنا بے سود ہے ۔

مذاہب اربعہ میں اختلاف کی حقیقت

دعوی اوّل میں اگر یہ ارادہ کیا گیا ہے کہ کسی چیز کے ساتھ مختلف اعتبارات اور حیثیات لگ جانے سے اُس چیز کی حقیقت یعنی ماہیت نفس الامری بدل نہیں سکتی ۔ مثلاً زید زمین پر چل رہا ہو یا ہوا میں اڑ رہا ہو یا کھانا کھا رہا ہو یا ہبو کا مر رہا ہو تحصیل علم میں مشغول ہو یا لہو ولعب میں اپنی عمر تباہ کرتا ہو ہر حالت میں اور ہر ایک حیثیت کے لگ جانے کے وقت اُس کی حقیقت وہی حیوان ناطق رہتی ہے اور زید کو کسی طرح لحاظ کرو اس کی حقیقت میں ذرا فرق نہیں آ سکتا تو بلا شبہ مشائین کے مذاق کے موافق یہ دعوی صحیح ہے اور ہم کو اس سے انکار کرنے کی ضرورت نہیں مگر مذاہب اربعہ کی حقیقت کے مسئلہ سے یہ دعوی محض بے تعلق ہے کیونکہ ائمہ اربعہ مثلاً جس چیز کے وجوب و حرمت میں مختلف ہیں تو ہر مجتہد کی تصویب کرنے والے بھی یہ نہیں کہتے کہ اُس چیز پر مختلف اور متضاد احکام جاری ہونے سے (جو ان کے زعم میں بسبب اختلاف نسب و اعتبارات کے جاری ہوئے ہیں) خود اس چیز کی حقیقت بدل جاتی ہے مثلاً قے یا رُعاف کو امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ ناقض وضو کہتے ہیں اور امام شافعی فرماتے ہیں کہ ناقض نہیں ہے تو دونوں صورتوں میں قے اور رعاف کی حقیقت اسی طرح محفوظ رہتی ہے جس طرح کہ زید کی حقیقت حالتِ تحصیل علم اور لہو ولعب میں یا مثلاً یہ نہیں کہا جاتا کہ اس فاتحہ کی

حقیقت کچھ اور ہے جس کو امام صاحب مقتدی کے حق میں مکروہ تحریمی قرار دیتے ہیں اور جس کو امام شافعی ہر ایک مصلی کے حق میں فرض فرماتے ہیں اس کی کوئی دوسری حقیقت ہے پس اگر مختلف اعتبارات وحیثیات کے طاری ہونے سے آپ کا یہ خیال ہے کہ اس شے کی حقیقت واقعیہ نہیں بدلتی تو میں اور بہت عقلا آپ کے ہم آہنگ ہیں اور اسکا انکار آپ نے کسی سے نہ سنا ہو گا لیکن اگر یہ مقصد آپ کا نہیں بلکہ یہ ہے کہ کسی شے کے ساتھ حیثیات زائدہ اور اعتبارات کے لگ جانے سے اس پر نفس الامر میں مختلف احکام جاری نہیں ہو سکتے ہیں تو میں کہتا ہوں کہ آپ نے یہی نہیں کہ محض ایک بے سند دعویٰ کیا ہے بلکہ ایسا دعویٰ کر کے ان سینکڑوں دلائل اور شواہد کو جھٹلا دیا جو اس دعوے کی ببانگ دہل تکذیب کرتے ہیں۔ مثلاً زید کو دیکھیے کہ وہ ایک شخص ہے اور اس کی ایک غیر متبدل حقیقت ہے لیکن وہ اتفاقاً عمرو کا بیٹا اور خالد کا باپ اور ہندہ کی اولاد اور زینب کا شوہر ہے تو کیا ان سب نسبتوں اور اعتبارات اور حیثیات کے لگنے کے بعد جو کہ اس کے نفس حقیقت سے یقیناً خارج ہیں ایک ہی وقت اور ایک ہی آن میں اس پر ان مختلف اعتبارات ونسب میں سے ہر ایک کے مناسب احکام وحقوق جن میں بعض متضاد بھی ہیں باتفاق عقلائے دنیا عاید نہیں ہوتے کیا جس طرح اس کو ہم اس کے بیٹے خالد کے اعتبار سے مطاع اور واجب التعظیم کہتے ہیں۔ اسی طرح اس کے باپ عمرو کے اعتبار سے بھی سمجھیں یا جس طور پر کہ اس کو اپنی زوجہ زینب پر تصرف کرنے کی اجازت دی جاتی

ہے اس طور سے ہندہ کے مقابلہ میں بھی (جو اس کی ماں ہے) مطلق العنان چھوڑ دیا جا سکتا ہے۔ حاشا ثم حاشا حالانکہ ہر ایک حالت میں اس کی حقیقت اور ماہیت جوں کی توں باقی رہی البتہ ابوۃ بنوۃ اور زوجیت وغیرہ نسبتیں لگ جانے سے اُس کے حق میں مختلف احکام تجویز ہو گئے اس کی مثالیں ایک دو نہیں، دس بیس نہیں، پچاس سو نہیں، لاتعد ولاتحصی ہیں ضلع کا مجسٹریٹ باشندگان ضلع پر حاکم مگر گورنمنٹ آف انڈیا یا ویسرائے یا لیفٹننٹ گورنر کا محکوم ہے تو کیا جو احکام ومعاملات اس کے لئے باعتبار رعایا کے تسلیم کئے جائیں گے وہی باعتبار حکام بالادست کے بھی ماننے پڑیں گے۔ ایک ہی مرغن غذا ایک تندرست آدمی کھا کر زیادہ قوی اور توانا ہوتا ہے۔ لیکن ایک ضعیف المعدہ مریض کو اُس کا استعمال ہلاکت سے قریب تر کر دیتا ہے ایک ہی نسخہ ایک طبیب کا تجویز کیا ہوا ایک ہی وقت میں ایک مریض کے حق میں اکسیر شفا ثابت ہوتا ہے مگر دوسرے مریض کے لئے جس کا مرض اس طرح کا نہ ہو سم قاتل سے کم نہیں رہتا ان سب صورت میں یہ دریافت کرتا ہوں کہ ایک ہی چیز ایک ہی وقت میں ایک ہی شیشی میں عطار کی دوکان یا سرکاری ہسپتال میں رکھی ہوئی ہے۔ اس کو ہم کسی طرح مفید بھی مضر بھی منجی بھی اور مہلک بھی واجب الاستعمال بھی اور ممنوع الاستعمال بھی کہہ سکتے ہیں اس کا جواب بجز اس کے اور کیا ہو گا کہ یہ سب احکام واوصاف واقعیہ اس دوا کے لئے مختلف استعمال کرنے والوں کی نسبت سے ثابت ہوئے ہیں جس کی واقعیت سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ تو میں پوچھتا ہوں کہ اب آپکا وہ قاعدہ کہاں درست رہا، کہ

مختلف حیثیات زائدہ کے لگنے سے کسی چیز کے واقعی احکام نہیں بدل سکتے کیونکہ یہاں ماہیت اور حقیقت تو اس دوا کی غیر متغیر ہے جو کچھ بھی اختلاف آیا ہے بہر حال باہر سے آیا ہے۔ بیش بریں نیست کہ آپ یہ کہیں گے، کہ مذاہب اربعہ پر اس مثال کے انطباق کی فرقہ مصوبہ (جو کل مجتہد مصیب کا قائل ہے) کے نزدیک کیا صورت ہوگی۔ اس کے متعلق بالا جمال یوں کہا جا سکتا ہے کہ شارع کی طرف سے کسی مجتہد کو اجتہاد کی اور غیر مجتہد کو تقلید کی اجازت ہونے اور اپنے اجتہاد یا امام کے مسلک کو واجب الاتباع ٹھہرانے کے یہ معنی ہیں کہ اُن کے مذاق کے موافق حق تعالیٰ شانہ کے علم ازلی میں جس فعل کا کرنا تمام بندوں کے حق میں مفید تھا اس نے تمام مجتہدین امت محمدیہ کو اُن کے جواز یا وجوب پر اتفاق کرنے کی توفیق مرحمت فرمائی اور جس کا چھوڑنا اصلح تھا۔ اس کے واسطے ایسے راستے نکالے اور سامان مہیا فرمائے کہ تمام مجتہدین کا اجماع اس کی حرمت یا کراہت پر ہو گیا اور جس فعل کو حق تعالیٰ شانہ نے اپنے علم ازلی میں بعض بندوں کے حق میں نافع اور بعض کے حق میں مضر سمجھا اس میں ائمہ ہدیٰ کی رائیں مختلف کر دیں۔ اور ہر عام مومنین کے قلوب میں خالص اپنی رحمت سے جو مومنین پر مبذول ہوتی ہے، ایسے مختلف دواعی اسباب پیدا فرما دیے جو ان میں سے ہر ایک کو خواہی نخواہی ایک ایسے امام کی تقلید کی طرف لیجائیں کہ جس کا مسلک اس خاص شخص کے حق میں اصلح تھا۔ اب یہ شخص عملاً ان دواؤں کا استعمال کرے یا نہ کرے جو اس کے طبیب نے اس کو بتلائی ہیں لیکن حق تعالیٰ نے اپنی حجت اس پر قائم کر دی لیھلک

من ھلک عن بینۃ و یحییٰ من حی عن بینۃ۔

یاد رکھیے میرا اس وقت یہ دعویٰ نہیں کہ فرقہ مصوبہ کی یہ تقریر صحیح ہے یا غلط ہے محض اس قدر گذارش ہے کہ جس طرح ایک ہی دوا مختلف مریضوں اور مختلف مواسم اور مختلف احوال مریض کے اعتبار سے نافع بھی اور مضر بھی۔ مہلک بھی اور زندگی بخش بھی ہو سکتی ہے اسی طرح فرقہ مصوبہ کے خیال میں ایک چیز اور ایک ہی کام بعض کے واسطے جائز اور بعض کے حق میں حرام بلکہ ایک ہی شخص کے لیے مختلف زمانوں کے اعتبار سے نفس الامر میں ایسا ہو سکتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ہر مقلد کو ہر وقت میں جو مسلک اس کے مناسب ہوتا ہے اسی کی طرف مائل ہونے کی اپنے فضل اور رحمت سے توفیق عطا فرماتا ہے۔ تحریر الاصول اور اس کی شرح میں اس فرقہ کے ایک طائفہ کی رائے کا جو مختصر تذکرہ کیا ہے اس تفصیل یہ ہے کہ جو بندہ نے گذارش کی۔ من شاء فلیطالعہ مع اللہ بجزا البالغ۔

الغرض مصوبہ کے زعم کو تسلیم کر کے اجتماع اضداد فی الامر کا خیال محض غلط ہے اور ایسا ہے جیسا کہ کوئی شخص یہ سنکر کہ کشتہ فولاد نہایت مقوی ہے اور یہ کہ نہایت مہلک بھی ہے اجتماع ضدین کا خیال باندھنے لگے۔

اختلافی مسائل میں حق ایک ہے یا متعدد؟

اب میں آپ کے سوال اوّل کے دوسرے جزو کی طرف متوجہ ہوتا ہوں جو کہ اصل مقصود ہے یعنی یہ کہ مسائل مختلف فیہا میں حق عند اللہ متعدد ہوتا

ہے یا واحد اور ہر ایک مجتہد مصیب ہے یا کوئی ایک غیر معین مصیب ہے اور باقی مخطی ہیں۔

تفصیل اس کی جیسا کہ علمائے محققین نے بیان کی ہے یہ ہے کہ عقلیات یعنی جن مسائل کا ماننا سماع کا موقوف نہیں مثلاً عالم کا حدوث اور صانع عالم کا وجود اور اس کی تمامی صفات کمالیہ اور انبیاء علیہم السلام کی بعثت ان میں اختلاف کے وقت بالاجماع مصیب کوئی ایک ہے اور وہ وہی ہے جس کا اجتہاد واقع کے مطابق ہو اور اس نے کوشش کر کے حق کو پا لیا ہو۔ کیونکہ یہ ممکن ہی نہیں کہ نفس الامر میں مثلاً عالم حادث بھی رہے اور قدیم بھی۔ یا خدائے تعالیٰ موجود بھی ہو اور معدوم بھی۔ تو لامحالہ فریقین میں سے صرف ایک ہی فریق حق پر ہو سکتا ہے۔ اور جو خطا پر ہے جب کہ اس کی خطا سے ملت اسلام کی یا اس کے بعض اجزاء ضروریہ کی نفی ہوتی ہو تو وہ بالاتفاق کافر ہے۔ اور اگر خطا مسائل دینیہ میں سے کسی ایسے مسئلہ اعتقادیہ میں ہے کہ جس کے انکار سے ملت اسلام کے اصول اولیہ کی نفی نہیں ہوتی مثلاً کوئی شخص قرآن مجید کو مخلوق کہے یا اس کا معتقد ہو کہ شرور اور قبائح حق تعالیٰ کے ارادہ کے بغیر پیدا ہوتے ہیں تو ایسا شخص اپنی خطا سے اگرچہ مذہب مختار کے موافق صریح کافر نہ کہا جائے لیکن مبتدع اور آثم ضرور ہے۔ یہ تو مسائل کلامیہ کا حال تھا رہ گئے مسائل فقہیہ۔ تو ان میں سے جو شخص اپنے اجتہاد کے زور سے بدیہیات فقہ کا انکار کرنے لگے۔ مثلاً نماز روزہ حج یا زکوٰۃ کی فرضیت۔ یا زنا سرقہ اور شراب کی حرمت کا تو یہ فقط یہ کہ وہ بالاتفاق مخطی ہے بلکہ صریح کافر اور آثم ہے ہاں

اگر وہ مسائل باوجود قطعی ہونے کے بدیہیات شرع میں سے نہیں ہیں جیسا کہ مثلاً اجماع اور خبر واحد اور قیاس شرعی کا حجت ہونا تو اس قسم کی باتوں کا نہ ماننے والا اگرچہ بلاشبہ مخطی اور مبتدع اور گنہگار ہوتا ہے مگر کفر کی نسبت اس کی طرف نہیں کی جا سکتی۔

باقی ایسے مسائل فرعیہ جن میں اجتہاد کا مساغ ہو اور کوئی نص قاطع یا اجماع اس میں موجود نہ ہو تو فقط اس قسم میں نزاع ہے۔ معتزلہ اور بعض اشاعرہ کی طرف یہ منسوب ہے کہ وہ ایسے مسائل میں اختلاف مجتہدین کے وقت تعدد حق کے قائل ہیں جن میں سے ایک جماعت کے خیالات کا خلاصہ جزو اول میں پیش کیا جا چکا ہے اور تفصیل ان کی اقوال و دلائل کی کتب اصول و کلام میں مذکور ہیں۔ حتیٰ کہ شیخ عبدالوہاب شعرانی رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف سے تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے تعدد حق کا بیان کرتے ہوئے مسائل فرعیہ میں مجتہد فیہا کی قید بھی باقی نہیں چھوڑی جو خود قائلین تعدد حق کے نزدیک بھی ضروری تھی۔ بہر حال عامہ معتزلہ اور چند اہل السنۃ والجماعت کی رائے یہ بتلائی جاتی ہے کہ وہ مسائل فقہیہ غیر منصوصہ میں تعدد حق کے قائل ہیں لیکن جمہور اہل سنت والجماعت کا جن میں ائمہ اربعہ بھی شامل ہیں۔ مذہب مختار یہی ہے کہ تمام مسائل منصوصہ اصلیہ اور فرعیہ کی طرح ان مسائل میں بھی عنداللہ کوئی ایک حق ہے کہ جس کی تلاش میں مجتہدین اپنی اپنی قوت اجتہاد صرف کرتے ہیں۔ پس جو مجتہد اپنی سعی بلیغ سے اس حکم مطلوب پر پہنچ گیا۔ وہ تو بالبداہت کامیاب ہو گیا اور جس کی نظر سے باوجود استفراغ وسع اور

امکانی جدوجہد کے حکم مطلوب مستور رہا تو گو کہہ سکتے ہیں کہ اس کو باعتبار اصل مقصود کے کامیابی نہ ہوئی لیکن اس اعتبار سے اس کی کوشش بھی رائگاں نہیں گئی کہ حق تعالیٰ کمال فضل و احسان سے بسبب مسائل اجتہادیہ کے غایت درجہ دقیق المأخذ ہونے کے اس کو معذور قرار دیکر اس کی محنت اور جدوجہد کی قدر کرتا ہے اور بجائے اس کے کہ ایک غیر معتد بہ رائے کے موافق اپنی اس خطا کی وجہ سے وہ آثم ٹھہرتا الٹا اجر اور ثواب کا مستحق ہوتا ہے۔ لما فی الصحیحین مرفوعاً۔

اذا حکم الحاکم فاجتھد فاصاب فلہ اجران واذا حکم فاجتھد فاخطأ فلہ اجر واحد۔	حاکم جب اپنے اجتہاد سے کوئی فیصلہ کرے اور وہ فیصلہ واقع میں بھی درست ہو تو اسکے واسطے دوہرا ثواب ہے اور اگر اس میں خطا ہوئی تو اکہرا ثواب تب بھی ہے۔

مثال سے اسکی تشریح

اس کو یوں سمجھیے کہ مثلاً فلسفہ کے ایک اُستاد نے اپنے تین ذہین طالب علموں کی شوق و محنت و توجہ و فطانت کا امتحان کرنا چاہا اور اعلان کر دیا کہ تم میں سے جو شخص طبیات شفاء کے فلاں مقام کو خوب اچھی طرح سمجھ کر ہمارے روبرو ٹھیک ٹھاک بیان کرے گا۔ اُس کو ہم بیس روپیہ کی ایک گھڑی انعام میں دینگے۔ اور فرض کیجیے کہ ان کو مطالعہ کرنے کے لئے ایک شب کی مہلت دے گئی۔ اب ایک طالب علم نے تو ان میں سے محض اپنی ذکاوت پر اعتماد کرکے اور شفاء کی عبارت کو ایک آدھ مرتبہ سرسری نظر سے گذار کر کتاب کو بالائے طاق رکھ دیا۔ اور رات بھر خوب بے فکری اور آرام کی نیند سویا مگر صبح

کو جب اس نے استاد کے سامنے کتاب کھولی تو نہ عبارت کتاب کی صحیح پڑھی اور نہ مطلب صاف بیان کیا بلکہ جو کچھ تقریر تھی وہ محض غلط تھی تو ظاہر ہے کہ ایسے طالب علم کے حق میں اس کے سوا کیا ہونا ہے کہ بجائے انعام کے مناسب سزا تجویز کی جاوے اور نفرین اور ملامت کی ہر چہار طرف سے اس پر بوچھار ہو اور شفاء کی جماعت سے اُسے خارج کر دیا جائے۔ باقی جو دو طالب علم اس کے سوا تھے ان کو استاد نے دیکھا کہ وہ باوجود اوّل درجہ کی ذہانت و فطانت کی محض اس خوف سے کہ کہیں کتاب کا مطلب سمجھنے میں کوئی سہو اور غلطی نہ ہو جائے جس سے استاد ناراض ہو جائے اور ہم عصروں کو شماتت کا موقع ملے۔ رات بھر چراغ کے سامنے آنکھیں تاپتے رہے بار بار نیند کا تقاضا ہوتا تھا۔ مگر وہ دونوں ہمت کے دُھنی شفاء اور اُس کے حواشی اور تعلیقات سامنے رکھے ہوئے اس مقام کی مختلف تقریروں کا موازنہ کرتے ہوئے اور شیخ رئیس کا صحیح صحیح منشاء معلوم کرنے کی فکر میں رات بھر مستغرق رہے یہ سب نظارا استاد اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا اور دل ہی دل میں ان کی محنت اور کاوش اور انتھک کوشش کی داد دے رہا تھا لیکن افسوس سوءِ اتفاق سے ایک طالب علم ان میں کا صبح کو جب اُستاد کے سامنے امتحان کے لیے حاضر ہُوا تو نتیجہ خلافِ اُمید نکلا اور بافسوس معلوم ہُوا کہ تمام شب کی دوا دوش میں بھی جس کا شاہد خود استاد کر رہا تھا، کتاب کے عمیق اور غامض مطلب تک رسائی نہ ہو سکی۔ ہاں اس کے دُوسرے حریف نے کہ وہ بھی ذہانت اور محنت میں اس سے پیچھے نہ تھا۔ اس مقام کی جو تقریر کی تو وہ ایسی کی کہ گویا خود ابن سینا قبر میں سے اٹھ کر اپنی مراد ظاہر کرتے

کے لئے آگیا اور اس نے کتاب کے ایک ایک لفظ کی گرہ کھول دی اس وقت اُستاد کو اس پر پیار آیا اور اس نے اس کی پیشانی چوم لی اور خوشنما گھڑی بیس روپیہ کی جیب سے نکال کر اس کے حوالہ کی۔ لیکن اس دوسری ذہین طالب علم کی محنت کو بھی جسے وہ رات بھر دیکھ کر رحم کھاتا رہا تھا۔ اس نے کالعدم نہیں سمجھا۔ نہایت شفقت سے اس کی تسکین کی اور شہسواروں کے میدانِ جنگ میں گرنے کی مثالیں پیش کر کے اس کو مطمئن کیا تا کہ وہ آئندہ اپنی فہم اور کوشش کی طرف سے بے پروا اور بدگمان نہ ہو جائے بلکہ دوسرے امتحانات میں اپنے معاصر سے سبقت لے جانے کی بیش از بیش سعی کرے اس کو بھی ایک گھڑی مگر دس روپیہ کی اس کی محنت کے صلہ کے طور پر دی جیسا کہ آپ نے سنا ہو گا کہ غازی عثمان پاشا شیر پلونا جب دشمنوں کے ہاتھ میں پڑ گئے تو خود دشمن کے یہاں اُن کی جانبازانہ بسالتوں کا کیا کچھ احترام ہُوا اور سلطان المعظم نے اُن کا شاندار استقبال ایک فاتح جنرل کی حیثیت میں کیا۔ اور دنیا کے عقلمند چلا اُٹھے کہ عثمان کی شکست ایک ایسی شکست ہے جس پر ہزاروں فتح قربان کی جاسکتی ہیں پس ٹھیک اسی طور پر تم مجتہدین کی حالت کو سمجھو اگر بالفرض مجتہد کسی مسئلہ کا حکم صحیح دریافت کرنے میں اس پہلے طالب علم کی طرح بے پروائی برتے اور قوتِ اجتہاد کو پوری پوری ہمت اور محنت کے ساتھ کام میں نہ لائے تو حسب تصریح علمائے محققین یہی نہیں کہ وہ محض مخطی ہو گا بلکہ گنہگار اور آثم ٹھہرے گا۔ ہاں وہ دونوں مجتہد جنہوں نے منصب اجتہاد پر فائز ہو کر مساوی کوشش اور محنت استخراج احکام میں کی مگر تقدیر سے ایک

تو حق تعالیٰ کے صحیح منشار کے معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا اور دوسرا نہ ہوا تو حق تعالیٰ اپنی غایت رافت اور رحمت سے ان دونوں کو علی قدر مراتب اجر و ثواب مرحمت فرمانے میں تنگی نہ کریں گے اگرچہ بعض کو بعض پر فضیلت ہو جیسا کہ انبیائے مرسلین اور خلفائے راشدین میں بھی بعض بعض سے افضل ہیں۔ وذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم ۔

شیخ تقی الدین کی رائے

شیخ تقی الدین ابن دقیق العید فرماتے ہیں کہ مجتہدین کے واسطے ہر ایک واقعہ میں اللہ تعالیٰ کے دو حکم ہیں ایک یہ کہ اس واقعہ کے متعلق خدا کا جو کچھ حکم واقع میں ہے جس کی طرف رہنمائی کرنے والے لطیف اشارات و امارات بھی اس نے اپنے کلام میں نصب فرما دیئے ہیں اس کو معلوم کریں۔ دوسرا یہ کہ ہر مجتہد بعد اپنی پوری قوت اجتہاد اور انتہائی کوشش صرف کر لینے کے جس نتیجہ پر پہنچے وہی اس کے حق میں واجب الاتباع ہے۔ پس وُہ مجتہد جو ایک مسئلہ اجتہادی میں پوری ہمت صرف کر لینے کے بعد بھی حق تعالیٰ شانہٗ کے صحیح منشار اور مطلوب پر مطلع نہ ہو سکا۔ اگرچہ اس حکم اول کے فوت ہونے کے اعتبار سے جس کا معلوم کرنا ہر مجتہد کے ذمہ لازم تھا، مخطی کہا جا سکتا ہے لیکن دوسرے حکم کے لحاظ سے ہر ایک مجتہد کو مصیب بھی کہہ سکتے ہیں کیونکہ جو کچھ اُس نے اپنے علم اور اجتہاد سے معلوم کر لیا ہے۔ اس کے حق میں اب وہی واجب الاتباع قرار دیا گیا ہے تو جن لوگوں نے "کل مجتہد مصیب" کی آواز بلند کی اگر اُن کی غرض یہی ہے۔ جو اب ہم نے بیان کی تو بلاشبہ اس میں تمام

اہل سنت والجماعت ان کے ساتھ متفق ہیں۔

اختلافی مسائل میں عدم تشدد

اور یہی وجہ تھی کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے عہد مبارک میں کوئی صحابیؓ دوسرے پر مسائل اجتہادیہ میں اختلاف رکھنے کی وجہ سے ملامت یا طعن و تشنیع نہیں کرتا تھا اور تضلیل یا تبدیع تو کجا ایک کی طرف سے دوسرے کی تاثیم بھی نہ ہوتی تھی بلکہ ایسے اختلافات کو توسع اور رحمت جان کر ایک دوسرے کے ساتھ نہایت رواداری کا برتاؤ کرتے تھے خود احناف کی کتابوں میں بجز ایسی صورتوں کے جس میں فساد صلوٰۃ کا مظنہ غالب ہو اقتداء حنفی کی شافعی کے پیچھے اور شافعی کی حنفی کے پیچھے جائز رکھی گئی ہے اور بعض بعض مسائل ہیں جہاں فقہائے نسائخ کو شرعاً رخصت اور تیسیر کی ضرورت محسوس ہوئی ہے دوسرے ائمہ کی آراء کو معمول بہا بنایا گیا ہے۔ کیونکہ کسی خاص امام کی تقلید کے لازمی معنی اگرچہ اس امام کے مذہب کو صواب اور راجح کہنا ہے لیکن پھر بھی احتمال خطا کا اعتراف اور دوسرے امام کے اجتہاد کے متعلق احتمال ثواب کی تصریح موجود ہے، اگر خاص خاص شرعی مصالح جن کا ادراک فقہا کر سکتے ہیں۔ اس طرف داعی ہوں کہ بعض مسائل میں دوسرے ائمہ کے مذاہب پر فتویٰ دیا جائے تو آخر پھر اس احتمال خطا و ثواب سے فائدہ اٹھانے کا اور کون سا موقعہ ہے۔

مذاہب اربعہ حق ہیں

اس لئے یہ خوب محفوظ رکھنا چاہیئے کہ باوجودیکہ حق عنداللہ کے اعتبار

سے ہر ایک مسئلہ میں کوئی ایک ہی مجتہد مصیب ہوتا ہے لیکن عملاً سب حق پر ہیں یعنی حق تعالیٰ شانہٗ نے یہ وسعت دی ہے کہ یہ مجتہد اپنے اجتہاد کے اوپر عمل کرے اگرچہ اس کا اجتہاد باوجود پوری کوشش کے ٹھیک نشانہ پر نہ بیٹھا ہو۔ تمثیلاً یوں سمجھو کہ کعبہ نفس الامر میں ایک معین مکان کا نام ہے اور اسی کا استقبال شریعت نے نماز میں ضروری قرار دیا ہے فول وجھک شطر المسجد الحرام لیکن جس وقت سمت کعبہ ٹھیک معلوم نہ ہو تو بعد تحری کے جو سمت معین ہو اسی کا استقبال قبول صلوٰۃ کے لئے کافی سمجھا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ ہماری تحری جس طرف ہو ضروری نہیں کہ نفس الامر میں خانہ کعبہ بھی اسی طرف منتقل ہو جائے پس یہ خدا کی رحمت اور انعام ہے کہ اگرچہ واقع میں مستقبل قبلہ وہی شخص ہے جس کا رُخ ٹھیک کعبہ کی طرف ہو مگر تاہم دوسری طرف منہ کرنے والوں کو بھی توسعاً اور حکماً مستقبل کعبہ تسلیم کر لیا گیا ہے تو باعتبار کعبہ نفس الامری اور حکم اولیٰ کے تو فقط ایک ہی شخص مصیب ہے اور سب مخطی لیکن باعتبار قبول صلوٰۃ اور امتثال امر ثانی کے سب مصیب ہیں۔ یہی مطلب ہے، حدیث اصحابی کالنجوم بایہم اقتدیتم اہتدیتم کا اگر وہ صحیح طور پر ثابت ہو جائے اور نیز حضرت الشیخ الاجل محدث گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے اس عبارت کا جو سبیل الرشاد صفحہ ۲۲ میں ہے۔

پس ہر چند کہ عنداللہ محل اختلاف میں حق واحد ہوتا ہے مگر عمل میں سب حق ہوتے ہیں " اور یہی محمل ہے حضرت امام ابو حنیفہؒ کے اس اشارہ " کل مجتہد مصیب والحق عنداللہ واحد " اور امام ابو یوسفؒ کے اس کلام کا " کل مجتہد مصیب



وان کان الحق فی واحد فمن اصابہ فقد اصاب الحق ومن اخطاہ فقد اخطاہ"
التقریر والتحبیر صفحہ ۳۰۸ ج ۳ مصری ۔

حضرت امام صاحبؒ وامام ابو یوسفؒ کی ان نصوص کو ہمیشہ یاد رکھیے جن سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ امام صاحب اور دیگر ائمہ اہل سنت سے جو بعض شاذ اقوال ہر مجتہد کے تصویب کی نسبت ان کے مشہور و معروف مذہب المجتہد یخطی ویصیب کے خلاف منقول ہیں۔ وہ فی الحقیقت ان کے اصل مذہب کے خلاف نہیں ہیں تعجب ہے کہ امام عبدالوہاب شعرانی نے بھی میزان کبریٰ میں بیشتر اسی قسم کے اقوال کی سطح سے مدد لی ہے۔

علماء وفقہا کی عبارات سے استدلال

اس جگہ میں مناسب سمجھتا ہوں کہ چند نقول مستند کتابوں کی آپ کے سامنے پیش کردوں جو اس بات کو ظاہر کرتے ہیں۔ کہ اصل مذہب جمہور اہل سنت و الجماعت اور ائمہ اربعہ کا یہی ہے کہ اجتہادیات میں حق عند اللہ واحد ہے اور اسی بناء پر ہر مجتہد مصیب بھی ہو سکتا ہے اور مخطی بھی چنانچہ تحریر الاصول اور اس کی شرح میں لکھتے ہیں کہ:۔

والمختار ان حکم الواقعۃ المجتہد فیہا حکم معین اوجب طلبہ فمن اصابہ فھو المصیب ومن لا یصیبہ فھو المخطی ونقل ھذا عن الائمۃ

مذہب مختار یہ ہے کہ ہر واقعہ مجتہد فیہا میں ایک حکم معین ہوتا ہے جس کی تلاش خدا کی طرف سے لازم کیگئی ہے پس مجتہد نے اس حکم کو پالیا وہ مصیب ہے۔ اور جو نہ پاسکا وہ مخطی ہے۔ چنانچہ یہی خیال چاروں اماموں

الاربعۃ ابی حنیفۃ ومالک والشافعی و احمد وذکر السبکی ان ھذا ھو الصحیح عندھم بل نقل الکرخی من اصحابنا جمیعاً ولھذا ذکر القرافی من مالک غیرہ وذکر السبکی انما الذی حررہ اصحاب الشافعی عنہ وقال ابن السمعانی ومن قال عنہ غیرہ فقد اخطأ (صفحہ ۳۰۶ جلد ۳)

(ابو حنیفہ، مالک، شافعی، احمد رضی اللہ عنہم) کا ہے اور سبکی نے لکھا ہے کہ یہی رائے ائمہ اربعہ کے نزدیک صحیح ہے۔ بلکہ کرخی نے تو ہمارے تمام اصحاب (حنفیہ) سے یہی خیال نقل کیا ہے۔ اور قرافی نے اس کے سوا امام مالک سے کوئی قول نقل نہیں کیا اور سبکی نے ذکر کیا ہے کہ یہی وہ قول ہے جسکو امام شافعی کے اصحاب نے امام شافعیؒ سے منقح کر کے لکھا ہے اور ابن السمعانیؒ نے فرمایا کہ جس کسی نے امام شافعی سے اس کے سوا دوسرا قول نقل کیا اس نے خطا کی۔

شیخ شمس الدین ابن القیم اعلام الموقعین میں لکھتے ہیں:۔

وقد صرح الائمۃ الاربعۃ بان الحق فی واحد من الاقوال المختلفۃ ولیست کلہا صواباً (صفحہ ۳۱۰ جلد ۳)

اور ائمہ اربعہ نے تصریح کی ہے کہ اقوال مختلفہ میں سے ایک ہی قول حق ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ سب کے سب قول درست ہوں۔

حافظ ابن تیمیہ فتاویٰ میں لکھتے ہیں:۔

(المقام الاول) ھل للہ فی کل حادثۃ تنزل حکم فی نفس الامر بمنزلۃ ما للہ قبلۃ معنیۃ ھی الکعبۃ وھی مطلوب المجتہدین عند الاشتباہ فالذی علیہ السلف وجمہور الفقہاء اکثر المتکلمین او کثیر منہم ان اللہ

پہلی بحث یہ ہے کہ کیا ہر ایک حادثہ میں جو پیش آئے خدا کی طرف سے کوئی ایک حکم معین ایسا ہوتا ہے جیسا کہ حق تعالیٰ نے خانہ کعبہ کو ایک معین قبلہ بنادیا ہے جس کو اشتباہ کے وقت مجتہدین معلوم کرنا چاہتے ہیں تو سلف صالحین اور جمہور فقہاء اور اکثر متکلمین یا یوں کہو کہ بہت سے متکلمین کا مذہب یہ ہے کہ حادثہ

في كل حادثة حكما معينا قد سمناه عفوا لكن اكثر اصحاب ابي حنيفة و بعض المعتزلة يسمون هذا الاشبه ولا يسمون حكما وهم يقولون ما حكم الله به لكن لو حكم لما حكم الا به فهو عندهم في نفس الامر حكم بالقوة وحدث بعد المائة الثالثة فرقة من اهل الكلام زعموا انه ليس عند الله حق معين هو مطلوب المستدل الا فيما فيه دليل قطعي يمكن المجتهد في معرفته فاما ما فيه دليل قطعي لا يمكن من معرفته او ليس فيه الا ادلة ظنية فحكم الله على كل مجتهد ما ظنه وترتب الحكم على الظن لترتب اللذة على الشهوة فكما ان كل عبد يلتذ بادراك ما يشتهيه وتختلف اللذات باختلاف الشهوات كذلك كل مجتهد حكمه ما ظنه وتختلف الاحكام ظاهرا وباطنا باختلاف

میں خدا کا حکم معین ہے جس کا نام ہم نے عفو رکھا ہے اور اکثر حنفیہ اور بعض معتزلہ اس کو اشبہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور اس کو وہ حکم نہیں کہتے بلکہ یوں کہتے ہیں کہ گو خدا تعالیٰ نے اُس حادثہ میں صاف حکم نہیں فرمایا لیکن اگر وہ حکم دیتے تو اس کے سوا حکم نہ دیتے تو ان لوگوں کے نزدیک نفس الامر میں حکم معین ہے مگر بالقوۃ پھر تیسری صدی کے بعد ایک جماعت متکلمین کی ایسی پیدا ہوئی جس کا یہ خیال ہے کہ بجز ان مسائل کے جن کے واسطے کوئی ایسی دلیل قطعی پہلے سے موجود ہو جس کی معرفت پر مجتہد پوری طرح قادر ہے باقی تمام مسائل میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے کوئی حکم معین نہیں۔ تو جن مسائل میں کوئی دلیل قطعی پہلے سے موجود تھی مگر مجتہد اس کی معرفت پر قادر نہ تھا یا سرے سے بجز ادلہ ظنیہ کے کوئی دلیل قطعی موجود ہی نہیں تھی تو ایسی صورت میں ہر مجتہد نے جو رائے اپنے اجتہاد سے قائم کی بس خدا کے نزدیک بھی مسئلہ کا حکم وہی ہے اور اس تقدیر پر مجتہد کی رائے پر حکم کا ترتب ایسا ہی ہوگا جیسا کہ لذۃ کا ترتب شہوۃ پر ہوتا ہے تو جیسا کہ ہر آدمی

الظنون وزعموا انه ليس على الظنون ادلة كادلة العلوم وانما تختلف خلاف احوال الناس وعاداتهم وطباعهم وهذا القول خبيث يكاد فساده يعلم بالاضطرار عقلا و شرعا وقوله صلى الله عليه وسلم فلا تنزلهم على حكم الله فانك لا تدري ما حكم الله فيهم وقوله لسعد لقد حكمت فيهم بحكم الله من فوق سبعة ارقعة وقول سليمان اللهم اني اسئلك حكما يوافق حكمك كلها يدل على فساد هذا القول مع كثرة الا دلة السمعية والعقلية على فساده (ص ۱۷۷، ج ۳)

کی جو خواہش ہو اُسی کے حاصل ہونے سے اس کو لذت حاصل ہوتی ہے اور لوگوں کی خواہشات کے اختلاف سے لذات بھی مختلف ہوتی ہیں اسی طرح ان لوگوں کے نزدیک کسی مجتہد نے جو خیال کسی مسئلہ میں قائم کر لیا خدا کا حکم بھی اس کے لئے وہی ہے۔ اور مجتہدین کے خیالات کے اختلاف سے احکام خداوندی بھی ظاہراً و باطناً مختلف ہوں گے اور ان لوگوں کا گمان یہ ہے کہ مسائل ظنیہ میں دلائل کا حال وہ نہیں جو مسائل یقینیہ میں ہوتا ہے اور ظنیات لوگوں کے حالات و عادات اور طبائع کے اختلاف سے مختلف ہوتے رہتے ہیں (حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں) کہ اس جماعت کا خیال ایک گندہ خیال ہے جس کا فساد اور بطلان از روئے عقل بھی اور از رو شریعت بھی قریب قریب بے ساختہ طور پر معلوم ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ اُن کو اللہ کے حکم پر مت اتارو کیونکہ تمکو کیا معلوم ہے کہ اللہ کا حکم ان کے بارہ میں کیا ہے اور نیز آپ کا وہ ارشاد جو حضرت سعدؓ کو فرمایا کہ بلاشبہ تم نے اُن کے بارہ میں وہ فیصلہ کیا جو حق تعالیٰ نے سات آسمانوں کے اوپر سے کیا تھا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا یہ سوال کہ اے اللہ میں تیرے سے ایسے حکم کا خواستگار ہوں جو تیرے حکم کے موافق ہو۔ یہ سب باتیں بہت سی ادلہ عقلیہ اور سمعیہ کی معیت میں اس خیال کے بطلان کی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔

شیخ محی الدین نووی لکھتے ہیں :-

وقد اختلف العلماء فی ان کل مجتہد مصیب ام المصیب واحد وھو من وافق الحکم الذی عند اللہ تعالیٰ والاٰخر مخطئ لا اثم علیہ لعذرہ والاصح عند الشافعی واصحابہ ان المصیب واحد (صفحہ ۱۶۹ ج ۲)

اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ آیا (مسائل مختلف فیہا میں) ہر ایک مجتہد مصیب ہے یا فقط ایک اور وہ وہی جس کی رائے اس حکم کے موافق پڑ جائے جو اللہ کے نزدیک پہلے سے متعین ہے۔ اس صورت میں دوسرا مخطی ہوگا۔ لیکن گناہگار نہ ہوگا کیونکہ وہ معذور تھا تو امام شافعی اور ان کے پیرووں کا صحیح ترین مسلک یہی ہے کہ مصیب کوئی ایک ہوتا ہے۔

شیخ الاسلام حافظ ابن حجر "انما انا بشر وانہ یاتینی الخصم فلعل بعضکم ان یکون ابلغ من بعض" الحدیث کے تحت میں لکھتے ہیں۔

وفیہ ان المجتہد قد یخطئ فیرد بہ علے من زعم ان کل مجتہد مصیب وفیہ ان المجتہد اذا اخطاء لا یلحقہ اثم بل یوجر کما سیاتی۔ (فتح الباری صفحہ ۱۳۲ ج ۱۳)

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ مجتہد سے کبھی کبھی خطا بھی ہوتی ہے تو یہ حدیث صحیح ان لوگوں کے رد میں پیش کی جائے گی جو کہتے ہیں کہ ہر ایک مجتہد مصیب ہی ہوتا ہے اور اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مجتہد اگر خطا بھی کر جائے تب بھی گنہگار نہیں ہوتا بلکہ ماجور ہوتا ہے جیسا کہ اسکا بیان آگے آتا ہے۔

اور باب ما یذکر من ذم الرائے میں تحریر فرماتے ہیں :-

والی ھذا یومی قول الشافعی فیما اخرجہ البیہقی بسند صحیح الی احمد

اور اسی کی طرف اس قول میں اشارہ موجود ہے جو بیہقی نے بسند صحیح بحوالہ امام احمد بن حنبل نقل کیا

بن حنبل سمعت الشافعی یقول القیاس عند الضرورۃ ومع ذلک فلیس لعامل براءۃ علی نفسہ من اللہ وقع علی المراد من الحکم فی نفس الامر وانما علیہ بذل الواسع فی الاجتہاد لیوجر ولو اخطاء وباللہ التوفیق (فتح الباری صفحہ ۲۵۰ جلد ۱۳)

ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ میں نے امام شافعی کو یہ کہتے سنا کہ قیاس ضرورت کے وقت جائز ہے مگر ساتھ ہی قیاس اور اسی پر عمل کرنے والے کو یہ وثوق نہیں ہو سکتا کہ اس کی رائے ٹھیک اس حکم پر جا پہنچی ہو جس کا فی الواقع حق تعالیٰ نے ارادہ فرمایا ہے بس اس کا کام تو اتنا ہے کہ اجتہاد میں اپنی پوری طاقت صرف کرے ثواب حاصل کرے خواہ اس اجتہاد میں وہ مخطی کیوں نہ ہو۔

پھر باب اجر الحاکم اذا اجتہاد فاصاب او اخطاء میں "اذا حکم الحاکم فاجتہد ثم اصاب فلہ اجران واذا حکم فاجتہد ثم اخطاء فلہ اجر" کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ای ظن ان الحق فی جہۃ فصادف ان الذی فی نفس الامر بخلاف ذلک فالاول لہ اجران اجر الاجتہاد واجر الاصابۃ والاٰخر لہ اجر الاجتہاد فقط وقد تقدمت الاشارۃ الی وقوع الخطاء فی الاجتہاد فی حدیث ام سلمۃ انکم تختصمون الی ولعل بعضکم ان یکون الحن بحجتہ من بعض ۱۲۔ (فتح الباری ص ۲۶۸ جلد ۱۳)

یعنی مجتہد نے خیال کیا کہ حق اس طرف ہے اور اتفاق ایسا ہوا کہ نفس الامر میں حق اس کے جانب مخالف میں تھا تو پہلے مجتہد کے (جس پر حق واضح ہو گیا) دو اجر ہیں۔ ایک اجتہاد (کوشش) کا اور ایک اصابۃ (یعنی حق کو پا لینے کا) اور دوسرے مجتہد کو فقط اجتہاد کا ثواب ملے گا۔ باقی یہ کہ اجتہاد میں خطا بھی واقع ہوتی ہے۔ اس کی طرف ام سلمہ کی حدیث انکم تختصمون الی الخ کی تحت میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔

پھر ابوبکر ابن العربی کا یہ قول نقل فرمایا ہے۔

تعلق بهذا الحديث من قال ان الحق في جهة واحدة للتصريح بتخطئة واحد لا بعينه ۔ (فتح الباری ص ۲۷ ج ۱۳)

اس حدیث سے ان لوگوں نے استدلال کیا ہے جو کہتے ہیں کہ حق کسی ایک ہی طرف ہوتا ہے کیونکہ حدیث میں وعلی التعیین کسی ایک کے تخطیہ کی تصریح موجود ہے

اس کے بعد حافظ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک قول علامہ مازری کا نقل کیا ہے جس کو میں ذیل میں درج کروں گا۔

لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ جو لوگ حق عند اللہ واحد مانتے ہیں اور المجتہد یخطی ویصیب کے قائل ہیں۔ وہ جیسا کہ اس مسئلہ معینہ کے اعتبار سے یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس خاص مسئلہ میں حق عند اللہ ایک جانب ہے۔ اسی طرح مجموعہ مسائل اجتہادیہ کے لحاظ سے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ حق عند اللہ فریقین کے اندر منحصر ہے یعنی دونوں سے باہر نہیں اگر بعض مسائل میں ایک مجتہد مصیب اور دوسرا مخطی ہے تو دوسرے بعض مسائل میں اس کا عکس ہو گا۔ اس اعتبار سے حق جانبین میں رہے گا۔ بلکہ خاص ایک معین مسئلہ کے اعتبار سے بھی اگر الحق فی الطرفین کا اطلاق کر دیں تو اس معنی سے صادق ہو سکتا ہے کہ حق ان دونوں سے خارج نہیں بلکہ انہیں دونوں میں منحصر اور دائر ہے اگرچہ تعیین مخطی اور مصیب کا بشخصہ نہ کیا جا سکے پس علامہ مازری کے سیاق عبارات میں تامل کرنے سے ان شاء اللہ تعالیٰ یہی مفہوم ہوتا ہے کہ جس مذہب کو انہوں نے الحق فی الطرفین کے عنوان سے نقل کیا ہے وہ یہی مذہب ہے جو مجتہد کو مخطی اور مصیب دونوں تسلیم کرتا ہے کیونکہ جیسا کہ آپ عبارت میں ملاحظہ فرمائیں گے۔ اس کے مقابل میں وہ دوسری جماعت قائم کر رہے ہیں جس کا مسلک کل مجتہد مصیب ہے اور اسی ترتیب

سے پھر دلائل بیان کئے ہیں چنانچہ حافظ لکھتے ہیں کہ:

قال المازری تمسك به (ای بالحديث (اذا حكم الحاكم فاجتهد الخ) كل من الطائفتين من قال ان الحق في الطرفين ——— ومن قال ان كل مجتهد مصيب اما الاولى فلانه لو كان كل مصيبا لم يطلق على احدهما الخطأ لاستحالة النقيضين في حالة واحدة واما المصوبة فاحتجوا بانه صلى الله عليه وسلم جعل لكل اجرا فلو كان لم يصب لم يوجر واجابوا عن اطلاق الخطأ في الخبر على من ذهل عن النص واجتهد فيما لا يسوغ الاجتهاد فيه من القطعيات فيما خالف الاجماع فان مثل هذا ان اتفق له الخطاء فيه نسخ حكمه و فتواه ولو اجتهد بالاجماع وهو الذي يصح عليه اطلاق الخطأ واما من اجتهد في قضية ليس فيها نص

علامہ مازری نے فرمایا کہ اس حدیث (اذا حکم الحاکم فاجتہد الخ) سے دونوں فریق استدلال کرتے ہیں وہ بھی جو یہ کہتا ہے کہ حق دونوں طرف دائر ہے (کسی مسئلہ میں اس طرف ہوتا ہے کسی میں اس طرف) اور وہ بھی جس کے نزدیک ہر مجتہد مصیب ہے (یعنی حق ہر ایک مسئلہ میں اس طرف بھی ہے اور اس طرف بھی) پہلا فریق کہتا ہے کہ اگر ہر مجتہد مصیب ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک پر خطا کا اطلاق کیوں فرماتے حالانکہ دو نقیضین (خطا اور ثواب) ایک حالت میں جمع نہیں ہو سکتیں۔ اور دوسرا فریق جو ہر ایک مجتہد کی تصویب کرتا ہے اس کا ماخذ یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے کیواسطے بھی ایک ثواب مقرر فرمایا ہے اور اگر وہ مصیب نہ ہوتا ثواب بھی نہ ملتا۔ باقی حدیث میں جو لفظ خطا کا اطلاق واقع ہوا ہے۔ اس کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ یہ ان صورتوں کے ساتھ مخصوص ہے جن میں کوئی نص موجود تھی اور مجتہد کو اس سے ذہول ہوا یا اس نے کسی ایسے مسئلہ میں اجتہاد کیا جس میں اجتہاد کی گنجائش نہ تھی مثلاً وہ قطعیات جیسے

والاجماع فلا يطلق عليه الخطاء و اطال المازری فی تقرير ذلك والانتصار له وختم كلامه بان قال ان من قال ان الحق فی الطرفين هو قول اكثر اهل التحقيق من الفقهاء والمتكلمين و هو مروی عن الائمة الاربعة وان حكی عن كل منهم اختلاف فيه ۔ ا ھ

(فتح الباری ص ۲۶۹ ج ۱۳)

انکار سے اجماع کی مخالفت ہوتی ہے۔ پس اگر اس قسم کی غلطی مجتہد سے اتفاق ہو جائے تو اس کا حکم اور فتویٰ والا اجماع ناقابل عمل ہے اگرچہ اس نے پوری ہمت سے اجتہاد کیا ہو۔ اور اسی قسم کی غلطی پر خطا کا اطلاق کرنا صحیح ہے۔ باقی جس مجتہد نے کسی ایسے معاملہ میں قیاس کیا جو نہ منصوص ہے اور نہ مجمع علیہ ہے اس پر خطا کا اطلاق صحیح نہیں اس کے بعد مازری نے اس مسلک کی تقریر اور حمایت میں طویل کلام کرنے کے بعد ان الفاظ پر اپنے بیان کو ختم کیا ہے کہ فقہاء اور متکلمین میں سے اکثر اہل تحقیق کا یہی قول ہے کہ حق طرفین میں دائرہ ہے اور یہی مذہب ائمہ اربعہ سے منقول ہے اگرچہ ان سے اس بارہ میں کچھ اختلاف بھی نقل کیا گیا ہے۔

پس اس عبارت میں الحق فی الطرفین کا لفظ دیکھ کر یہ شبہ نہ پیدا ہونا چاہیے کہ علامہ مازری سب مصنفین کے خلاف جمہور فقہاء و متکلمین اور ائمہ اربعہ سے تعدد حق کا قول نقل کر رہے ہیں۔ کیونکہ جیسا کہ میں نے گذارش کیا۔ وحدۃ حق کے ماننے والوں سے بھی اپنے مذہب کے بیان کرنے میں اس عنوان (الحق فی الطرفین) کا اختیار کر لینا چنداں مستبعد نہیں ہے خصوصاً جبکہ سیاق و سباق سے اس کی کافی تشریح ہو سکتی ہو۔ اور بالفرض اگر ایسا ہی ہے جیسا کہ آپ کو شبہ گذرتا ہے تو یہ نقل تمام مصنفین کی نقل کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ الغرض ہمارے اوپر کے بیان سے جمہور اہل سنۃ کا مسلک آپ کو معلوم ہو گیا کہ باعتبار حکم نفس الامری اور حق عند اللہ کے

مجتہد مخطی بھی ہوتا ہے اور مصیب بھی بالخصوص جبکہ یہ اجماعی مسئلہ ہے کہ مسائل منصوصہ میں حق عند اللہ واحد ہوتا ہے اور یہ بھی مسلم ہے کہ ان الحکم الا اللہ کے اقتضا کے موافق قیاس مظہر حکم ہے مثبت حکم نہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ مجتہد فیہ مسائل میں جو کہ عند التامل شارع ہی کی طرف منسوب ہیں وحدۃ حق کا انکار کیا جائے۔

حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ عقد الجید میں جس کے ابتدائی صفحات ہمارے معروضات کے خلاف شبہات پیدا کر سکتے ہیں، صفحہ ۳۲ پر لکھتے ہیں۔

واذا تحقق عندك ما بيناه علمت ان كل حكم يتكلم فيه المجتهد باجتهاده منسوب الى صاحب الشرع عليه الصلوٰة والسلام اما الى لفظه او الى علة ماخوذة من لفظه وان كان الامر على ذلك ففی كل اجتهاد مقامات احدها ان صاحب الشرع هل اراد بكلامه هذا المعنى او غيره وهل نصب هذه العلة مدارا فی نفسه حين ما تكلم بالحكم المنصوص عليه اولا فان كان التصويب بالنظر الى هذا المقام فاحد المجتهدين لا بعينه مصيب دون الآخر۔ وثانيها ان من جملة

اور جبکہ وہ باتیں جو ہم نے پہلے بیان کی ہیں تمہارے نزدیک محقق ہو گئیں تو تم نے یہ بھی سمجھ لیا ہو گا کہ ہر ایک ایسا حکم جس پر مجتہد اپنے اجتہاد کی قوت سے کلام کرتا ہے وہ منسوب شارع علیہ السلام ہی کی طرف ہو گا یا تو شارع کی صریح الفاظ کی طرف اس کی نسبت ہو گی اور یا کسی ایسی علت کی طرف جو شارع کے الفاظ سے نکالی گئی ہو۔ اور جب قصہ یوں ہے تو کہ مجتہد کے بتائے ہوئے کل احکام شارع علیہ السلام کی طرف منسوب ہیں۔ یعنی یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ خود شارع نے تنقیحاً یا تعلیلاً یہ احکام دیئے ہیں) تو اب یہاں دو درجے ہیں۔ پہلا درجہ یہ ہے کہ آیا فی الحقیقت شارع نے اپنے کلام سے اسی معنے کا ارادہ کیا تھا جو مجتہد نے سمجھے ہیں یا اس کے سوا کوئی اور معنے مراد



احکام الشرع انہ صلی اللہ علیہ وسلم عہد الی امتہ صریحا او دلالۃ انہ متی اختلف علیہم نصوصہ او اختلف علیہم معانی نص من نصوصہ فہم مامورون بالاجتہاد واستفراغ الطاقۃ فی المعرفۃ ما ہو الحق من ذلک فاذا تعین عند مجتہد شیء من ذلک وجب علیہ اتباعہ کما عہد الیہم انہ متی اشتبہ علیہم القبلۃ فی اللیلۃ الظلماء یجب ان یتحروا او یصلوا الی جہۃ وقع تحریہم علیہا فہذا حکم الشرع بوجود التحری کما علق وجوب الصلوۃ بالوقت وکما علق تکلیف الصبی ببلوغہ فان کان البحث بالنظر الی ہذا المقام نظر فان کانت المسئلۃ مما ینقض فیہ اجتہاد المجتہد فاجتہادہ باطل قطعا وان کان فیہا احادیث

تھے اور آیا حکم منصوص کا جب شارع نے تکلم فرمایا تو اپنے دل میں اسی علت کو اس نے حکم کا مدار ٹھہرایا تھا جس کو مجتہد نے قرار دیا ہے یا اور کچھ تو اس درجہ میں کوئی ایک ہی مجتہد مصیب ہو سکتا ہے (یعنی جس کا اجتہاد شارع کی مراد اور مقصود کے موافق ہو) دوسرا درجہ یہ ہے کہ منجملہ احکام شریعت کے ایک یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحۃً یا دلالۃً اپنی امت کو یہ وصیت فرمائی ہے کہ جب ان کو اپنے نبی کے نصوص مختلف معلوم ہوں یا ایک ہی نص کے معانی میں اختلاف پیش آئے تو وہ مامور ہیں کہ حق کے دریافت کرنے میں اجتہاد سے کام لیں اور اپنی پوری پوری طاقت اس میں صرف کریں اس کے بعد جب ایک مجتہد کے نزدیک کوئی ایک بات متعین ہو جائے تو اس پر اسی کا اتباع واجب ہے۔ جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو یہ وصیت فرمائی کہ جب اندھیری رات میں (مثلاً) قبلہ مشتبہ ہو جائے تو اول خوب تحری کریں پھر جس طرف تحری سے قبلہ متعین ہو اسی کی طرف کو نماز پڑھ لیں تو یہ ایک ایسا حکم ہے

صحیح وقد حکم بخلافہ فاجتہادہ باطل ظنا وان کان المجتہدان جمیعا قد سلکا ما ینبغی لہما ان یسلکاہ ولم یخالفا حدیثا صحیحا ولا امرا ینقض اجتہاد القاضی والمفتی فی خلافہ فہما جمیعا علی الحق (ای بالنظر الی المقام الثانی لما مر حرفیا تقدم ان المصیب واحد لا بعینہ بالنظر الی المقام الاول)

جس کو شریعت نے تحری پر معلق رکھا ہے جس طرح نماز کی فرضیت وقت کے آنے پر معلق ہے اور کسی لڑکے کا مکلف ہونا اس کے بالغ ہونے پر معلق ہے۔ پس (اگر مجتہد کے مخطی اور مصیب ہونے کی بحث) اس درجہ میں آکر ہو تو دیکھا جائے گا کہ یہ مسئلہ ان مسائل میں سے تو نہیں جن میں مجتہد کا اجتہاد ٹوٹ جاتا ہے اگر ایسا ہو تو اس کا اجتہاد قطعاً باطل ہوگا اور اگر اس مسئلہ میں کوئی حدیث صحیح اور مجتہد کا حکم اس کے خلاف ہوا تو ظن غالب یہ ہے کہ اس کا اجتہاد باطل ہے اور اگر دونوں مجتہد اس مسلک پر چلے، جس پر انکو چلنا چاہیے تھا اور کسی حدیث صحیح کی انہوں نے مخالفت بھی نہیں کی اور نہ کسی ایسی امر کا خلاف کیا جس کے خلاف میں قاضی اور مفتی کا اجتہاد قائم نہیں رہ سکتا۔ تو اس صورت میں دونوں مجتہد حق پر ہوں گے (یعنی باعتبار درجہ ثانیہ کے کیونکہ درجہ اولیٰ کے اعتبار سے تو کسی ایک مجتہد کے مصیب ہونے کی تقریر پہلے ہو چکی ہے)

شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ اپنے فتاوی میں لکھتے ہیں:-

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اخبر ان الحاکم المجتہد المخطی لہ اجر والمصیب لہ اجران

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو آگاہ فرمایا کہ حاکم مجتہد جب مخطی ہو تو اس کے لئے ایک اجر ہے اور مصیب ہو تو دو اجر ہیں۔



ولو كان كل منهما اصاب حكم الله باطناً وظاهراً لكان سواء ولم ينقض حكم الحاكم والمفتي اذا تبين ان النص بخلافه وان كان لم يبلغه من غير قصور ولا تقصير ولما قال النبي صلى الله عليه وسلم فانك لا تدري ما حكم الله فيهم ولما قال لسعد لقد حكمت فيهم بحكم الملك ان كان كل مجتهد بحكم بحكم الله وارتفاع اللوم بحديث المختلفين في صلوٰة العصر في بني قريظة وحديث الحاكم۔

(صفحہ ۱۷۹ جلد ۳)

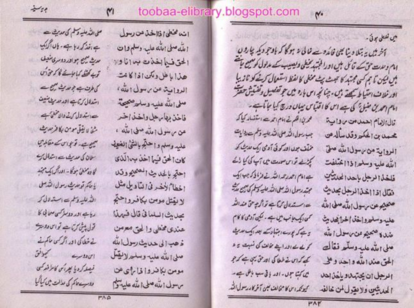
اور اگر دونوں مجتہدوں میں سے ہر ایک کی رسائی ظاہراً و باطناً ٹھیک ٹھیک اللہ تعالیٰ کے حکم تک ہو جاتی تو پھر دونوں کا اجر بھی مساوی ہوتا اور حاکم اور مفتی کا قول اس صورت میں نہ ٹوٹ سکتا جب کہ یہ ظاہر ہو جائے کہ نص صریح اُس کے مخالف ہے مگر مجتہد کو وہ نہیں پہنچی باوجودیکہ اس کی طرف سے کسی قصور اور کوتاہی کا اظہار نہیں ہوا اور اگر ہر مجتہد کا حکم اللہ کا ہی حکم ہوتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی یہ ارشاد نہ فرماتے کہ تو نہیں جانتا کہ اللہ کا حکم ان کے بارہ میں کیا ہے اور حضرت سعد سے یوں خطاب نہ فرماتے کہ تو نے ان کے متعلق وہ فیصلہ کیا جو بادشاہ کا فیصلہ تھا (رہی یہ بات کہ جب کہ دو مجتہدوں میں سے کوئی ایک خطا پر ہوا تو مخطی پر کچھ ملامت کیوں نہیں ہو سکتی) اس کا جواب اس حدیث میں ہے جس کے اندر عصر کی نماز بنی قریظہ میں پڑھنے نہ پڑھنے کی بابت صحابہ کرام کا اختلاف بیان ہوا ہے۔

اور شیخ ابن ہمام تحریر الاصول میں لکھتے ہیں:۔

بل الدليل اطلاق الصحابة الخطأ في الاجتهاد شائعاً مشكوراً بلا نكير كعلي وزيد بن ثابت وغيرهما من مخطئة ابن عباس في ترك العول وهو اي ابن عباس خطأهم في القول به وقول ابي بكر في الكلالة اقول برائي فان يكن صواباً فمن الله وان يكن خطأ فمني ومن الشيطان وعن ابن مسعود مثل قول ابي بكر ففي سنن ابي داود عنه فان يك صواباً فمن الله وان يك خطأ فمني ومن الشيطان والله ورسوله بريئان وقول عمر في المجهضة ان كانا قد اجتهدا فقد اخطأ عثمان وعبد الرحمن بن عوف اه مع حذف من زيادة

(ص ۳۰۹ ج ۳)

بلکہ بڑی دلیل مجتہد کے مخطی ہونے کی یہ ہے کہ صحابہ صراحۃً خطأ فی الاجتہاد کا اطلاق کرتے تھے اور باوجودیکہ یہ بات اُن میں عام تھی۔ لیکن کسی صحابی کا اس پر انکار کرنا مسموع نہیں ہوا۔ دیکھو ترک عول کے مسئلہ میں حضرت علی اور زید بن ثابت وغیرہ نے حضرت عبداللہ بن عباس کو خطا پر بتلایا اور ابن عباس عول کے قائل ہونے پر ان حضرات کا تخطیہ کرتے تھے اور کلالہ کے مسئلہ میں حضرت صدیق اکبر نے فرمایا کہ یہ مسئلہ میں اپنی رائے سے بیان کرتا ہوں اگر وہ درست ہو تو اللہ کی طرف سے ہے اور درست نہ ہو تو میری طرف سے اور شیطان کے دخل سے ہے اور اسی طرح کا قول ابن مسعود کا سنن ابی داؤد میں موجود ہے کہ اگر یہ مسئلہ صحیح ہے تو حق تعالیٰ کی ہدایت سے ہے، ورنہ اس کو میری طرف سے اور شیطان کی طرف سے سمجھو۔ کیونکہ اللہ اور اس کا رسول ایک غلط بات سے بری ہے، اور فاروق اعظم نے مجہضہ کے مسئلہ میں فرمایا کہ اگر عثمان اور عبدالرحمن بن عوف نے اجتہاد کیا ہے تو ان سے اس اجتہاد



میں غلطی ہوئی۔

آخر میں یہ بتلا دینا بھی فائدہ سے خالی نہ ہوگا کہ باوجودیکہ چاروں امام وحدت حق کے قائل ہیں اور المجتہد یخطی ویصیب کے مدلول کو صحیح جانتے ہیں لیکن تاہم کسی مجتہد کا جہت پٹ مخطی کا لفظ استعمال کرنے کو نازیبا اور خلاف احتیاط سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اس بارہ میں جو تفصیل و تفتیش حضرت امام احمد بن حنبلؒ کی ہے اس کا اقتباس یہاں درج کیا جاتا ہے۔

قال الامام احمد من روایة محمد بن الحکم وقد سأله عن الروایة من رسول الله صلی الله علیه وسلم اذا اختلفت فلخذ الرجل باحد الحدیثین فقال اذا اخذ الرجل بحدیث صحیح عن رسول الله صلی الله علیه وسلم واخذ اخر بحدیث ضده صحیح عن رسول الله صلی الله علیه وسلم فقال الحق عند الله واحد وعلی الرجل ان یجتهد و یاخذ احد الحدیثین ولا یقول لمن خالفه

محمد بن الحکم نے امام احمد سے استفسار کیا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایات مختلف ہوں اور کوئی آدمی ایک حدیث کو پکڑلے تو اس صورت میں آپ کی کیا رائے ہے امام احمد رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جب ایک مجتہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح حدیث سے استدلال کرتا ہے تو اگرچہ حق عند اللہ کسی ایک جانب میں ہے۔ لیکن آدمی کا کام یہ ہے کہ پورے اجتہاد کے بعد ایک حدیث کو لے اور اپنے مخالف کی نسبت یہ نہ کہے کہ اس نے خطا کی اور حق یہی ہے کہ جو میں کہتا ہوں۔ اور باقی سب باطل ہے۔ کیونکہ اس کا مخالف بھی آخرکار رسول اللہ

انه مخطی اذا اخذ عن رسول الله صلی الله علیه وسلم وان الحق فیما اخذت به انا و هذا باطل ولکن اذا کانت الروایة عن رسول الله صلی الله علیه وسلم صحیحة فاخذ بها رجل واخذ اخر عن رسول الله صلی الله علیه وسلم واحتج بالشیئ الضعیف کان الحق فیما اخذ به الذی احتج بالحدیث الصحیح وقد اخطأ الاخر فی التاویل مثل لا یقتل مومن بکافر واحتج بحدیث السلمانی قال فهذا عندی مخطی والحق مع من ذهب الی حدیث رسول الله صلی الله علیه وسلم لا یقتل مومن بکافر واذا رای عن رسول الله صلی الله علیه وسلم

صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے ہے اخذ کر رہا ہے۔ ہاں اگر ایک حدیث صحیح ہو اور دوسری ضعیف تو بے کھٹکے کہا جائے گا کہ حق اُس کی طرف ہے جو حدیث صحیح سے استدلال کرتا ہے اور حدیث ضعیف سے استدلال کرنے والا مخطی ہے مثلاً لا یقتل مومن بکافر حدیث صحیح ہے۔ تو جو اس کے مقابلہ میں سلمان کی حدیث سے استدلال کرے گا وہ مخطی ہوگا۔ اور اگر ایک مجتہد یا حاکم تو حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے استدلال کر رہا ہے اور دوسرا کسی صحابی کا قول پیش کرتا ہے تو اس دوسرے نے خطا کی اور اگر کسی حاکم نے اس دوسرے کیموافق فیصلہ کردیا پھر اُس کا مرافعہ کسی دوسرے حاکم کی عدالت میں کیا گیا

حدیث واحتج رجل وحاکم عن اصحاب رسول الله صلی الله علیه وسلم کان قد اخطأ التاویل وان حکم به حاکم ثم رفع الی حاکم آخر ردہ الی حکم رسول الله صلی الله علیه وسلم واذا اختلف اصحاب محمد صلی الله علیه وسلم و اخذ آخر عن رجل آخر من اصحاب رسول الله صلی الله علیه وسلم فالحق عند الله واحد وعلی الرجل ان یجتهد وهو لا یدری اصاب الحق ام اخطأ وهکذا قال عمر والله ما یدری عمر اخطأ ام اصاب ولکن انما کان رایا منه قال واذا اختلف اصحاب رسول الله صلی الله علیه وسلم و اخذ رجل بقول اصحاب رسول

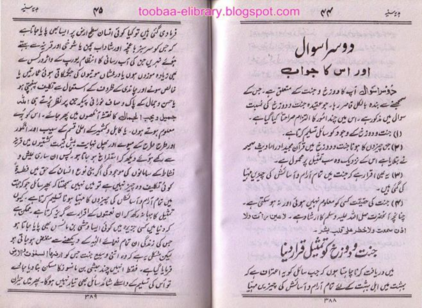
ہے۔ تو یہ دوسرا حاکم پہلے کے فیصلے کو توڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کی طرف لوٹا دے گا اور اگر ایک شخص ایک صحابی کے قول کی سند پکڑتا ہے اور دوسرا دوسرے صحابی کے قول سے۔ تو خدا کے نزدیک حق پر کوئی ایک ہے۔ لیکن انسان کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے اجتہاد کو کام میں لائے، اور اس وقت اس کو یہ معلوم نہیں ہوگا کہ وہ خطا پر ہے یا صواب پر ہے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے ایسا ہی فرمایا کہ عمر نہیں جانتا کہ وہ خطا پر ہے یا صواب پر۔ البتہ ایک رائے اس کی تھی (جو بیان کر دی گئی) امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ اگر ایک شخص تو صحابہ کے اقوال سے استدلال کرتا ہے اور

الله علیه وسلم واخذ آخر بقول التابعین کان الحق فی قول اصحاب رسول الله صلی الله علیه وسلم ومن قال بقول التابعین کان تاویله خطاء والحق عند الله واحد۔

دوسرا اس کے جواب میں تابعین کے اقوال سے تو حق صحابہؓ کے اقوال کی طرف ہوگا۔ اور اُس وقت تابعین کے اقوال سے احتجاج کرنا غلطی ہوگی۔ اور بہرحال حق اللہ کے نزدیک کسی ایک طرف ہے۔

(فتاویٰ ابن تیمیہ صفحہ ۲۸۹ جلد ۳)

امام احمدؒ کے اس کلام سے اندازہ کرو کہ ایسے بڑے بڑے جلیل القدر اور رفیع المنزلۃ ائمہ یہ یقین رکھنے کے باوجود کہ ہر مسئلہ میں حق صرف ایک ہو سکتا ہے پھر بھی اپنے مخالف کے تخطیہ میں کس قدر محتاط تھے چنانچہ جو کچھ بھی حسن ظن ائمہ کرام کی نسبت آج باقی ہے۔ وہ ان ہی پاک نفس بزرگواروں کی احتیاط اور بے تعصبی اور فراخدلی اور حسن تادب کا نتیجہ ہے۔ برّد الله مضاجعهم ونور الله قبورهم وافاد علینا شآبیب برکاتهم آمین ٭ وقد بقی خبایا فی الزوایا ترکنا ابرازها مخافة التطویل والله یقول الحق وهو یهدی السبیل وحسبنا الله ونعم الوکیل ٭ فقط۔



دوسرا سوال

اور اس کا جواب

دوسرا سوال آپ کا دوزخ و جنت کے متعلق ہے۔ جس کے سمجھنے سے بندہ بالکل قاصر رہا۔ جو عقیدہ جنت و دوزخ کی نسبت سوال میں مذکور ہے۔ اس میں چند امور کا التزام صراحتاً کیا گیا ہے۔

(۱) جنت و دوزخ کے وجود کو سائل تسلیم کرتا ہے۔

(۲) جن چیزوں کا ہونا جنت و دوزخ میں قرآن مجید اور احادیث صحیحہ نے بتلایا ہے اس کے نزدیک وہ سب تمثیل پر محمول ہے۔

(۳) یہ بھی اقرار ہے کہ جنت میں تمام آرام و آسائش کی چیزیں مہیا کی گئی ہیں۔

(۴) جنت کی حقیقت کسی کو معلوم نہیں ہوئی اور نہ ہو سکتی ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ لا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر۔

جنت و دوزخ کو تمثیل قرار دینا

میں دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ جب سائل کو یہ اعتراف ہے کہ بہشت میں اہل بہشت کے لئے تمام آرام و آسائش کی چیزیں مہیا

فرما دی گئی ہیں تو کیا کوئی انسان سطح ارض پر ایسا بھی پایا جاتا ہے کہ جس کو سرسبز باغیچہ اور شاداب چمن یا شوخی اور قرینہ سے بہتے ہوئے نہریں جن کی آب رسانی کا انتظام یورپ کے واٹر ورکس سے بھی زیادہ موزوں ہوں یا درخشاں موتیوں کی جگمگاتی ہوئی عمارتیں یا خالص سونے اور چاندی کے ظروف کے استعمال سے تکلیف پہنچتی ہو یا حسن و جمال کے پاک و صاف نورانی پیکر جن پر نظر پڑتے ہی اللہ جمیل و یحب الجمال کا نقشہ آنکھوں میں پھر جائے۔ اس کو بُرے معلوم ہوتے ہوں۔ یا کابل و کشمیر کے اعلیٰ قسم کے سیب اور انگور اور طرح طرح کے میوے اور پھل نہایت بیش قیمت کشتیوں میں قرینہ سے رکھے ہوئے دیکھ کر استفراغ ہو جاتا ہو۔ پس ان ساری عیش و نشاط کے سامانوں کی موجودگی اگر بنی نوع انسان کے حق میں فطرۃً کوئی تکلیف وہ چیز نہیں ہے تو میں نہیں سمجھتا کہ پھر سائل جو کہ جنت میں تمام آرام و آسائش کی چیزوں کا مہیا ہونا تسلیم کرتا ہے۔ کیوں تمثیل کا بہانہ رکھ کر ان نعمتوں کے اقرار سے گریز کرتا ہے، ممکن ہے کہ دنیا میں کسی جزیرہ میں کوئی ایسا وحشی بن مانس بھی پایا جاتا ہو جس کی زندگی ان تمام نعمائے الٰہیہ کے دیکھنے سے منغص ہو جاتی ہو لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ اتنی وسیع جنت جس کو ارضہا السموٰت والارض فرمایا گیا ہے۔ فقط انہیں چند حبشی بن مانسوں کا مسکن بنا دیا جائے تو اس کی تسلیم کے واسطے شائد سائل بھی تیار نہیں ہوگا۔ پھر میں حیران

ہوں کہ جن چیزوں کے وجود کی تمام انبیائے سابقین خبر دیتے چلے آئے۔ قرآن اور حدیث نے اس کی تصدیق پر مہر کی قرن صحابہ سے لے کر تیرھویں صدی کے ملحدوں کے زمانہ تک تمام اہل اسلام اسکی تصدیق کو جزو ایمان سمجھتے رہے۔ تمثیل کے ایک عیارانہ حیلہ سے کس طرح اُن کی نفی کی جا سکتی ہے۔

سوال میں جس شخص کا عقیدہ بیان کیا گیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی اس ابلیس کی وحی کو پوری طرح ضبط نہ کر سکا۔ جس نے یہ لکھا تھا کہ ان تمام جنت کے بیان سے تمثیلاً ایک اعلیٰ قسم کی راحت کی طرف اشارہ کرنا ہے جس کو کوئی عبارت نہیں سمجھا سکتی اس نے یہ لفظ نہیں لکھے کہ جنت میں تمام آرام و آرائش کی چیزیں مہیا کی گئی ہیں۔ وہ گرگ باراں دیدہ تھا جانتا تھا کہ ایسا لکھنے سے تمام ظواہر نصوص پر ایمان رکھنا ضروری ہوا جاتا ہے۔ سوال میں جس شخص کی نسبت استفسار کیا گیا ہے وہ مسکین" ایک قسم کی راحت اور تمام آرام و آسائش کی چیزیں" ان دونوں عبارتوں میں فرق کو ملحوظ نہیں رکھ سکا۔ حالانکہ اب اس کی عبارت خود اس کو ملزم کرتی ہے۔ اور اس کے کلام کی تہافت پر صاف شہادت دیتی ہے۔ پس میں ایسی نو آموز اور خام مرید سے کیا خطاب کروں۔ جو اپنے اعتقاد کو خود بھی واضح طور پر سمجھا ہوا نہیں ہے یا بیان نہیں کر سکتا اسکے عقیدہ کا ماخذ اس وقت میرے سامنے ہے۔ کبھی دل چاہتا ہے کہ حرفاً حرفاً جواب لکھ کر

آپ کے پاس بھیجدوں لیکن بندہ کے پاس وقت زیادہ نہیں۔ محض آپ کی خاطر عزیز جان کر یہ چند سطور لکھی ہیں۔ اور چند اور لکھتا ہوں۔

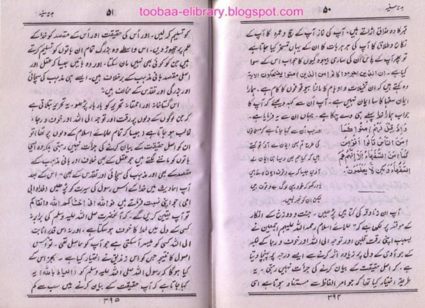
وہ شخص جس کی کتاب اس وقت میرے سامنے رکھی ہے۔ اگر جاہل تھا تو کیا آپ کے علم کو بھی اُس کے جہل کی ظلمت نے اپنے اندر چھپا لیا۔ آپ نے لکھا ہے کہ جنت کی حقیقت نہ کسی کو معلوم ہوئی اور نہ ہو سکتی ہے۔ کیونکہ مخبر صادق نے فرمایا ہے۔ لاعین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علیٰ قلب بشر آپ مجھ کو بتلائیے کہ اس حدیث صحیح کے سن لینے کے بعد آپ نے خود جنت کے وجود سے ہی کیوں انکار نہ کر دیا۔ جب خطر علیٰ قلب بشر کو اس قدر عام تسلیم کرتے ہیں۔ تو بہر حال یہ عقیدہ کہ جنت ہے اور اس میں اعلیٰ قسم کی راحت موجود ہے۔ اس قدر ایمان رکھنے کے واسطے بھی تو یہ ضرور ہے کہ جنت اور اس کی اعلیٰ قسم کی راحت کا کسی نہ کسی طرح تصور آئے اور جب کسی طرح سے بھی اُن کا تصور آیا تو خطور علیٰ قلب بشر صادق ہو جائے گا۔ کیونکہ خطور بالبال عام ہے۔ اجمالی ہو یا تفصیلی بالکنہ و بکنہہ ہو یا بالوجہ اور بوجہ۔ اب اگر آپ خطور کے معنے میں کوئی تخصیص کریں گے۔ تو آپ کے حریف کو بھی اجازت ہوگی، کہ وہ اپنے مذاق کے موافق اس کی تخصیص کرلے۔ اس کے علاوہ، آپ عنب و رمان اور حور و قصور کی آیتوں کو جب تمثیل پر محمول فرماتے ہیں تو ظاہر ہے کہ لفظی تمثیل سے مراد آپ کی تشبیہ ہے

اور تشبیہ کا حاصل اس کے سوا کیا ہے کہ مشبہ اور مشبہ بہ میں کوئی وصف جامع ہو حتی کہ اگر اُس وصف جامع کا ادراک مخاطب کو نہ ہو تو وہ تشبیہ اس کے حق میں اس سے زیادہ کار آمد نہیں ہو سکتی ہے جتنا کہ ایک اندھے کے حق میں کھیر کی تشبیہ بگلے کے سر سے تو کار آمد ہوئی تھی۔

پس اس وصف جامع کے ادراک سے جو کہ مشبہ اور مشبہ بہ یا مثال اور ممثل لہ میں ضرور ہوتا ہے یہ لازم ہو گا کہ جنت کی نعمتوں کا تصوّر اس وصف جامع سے ہو جائے حالانکہ خطور بالبال کی مشکل پھر اس وقت ناقابل حل رہ جائے گی۔ اگر آپ یہ کہیں کہ ولاخطر علیٰ قلب بشر سے یہ مراد ہے کہ نعمائے جنت کی کنہ اور ماہیت کسی کے دل پر نہیں گذری تو اس سے یہ کیوں لازم آیا کہ آپ ان کے وجود جسمانی کا انکار کر دیں۔ کیا جس چیز کی حقیقت معلوم نہ ہو۔ مثلاً خود حق تعالےٰ شانہٗ تو اس کے وجود کی بھی نفی کر دینی چاہیئے پھر تو سب سے اول خدا ہی کی نفی کی جاوے تاکہ نہ قرآن کو ماننا پڑے اور نہ رسول کو اور نہ جنتؔ و دوزخ کا مصنوعی اقرار کر کے خدا پر احسان رکھا جاوے۔ میں جانتا ہوں کہ شاید ہزاروں چیزیں محسوسات میں ایسی ہوں گی کہ اُن کی حقیقت آپ کو اور مجھ کو بلکہ تمام حکمائے متفلسفین کو معلوم نہ ہوگی اور میں تو یہاں تک بدگمان ہوں کہ جن چیزوں کی حقیقت معلوم

ہو جانے کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ وہ بھی محک امتحان پر شاید ہی کھرا ثابت ہو سکے۔

بہر کیف جن چیزوں کی حقیقت جاننے سے حکمار کی زبانیں بھی عجز کا اعتراف کرنے لگی ہیں کیا ان کے وجود سے آپ انکار کر سکتے ہیں۔ تو پھر میں نہیں سمجھا کہ جنت کی جسمانی نعمتیں کیوں آپکو ایسی بری معلوم ہوتی ہیں کہ ان کی حقیقت معلوم نہ ہونے کی وجہ سے آپ ان کی ہستی ہی اڑائے دیتے ہیں۔ یہاں اگر کسی چیز کے وجود کی خبر حواس نے دی ہے تو اُن کی خبر حواس سے زیادہ سچے مخبر کے پاس سے قطعی طور پر پہنچ چکی ہے۔ میرا خیال ہے کہ جنت کی جسمانی نعمتوں کا انکار کرتے وقت اس کے دل میں بھی گدگدیاں ضرور اٹھی ہوں گی اور خواہ آپ کتنا ہی اس ہوس کو بیہودہ سمجھیں لیکن اس تمنا سے دل آپ کا بھی خالی نہ ہوگا کہ کاش ایسا ہی ہو جاتا جیسا کہ یہ مولوی کہتے ہیں۔ پر آپ کا دل یورپ کے ملحدوں سے ڈرا ہوا ہے اور اس شخص کے تمسخر نے آپ کو اور زیادہ کھسیا کر رکھا ہے۔ اس لئے آپ اس بات کا انکار کرتے ہیں۔ جس کی تمنا دل میں لئے ہوئے ہیں۔ حالانکہ ان ملاحدہ سے آپ کہاں تک ڈریں گے۔ خدا کی ہستی کا وہ مذاق اڑاتے ہیں نبوت اور وحی کا وہ مذاق اڑاتے ہیں۔ فرشتوں اور شیاطین کا وہ مذاق اڑاتے ہیں۔ مر کر زندہ کئے جانے کا وہ مذاق اڑاتے ہیں۔ عذاب



قبر کا وہ مذاق اڑاتے ہیں۔ آپ کی نماز آپ کے حج وعمرہ کا آپ کے نکاح وطلاق کا آپ کی ہر ہر بات کا ان کے یہاں تمسخر کیا جاتا ہے تو پھر آپ کے پاس اُن کی ساری بیہودگیوں کا جواب اس کے سوا کیا ہے۔ ان الذین اجرموا کانوا من الذین امنوا یضحکون الایۃ وہ کہتے ہیں کہ ان تخیلات واوہام کا ماننا بیوقوفوں کا کام ہے۔ ہمارا ایمان سفہا کا سا ایمان نہیں ہے۔ آپ اُن سے کہہ دیجیے کہ آپ کا جواب ہمارا خدا پہلے ہی دے چکا ہے۔ جہاں ان سے یہ فرمایا ہے۔

وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ۔

اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں کی طرح تم بھی ایمان لے آؤ تو کہتے ہیں کہ کیا ہم بھی ویسا ہی ایمان لے آویں جیسا کہ بے وقوف ایمان لائے ہیں یاد رکھو کہ خود یہی لوگ بے وقوف ہیں لیکن ان کو خبر نہیں۔

آپ ان زنادقہ کی کتابیں پڑھیں۔ جنت و دوزخ کے انکار کے موقعہ پر لکھا ہے کہ " علمائے اسلام رحمہ اللہ علیہم اجمعین نے بسبب اپنی رقت قلبی اور توجہ الی اللہ اور خوف و رجا کے غلبہ کے جو آدمی کے دل پر زیادہ اثر کرنے سے ایسے درجہ پر پہنچا دیتا ہے۔ کہ اصل حقیقت کے بیان کرنے کی جرأت نہیں رہتی۔ یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ جو امر الفاظ سے مستفاد ہوتا ہے اسی

کو تسلیم کر لیں۔ اور اُس کی حقیقت اور اُس کے مقصد کو خدا کے علم پر چھوڑ دیں۔ اس واسطے وہ بزرگ تمام ان باتوں کو تسلیم کرتے ہیں جن کو کوئی بھی نہیں مان سکتا۔ اور وہ باتیں جیسا کہ عقل اور اصلی مقصد بانی مذہب کے برخلاف ہیں۔ ایسے ہی مذہب کی سچائی اور بزرگی اور تقدس کے مخالف ہیں"

اس گستاخانہ اور احمقانہ تحریر کو بار بار پڑھو۔ یہ تحریر بتلاتی ہے کہ جن لوگوں کے دلوں پر رقت اور توجہ الی اللہ اور خوف و رجا، غالب ہو جاتا ہے (جیسا کہ تمام علمائے اسلام کے دلوں پر تھا) تو ان کو اصل حقیقت کے بیان کرنے کی جرأت نہیں رہتی بلکہ وہ ایسی باتوں کو ماننے لگتے ہیں جو عقل کے بھی خلاف اور بانی مذہب کے مقصد کے بھی اور مذہب کی سچائی اور تقدس کے بھی" اس کے بعد آپ احادیث میں خدا کے اس رسول کی سیرت کو پڑھیں (فداہ ابی امی) جو اپنی نسبت فرماتے ہیں فواللہ انی اخشاکم اللہ واتقاکم تو آپ یقین کریں گے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی برابر نہ کسی کے دل میں خدا کا خوف ہو سکتا ہے۔ اور نہ اس قدر انابت الی اللہ کسی کو میسر آ سکتی ہے جو آپ کو حاصل تھی۔ تو اس اصول کا نتیجہ جس کو اس زندیق نے اختیار کیا ہے۔ بجز اس کے کیا ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو (العیاذ باللہ) یہ کہا جاتا ہے کہ آپ حقیقت کے بیان کرنے میں سب سے کم

جرأت کر سکتے ہوں گے اور جو کچھ فرماتے ہوں گے وہ علمائے اسلام سے بھی زیادہ لوگوں کی عقل کے خلاف اور مقصود خداوندی کے منافی ہوگا۔ کبرت کلمۃ تخرج من افواھھم ان یقولون الا کذبا (الآیۃ) تکاد السموٰت یتفطرن منہ وتنشق الارض وتخر الجبال ھدا (الآیۃ)

بلاشبہ ان لوگوں کی تحریرات کا منشا یہ ہے کہ جس شخص کا دل خوف سے خالی ہو قسوۃ اور غفلت عن اللہ اس پر چھا گئی ہو شیطان کے تسلط نے اس کو پورا بیباک اور شوخ بنا دیا ہو تو شاید وہ اصل حقیقت اور صداقت کا اظہار نہایت جرأت کے ساتھ کر سکتا ہے۔ اور صرف اس سے یہ امید کی جا سکتی ہے کہ وہ خداوند رب العزت کی صحیح صحیح مراد کو سمجھ کر تمام مخلوق کو خدا کے دین کی طرف متوجہ کر سکے اور ان کے دلوں میں اس کا سچا منشا اتار سکے۔ بے شک ایسا ہی ہوتا اگر تاریکی روشنی کو پیدا کر سکتی اور بول و براز سے عطر کشید کیا جا سکتا۔ اور جب ایسا نہیں تو کہہ دو کہ ما یستوی الاعمیٰ والبصیر ولا الظلمات ولا النور ولا الظل ولا الحرور وما یستوی الاحیاء ولا الاموات الآیۃ۔

اس موقع پر میرے واسطے سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ ان لوگوں کی ایسی گستاخانہ اور جاہلانہ تحریروں سے بعض فہمیدہ اہل علم کو کیوں شبہات پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایک کور چشم بے بصیرت نے اتنا

لکھ دیا کہ لاخطر علیٰ قلب بشر سے نعمائے جسمانی کی نفی ہوتی ہے اور قرآن مجید کی سینکڑوں آیات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیسیوں احادیث تمثیل پر محمول ہیں تو اہل علم کو اس سے پوچھنا تھا کہ لاخطر علیٰ قلب بشر سے کیا مراد ہے۔ اگر بالکل عام ہے تب تو یہ غلط ہے جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔ اور اگر کسی خاص قسم کے خطور کی نفی کی گئی ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جنت میں سے خواہی نخواہی جسمانی لذائذ کو خارج کیا جاوے۔

تماشا ہے کہ نعمائے جسمانی کے منکر اس کو تو جائز رکھتے ہیں کہ سینکڑوں آیات اور روایات کو ان کے حقیقی معانی سے پھیر کر تمثیل پر عمل کر لیں۔ مگر ایک ولاخطر علیٰ قلب بشر ایسا جملہ ہے کہ اس میں کسی طرح ادنیٰ تصرف بھی جائز نہ رکھا جاوے حالانکہ محاورات کے موافق اس میں کچھ بھی اشکال نہیں۔

مثال سے اس کی تشریح

اگر سلطان المعظم کسی معمولی عالم کی دعوت کر دیں تو اس کو پورا یقین ہوگا کہ وہاں ضرور پر تکلف کھانے تیار ملیں گے۔ اور اپنی معلومات کے اندازہ کے موافق اس نے کچھ فہرست بھی کھانوں کی ضرور اپنے ذہن میں سوچ رکھی ہوگی۔ بلکہ یہی

فرض کرو کہ کھانوں کی فہرست لکھی ہوئی پہلے ہی سے اُس کے پاس مطبخ سلطانی سے پہنچ گئی تھی۔ مگر جب دستر خوان پر پہنچا تو بعض کھانے اس نے ایسے پائے جو اس نے پہلے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھے تھے۔ اور بعض ایسے پائے کہ جن کا تجربہ ہوا تھا مگر وہاں اُن کی ترکیب ہی کچھ اور تھی۔ اور لذت اور مزہ ہی دوسرا تھا۔ پھر ایوان سلطانی میں عجب عجب طرح کے تکلفات اُس کو نظر پڑے جنہوں نے اس کی آنکھیں خیرہ کر دیں۔ اور سلطان المعظم نے اس کا اس قدر تپاک سے خیر مقدم اور احترام کیا کہ وہ بالکل مبہوت ہو گیا۔ اب وہ شخص وہاں سے واپس آکر اگر اپنے، ہمنشینوں سے یہ کہے کہ ایوانِ سلطانی میں اس طرح کے تکلفات اور الوانِ طعام اور لذیذ غذائیں مہیا تھیں۔ اور سلطان نے میری اس قدر تکریم اور عزت افزائی کی جس کا میرے دل میں خطرہ اور وہم و خیال بھی نہ گذرا تھا تو اس کے معنے اس کے سوا کیا ہیں۔ کہ اعزاز و اکرام اور مدارات کا وہ انتہائی درجہ جو اس نے ایک ایسے بڑے باجاہ و جلال بادشاہ کے دربار میں دیکھا وہ اس کے حوصلہ اُمید سے باہر تھا اور اس کی توقعات کی پرواز وہاں تک کبھی نہ پہنچی تھی اگرچہ نفس اعزاز اور مدارت کا اُس کو پہلے سے یقین تھا، تاہم یہ کیفیت اور ایسا شاندار سماں اپنے اعزاز و احترام کا اس کے خیال میں نہ تھا۔ اسی طرح یاد رکھیے

کہ جن میووں اور پھلوں وغیرہ کے نام نعمائے جنت کی فہرست میں لئے گئے ہیں اگرچہ آدمی کتنی ہی پرواز اُن کی اعلیٰ کیفیات کے سمجھنے کے لئے کرے لیکن چونکہ اس کی پرواز اس کی محسوسات کے ذائقہ تک محدود ہے اس وجہ سے اس کے خیال و خطرہ میں بھی جنت کے پھلوں کی اعلیٰ سے اعلیٰ کیفیت نہیں آسکتی فرض کرو کہ ایک شخص نے مسقطی حلوا کبھی نہ کھایا اور نہ کبھی دیکھا ہو اب اگر اس کے سامنے حلوائے مسقطی کی تعریف کرے تو اگرچہ وہ اتنا یقین کرے گا کہ وہ کوئی قسم حلوے کی ہے اور کھانے کی چیز ہے لیکن اس کی صورت اور رنگ اور مزے کی جو کچھ اجمالی وساوس و خطرات آئیں گے تو اپنی ماکولات کے اندازہ کے موافق آئیں گے۔ خواہ وہ کتنا ہی اپنے خیال کو آگے بڑھانا چاہے اب اگر اُس کو کبھی اتفاق سے حلوائے مسقطی کھانے کی نوبت آجاوے اور اس وقت وہ مزہ لے کر بول اُٹھے کہ یہ مزہ اور لذت تو خیال اور گمان میں بھی نہ تھا تو ظاہر ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس اعلیٰ لذت تک خیال کی رسائی نہیں ہوسکی تھی نہ یہ کہ اس کے نفس مزہ اور لذت کا تصور بوجہ ماہیٔ نہ تھا۔ فرض کرو کہ اخبار ٹائمز کا ایک نامہ نگار جس کی نظر دُنیا کے تمام عظیم الشان لڑائیوں کی تاریخ پر تھی یہ لکھ کر بھیجے، کہ آج جو حملہ جرمنی نے وردُون پر کیا جس کی اطلاع ہمارے

جاسوسوں نے پہلے سے دی تھی کہ حملہ ہونے والا ہے اور اسیطرح جو مقاومت فرانس نے اس حملہ کی کی اور جس شدت کی جنگ ہوئی اور جس زور کا رن پڑا نہ آنکھوں نے کبھی دیکھا تھا اور نہ کانوں نے سنا تھا اور نہ دل میں اس طرح کا کبھی خیال اور خطرہ گذرا تھا تو غالباً لاخطر علیٰ قلب بشر سے نعمائے جنت کا انکار کرنے والے یہاں بھی شاید یہ کہنے لگیں کہ اس جملہ سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ وردُن پر جنگ ہی نہیں ہوئی کوئی ایسا مجہول الکنہ اور نامعلوم الحقیقت واقعہ یورپ میں پیش آیا ہوگا۔ جس کے ہولناک ہونے کو لنڈن ٹائمز کے نامہ نگار نے اس تمثیل میں بیان کیا ہے کیونکہ جب وردُن پر دشمن کے حملہ آور ہونے کے ارادہ پر پہلے سے یقینی اطلاع ہو چکی تھی تو یہ کہنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ اس حملہ کا خیال اور وہم بھی نہ تھا دل میں تو یہ حملہ خطور کر چکا تھا اگرچہ کتنی ہی کم حیثیت میں کیوں نہ ہو۔

اب آپ ہی انصاف سے فرما دیں کہ ان سب مثالوں میں پہلے سے دل میں خطور نہ ہونے کے کیا معنی ہیں اگر وہی معنے ولاخطر علیٰ قلب بشر میں لئے جاویں تو کیا مضائقہ ہے۔ اس کے بعد میں وہ بات کہتا ہوں کہ جس سے بحث کا خاتمہ ہو جائے اور مصنف فہیم کے لئے انشاء اللہ العزیز قیل و قال کی گنجائش نہ رہے۔ جس حدیث سے منکرین احتجاج کر رہے ہیں اس

کے الفاظ یہ ہیں اعددت لعبادی الصالحین مالا عین رأت ولا اذن سمعت ولاخطر علیٰ قلب بشر۔ جس کا ترجمہ صرف اس قدر ہے کہ میں نے اپنے نیک بندوں کے واسطے ایسی چیز تیار کی ہے۔ جس کو نہ آنکھ نے دیکھا ہے اور نہ کان نے سنا اور نہ کسی آدمی کے دل میں اس کا خطور ہوا۔ "بیش ازیں نیست" کہ اس سے جنت میں ایسی چیز کا موجود ہونا ثابت ہوا کہ جن کی یہ حالت ہے لیکن یہ کس لفظ سے نکلتا ہے کہ ایسی چیز کے سوا جس کے یہ اوصاف ہیں اور کوئی چیز جنت میں نہیں جس کو فرض کیجئے۔ آنکھ نے دیکھا ہو یا کان نے سنا ہو یا دل میں اسکا خیال گذرا ہو یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ آپ کو کوئی مدعو کرے۔ اور یہ کہے کہ آج ہم نے تمہارے لئے ایسی چیز تیار کی ہے جو تم نے کبھی نہ کھائی ہوگی۔ اس کا کسی کے نزدیک یہ مطلب نہیں، کہ بس اس چیز کے سوا دستر خوان پر کوئی ایسی چیز نہ آئے گی۔ جو آپ نے کبھی کھائی ہو۔ ایک سوداگر یہ کہے کہ میری دُکان پر آج کل اس قسم کے کپڑے آئے ہوئے ہیں جو آج تک آپ نے کبھی نہ دیکھے ہوں گے تو ہرگز یہ مراد نہیں کہ دکان میں اُن کے سوا ایسے تھان نہ ہوں گے۔ جن کو ہم نے کبھی دیکھا ہو۔

اسی طرح اگر یہاں سمجھا جائے تو کیا حرج ہے، کہ جنت

ہیں ایسی نعمتیں بھی ہیں کہ جن کا من وجہ خطور پہلے ہُوا ہو اور ایسی بھی جو کبھی مدت العمر خیال میں نہ آئی ہوں باقی جنت کی نعمائے جسمانیہ کا تمسخر کر کے ایک غیر مہذب بھانڈ کا فرض انجام دیا گیا ہے تو اس کا جواب ہمارے پاس کچھ نہیں، بجز اس کے کہ ان تسخروا منا فانا نسخر منکم کما تسخرون فسوف تعلمون من یاتیہ عذاب یخزیہ۔ و یحل علیہ عذاب مقیم۔

یہ عجیب بات ہے کہ یہ لوگ زبان سے خدا کے وجود اور اس کے غیر محدود قدرت رکھنے اور کتاب اللہ کو ماننے کے باوجود کس طرح جسارت کر کے اس کی لامحدود قدرت و حکمت کو اپنی عقل کی کلھیا میں بند کر دیتے ہیں۔ نہ معلوم جنت میں، کون سی چیز ایسی ہے جس کا پیدا کرنا اس قادر قیوم کے لئے آسمانوں اور زمین اور چاند سورج اور سمندر اور پہاڑوں سے بھی زیادہ دشوار ہے یا آگ پانی کا ایک کرہ یا آگ کا ایک کرہ اور ایک طبقہ پیدا کرنا سراسر اس کی حکمت اور دانائی کو ظاہر کرتا ہے اور پھر ان کے تھوڑے تھوڑے اجزاء کو محفوظ کر کے آدم کا خمیر بنانا اس حکمت کے اظہار میں اور چار چاند لگاتا ہے تو اسی طرح اگر اس دنیا میں اُس نے راحت و تکلیف کو مخلوط پیدا فرمایا اور ان دونوں کے واسطے ایک ایک کرہ اور مخزن علیحدہ علیحدہ بنا دیا کہ جو جسمانی اور روحانی خوشی

اور راحت اور عیش کا خزانہ ہے اس میں کسی تکلیف کا نام اور نشان نہ آنے پائے اور جو رنج اور تکلیف اور مصیبت کا خزانہ ہے اس میں راحت کا اور خوشی کا شائبہ نہ پایا جا سکے۔ تو کیوں حکمت کا خلاف ٹھہرے گا۔

مولانا رومیؒ کی ایک مثال

مولانا جلال الدین رومی نے سچ فرمایا ہے کہ یہی جنت اور اس کی نعمتوں کا انکار کرنے والے جب رحم مادر میں تھے اُس وقت اُن سے اگر کوئی جا کر کہتا کہ اس تنگ و تاریک کوٹھڑی سے تم باہر نکلو اور یہ حیض کا ناپاک خون کھانا چھوڑ دو۔ تم کو باہر ایک ایسا وسیع زمین و آسمان نظر پڑے گا کہ جس کی وسعت سے تمہاری اس حجرے کی نسبت ایک اور کروڑ کی بھی نہ ہو گی، اور جب تم یہ ناپاک غذا (دم طمث) چھوڑ دو گے۔ تو تم کو نہایت خوش رنگ اور خوش ذائقہ لطیف غذا دی جائے گی۔ جس کے بعد تم اس غذا کو کبھی نہ یاد کرو گے تو یہ منکرین ہی انصاف سے بتلا دیں کہ کیا وہ رحم مادر میں ان باتوں کو باور کر سکتے تھے۔ وہ نیچے اوپر اِدھر اُدھر نظر دوڑاتے اور رحم کی جھلی کے سوا کچھ نہ دیکھتے جن غذاؤں کا اُن سے وعدہ کیا جاتا تھا۔ وہ یہ ہی کہتے جو جنت کے کھانوں کی نسبت کہتے ہیں کہ یہ سب تمہارے



خیالات و اوہام ہیں نہ اس مکان سے وسیع کوئی مکان ہے، اور نہ اس غذا کے سوا کوئی غذا ہے۔ لیکن حق تعالیٰ شانہ نے اپنی قدرت بالغہ سے ان کو بطن مادر سے باہر نکالا اور انہوں نے وہ سب چیزیں دیکھ لیں جن کی اُن کو خبر دی جاتی تھی اور اب کوئی تردد اس میں باقی نہ رہا۔ پس ٹھیک ٹھیک یہی مثال ہمارے نزدیک ان تنگ نظروں اور کور باطنوں اور دنیا کے بدمستوں کی ہے۔ یہ ہرگز ان چیزوں کو تسلیم نہ کریں گے۔ جب تک کہ اُن کو دیکھ نہ لیں گے۔ اسی خیال کے شخص کی تاریخ کا مصرعہ ہمارے استاد دام فیضہ نے کیا ہی خوب کہا ہے۔ ؏

مانتے جس کو نہیں تھے پیچھے پہنچے وہاں

اب میں اس جواب کو ختم کرتا ہوں۔ کیونکہ بندہ کو فرصت زیادہ نہیں ہے۔ اخیر میں اتنا اور گذارش کرتا ہوں کہ آپ نے جو ایسے شخص کا شرعاً حکم دریافت کیا ہے جو یہ عقیدہ رکھتا ہو اس کا استفتا حضرت مفتی صاحب سے کریں۔ بندہ تو فقط ایک عبارت حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی لکھے دیتا ہے جو حجۃ اللہ البالغہ میں ہے عالم مثال کے ذکر میں جو احادیث لائے ہیں اُن کے ماننے والوں کے انہوں نے تین درجہ کئے ہیں جن میں تیسرا یہ ہے۔

او یجعلها تمثیلاً لتفهم معان — یا ان احادیث کو تمثیل پر محمول کیا جائے۔

اخری ولست اری المقتصر علی الثالثۃ — جس سے دوسرے معانی کی تفہیم مقصود ہے۔

من اهل الحق وقد صرح الامام الغزالی فی عذاب القبر تلک المقامات الثلث حیث قال و امثال هذه الاخبار لها ظواهر صحیحۃ واسرار خفیۃ ولکنها عند ارباب البصیرۃ واضحۃ فمن لم ینکشف له حقائقها فلا ینبغی ان ینکر ظواهرها بل اقل درجات الایمان التسلیم و التصدیق ۱۰ (حجۃ اللہ البالغہ ص۱۳)

اور میں ایسے شخص کو جو اس تیسرے درجہ پر مقصد رہے اہل حق میں شمار نہیں کرتا اور امام غزالی نے بھی عذاب قبر کے بیان میں یہ تینوں وجہیں بیان کئے ہیں جہاں یہ فرمایا ہے کہ اس قسم کے اخبار کے ایک تو ظاہر معنی ہیں جو صاف ہیں اور ایک ان کے دقیق اسرار ہیں جو اہل بصیرۃ کے نزدیک واضح ہیں۔ تو جس شخص پر وہ حقائق منکشف نہ ہوں اس کو یہ مناسب نہیں کہ وہ ظواہر کا بھی انکار کر بیٹھے۔ بلکہ کم از کم ایمان یہ ہے کہ ان کو تسلیم کرے اور ان کی تصدیق کرے۔

میرے اس سارے خط کو آپ مہربانی فرما کر ہمارے خانصاحب محترم اور محبی مولوی محمد عرفان صاحب کو ضرور سنا دیں اگر کچھ اصلاح فرماویں تو مطلع کر دیں۔ والسلام اور ان دونوں صاحبوں سے بہت بہت سلام بندہ کا عرض کر دیں۔ اور بعض الفاظ جو آپ کو خطاب کرکے تیز لکھے گئے ہیں ان سے فی الحقیقت آپ مراد نہیں بلکہ وہ شخص مراد ہے جس کا یہ عقیدہ ہو فقط۔

الراقم

شبیر احمد عثمانی عفی اللہ عنہ از دار العلوم دیوبند

۲۰ ربیع الثانی ۱۳۳۶ھ ہجری

وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى (القرآن)

تحقیق الخطبہ

کیا خطبہ اردو زبان میں جائز ہے؟ خطبہ جمعہ اور جمعہ سے متعلق بعض اہم سوالات کے جواب

از

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ

ناشر

ادارہ اسلامیات ۱۹۰ انارکلی لاہور

تحقیق مسئلہ خُطبۂ جُمعہ

بزبان اُردو فارسی وغیرہ

کیا جمعہ کا خطبہ اُردو میں جائز ہے ؟

کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں ۔

(۱) زید کہتا ہے کہ خطبۃ الجمعۃ والعیدین بزبان عربی مسنون ہے ۔ زبان، اُردو یا دیگر غیر عربی زبانوں میں خطبہ پڑھنا سنت رسول اللہ اور صحابہ تابعین تبع تابعین، مجتہدین، محدثین، فقہاء امت کے طرز عمل کے خلاف ہے ۔ عمر کا دعویٰ ہے کہ خطبہ مذکور سامعین کی زبان ہونا چاہیئے ۔ خواہ زبان اُردو ہو یا فارسی، عربی ہو یا ترکی، جاپانی ہو یا انگریزی ۔ اور خطبہ کو سامعین کی زبان میں پڑھنا ہی عین ادائے سنت ہے ۔ کیونکہ خطبہ کی غرض وعظ و تذکیر اور احکام کا سنانا ہے اور یہ غرض زبان مروجہ ہی میں خطبہ پڑھنے سے حاصل ہوسکتی ہے ۔

عمرو یہ سوال بھی پیش کرتا ہے کہ عیدین کی نماز کے بعد جو خطبہ بزبان عربی پڑھا جاتا ہے ۔ اس کے پڑھتے وقت خطیب کے مخاطب آیا وہ انسان ہوتے ہیں جن کی طرف وہ منہ کرکے کھڑا ہوتا ہے یا اور کوئی مخلوق ؟ اور

یہ کہ عیدین کے متعلق جو مسائل و احکام بیان کرتا ہے ۔ اس سے غرض یہ ہوتی ہے کہ لوگوں کو مسائل و احکام سے آگاہی ہو یا اس کے سوا کچھ اور ۔

عمرو اپنے دعویٰ پر حسب ذیل کتب لغت ۔ احادیث ۔ فتاویٰ ، سے استدلال کرتا ہے اور کہتا ہے کہ مصباح المنیر میں ہے فیقال فی المواعظۃ خطب القوم غیاث اللغات میں ہے خطبہ آنچہ بحمد و نعت خطاب و نصیحت و وعظ خلق اللہ باشد ۔ کتاب ترغیب و ترہیب میں ابن ماجہ سے بسند حسن منقول ہے ۔ کہ عن ابی بن کعب رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرأ یوم الجمعۃ تبارک وھو قائم یذکر بایام اللہ فتاویٰ عالمگیری میں خطبہ کی سنتوں میں وعظ کرنا اور سمجھانا تحریر کیا ہے وقال صاحب الفتاوی الھندیۃ و اما سننھا فخمسۃ عشر ثم قال بعد ذالک وعاشرھا العظۃ والتذکیر ۔ درمختار ۔ باب العیدین میں ہے انما جعل الخطبۃ للتعلیم کفایہ میں ہے ولو خطب قاعدا او علی غیر طھارۃ اجزاہ لحصول المقصود وھو الوعظ والتذکیر اور فتاویٰ عالمگیری میں ہے ویکرہ للخطیب ان یتکلم فی حال الخطبۃ الا ان یکون امر بمعروف ہدایہ میں ہے فان اقتصر علی ذکر اللہ جاز عند ابی حنیفۃ وقال لابد من ذکر طویل یسمی خطبۃ لان الخطبۃ ھی الواجبۃ والتسبیحۃ والتحمید لا یسمی خطبۃ ہدایہ میں ہے ویخطب بعد الصلوٰۃ خطبتین یعلم الناس فیھا صدقۃ الفطر و احکامھا لانھا شرعت لاجلہ پس استدعا ہے کہ بدلائل شرعیہ و براہین عقلیہ تبلایا جاوے کہ خطبہ کے معنیٰ اور اس سے مقصود کیا ہے اور آیا وہ زبان عربی ہی پڑھنے سے پورا ہوسکتا ہے یا نہیں اور زبان غیر عربی

میں خلاف سنت ہے یا نہیں؟

(۱) مسلمان نمازی جو عربی سے ناواقف ہیں اور سورۂ قرآنی کے معنے کو نہیں سمجھتے وہ: کام شرعیہ کے مکلف ہیں یا نہیں؟ ان کی نماز ادا ہوتی اور اس پر ثواب ملتا ہے یا نہیں؟

(۲) جمعہ و عیدین میں کس حد تک سورۂ قرآنیہ تلاوت کرنا داخل سنت ہے اور کہاں تک مجاز ہے؟

(۳) جمعہ و عیدین میں سبح اسم ربك الاعلی اور هل اتاك حديث الغاشية پڑھنا اتباع سنت میں شامل ہے یا نہیں؟

(۴) طول قرائۃ لعذر ہے یا تخفیف قراۃ۔

(۵) قرأت وتلاوۃ قرآن پر حصول ثواب فہم معانی و مطالب پر موقوف و منحصر ہے یا نہیں؟

(۶) جو شخص قرآن کے معنی نہ سمجھے اُسے قرآن پاک پڑھنے کا ثواب ملتا ہے یا نہیں؟ بینوا بالدلائل وتوجروا

الجواب

خطبہ کا شرعی مفہوم

(۱) اولاً چند عبارتیں کتب فقہ سے ایسی نقل کی جاتی ہیں جن سے یہ ثابت ہو گا کہ فقہاء کرام نے کسی جگہ تو خطبہ کو محض ذکر قرار دیا ہے۔ اور کہیں شرف

موعظت و تذکیر۔ اس کے بعد کوئی عبارت ایسی درج کی جائے گی۔ جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ ان میں سے خطبہ کا اصلی موضوع لہ جس کے بغیر اس کا تقوم ہی نہ ہو سکے لغۃً اور شرعاً کیا ہے۔ اور جن امور زائدہ پر خطبہ کا اطلاق کیا گیا ہے وہ خطبہ کے مفہوم میں کس حد تک داخل ہو سکتے ہیں۔

فقہا کی عبارات

شمس الائمہ سرخسی فرماتے ہیں۔

ولنا ان الخطبة ذكر والمحدث والجنب لا يمنعان من ذكر الله ماخلا قرأة القران فى حق الجنب انتهى (كتاب المبسوط للسرخسى جلد ثانى ص۲۶ مصرى)	ہماری دلیل یہ ہے کہ خطبہ ذکر ہے اور محدث یعنی جو بغیر وضو ہو اور جنبی جس پر غسل جنابت واجب ہو اللہ کے ذکر سے منع نہیں کیے جاتے۔ البتہ قراۃ جنبی کو منع ہے۔
ولا ينبغى للامام ان يتكلم فى خطبة بشئ من حديث الناس لانه ذكر منظوم والتكلم فى خلاله يذهب بهائه (كتاب مبسوط جلد ۲ ص۲۹ مصرى)	امام کو لائق نہیں ہے کہ خطبہ میں کوئی ایسی کلام کرے جو لوگوں کی باہمی گفتگو کے مشابہ ہو۔ کیونکہ خطبہ ذکر منظوم کا نام ہے اور اس کے درمیان میں کلام کرنا خطبہ کی خوبی و رونق کو زائل کر دیتا ہے۔

اور یہی شمس الائمہ دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

والخطبة كلها وعظ وامر معروف (مبسوط ج ۲ ص۳۵)	اور خطبہ سب کا سب نصیحت اور امر بالمعروف ہے۔

ولانہ فی الخطبۃ یخاطبھم بالوعظ فاذا اشتغلوا بالکلام لم یفد وعظہ ایاھم شیئاً (مبسوط ج ۲ ص ۳ مصری)

اور اس لئے کہ امام خطبہ میں لوگوں کو نصیحت کیساتھ خطاب کرتا ہے اور جب لوگ باہم کلام میں مشغول ہونگے تو اس کا نصیحت کرنا ان کو کچھ مفید نہ ہوگا۔

وھکذا نقل عن ابی حنیفۃ رضی اللہ عنہ انما کان یفعلہ لان الخطیب یعظھم (مبسوط ج ۲ ص ۳ مصری)

امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایسا کرتے تھے اس لئے کہ خطیب ان کو نصیحت کرتا ہے۔

ذیل کی عبارت سے ثابت ہوگا کہ اگرچہ صاحبین رضی اللہ عنہما فقط ایک تسبیح یا تحمید وغیرہ کو خطبہ کے لئے کافی نہیں سمجھتے لیکن وہ بھی خطبہ کو مجرد ذکر ہی قرار دیتے ہیں۔ ہاں یہ شرائط لگاتے ہیں کہ وہ ذکر طویل ہو۔ اتنا قصیر نہ ہو کہ خطبہ کا اطلاق ہی اس پر نہ ہو سکے۔ ہدایہ میں ہے۔

فان اقتصر علی ذکر اللہ جاز عند ابی حنیفۃ رحمہ اللہ وقالا لابد من ذکر طویل یسمی خطبۃ

اگر امام نے فقط ذکر اللہ پر اکتفا کیا تو امام ابو حنیفہ کے نزدیک جائز ہے صاحبین کہتے ہیں کہ ذکر طویل ہونا ضروری ہے جس کو خطبہ کہہ سکیں۔

فتح القدیر میں ذکر طویل کی شرح میں لکھا ہے۔

قیل اقلہ عندھما قدر التشھد۔

کہا گیا ہے کہ ذکر طویل کا کمتر درجہ صاحبین کے نزدیک یہ ہے کہ تشہد کی قدر ہو۔

اور علامہ ابن عابدین نے رد المختار میں اسی قول کے تحت میں لکھا ہے۔

فی العنایۃ وھو مقدار ثلث آیات عند الکرخی وقیل مقدار التشھد۔

عنایہ میں ہے کہ ذکر طویل کی مقدار کرخی کے نزدیک تین آیتوں کی قدر ہے۔ بعض نے کہا کہ تشہد کی قدر۔

اور علامہ سید مرتضیٰ زبیدی حنفی احیاء العلوم کی شرح میں تحریر فرماتے ہیں۔

وعن ابی حنیفۃ یصح اقتصار فی الخطبۃ علی ذکر خالص للہ تعالیٰ نحو تسبیحہ او تھلیلۃ او تکبیرۃ مع الکراھۃ وھی التی یعتد بھا و یجزی ھذا الذکر عن خطبتین ولا یحتاج الی تسبیحتین وعن مالک روایتان کالمذھبین وقال ابو یوسف ومحمد لابد من ذکر طویل یسمی خطبۃ قیل اقلہ قدر التشھد الی قولہ عبدہ ورسولہ حمد وصلوٰۃ ودعا للمسلمین"

شرح احیاء العلوم مطبوعہ مصر جلد ثالث ص ۲۲۶

امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ خطبہ میں خالص ذکر پر اکتفا کرنا جائز ہے۔ مثل ایک دفعہ تسبیح یعنی سبحان اللہ کہنے یا تہلیل یعنی لا الٰہ الا اللہ کہنے اور تکبیر یعنی اللہ اکبر کہنے کے مگر کراہت کیساتھ اور یہی مقدار وہ ہے جس کا خطبہ میں اعتبار ہے۔ اور اسی قدر ذکر دونوں خطبوں کا قائم مقام ہو سکتا ہے اس کی ضرورت نہیں ہے کہ دو خطبوں کے لئے دو دفعہ تسبیح کرے۔ امام مالک سے دونوں مذہب کے موافق دو روایتیں ہیں۔ امام ابو یوسف اور امام محمد فرماتے ہیں کہ ذکر طویل ہونا چاہیے جو خطبہ کہا جا سکے بعض نے کہا کہ ذکر طویل کی مقدار تشہد کی مقدار ہے عبدہ ورسولہ تک کہ اسمیں حمد و صلوٰۃ بھی ہے اور مسلمانوں کیلئے دعا بھی۔

خطبہ کی حقیقت

اس طرح کی سینکڑوں عبارتیں کتب فقہ میں موجود ہیں جن کا استقصاً بے فائدہ ہے لیکن اب بعض ایسے اقوال نقل کرتا ہوں جن سے یہ ثابت ہوگا کہ خطبہ کی اصل حقیقت شرعاً ولغۃً مطلق ذکر سے زیادہ نہیں ہے بلکہ لغۃً تو ذکر اللہ کی بھی تخصیص نہیں مطلق کلام کو خطبہ کہتے ہیں۔ اگرچہ عرف عام میں

بعض دوسرے امور بھی جو کہ سنت کے درجہ میں ہیں اس کی ماہیت میں شامل کرلئے گئے ہوں۔ مجمع البحار میں ہے۔

خطب خطبة بالکسر والاسم ایضا بالکسر فاما بالضم فمن القول والکلام انتھی۔

خطب خطبۃ بکسر الخاء یعنی مصدر خطب کا خاء کی کسرہ کے ساتھ ہے اور اس کا اسم بھی خطبہ کی خاء کے کسرہ کے ساتھ ہے اور خطبہ کو خاء کے ضمہ کیساتھ پڑھیں تو اس کے معنی گفتگو اور کلام کے ہونگے۔

ذرا اور آگے چل کر لکھتے ہیں۔

وفیہ انا خطیبھم اذا انصتوا۔ ای انا المتکلم من الناس حین سکتوا عن الاعتذار فاعتذر بھم ولم یوذن لغیری فی التکلم انتھی۔

اور میں ان کا خطیب ہوں جب کہ وہ سکوت اختیار کریں یعنی تمام لوگوں میں کلام کرنے والا میں ہی ہوں گا جبکہ وہ اپنا عذر پیش کرنے سے ساکت ہو گے میں ان کے رب کے سامنے عذر پیش کروں گا سوائے میرے کسی کو بولنے کی اجازت نہ ہوگی۔

شمس الائمہ سرخسی فرماتے ہیں۔

ولان المنصوص علیہ الذکر قال اللہ تعالی فاسعوا الی ذکر اللہ وقد بینا ان الذکر بھا ای بالخطبۃ ثبت بالنص والذکر یحصل بقولہ الحمد للہ فمازاد علیہ شرط الکمال لاشرط الجواز وھو نظیر ماقال ابوحنیفۃ ان فرض القراءۃ یتادی بآیۃ

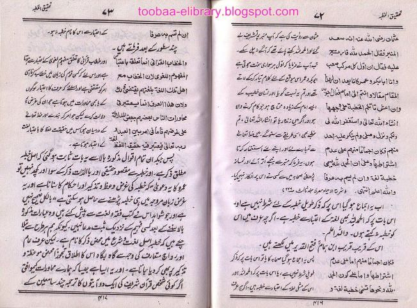
اس لئے کہ نص سے ذکر ہی ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے خدا کے ذکر کی طرف دوڑو۔ اور یہ ہم بیان کرچکے ہیں کہ خطبہ کے ساتھ ذکر نص سے ثابت ہے اور ذکر الحمد للہ سے بھی حاصل ہو جاتا ہے اس سے زائد کمال کی شرط ہے ذکر جواز کی۔ اور یہ نظیر ہے امام ابوحنیفہ کے اس قول کہ فرض قراۃ یعنی نماز میں ایک آیت سے ادا ہو جاتا ہے۔

واحلاۃ انتھی۔ (بسوط جلد ۲ ص ۳۱ مصری)

اور علامہ سید مرتضی زبیدی حنفی صاحب تاج العروس فی شرح القاموس تحریر فرماتے ہیں۔

ودلیل ابی حنیفۃ قولہ تعالیٰ فاسعوا الی الذکر اللہ فلم یفصل بین کونہ ذکرا طویلا اولا فکان الشرط الذکر العام بالدلیل القاطع غیر ان الماثور عنہ صلی اللہ علیہ وسلم اختیار احد الفردین اعنی الذکر المسمی بالخطبۃ والمواظبۃ علیہ فکان ذلک واجبا اوسنۃ لا انہ الشرط الذی لایجزی غیرہ اذ لا یکون بیانا لان الدلیل وھو لفظ الذکر المامور بالسعی الیہ لیس مجملا لیقع فعلہ صلی اللہ علیہ وسلم بیانا للمجمل فلم یکن فرضا تنزیلا للمشروعات علی حسب ادلتھا ویؤیدہ مارواہ قاسم بن ثابت السرقسطی فی غریب الحدیث عن

امام ابوحنیفہ کی دلیل ارشاد خداوندی فاسعوا الی ذکر اللہ ہے اس میں اس کی تفصیل نہیں کہ ذکر طویل ہو یا نہ ہو تو اب شرط جواز ذکر عام ہوگا۔ اس قطعی دلیل سے مگر ہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے کہ آپ ذکر کی دو فردوں طویل اور قصیر میں سے ایک فرد کو اختیار فرماتے یعنی ذکر طویل کو جس کو خطبہ اور موعظہ کہتے ہیں اور اسی پر مداومت بھی ثابت ہے تو یہ ذکر طویل واجب ہوگا یا سنت۔ یہ نہ ہوگا کہ سوائے ذکر طویل کے اور کوئی کافی نہ ہو۔ اور یہ آپ کا دائمی عمل بیان نہ ہوگا۔ کیونکہ دلیل یعنی لفظ ذکر جس کا خطبہ میں حکم ہے مجمل نہیں کہ آپ کا فعل اس کے لئے بیان ٹھہرے۔ پس ذکر طویل نہ ہوگا۔ یہ فرق ہم نے اس لئے کیا ہے کہ تمام احکام کو ادلہ کے موافق اپنے اپنے درجہ میں رکھا جاوے اور اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جو قاسم بن ثابت سرقسطی نے غریب الحدیث میں حضرت



عثمان رضی اللہ عنہ انہ صعد المنبر فقال الحمد للہ فارتج علیہ فقال ان اول کل مرکب صعب وانا ابابکر و عمر کانا یعدان لهذا المقام مقالا و انتم الی امام فعال احوج وان اعش تاتکم الخطبة علی وجهها انشاء اللہ تعالی واستغفر اللہ لی ولکم و نزل وصلی ولم ینکر علیہ احد منهم فکان اجماعا منهم علی عدم اشتراطها و علی ان الحمد للہ یسمی خطبة لغة وان لم یسم بہ عرفا واللہ اعلم انتهی۔

عثمان سے روایت کی ہے کہ آپ منبر پر تشریف لے گئے اور الحمد للہ کہنے پائے تھے کہ آگے نہ چل سکے۔ تب آپ نے فرمایا کہ اول ہر سواری سخت ہوتی ہے ابوبکر و عمر اس موقع کے لئے کلام تیار کرکے لاتے تھے اور تم بہ نسبت گویا اور لسان خطیب کے ایسے امام کے زیادہ محتاج ہو جو کام کرنے والا ہو اور اگر میں زندہ رہا تو انشاء اللہ تعالیٰ، تم خطبے بھی اسی طریقے سے سنوگے۔ میں خدا تعالیٰ سے تمہارے لئے اور اپنے لئے استغفار کرتا ہوں۔ یہ فرما کر منبر سے نیچے اتر آئے اور نماز پڑھائی صحابہ میں سے کسی نے اس پر انکار نہیں کیا۔ (شرح او جیاء مصری جلد ثالث ص ۴۲۶)

اب یہ اجماع ہو گیا اس پر کہ ذکر طویل خطبہ کے لئے شرط نہیں ہے اور اس بات پر کہ الحمد للہ بھی لغۃ کے اعتبار سے خطبہ ہے۔ اگرچہ عرف میں اس کو خطبہ نہ کہتے ہوں۔ واللہ اعلم۔

اس کے قریب قریب ابن ہمامؒ فتح القدیر میں لکھتے ہیں۔

فکان اجماعا منهم اما علی عدم اشتراطها و اما علی کون الحمد للہ و نحوها تسمی خطبة لغة و

پس یہ اجماع ہو گیا صحابہ کا یا تو اس بات پر کہ ذکر طویل شرط نہیں ہے، یا اس بات پر کہ الحمد للہ اور اس کے مثل لغۃ کے اعتبار سے خطبہ ہیں۔ اگرچہ عرف

ان لم تسم بہ عرفا

کے اعتبار سے اس کا نام خطبہ نہ ہو۔

چند سطور کے بعد فرماتے ہیں۔

والخطاب القرانی انما تعلقہ باعتبار المفهوم اللغوی لان الخطاب مع اهل تلك اللغة بلغتهم یقتضی ذلك ولان هذا العرف انما یعتبر فی محاورات الناس بعضهم ببعض للدلالة علی غرضهم فاما فی امر بین العبد و ربہ تعالی فیعتبر فیہ حقیقة اللفظ لغة

اور خطاب قرآنی کا تعلق مفہوم لغوی کے اعتبار سے ہوتا ہے اور اس لئے کہ کسی قوم کی زبان میں خطاب کرنا اسی امر کو مقتضی ہے اور اسلئے کہ عرف کا اعتبار لوگوں کے باہمی محاورات میں ہوتا ہے جو ان کی غرض پر دلالت کرے لیکن جو امر کہ بندے اور خدا تعالیٰ کے درمیان ہو اس میں حقیقت لفظ کا باعتبار لغت کے اعتبار ہوتا ہے۔

پس جبکہ ان تمام اقوال مذکورہ بالا سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ اصل خطبہ مطلق ذکر ہے۔ اور خطبہ سے مقصود حقیقی اور بالذات ذکر کے سوا اور کچھ نہیں تو عمرو کا یہ دعویٰ ہو کہ خطبہ کی غرض وعظ و تذکیر اور احکام کا سنانا ہے اور یہ غرض زبان مروجہ میں ہی خطبہ پڑھنے سے حاصل ہو سکتی ہے" بالکل صحیح نہیں ہے اور جو شواہد اس نے کتب فقہ و لغت سے پیش کئے ہیں وہ عبارات مذکورہ بالا سننے کے بعد کسی فہیم کے نزدیک مثبت مدعا نہیں۔ کیونکہ ہم ہر طرح سے بتلا چکے ہیں کہ خطبہ اصل لغت و شرع میں محض ذکر کا نام ہے۔ لیکن عرف عام اور رواج متعارف کی وجہ سے گاہ بگاہ اس کا اطلاق تجوزاً محض موعظہ و تذکیر پر بھی کر دیا جاتا ہے۔ اور یہ ایسا ہے جیسا کہ ہمارے محاورات کے موافق اگر کوئی شخص قرآن شریف کی ایک دو آیتوں کا ترجمہ چند سامعین کے

روبرو کردے یا وہ ایک دو مسئلہ فقہی بیان کر کے چلا جائے تو کوئی اس کو یہ نہیں کہتا کہ اس نے وعظ کہا کیونکہ عرف عام میں اب وعظ کے لئے چند خصوصیات ایسے ٹھیر گئے ہیں کہ ان کے بغیر عوام ہر ایک پند و نصیحت کو وعظ نہیں سمجھتے۔

پس جب خطبہ اصل میں محض ذکر کا نام ہوا تو اس کی ضرورت نہیں رہی کہ خطیب بعض سامعین کی رعایت سے قرآن اور رسول اور اہل جنت کی زبان چھوڑ کر انگریزی اور جاپانی میں خطبہ پڑھے۔

ایک شبہ اور اسکا جواب

اور اگر یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ خطبہ سے اصل مقصود وعظ و تذکیر ہے تو جب کہ قرآن شریف جو کہ اُمیین اور اٰخرین منھم لما یلحقوا بھم۔ کے لئے اتارا گیا ہے اور جس کے اتارنے والے نے اُس کے حق میں صاف کہدیا لیکون للعٰلمین نذیراً۔ اور جس سے مقصود سوائے تبلیغ عام اور احکام عامہ سنانے کے اور کچھ نہیں ہے وہ اس لئے عربی زبان میں اترا کہ فَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِہٖ" اور تمام عجمیوں کے ذمہ یہ فرض ہوا کہ وہ جس طرح ممکن ہو اُس کو پڑھیں اور سیکھیں تو اگر فقہاء کرام خطبہ کی نسبت بھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے بلکہ تمام سلف و خلف کے عمر بھر کے تعامل کو دیکھ کر یہ حکم لگا دیں کہ وہ مسلمانوں کی سرکاری ہی زبان میں ہونا چاہیئے تو کیا بعید ہے۔ مسلمانوں کا فرض منصبی ہوگا، کہ اگر وہ اس

وعظ و پند سے متمتع ہونا چاہتے ہیں تو اس سرکاری زبان (عربی) کو سیکھیں یا جاننے والوں سے دریافت کر لیں تاکم از کم خطبہ کا ترجمہ ہی یاد رکھیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فارس میں تشریف لا کر خطبہ فارسی زبان میں نہیں بلکہ عربی زبان میں پڑھتے تھے۔ جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہٗ نے موطاء کی شرح میں تحریر فرمایا ہے اور شاید اس لئے امام رافعیؒ نے جو کہ اعیان شوافع میں سے ہیں کہا ہے کہ وھل یشترط کون الخطبۃ کلھا بالعربیۃ وجھان الصحیح اشتراط۔ فان لم یکن فیھم من یحسن العربیۃ خطب لغیرھا و یجب علیھم التعلم و الا عصوا ولا جمعۃ لھم۔ منقول عن شرح الاحیار للسید مرتضی الزبیدی جلد ثالث ص۲۲۶ اور یہی وجہ ہے کہ صاحبین رحمۃ اللہ علیہما قادر علی العربیۃ کی نسبت فرماتے ہیں کہ اگر وہ کسی دوسری زبان میں خطبہ پڑھے تو صحیح نہیں۔

امام صاحبؒ اگرچہ صحیح کہتے ہیں لیکن پسندیدہ ان کے نزدیک بھی یہی ہے کہ عربی میں پڑھا جاوے۔ در مختار میں شروع فی الصلوٰۃ کے متعلق یہی خلاف نقل کر کے لکھا ہے۔ وعلی ھذا الخلاف الخطبۃ وجمیع اذکار الصلوٰۃ۔

یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ جب کوئی مضمون کسی عبارت میں ادا کیا جاوے تو مضمون کے ساتھ الفاظ اور اُن کی ترکیب بھی شریعت اور عقل و عرف کے اعتبار سے ایک بڑی حد تک قابلِ رعایت ہوتے ہیں قرآن شریف تو کلام الٰہی ہے۔ اس لئے مضامین کی محافظت کے ساتھ اس کے کسی ایک لفظ اور ایک شوشہ کو کوئی بڑے سے بڑا نبی اور فرشتہ بھی

تبدیل نہیں کر سکتا اور اگر اس کی تھوڑی سی بھی اجازت ہوتی تو یقیناً اس ترمیم و تغیر کا سلسلہ نالائقوں کے ہاتھوں سے اس حد پر جا کر منتہی ہو جاتا جہاں آج کتب عہد عتیق اپنے مترجمین اور ترجموں پر قناعت کرنیوالے پیروؤں مسلسل مساعی کی بدولت نظر آرہی ہیں۔

اس لئے ائمہ اسلام نے تو قرآن شریف سے بھی گذر کر رسول اکرم (فداہ ابی و امی) کے کلام میں بھی اس درجہ احتیاط کو کام فرمایا ہے کہ وہ تا امکان حدیث کی روایت باللفظ ہی کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور جہاں کہیں ایسا نہ کر سکیں تو بسا اوقات او کما قال کہہ کر فارغ الذمہ ہو جاتے ہیں۔

صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ایک مرتبہ یہ روایت کی کہ بنی الاسلام علی خمسۃ ان یوحد اللہ واقام الصلوٰۃ وایتاء الزکوٰۃ وصیام رمضان والحج" مجلس میں ایک شخص نے اس کو یوں ادا کیا" والحج وصیام رمضان" تو ابن عمرؓ نے فرمایا کہ نہیں وصیام رمضان والحج ھکذا سمعتہ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کو ایک دعا تلقین فرمائی اس میں" ونبیک الذی ارسلت" یہ الفاظ بھی تھے، اس نے اس کے بجائے" ورسولک الذی ارسلت" پڑھا تو جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے آپ نے اس پر انکار فرمایا اور" ونبیک الذی

ارسلت" کو پھر دوہرایا۔ ایک خطیب نے آپ کے عہد مبارک میں" ومن یعصہما فقد غوی" بجائے" من یعص اللہ ورسولہ" کے کہا تو آپ کی جناب سے اس کو" بئس الخطیب" کا خطاب ملا۔ ان چند نظائر سے جو نمونہ کے طور پر پیش کی گئی ہیں یہ خوب واضح ہوتا ہے کہ شریعت نے مضمون کے ساتھ ساتھ الفاظ و عبارات کی بھی انتہا درجہ تک نگہداشت کی ہے اور ان کو محض لغو اور بیکار چیز تصور نہیں کیا۔

اس لئے بغایت ضرور ہے کہ ہماری نمازوں اور ہمارے خطبوں وغیرہ میں بھی الفاظ و عبارات منقولہ کی علی حسب تفاوت الدرجات کامل نگرانی کی جائے خصوصاً خطبۃ الجمعۃ میں جسکو محققین نے بعض حیثیات سے دو رکعت ظہر کا قائم مقام قرار دیدیا ہے چنانچہ قدماء مشائخ حنفیہ میں سے بھی بعض حضرات کا یہ قول ہے مبسوط سرخسی میں منقول ہے" قال بعض مشائخنا الخطبۃ تقوم رکعتین ولھذا لا تجوز الا بعد دخول الوقت۔

اگرچہ خود امام سرخسیؒ کے نزدیک یہ قول اس وجہ سے زیادہ صحیح نہیں کہ خطبہ میں استقبال نہیں ہوتا اور نہ اثنار خطبہ میں کلام کرنا اس کے لئے قاطع ہے اور نہ اس کے لئے وضور شرط ہے۔

لیکن میں کہتا ہوں کہ اگر نائب و منیب میں ایسی بجمیع الوجوہ مشاکلت شرط ہو تو شاید تیمم بھی وضور اور غسل کا خلیفہ نہ بن سکے اور نہ جنازہ کی چار تکبیریں چار رکعتوں کے قائم مقام ہو سکیں۔ حالانکہ خود امام ممدوح نے اس کا اعتراف فرمایا ہے۔

بہر حال محققین نے اسی کو اپنے موقع میں مرجح سمجھا ہے کہ خطبۃ الجمعۃ دو رکعت ظہر کے قائم مقام ہے۔ اسی اعتبار سے اس میں عربی زبان کی رعایت اور بھی اہم ہوئی جاتی ہے۔

خطبہ عربی زبان میں عقلی طور پر

ادھر عقلی حیثیت سے بھی یہی راجح معلوم ہوتا ہے کہ خطبہ جو کہ بہت بڑا شعار اسلام ہے۔ عربی ہی میں پڑھا جاوے کیونکہ یہ قاعدہ ہے کہ اقوام عالم میں سے کسی قوم کو جب خدا تعالیٰ دنیا میں ترقی عنایت فرماتا ہے، تو اُس کے تمدن کے سامنے تمام دوسری اقوام کی گردنیں طوعاً و کرہاً جھک جاتی ہیں اور اُس کے آثار قاہرہ کا تسلط خود بخود بنی نوع انسان کی حالتوں پر قائم ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ قوم چلی جاتی ہے لیکن اس کے آثار نہیں جاتے اور وہ مٹ جاتی ہے مگر اس کی یادگاریں نہیں مٹتیں۔

زبان کا اثر اقوام پر

پس جبکہ مسلمان بحیثیت مسلمان ہونے کے عرب سے نکل کر چار دانگ عالم میں اپنے مذہب کی منادی کرنے کے لئے بڑھے تو اُن کا علم عظیم الشان تمدن بھی اُن کے ساتھ ساتھ چلا اور جہاں جہاں اُن کے مبارک قدم پہنچتے گئے تو ان کی حکومت کے ساتھ ان کا مذہب اور اُن کا تمدن بھی اپنے قدم جماتا گیا۔ اکثر بڑی بڑی اقلیموں کے تمدنوں کو مٹا

کر اسلامی تمدن نے اُن کی جگہ لے لی۔ زبان چونکہ سیاست مُدن کے ماہرین کے نزدیک انسانی تمدن کا ایک جزو اعظم ہے اُس کی وسعت اثر کو کسی قوم کی ترقی و تنزل کے جانچنے میں بہت زیادہ دخل ہے اور مسلمانوں کی مذہبی زبان عربی ہیں (جس کو ہم اس وجہ سے کہ اُن کا مذہب ہی اُن کی قومیت ہے اُن کی قومیت ہے اُن کی قومی زبان بھی کہہ سکتے ہیں) قدرتی طور پر کچھ قبولیت عامہ حاصل کرنے کی استعداد بہت زیادہ تھی، چنانچہ جب عربوں کا گذر کسی ملک پر ہوا تو یہ بہت حیرت سے دیکھا جاتا ہے، کہ ان کی قومی اور مذہبی زبان عربی وہاں ایسی مقیم ہوئی کہ اُن کے رخصت ہونے کے بعد بھی اُس نے اپنی حکومت وہاں سے نہیں اٹھائی۔

ڈاکٹر گستاولی بان کہتا ہے کہ زبان عربی کی نسبت ہم کو وہی کہنا ہے جو ہم نے مذہب عربی کی نسبت کہا ہے۔ یعنی جہاں پہلے ملک گیر اپنی زبان کو مفتوحہ ممالک میں جاری نہ کر سکے تھے، عربوں نے اس میں کامیابی حاصل کی اور مفتوحہ اقوام نے ان کی زبان کو بھی اختیار کر لیا یہ زبان ممالک اسلامی میں اس درجہ پھیل گئی کہ اس نے یہاں کے قدیم زبانوں، یعنی سریانی، یونانی، قبطی، بربری۔ وغیرہ کی جگہ لے لی۔ ایران میں بھی ایک مدت تک عربی زبان قائم رہی اور اگرچہ اس کے بعد زبان فارسی کی تجدید ہوئی لیکن اس وقت تک علماء کی تحریریں اسی زبان میں ہوتی تھیں۔ ایران کے کل علوم مذہب کی کتابیں عربی ہی میں لکھی گئی ہیں، ایشیا کے اس خطہ میں زبان عربی کی وہی حالت ہے جو ازمنہ متوسط میں زبان

لاطینی کی حالت یورپ میں تھی۔ ترکوں نے بھی جنہوں نے عربوں کے ملک فتح کئے انہیں کی طرز تحریر اختیار کرلی اور اس وقت تک ترکوں کے ملک میں کم استعداد لوگ بھی قرآن کو بخوبی سمجھ لیتے ہیں۔

یورپ کے لاطینی اقوام کی البتہ ایک مثال ہے جہاں عربی زبان نے ان کی قدیم السنہ کی جگہ نہیں لی لیکن یہاں بھی انہوں نے اپنے تسلط کے بیّن آثار چھوڑے ہیں۔ موسیو ڈوزی اور موسیو انگلیمن نے مل کر زبان اندلس اور پرتگال کے ان الفاظ کی جو عربی سے مشتق ہیں ایک لغت تیار کرلی ہے۔ فرانس میں بھی عربی زبان نے بڑا اثر چھوڑا ہے۔ موسیو سدی نہایت درست لکھتے ہیں کہ "ادورن اور موڑبین کے بھی زبان عربی الفاظ سے زیادہ معمور ہوگئے ہیں اور اُن کے ناموں کی صورت بھی بالکل عربی ہے۔ فرانسیسی زبان کے ایک لغت نویس جنہوں نے الفاظ کا اشتقاق دیا ہے لکھتے ہیں کہ "جنوبی فرانس میں عربوں کے قیام کا کوئی اثر نہ محاورہ پر رہا ہے نہ زبان پر۔ جو فہرست اوپر لکھی جاچکی ہے اس سے معلوم ہوگا کہ اس رائے کی کس قدر وقعت ہے۔ نہایت تعجب کی بات ہے کہ اب بھی ایسے تعلیم یافتہ لوگ موجود ہیں جو اس قسم کے مہمل اقوال کا اعادہ کرتے ہیں۔ انتہی۔ خیال کرو کہ اگر اگلے زمانہ کے مسلمان بھی ہماری طرح یہی رائے رکھتے ہوتے کہ خطبہ جس زبان میں چاہو پڑھو اور نماز جس لغت میں مناسب سمجھو ادا کرو اور قرآن وحدیث وغیرہ کے پُرمغز اور متبرک الفاظ سے قطع نظر کرکے محض اس کے مضامین واحکام سے سروکار رکھو تو کیا واقعی مسلمانوں

کے عروج وفروغ کی یہ عبرت انگیز کہانی جس کے بیان میں ایک نصرانی مورخ اتنا رطب اللسان ہے۔ دنیا میں آج تک باقی رہتی اور اسلام کی نہیں بلکہ اس کی اصلی ہیئت کی اُس آن بان کو جو اس وقت بھی ویران کنڈروں میں اپنی پرانی شان دکھا رہی ہے کسی مسلم یا کافر کی آنکھیں دیکھ سکتیں۔ سچ یہ ہے کہ ہم نے قرآن شریف یا حدیث یا خطبہ وغیرہ عربی زبان میں پڑھ لینے کو آج تک کلمۃ الاسلام کے اتحاد میں کچھ بھی موثر نہیں سمجھا حالانکہ ذرا اسی بات کی قدر وقیمت فرانس کے اس عیسائی مورخ سے پوچھو جو اپنے سیدھے سادے والے لہجہ میں کہتا ہے کہ ان مختلف اقوام عالم میں جو اسلامی قانون کے پابند ہیں دو چیزوں نے باہم اتفاق پیدا کر رکھا ہے۔ اولاً زبان عربی اور ثانیاً حج بیت اللہ جہاں عالم کے مسلمانوں کو یکجا ہونا پڑتا ہے۔ ہر ایک مسلمان کو گو وہ کسی فرقہ کا کیوں نہ ہو ضرور ہے کہ قرآن مجید کو عربی میں پڑھ سکے اور اسی وجہ سے کہا جاسکتا ہے کہ زبان عربی تمام عالم میں مروج ہے اگرچہ پیروانِ اسلام اس وقت بہت ہی مختلف اقوام اور راجیال کے اشخاص ہیں لیکن ان سب میں ایک قسم کا اندرونی تعلق ہے جس نے ان کو دینی اخوت کا رشتہ میں بالکل جکڑ بند کر رکھا ہے اشاعتِ قرآن اور دینِ اسلام کی حیرت انگیز سرعت نے مؤرخین مخالف کو نہایت تعجب میں ڈالا ہے۔ ایک اور مقام پر لکھتا ہے کہ "عربوں کی ملک گیری میں ایک خاص بات ہے جو اُن کے بعد کے ملک گیروں میں ہرگز نہیں پائی جاتی اور اقوام نے بھی مثل بربریوں اور ترکوں کے

ملک گیری کی ہے لیکن انہوں نے کوئی تمدن قائم نہیں کیا اور اُن کی ساری ہمت اس میں مصروف رہی کہ جہاں تک ممکن ہو اقوام مفتوحہ کے مال سے فائدہ اٹھالیں۔ برخلاف اس کے عربوں نے ایک قلیل زمانہ میں جدید تمدن کی عمارت کھڑی کر دی اور انہوں نے ایک گروہ اقوام کو اس جدید تمدن کے ساتھ اپنے مذہب اور اپنی زبان سیکھنے پر آمادہ کر دیا عربوں کی صحبت کے ساتھ ہی مصر اور ہندوستان کی سی قدیم اقوام نے اُن کا دین ان کا لباس ان کی معیشت بلکہ اُن کا طریقہ تعمیر تک اختیار کر لیا عربوں کے بعد بہت سی اقوام نے انہیں خطوں پر حکومت کی مگر پیغمبر اسلام کی تعلیم کا اثر اس وقت تک ان ملکوں میں باقی ہے۔ کل ممالک افریقہ اور ایشیا میں مراکش سے لیکر ہندوستان تک جہاں کہیں عرب پہنچے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اثر ان ملکوں پر ہمیشہ کیلئے قائم ہو گیا ہے۔ بہت سے ملک گیروں نے ان ممالک کو عربوں کے بعد فتح کیا ہے لیکن وہ ان سے عربوں کے مذہب اور عربوں کی زبان کو ہرگز ہرگز نہیں مٹا سکے۔

الغرض ایک محقق اور عقلمند آدمی ہمارے تمام سابق بیانات سے اس کو خوب سمجھ سکتا ہے کہ شرعی اور تمدنی دونوں حیثیتوں سے زید کی رائے صحیح اور عمرو کا خیال غلط ہے اور یہ ہرگز مناسب نہیں کہ ہر ایک زبان میں خطبہ اور قرآن پڑھنے کی رائے دیکر مسلمانوں میں تفرق و تشتت کا ایک کریہ منظر رونما کیا جائے۔ واللہ اعلم بالصواب وعندہ علم الکتاب۔

عربی زبان سے ناواقف لوگوں کی مثال

۲: ایسے مسلمان جو عربی زبان سے ناواقف ہوں اور قرآن پاک کے معانی کو نہ سمجھتے ہوں وہ برابر احکام شرعیہ کے اسی طرح مکلف ہیں جس طرح انگریزی قانون کو نہ پڑھ سکنے اور نہ سمجھ سکنے والوں پر بھی اسکا اتباع حکومت کی طرف سے ضرور ہے۔ کیونکہ جب قانون عام بن گیا تو ہر ایک فرد رعایا کا یہ فرض ہے کہ وہ اس کو جس طریق سے ممکن ہو معلوم کرے۔ تبارک الذی نزل الفرقان علی عبدہ لیکون للعٰلمین نذیرا۔ ایسے لوگوں کی نماز وغیرہ نہ معتبر ہونے کی کوئی وجہ نہیں واللہ اعلم۔

جمعہ کی نماز میں کسی خاص سورت کی تعیین

۳ و ۴: عام قاعدہ تو جماعت کے متعلق وہی ہے جس کو آپ نے ان الفاظ میں ادا فرمایا ہے کہ "من ام منکم فلیخفف فان فیہم الضعیف والکبیر وذا الحاجۃ" اور بالخصوص جمعہ اور عیدین میں آپ سے "سبح اسم ربک الاعلیٰ" اور "ھل اتٰک حدیث الغاشیۃ" پڑھنا ثابت ہے اور جمعہ میں سورۂ "منافقون" بھی پڑھنا ثابت ہے باقی ہمارے (حنفیہ) کے نزدیک مشہور یہ ہے کہ کسی سورت کی توقیت مناسب نہیں۔ اس کی مفید تشریح حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے مصفّٰی شرح موطا میں اس طرح کی ہے کہ "در پیش مالکیہ و شافعیہ مستحب ست قرأۃ سورۂ جمعہ و منافقون

وہمچنیں قراۃ سبح اسم وغاشیہ وحنفیہ توقیت بعض قرآن را بعض صلوٰۃ مکروہ داشتند وتفسیر کلام ایشان چنانچہ محققان نوشتہ اند آن ست کہ ایں کراہت درصورتے ست کہ بغیر آن نماز را جائز ندارند یا قراۃ بغیر آں مکروہ شمارد واگر بجہت آسانی یا تبرکاً بقراۃ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم التزام کند ہیچ باک نیست لیکن می باید کہ گاہ گاہ غیر آں نیز خواندہ باشد تا جاہلان از ارکان صلوٰۃ نشمارند" واللہ اعلم۔

نماز میں قرائت کی کمی وزیادتی

۵: اسباب عوارض عمومیہ کی وجہ سے جن سے کم کوئی جماعت خالی ہو سکتی ہے تخفیف قرأت اصل ہے اور طول لعذر لیکن اصل حقیقت صلوٰۃ کے اعتبار سے جو کہ محققین نے بیان کی ہے، طول اصلی ہے اور تخفیف لعذر" وتفصیلہ یطلب من کتب المحققین کالشیخ العلامۃ مولانا محمد قاسم النانوتوی قدس سرہٗ۔

قرآن شریف بغیر معنی سمجھے پڑھنا

۶: جو شخص قرآن پاک کے معانی نہ سمجھے اس کو بھی قرآن شریف ضرور پڑھنا چاہیے اور بیشک اس کو ثواب ملتا ہے جامع ترمذی میں ہے من قرأ حرفا من کتاب اللہ فلہ بہ حسنۃ والحسنۃ بعشر امثالہا لا اقول الٓمٓ حرف بل الف حرف ولام حرف وحرف میم حرف اس کے سوا

اور بھی روایات ہیں جن کے سیاق سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نفس الفاظ وحروف کا تلفظ کرنے پر بھی ثواب ملتا ہے تطویل کے خیال سے اُن کے ذکر کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ

شبیر احمد عثمانی عفا اللہ عنہ خادم دارالعلوم دیوبند ۱۳۴۳ھ

الجواب صحیح۔ بندہ عزیز الرحمٰن عفی عنہ
مفتی مدرسہ عربیہ دیوبند

للہ در الفاضل المجیب با حسن۔ اجاب۔
(حضرت مولانا الاستاذ العلام) محمود حسن عفی عنہ
(زید مجدہم السامی صدر مدرس دارالعلوم دیوبند)

للہ در العلامۃ المجیب المصیب زحزح عن الحق حتی قد بین الصبح لذی عینین۔ (حضرت مولانا) محمد انور شاہ صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ مدرس دارالعلوم دیوبند۔

وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ

اور شمس جاری رکھتا ہے اپنے دورکو اپنے مستقر کیلئے اپنی مدت مقررہ میں یہی عزیز و علیم کا نظم و انتظام ہے

سجود الشمس

حدیث سجود الشمس پر ایک بصیرت افروز مقالہ

— از —

شیخ التفسیر حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ

مع مقدمہ

مولانا سید حسن صاحبؒ استاذ دارالعلوم دیوبند

— ناشر —

ادارہ اسلامیات ۱۹۰ انار کلی لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رب یسر ولا تعسر وتمم بالخیر

حدیث سجود الشمس

الحمد للہ رب الشمس والقمر ورب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سیدنا شمس العالمین وعلی آلہ واصحابہ نجوم الھدایۃ والیقین۔

اما بعد.... اس عالم دنیا میں جو کائنات کا وجود ہے دراصل وہ وجود ظلی ہے اور درحقیقت کل کائنات پر نیست و فنا طاری ہے۔

صاحب روح المعانی نے کل شئ ھالک الا وجھہ کی تفسیر میں نقل فرمایا ہے کہ ممکنات بتمامہا ہر آن میں ھالک بالذات ہیں کیونکہ غیر اللہ کا وجود بالذات نہیں بلکہ وہ واجب تعالیٰ کے ارادہ کی جانب منسوب ہے اس لیے ہر آن میں وہ قابل عدم ہے اس لئے وجود ممکنات مثل معدوم کے ہے اسی طرح اگر ہم اس عالم دنیا کی سب سے زیادہ تاباں اور منور مخلوق جن کو کواکب کہتے ہیں ان کی جانب نظر کرتے ہیں تو ان کا طلوع و غروب کا نظام بھی اس کا شاہد عدل ہے کہ ان کا وجود رب کائنات کی قدرت سے وابستہ ہے جب وہ چاہتے ہیں تو ستاروں کو منور فرما کر عالم کو نور بخشتے ہیں اور جب چاہتے ہیں حجاب غروب میں مستور اور محجوب بنا دیتے ہیں۔ کواکب کے تابع فرمان ہونے کی ایک دلیل

یہ بھی ہے کہ شمس جس کو نیر اعظم کا لقب دیا جاتا ہے اس کے غروب کے بعد کا حال صحیح بخاری کی روایت میں اس طرح منقول ہے۔

حدیث ابوذر بروایت البخاری:۔

عن ابی ذرؓ قال کنت مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی المسجد عند غروب الشمس۔

فقال یا اباذر اتدری؟ این تغرب الشمس قلت اللہ ورسولہ اعلم۔ قال فانھا تذھب حتیٰ تسجد تحت العرش فذلک قولہ تعالیٰ والشمس تجری لمستقر لھا۔

اور اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ سورج غروب ہونے کے بعد تحت عرش الٰہی سربسجود ہو کر مزید طلوع اور گردش کی اجازت طلب کرتا ہے۔

رب اکبر کی اجازت دینے کے بعد پھر دوبارہ کائنات پر ضیا باری اور نور افشانی میں مصروف ہو جاتا ہے اور روزانہ غروب کے بعد بدستور سابق سجدہ کر کے اجازت طلوع طلب کرتا ہے۔ قرب قیامت میں سورج کی رجعت قہقری کا امر ہوگا۔ لہٰذا بجائے مشرق سے طلوع کرنے کے مغرب سے طلوع کرے گا

اس مقدس کلام نبویؐ کو مع متن و ترجمہ کے علامہ عثمانیؒ نے اپنے مضمون میں ذکر فرمایا ہے۔ مگر وہ طبقہ جس کو عقل کی غلامی پر فخر حاصل ہے اور صاحب شریعت کے کلام کو معیار عقل سے وزن کرنے کے بعد اس کی تصدیق کی زحمت گوارہ کرتے ہیں وہ ایسی صحیح اور معتبر خبر کو تسلیم کرنے سے گریز کرتے

ہیں اور عقل نارسا ان کو چند اوہام وشبہات میں مبتلا کر دیتی ہے۔ جن کی تفصیل یہ ہے :۔

(۱) سورج تو دائما متحرک ہے اس کا غروب حقیقتاً کبھی نہیں ہوتا، تو جب غروب ہونا محقق نہ رہا تو یہ کہنا کہ آفتاب غروب ہونے کے بعد سجدہ کرتا ہے۔ کیسے درست ہوگا؟۔

(۲) سورج میں عقل وادراک کہاں ہے کہ وہ سجدہ کرنے کی حقیقت سے آگاہ ہو اور اجازت طلب کرنے کی حقیقت اور اس کے فوائد کا ادراک کر سکے۔

(۳) جب سارے آسمان عرش الٰہی کے تحت واقع ہیں جیسا کہ عقیدۂ اہل اسلام ہے تو پھر عرش کے نیچے جا کر سجدہ کرنے کے کیا معنی ہیں؟

(۴) جب سورج سجدہ میں مصروف رہے گا تو نظام عالم کا تعطل ہونا ضروری ہے کیونکہ سجدہ کی حقیقت وقوف وسکون کو چاہتی ہے تو اس حدیث شریف سے لازم آتا ہے کہ کچھ ساعت تک روزانہ حرکت شمسی منقطع ہو جاتی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ حقیقت علماٰ ہئیت کے اصول کے مطابق درست نہیں۔ یہ وہ شبہات ہیں جن کی وجہ سے غلامان عقل ودانش مخبر صادق کے سچے کلام میں کاذب اور بے معنی وساوس اور شبہات پیش کرتے ہیں۔

ہم بعونہ تعالیٰ وتوفیقہ ان شبہات کے ازالہ کے لئے ایسے جواب تحریر کرتے ہیں جو کہ بشرط فہم سلیم موجب سکون قلبی اور تصدیق ہوں۔ ہر شبہ کا جواب ترتیب وار پیش کیا جاتا ہے اور جواب کے ساتھ پہلے شبہ لکھا گیا ہے تاکہ ناظرین کو

مطالعہ کرنے میں سہولت ہو۔

شبہ اول

سورج جب ہمیشہ متحرک ہے اور اس کا غروب حقیقتاً کبھی نہیں ہوتا۔ اگر ایک ملک اور ایک جگہ پر سورج غروب ہوتا ہے تو دوسرے ملک اور دوسری جگہ میں طلوع ہوتا ہے تو جب آفتاب کے لئے غروب ہی ثابت نہیں تو پھر حدیث نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم میں یہ فرمانا کہ۔ حتی اذا غربت ..... کیسے صحیح ہوگا۔

جواب

ممکن ہے فرمان نبوی میں معظم المعمورہ کا غروب مراد ہو۔ یعنی ایسا زمانہ جب اکثر حصہ آبادی سے آفتاب چھپ جاتا ہے اسی کو غروب سے تعبیر کیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ صحابۂ کرام کے سامنے آپ جب یہ ارشاد فرما رہے ہیں تو ان کے لحاظ سے غروب کے وہی معنی لئے جا سکتے ہیں جو فہم سامع کے قریب تر ہوں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ خاص مدینہ منورہ کا ہی غروب مراد ہو جس کا قرینہ یہ ہے کہ حدیث ابوذرؓ میں یہ کلمات مذکور ہیں۔ کنت مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی المسجد یعنے ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں مسجد نبوی میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ موجود تھا۔ بہر حال آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے جو لفظ غروب استعمال فرمایا ہے وہ فن ہیئت کی اصطلاح کے مطابق نہیں ہے کہ غروب حقیقی مراد لیا جائے جس پر شبہ کی بنیاد قائم کی گئی ہے۔

شبہ دوم

سورج میں عقل وادراک نہیں پھر سجدہ کرنا کیا معنی؟ اور اسی طرح اجازت طلب کرنا تو عقل وشعور کو

چاہتا ہے سورج اور اسی طرح تمام سیارے عقل و دانش سے محروم ہیں تو پھر شارع علیہ السلام نے سورج کے لیے سجدہ کرنے اور اجازت طلب کرنے کا حکم کس طرح بیان فرمایا ہے۔

جواب یہ تصور غلط ہے کہ سورج اور سیارات میں بالکل شعور و ادراک نہیں بلکہ متعدد آیات قرآنیہ و روایات نبویؐ سے یہ بات ثابت ہے کہ سورج و سیارات میں شعور و ادراک ہے گو انسان جیسا شعور و ادراک نہیں جس سے وہ مکلف ہو۔ لہٰذا وہ قوت ادراکی کے اعتبار سے حق تعالیٰ کو سجدہ کرتا ہو اور ممکن ہے کہ اس سجدہ کے معنی سجدہ حسی وضع الجبھۃ علی الارض نہ ہو بلکہ سجدہ روحانی جس کی حقیقت خشوع خضوع ہے مراد ہو۔

سجدہ سے مراد سجدۂ روحانی ہونے پر بعض الفاظ روایت دلالت کرتے ہیں جس کو محدث ابن رزاق کے حوالہ سے ابن کثیر نے اس آیت کی تفسیر میں بیان فرمایا ہے۔ اس میں یہ الفاظ موجود ہیں حَتّٰی اِذَا غَرَبَتْ سَلَّمَتْ وَسَجَدَتْ وَاسْتَأْذَنَتْ فَيُؤْذَنُ لَهَا۔ (یعنی یہاں تک کہ جب آفتاب غروب ہو جاتا ہے تو سلام کرتا ہے سجدہ کرتا ہے اور اجازت چاہتا ہے۔ تب اس کو دوبارہ طلوع ہونے کی اجازت ملتی ہے۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ سلام اور سجدہ اور اجازت طلب کرنے سے اس کا مقصد اپنے ظاہری اور باطنی حال سے انقیاد ربانی اور تابع فرمان ہونے کو ظاہر کرنا ہے تو جیسا کہ سورج کے گرہن کے وقت سارے عالم کے سامنے سورج کی عاجزی اور کمال نورانیت میں ربِّ اکبر کا محتاج ہونا

کھلی آنکھوں سامنے آجاتا ہے اسی طرح روزانہ سورج غروب ہونے کے بعد سورج پر تذلل و انقیاد کی ایک خاص کیفیت طاری ہوتی ہے جس کو حدیث میں سجدہ سے تعبیر فرمایا ہے۔ واللہ اعلم ۱۲۔

یہ لطیف توجیہہ جو ہم نے پیش کی ہے حضرت مرشدی و مولائی حکیم الامت نے بیان القرآن میں ان الفاظ سے ذکر فرمائی ہے۔ "چونکہ ظاہری آیات و روایات سے ان مخلوقات میں بھی من وجہ شعور ہونا ثابت ہے تو اسی قوت شعوری کے اعتبار سے حق تعالیٰ کے حضور میں خشوع و خضوع عرض و معروض کرتا ہو پس سجدہ سے یہ مراد ہو اور سہل یہی ہے کہ اس کی روح کو ساجد کہا جائے تو بہت سے شبہات کا استیصال ہو جائے گا" (سورۂ یٰسین تفسیر بیان القرآن)۔

شبہ سوم جب سارے آسمان عرش الٰہی کے تحت واقع ہیں جیسا کہ عقیدۂ اہل اسلام یہی ہے پھر غروب ہونے کے بعد عرش کے نیچے پہنچنا اور سجدہ کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟۔

جواب یہ صحیح ہے کہ سارے آسمان عرش الٰہی کے تحت واقع ہیں، سورج ہمیشہ عرش الٰہی کے تحت رہتا ہے۔ مگر ہو سکتا ہے کہ یہاں عرش الٰہی کا کوئی خاص مقام قرب خداوند تعالیٰ مراد ہو جس کے لیے قرینہ یہ ہے کہ حافظ ابن کثیر نے بروایت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نقل کیا ہے جس کے کلمات یہ ہیں قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ فانہا تذھب حتی تسجد بین یدی ربھا عزوجل فتستأذن للرجوع فیؤذن لھا (ترجمہ) فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ سورج غروب ہونے کے بعد چلا جاتا ہے یہاں تک کہ حق تعالیٰ

کے سامنے سجدہ کرتا ہے۔ پھر اجازت طلب کرتا ہے واپسی کی (پھر) اس کو دوبارہ طلوع ہونے کی اجازت دیدی جاتی ہے۔

اس روایت نبوی سے صاف ظاہر ہے کہ تحت عرش کا کوئی مخصوص مقام مراد ہے جس کو حدیث میں تحت العرش کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے اور فلسفی اصطلاح کے اعتبار سے اگر یوں کہا جائے کہ تحت عرش جو حدیث میں آیا ہے اس سے مراد وہ نقطۂ تحت ہے جس کو فلاسفہ تحت حقیقی کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں، تو پھر اس عقلی شبہ کی بنیاد ہی ختم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ جتنے سماوات عرش کے تحت واقع ہیں ان کو تحت العرش کہہ سکتے ہیں مگر تحت اضافی کیونکہ فلاسفہ کی اصطلاح کے اعتبار سے تحت حقیقی فقط ایک نقطہ ہی ہوتا ہے۔ واللہ اعلم بمرادہ۔

اور حضرت مرشدی مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا ہے کہ تحت العرش کی قید جو حدیث میں آئی ہے وہ مخصوص بالذکر نہیں ہے بلکہ اصل مقصد سورج کے سجدہ کرنے کو بیان کرنا ہے۔ حضرت والا دامت برکاتہم کی عبارت بعینہ یہ ہے۔

عبارت:۔ تخصیص مقصود ہونا ضروری نہیں ہے۔ ممکن ہے یہ قید واقع ہی ہو اور اصلی مقصود انجاز من السجدہ ہو اور اس تعبیر سے یہ فائدہ ہو کہ اس سے تحت امر الٰہی ہونے کی تصریح ہو گئی کیونکہ استویٰ علی العرش کا کنایہ ہونا نفاذ احکام و تصرفات سے آیات عدیدہ میں مذکور ہے۔ (بیان القرآن تفسیر سورۂ یٰسین)۔

شبہ چہارم

جب سورج سجدہ کرے گا۔ جتنی دیر تک سجدہ میں مصروف رہے گا تو حرکت شمسی باقی نہ رہے گی کیونکہ سکون طاری ہوگا۔ حالانکہ دلائل رصدیہ سے حرکت شمسی کا منقطع نہ ہونا ثابت ہے۔

جواب

یہ ہے کہ جب سجدہ کی حقیقت سجدہ روحانی ہے جیسے شبہ سوم کے جواب میں مفصل گزرا تو ظاہر ہے کہ اس سجدہ کے لیے وقوف و سکون ضروری نہیں ہے اور قرینہ اس معنی کے لیے یہ ہے کہ روایت میں یہ کلمے موجود ہیں۔ (حتی تسجد فتستاذن فی الرجوع فیوذن لها جس کا حاصل یہ سمجھ میں آتا ہے کہ جب وہ سجدہ کرتا ہے تو اجازت رجوع میں اور سجدہ میں کوئی خاص زمانہ فاصل نہیں ہوتا ورنہ حتی تسجد کے بعد بجائے فتستاذن کے ثم تستاذن ہونا چاہیے کہ اہل عربیت پر یہ امر روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ ثم تراخی کیلئے اور فا تعقیب کے لیے آتی ہے اور یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ حکیم الامت مرشدی نور اللہ مرقدہ نے اس شبہ کے جواب میں فرمایا ہے کہ ممکن ہے کہ یہ سکون آنی ہو اور حرکت زمانی ہو اس لیے حساب رصدی مختل نہ ہوتا ہو اور نہ وہ منضبط اور مدرک ہوتا ہو۔ انتہی۔ (تفسیر بیان القرآن سورۂ یٰسین)

اس معنی کے لیے قرینہ یہ ہے کہ جس شب کے بعد سورج مغرب سے طلوع کرے گا اس سلسلہ میں جو روایت آئی ہے اس روایت کے کلمات یہ ہیں۔

فتحبس ماشاء اللہ ان تحبس ثم یقال لها اطلعی من حیث غربت۔

(تفسیر ابن کثیر سورۂ یٰسین)

ترجمہ:۔ پھر اللہ تعالیٰ جس زمانے تک سورج کو روکنا چاہیں گے روک لیں گے۔

پھر سورج سے کہا جائے گا کہ جہاں سے تو نے غروب کیا ہے وہیں سے طلوع کر اس روایت کے الفاظ سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ اس وقت میں سورج سجدہ میں جو مشغول ہوگا اور اجازت طلب کرے گا تو اس کے لیے ایک زمانہ وقوف کا ہوگا۔ اس کے بعد اسکو طلوع کی اجازت دی جائے گی چنانچہ فقحبس ماشاء اللہ ثم یقال لہا اطلعی اس پر قرینہ ہیں۔

ان شبہات کے جواب کے بعد یہ بات قابل توجہ ہے کہ یہ حدیث نہایت درجہ صحیح ہے چنانچہ امام بخاریؒ نے کتاب التفسیر میں والشمس تجری لمستقر لہا کے تحت اس کو نقل فرمایا ہے۔ تو جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر سند صحیح سے پہنچ جائے تو وہ واجب التسلیم ہے۔ اگر چہ اس میں انسانی فہم و دانش سمجھنے میں کوتاہی کرے۔ کیونکہ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں قرآن کریم میں ارشاد ہے۔ "ما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحیٰ"

بحمد اللہ اس تفصیل کے بعد عقل سلیم کو اس حدیث شریف کے ماننے میں ذرہ برابر مجال انکار نہ ہوگا۔ اس آیت کی تفسیر میں اور بھی اقوال مذکور ہیں جن کو حافظ ابن کثیرؒ نے ذکر فرمایا ہے لیکن تفسیر مذکور چونکہ صحیح بخاری میں منقول ہے لہذا نہایت معتبر اور قابل اعتماد ہے چنانچہ صاحب لمعات فرماتے ہیں:۔

قد ذکر لہ فی التفاسیر وجوہ غیر ما فی ھذا الحدیث و لاشک ان ما وقع فی الحدیث المتفق علیہ۔ ھو المعتبر و المعتمد۔

ترجمہ:۔ اس آیت کی بہت سی تفسیریں علاوہ اس تفسیر کے جو اس حدیث میں مذکور ہے نقل کی گئی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جو حدیث متفق علیہ میں

مذکور ہے وہ معتبر اور نہایت معتمد ہے انتہی۔

لہذا ناظرین سے گزارش ہے کہ اس حدیث کو جس کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے آیت کریمہ کی تفسیر راجح سمجھیں۔ اور جو شبہات اس پر پیش آئیں ان کے جوابات پر غور کر کے اطمینان قلبی حاصل کریں۔ رہا کائنات کے اسرار اور شمس کے حقایق کو نیہ اور اس کے انقلابات اور اس کے سجدہ کرنے کی کیفیت وغیرہ اگر ہمارے ناقص عقل و فہم میں بھی نہ آئے تو شارع علیہ السلام کے خبر دینے کے بعد اس کا یقین کر لینا ہی سعادت دارین ہے۔

جیسے سعدی علیہ الرحمۃ نے فرمایا ہے ؎

زبان تازہ کردن باقرار تو نینگیختن علت از کار تو

اب ہم اس مضمون کو عارف شیرازی کی اس عارفانہ نصیحت پر ختم کرتے ہیں۔

حدیث مطرب و می گو و راز دہر کم ترجو
کہ کس نہ کشود و نکشاید بحکمت این معمہ را

سبحانک لاعلم لنا الا ما علمتنا انک انت العلیم الحکیم و صلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ سیدنا و مولانا محمد و آلہ و اصحابہ و بارک و سلم تسلیما کثیرا کثیرا۔

حررہ سید حسن عین الحوادث و الفتن ... رضی عنہ ذو المنن ابن مولانا ملیح حسن۔ المدرس دار العلوم الدیوبندیۃ۔

مضمون

حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

منجملہ ان پیچیدہ اور معرکۃ الآرا مباحث کے جن میں فلسفۂ طبعی نے ہمیشہ حکمتِ الہٰیہ سے مزاحمت کی ایک مسئلہ آفتاب کے زیر عرش سجدہ کرنے کا ہے۔ جس کا تعلق صحیح روایاتِ حدیثیہ کے موافق اس آیت سے ہے جو مضمون ہذا کے عنوان میں لکھی گئی ہے

اس کا مفصل واقعہ وہ ہے جو حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:۔

كنت مع النبي صلى الله عليه وسلم في المسجد عند غروب الشمس فقال يا ابا ذر اتدري اين تذهب هذا الشمس قلت الله ورسوله اعلم قال تذهب لتسجد فتستاذن فيوذن لها في الرجوع كما جاء كما في الرواية الترمذي احمد) ويوشك ان تسجد فلا يقبل منها وتستاذن فلا يوذن لها فيقال لها ارجعي من حيث جئت فتطلع من مغربها فذلك قوله عز وجل والشمس تجري لمستقر لها..........

....

میں غروب آفتاب کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مسجد میں تھا۔ آپ نے فرمایا کہ ابوذر جانتے ہو کہ یہ سورج کہاں جاتا ہے، میں نے ازراہ ادب عرض کیا کہ خدا اور خدا کا رسول زیادہ جانتے ہیں، فرمایا کہ یہ جاتا ہے اور چلتا رہتا ہے یہاں تک کہ زیر عرش اپنے ٹھکانے پر پہنچ جائے۔ پس سجدہ میں گرتا ہے اور خدا سے اس کی اجازت حاصل کرتا ہے کہ جیسے آیا ہے اسی طرح چلا جائے چنانچہ اس کو اجازت دی جاتی ہے اور قریب ہے کہ قیامت کے نزدیک، وہ سجدہ کرے گا لیکن قبول نہ ہوگا اور اجازت چاہے گا مگر نہیں ملے گی اور کہا جائے گا کہ جدھر سے آیا ہے ادھر ہی پھر لوٹ جا چنانچہ وہ مغرب کی طرف سے طلوع ہو گا۔ اسی مضمون کی طرف اشارہ ہے خدا تعالیٰ کے اس قول میں والشمس تجری لمستقر لہا۔

یہ روایت جس کو ہم نے فقط صحاح کی کتابوں سے نقل کیا ہے اپنے ثبوت میں نہایت محکم اور مضبوط اسناد رکھتی ہے۔ اور ہر ایسے شخص کے حق میں برہان قاطع ہے جو روایات کے رد و قبول میں کسی معقول ضابطہ کا پابند ہو۔ خصوصاً آجکل جب کہ ملک میں متواتر تجربوں کے باوجود ریوٹر کی تار برقیوں سے متاثر ہونے والوں کی تعداد خوش قسمتی سے بہت زیادہ پھیل چکی ہے۔

مفسرین اور ارباب حدیث نے اس بارہ میں اگرچہ اور بھی روایات بکثرت فراہم کی ہیں جن کا استیعاب غالباً شیخ جلال الدین سیوطی کی کتاب الہیۃ السنیہ سے زیادہ کسی دوسری جگہ نہ ہوگا۔

لیکن افسوس ہے کہ عامہ محدثین بلکہ مفسرین تک کو بھی اس کی صحت پر چنداں اطمینان نہیں۔ اور بالفرض اگر ایسی نقول کا اعتبار ہو فرقہ امامیہ کی بے سروپا مگر عجیب و غریب روایات پر وثوق کیا جائے انہوں نے اپنی نام نہاد احادیث میں سورج کے سجدہ کرنے اور روزانہ طلوع کی اجازت چاہنے کا جو فلسفہ بیان کیا ہے اس کا سننا فنِ ہیئت کے ایک طالبعلم

کے واسطے نہایت دلچسپ ہوگا۔

ان روایات میں بتلایا گیا ہے کہ سورج کے اندر ستر ہزار کلالیب (آنکڑے) لگے ہوئے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کو ستر ہزار فرشتے تھامے رہتے ہیں اور اس طرح سے یہ لاکھوں فرشتوں کا لشکرِ جرار آفتاب کو کھینچ کر مشرق سے مغرب کو لے جاتا ہے، پھر وہاں پہنچ کر اسی میں سے یہ فرشتے نور کھینچ لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ سورج کالا توا سا ہو کر سجدہ میں گر پڑتا ہے۔ تب فرشتے اپنے پروردگار سے اس کو دوبارہ خلعت نورانی پہنانے کی بابت دریافت کرتے ہیں اور یہ بھی پوچھتے ہیں کہ آیا اس کو پورب کی طرف سے نکالا جائے یا پچھم سے اور آج کے دن کے واسطے روشنی کی کتنی مقدار اس میں ودیعت کی جائے۔ ان سب سوالات کا خدا تعالیٰ اپنی مرضی کے موافق جیسا چاہتا ہے جواب مرحمت فرماتا ہے اور وہ ملائکہ اس حکم کو نہایت مستعدی کے ساتھ بجالاتے ہیں۔ اور طلوع و غروب کی یہ عجیب داستان بارہ مہینے اسی طرح دہرائی جاتی ہے۔

مگر میرے خیال میں اس قسم کی مذہبی حکایات جو سر تا پا حکمتِ ریاضی کو شرمندہ کرنیوالی ہیں شاید اتنی زیادہ عجیب نہ سمجھی جائیں جتنا کہ رئیس طائفہ امامیہ کا یہ حیرت انگیز دعویٰ کہ یہ تحقیق جو سورج کی نسبت اوپر بیان ہوئی اہل ہیئت کے اقوال سے سر مو بھی مخالفت نہیں رکھتی۔

ہم نہیں کہہ سکتے کہ موجودہ ہیئت کے مسائل دیکھنے والے کو اس قسم کے ادعاء پر زیادہ ہنسنے کا استحقاق ہے یا خود ہیئت والوں کے قہقہہ

لگانے پر۔

ہاں یہ بہت ممکن ہے کہ اہل ہیئت سے اس رئیس الطائفہ کی مراد نہایت ہی قدیم زمانہ کے وہ لوگ ہوں جن کا خیال سر رابرٹ بال کے الفاظ میں یہ تھا کہ "یہ ہماری زمین ایک بڑا ہموار اور مسطح میدان ہے جو ہر طرف بے حد پھیلا ہوا ہے۔" اس لیے وہ بڑے حیران و پریشان ہوتے تھے کہ سورج دن کو نکلتا اور آسمان پر گردش کرتا ہے مگر رات کو کہاں چلا جاتا ہے۔ ان کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ آترتے آترتے کہیں دور سمندر میں ڈوب جاتا ہے۔ اگر یہ صحیح ہوتا تو سورج کی گرمی پانی میں ساری بجھ جاتی اور اس کی تپش ہی جاتی رہتی۔ قدیم زمانہ کے بعض لوگ یہاں تک کہا کرتے تھے کہ جب آفتاب شام کے وقت سمندر میں جاکر ڈوب جاتا ہے تو ہمکو اس کی بڑی خوفناک سنسناہٹ کی آواز تک سنائی دیتی ہے۔ جیسے کہ جب تپا ہوا لوہا پانی میں بجھایا جاتا ہے۔ مگر اس خیال میں ایک بڑی خرابی یہ پیش آتی تھی کہ اگر سورج ہر روز شام کے وقت مغرب میں سیکڑوں کوس کے فاصلے پر سمندر میں جا کر ڈوب جاتا اور ٹھنڈا ہو جاتا ہے تو کس طرح دوسرے روز صبح کو سیکڑوں کوس پرے مشرق میں بالکل ویسے ہی زور کی تپش کے ساتھ نکل کر چمکنے لگتا ہے۔ اس معمہ کو کوئی حل نہ کر سکتا تھا۔ بعض یہ کہتے تھے کہ نہیں صاحب سورج جو آج صبح کو یورپ میں چمکتا ہوا نکلا ہے وہی سورج نہیں ہے جو کل شام کے وقت مغرب میں ڈوب گیا تھا بلکہ ایک اور نیا سورج ہے۔ دیوتا لوگ ہر روز صبح کو بڑی دور مشرق میں ایک نیا آفتاب چلا

دیتے ہیں۔ پھر وہ دن بھر اپنا دورہ پورا کر کے شام کے وقت مغرب میں جا کر مر جاتا ہے پھر رات بھر دیوتا لوگ اسی کام میں مشغول رہا کرتے ہیں تا کہ، دوسری صبح کے لیے ایک نیا سورج بنا کر تیار کر دیں مگر اس قیاس کی نسبت اور لوگوں نے یہ اعتراض کیا کہ اس طرح تو ایک بڑا سورج ہر روز ضائع ہوتا ہے اس لئے اوروں نے ایک اور قیاس باندھا جس میں کفایت رہے اور بے فائدہ کچھ نقصان نہ اٹھایا جائے اور وہ یہ ہے کہ قدیم زمانہ کے لوگوں کو اپنے علم کے موافق یہ یقین تھا کہ بڑے بڑے خشکی کے قطعات جو براعظم کہلاتے ہیں ان کے چاروں طرف ایسے بڑے سمندر پھیلے ہوئے ہیں جن کی حد کہیں ختم نہیں ہوتی ان کا خیال تھا کہ زمین کے شمال میں بڑے بڑے پہاڑ اور یخ اور برف ہے اس وجہ سے شائستہ ملکوں کے لوگوں کی اس سمندر تک رسائی نہیں ہو سکتی۔

ایک دیوتا جس کا نام ڈلکن ہے وہ اس سنسان سمندر پر جہاز رانی کا مالک ہے۔ یہ بڑا ذمہ داری کا کام اسی کے سپرد ہے کہ آفتاب کو حفاظت کے ساتھ اس سمندر سے پار لے جائے اور صبح کو سلامت منزل مقصود پر پہنچا دے اور ہلاکت سے بچا لے۔ اس کام کو انجام دینے کے لیے ڈلکن کے پاس ایک بڑا جہاز تیار رہتا تھا جب وہ دیکھتا تھا کہ اب غروب آفتاب کے وقت سورج سمندر میں ڈوبنے کو ہے تو وہ آنکر اس کو جھٹ سنبھال لیتا تھا اور اپنے جہاز میں سوار کر کے راتوں رات سمندر میں جہاز رانی کرتا ہوا شمال کی راہ سے اپنی عظیم الشان سواری کو لے جایا کرتا تھا۔ جب سورج کی سواری

اسی طرح شمال کی راہ سے گزرا کرتی تھی تو اس کی چمک بعض وقت گرمیوں میں شمالی پہاڑوں پر سے دکھائی دیجایا کرتی تھی۔ غرض متقدمین کا خیال تھا کہ عین گرمیوں میں جو رات کو شفق کی روشنی بہت عرصہ تک رہا کرتی ہے اس کی وجہ یہی ہے اس طرح دل کن رات بھر جہاز چلاتا ہوا آخر کار صبح ہوتے ہوتے ٹھیک وقت پر سورج کو مشرق میں پہنچا دیا کرتا تھا اور وہاں اس کو ایسے زور کے ساتھ اوپر کی طرف دھکیل دیتا تھا کہ وہ اسی روز میں بھرا ہوا دن بھر اپنا دورہ کئے جاتا تھا۔ پھر وہ بڑا محنتی دیوتا یعنی دل کن آفتاب کو مشرق میں روانہ کر کے الٹے پیروں اپنی ساری قوت خرچ کر کے اسی سمندر کی راہ واپس آ جاتا تھا کہ شام کو آفتاب کی سواری کے لیے پھر مغرب میں تیار رہے۔ یہ دھندا بیچارے دل کن کو رات دن برابر رہتا تھا۔ آفتاب کی ظاہری گردش کو سمجھانے کے لیے دل کن اور اس کی کشتی کا جو حال ہم نے بیان کیا اچھا تو معلوم ہوتا ہے مگر اس میں ایک تو نقص یہ ہے کہ بیچارے دل کن کو رات دن محنت کرنے سے ایک لمحہ کی بھی فرصت نہیں ملتی۔ اس کے سوا بعض اور مشکلیں بھی تھیں۔ مثلاً جہازوں کے کپتان کہا کرتے تھے کہ ہم تو سارے بڑے بڑے سمندروں پر چاروں طرف پھرے مگر ہم کو تو یہ نہیں معلوم ہوا کہ سمندر آگے ہی کی طرف برابر پھیلتے چلے جاتے ہیں اور کبھی ختم ہونے میں نہیں آتے بلکہ ہم کو یہ معلوم ہوا ہے کہ سمندر کی سطح جھک کر خمدار ہو جاتی ہے کیونکہ ہمارے جہاز ایک ہی طرف کو بہت دور تک چلتے چلتے آخر کار پھر اسی جگہ آ پہنچے جہاں سے ہم پہلے روانہ ہوئے

تھے۔ ان جہازرانوں نے یہ بھی کہا کہ ہمکو شمال کا حال بھی کسی قدر معلوم ہے کہ وہاں کوئی ایسا سمندر نہیں جس میں دل کن اپنا جہاز چلا سکے۔ یہ بات بھی لوگوں کو معلوم ہوئی کہ جہازراں لوگ رات دن کرۂ زمین پر سمندروں میں ہر طرف سفر کرتے پھرتے ہیں مگر انہوں نے کبھی سورج کو سمندر میں اترتے نہیں دیکھا اور گو دل کن اپنا جہاز لیے روایت مذکورہ بالا کے موافق رات دن سمندر میں سفر کرتا رہتا ہے مگر ان جہازرانوں کو کبھی اس کا سایہ تک نہیں دکھائی دیا۔ غرض ان باتوں سے لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ زمین ایسی ہموار سطح نہیں ہے کہ جو برابر آگے کو پھیلتی چلی جاتی ہو۔ بلکہ وہ ضرور گول کرہ ہے جو آسمان میں معلق دھرا ہوا ہے اور کسی چیز کے ساتھ بندھا ہوا نہیں جس سے وہ تھما ہوا ہو۔ اس کے بعد لوگوں کو یہ خیال آیا کہ رات سے بدل کر دن اور دن سے بدل کر رات جو پیدا ہوتی ہے اس کا سبب یہ ہے کہ آفتاب درحقیقت آسمان میں زمین کے گرد پھرتا ہے اور دن کو ہمارے سر کے اوپر اور رات کو ہمارے پیروں کے تلے کی طرف گردش کرتا ہے۔" آہ

لیکن اس اخیر خیال کو درست ماننے کی صورت میں حدیث کا جو عقدہ ہم حل کرنا چاہتے تھے وہ جوں کا توں باقی ہے۔ کیونکہ بقول امام الحرمین رحؒ وغیرہ کے یہ متفق علیہ مسئلہ ہے کہ آفتاب جس وقت ایک قوم کے یہاں غروب ہوتا ہے اسی وقت دوسروں کے یہاں طلوع ہوتا ہے۔ اور رات کسی ملک میں چھوٹی ہوتی ہے تو کسی میں بڑی یہاں تک کہ بلغار کے علاقہ میں بعض اوقات شفق غائب بھی نہیں ہونے پاتی کہ صبح صادق نکل آتی ہے

اور جیسا کہ اپنے موقع میں ثابت کیا گیا ہے۔ عرض تسعین میں ہمیشہ چھ مہینے کی رات اور چھ مہینے کا دن ہوتا ہے۔ غرض کہ اس پر دلائل قایم ہیں کہ غروب کے وقت آفتاب ساکن نہیں ہوتا۔ ورنہ لازم آئے کہ طلوع کے وقت بھی ساکن ہو (بلکہ ہر وقت ساکن ہی رہے) کیونکہ اب ایک افق کا غروب بعینہ دوسرے افق کا طلوع ہے۔ پھر یہ بھی براہین سے ثابت ہو چکا ہے کہ سورج اپنے آسمان سے کسی حالت میں جدا نہیں ہوتا تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ طلوع ہو کر ایک آسمان سے دوسرے آسمان پر اور وہاں سے تیسرے پر اور اسی طرح عرش معلےٰ تک جا پہنچے۔ جو کوئی ایسی بدیہی البطلان بات کا دعویٰ کرے وہ گویا روز روشن میں سورج کے نہ نکلنے کا اقرار کرتا ہے۔ اس موقع پر یہ امر بھی فراموش کرنے کے قابل نہیں کہ آفتاب ہمیشہ عرش کے نیچے ہی رہتا ہے کیونکہ عرش تمام آسمانوں کو (جن میں فلک شمس بھی داخل ہے) محیط ہے اور وہ سب اس کے جوف میں واقع ہیں۔ پھر فقط غروب کے وقت اس کے تحت العرش جانے کے کیا معنی۔ اسی قسم کے شبہات پر نظر کر کے سید محمود آلوسی بغدادیؒ صاحب روح المعانی نے یہ تحریر فرمایا ہے کہ:-

وقد سألت كثيراً من اجلة المعاصرين عن التوفيق بين ما سمعت من الاخبار الصحيحة وبين ما يقتضي خلافها من العيان والبرهان فلم اوفق لان افوز منهم بما يروى

میں نے اپنے بہت سے جلیل القدر معصروں سے ان روایات صحیحہ اور شاہدات و دلائل عقلیہ کے درمیان تطبیق کی صورت دریافت کی لیکن میری قسمت میں کسی ایسے جواب سے فائز ہونا نہ تھا جو کسی تشنہ کام کی پیاس کو فرد

ا لعليل و يشفى العليل ۔ کردے یا کسی بیمار کو شفا بخشے ۔

اس کے بعد جو کچھ انہوں نے اپنی ذاتی تحقیق اس بارہ میں بیان کی اس کا خلاصہ یہ ہے کہ آفتاب اور اسی طرح تمام ستارے ہمارے نزدیک عقل و ادراک رکھتے ہیں جیسا کہ کتاب و سنّت کے شواہد کثیرہ سے ہویدا ہوتا ہے ۔ اور جب یہ بات ہے تو کچھ بعید نہیں کہ آفتاب کے لیے انسان کی طرح کوئی نفس ناطقہ بھی ہو بلکہ بعض صوفیہ نے تو اس کی تصریح کر دی کہ اس کے واسطے ، نہایت اعلیٰ درجہ کا کامل نفس ناطقہ ہے اور حکماء تے بھی افلاک کے حق میں تو عموماً کہا ہے کہ ان کے اندر نفوس منطبعہ موجود ہیں لیکن بعض حکماء نے کواکب کیلئے بھی ایسا ہونا بیان کیا ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ ہر وہ چیز جو عالم علوی میں ہے خواہ وہ کواکب ہوں یا افلاک کلیہ ۔ یا افلاک جزئیہ ۔ یا تداویر یا اور کچھ حیّ و ناطق ہے ۔

اور انسان کا نفس ناطقہ گاہ و بگاہ مقدس ہو کر بدن سے نکل جاتا ہے اور پھر اپنے بدن کی یا کسی اور کی صورت میں متمثل ہو کر ظاہر ہوتا ہے ۔ جیسا کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام صحیح روایات کے موافق حضرت دحیہ کلبی یا بعض اعراب کی صورت میں ظاہر ہوتے تھے اور ایسے حالات میں جب کہ انسان کے نفس ناطقہ پر یہ کیفیت پیش آئے اپنے اصلی جسم کے ساتھ بھی اس کو ایک درجہ کا تعلق باقی رہتا ہے جس کی وجہ سے اس کے جسم اصلی سے بھی افعال و حرکات سرزد ہوتے ہیں ۔ چنانچہ بعض اولیاء اللہ کی نسبت ایسی بہت حکایات منقول ہیں کہ وہ ، ایک ہی وقت میں متعدد جگہ دیکھے گئے ۔ اور اس کا سبب ان کے نفوس

قدسیہ کی قوۃ تجرد کے سوا اور کچھ نہ تھا جس کی بناء پر وہ ایک موقعہ پر متمثل ہو کر ظاہر ہوتے تھے ۔ اور دوسری جگہ ان کا اصلی جسم پایا جاتا تھا ۔ اور یہ ایک ایسی بات ہے کہ حضرات صوفیہ کے درمیان مشہور اور مشاہد اور مسلم ہے اور احادیث معراج وغیرہا میں جو بعض انبیاء علیہم السلام سے آپ کی ملاقات کے تذکرے آئے ہیں ان سے بھی اسی اصول کی تائید ہوتی ہے ۔

پس اب ہم اسی اصول کی بناء پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ آفتاب کے لئے بھی ممکن ہے کہ ایک ایسا ہی نفس مقدس ہو جو اس کے مشاہد جسم سے اس طرح جدا ہو کر کہ ایک نوع کا تعلق اس سے بھی باقی رہے عرش تک جا پہنچے ۔ اور بلا واسطہ اس کے نیچے سجدہ کرے اور اجازت مانگے اور اسی حالت میں اس کا یہ جسم مشاہد برابر چلتا رہے اور ایک منٹ کے لئے بھی ساکن نہ ہو ۔ جیسا کہ اہل ہیئت دعوٰی کرتے ہیں اور اس کے عروج الی العرش کا واقعہ اس وقت پیش آتا ہو ۔ جبکہ افق حقیقی کے اعتبار سے غروب ہوتا ہو اور ربع مسکون کے لوگ عموماً اس کے دیکھنے سے محروم ہو جاتے ہیں ۔ اگرچہ عرض تسعین میں وہ اس وقت طلوع ہو رہا ہو ۔ کیونکہ یہ ہمارے لئے اب کچھ مضر نہیں اور یہ بھی ایک احتمال ہے کہ غروب کا اعتبار خاص افق مدینہ کے اعتبار سے کیا جائے ۔ آہ واللہ اعلم بالصواب ۔

○ ان تمام توجیہات کے بعد جو اوپر مذکور ہوئیں یہ عرض کرنا بیجا نہ ہوگا کہ جس صحیح حدیث کا مطلب حل کرنے کے لئے مسائل ہیئۃ کے مقابلہ میں اس قدر جد و جہد کام میں لائی گئی اگر اس سے پہلے خود الفاظ حدیث کا منطوق متعین

کرنے کی سعی کی جاتی تو میرے خیال میں بہت سی تاویلات سے نجات مل جانے کا امکان تھا۔ اگر یوں کہا جاتا تو کیا حرج تھا کہ اس حدیث میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فی الحقیقت خداوند ذوالجلال کی عظمت و جبروت اور مخلوقات میں سے بڑی سے بڑی مخلوق کی عجز و بیچارگی کو واضح فرمایا ہے اور ربط حادث بالقدیم کے اس مسئلہ کی تقریر کی ہے جسکو محققین ام المسائل کہتے ہیں اور جس کا حاصل یہ ہے کہ مخلوقات کو جو علاقہ (استفادہ وجود کا) اپنے خالق جل علاسے ہے وہ اگر بالفرض ایک لمحہ کے لئے بھی منقطع ہو جائے تو عالم میں سے کسی چیز کا وجود اسی طرح باقی نہیں رہ سکتا جس طرح آفتاب کی شعاعوں کا تعلق زمین سے رک جانے پر زمین کا روشن رہنا ممکن نہیں اسی لئے اسلام کا یہ قطعی عقیدہ ہے کہ ہر قسم کے وجود اور تمامی حرکات و سکنات کی باگ فقط خدائے واحد کے قبضۂ اقتدار میں ہے یہاں تک کہ کوئی متنفس جو سانس لیتا ہے اور ہر پتہ جو درخت پر ہلتا ہے اور ہر ایک تنکا جو اپنی جگہ سے سرک جاتا ہے اس میں بھی اسی کی اجازت اور اسی کا ارادہ درکار ہے۔

وہ آفتاب درخشاں (جس کو ان تمام اجرام علویہ کا بادشاہ کہنا چاہیے جو کل اجسام سفلیہ پر اپنی حکومت رکھتے ہیں)، اس وحدہ لاشریک کی اطاعت کے لئے محیط کے پردہ سے باہر آتا ہے اور دنیا کا یہ سب سے زیادہ روشن ستارہ (جس کے محکم نظام حرکت نے حضرت خلیل اللہ کے مقابلہ میں نمرود مغرور کو ہکا بکا کر دیا اور جس کی آب و تاب کے سامنے سبا کی بہت

بڑی ملکہ (بلقیس نے، باوجود اوتیت من کل شیء ولہا عرش عظیم کی شان کے جبین نیاز جھکا دی اور سر سجود خم کر دیا۔ جب مشرق سے مغرب کو روانہ ہوتا ہے (اور ہر وقت روانہ ہوتا رہتا ہے)، تو اپنی حرکت کی ہر ہر آن میں اور مسافت کے ہر ہر قدم پر عرش کے نیچے اور رب العرش کے سامنے سجدہ میں گرتا ہے اور (علی اختلاف الآراء)، حالاً یا قالاً ہر لحظہ آگے بڑھنے کی اجازت طلب کرتا رہتا ہے یہ مجال نہیں کہ اس عزیز و علیم کا اذن حاصل کئے بغیر وہ ایک قدم ادھر یا ادھر رکھ سکے چنانچہ صبح سے شام اور شام سے صبح تک جو چکر چوبیس گھنٹہ میں وہ پورا کرتا ہے اس میں ایک ساعت بھی ایسی نہیں آتی کہ وہ رب العزت کے حکم سے بے نیاز ہو سکے۔ یا اس سے سرتابی کا خیال لا سکے۔

اس کا یہ سلسلۂ رفتار اسی طرح روزمرہ چل رہا ہے اور یونہی ہمیشہ چلتا رہے گا۔ یہاں تک کہ اہل اسلام کے معتقدات کے موافق امر الٰہی آن پہنچے۔ اور عالم کی تباہی کی گھڑی نزدیک آ جائے اور اپنے جس مستقر (جائے قرار و سکون) کی تلاش میں یہ آفتاب سرگرداں رہتا تھا اس کو پا چکے۔

اس وقت اس کو حکم ہو گا کہ قدم آگے مت اٹھاؤ۔ اپنی حرکت کو روک لو اور جس طرف سے آئے تھے اسی طرف پھر الٹے پاؤں لوٹ جاؤ۔

ما قال سبحانہ و تعالیٰ والشمس تجری لمستقر لہا ذلک تقدیر العزیز العلیم۔ والقمر قدرناہ منازل حتی عاد کالعرجون القدیم لا الشمس ینبغی لہا ان تدرک القمر ولا اللیل سابق النہار وکل فی فلک یسبحون۔

(ترجمہ) اور آفتاب ہے کہ اپنے ٹھکانے کی طرف کو چلا جا رہا ہے۔ یہ اندازہ

خدا کا باندھا ہوا ہے جو زبردست اور (ہر چیز سے) آگاہ ہے۔ اور چاند ہے کہ ہم نے اس کے لئے منزلیں ٹھیرا دیں یہاں تک کہ (آخر ماہ میں گھٹتے گھٹتے پھر) (ایسا ٹیڑھا اور پتلا) رہ جاتا ہے جیسے (کھجور کی) پرانی ٹہنی۔ نہ تو آفتاب ہی سے بن پڑتا ہے کہ چاند کو جا لے اور نہ رات ہی دن سے پہلے آسکتی ہے (اور کیا سورج) سب (اپنے اپنے) مدار (آسمان) میں (پڑے) تیر رہے ہیں۔

ہماری اس تقریر کے موافق جو ہم نے حدیث مذکور کے متعلق عرض کی آفتاب کا ہر وقت زیر عرش رہنا یا ہر آن میں طلوع و غروب کا ہونا یا لیل و نہار میں اختلاف پایا جانا وغیرہ امور جن کو امام الحرمین نے شبہہ کے موقع پر پیش کیا تھا کچھ مضر نہیں بلکہ مفید ہیں۔ البتہ تجری حتیٰ تنتھی الی مستقرھا تحت العرش الخ والی روایت میں تحت العرش کو برخلاف تصریحات قوم تجری کے متعلق کرنا پڑتا ہے جس میں قواعد عربیت کے لحاظ سے کوئی قباحت نہیں باقی مستقر کے جو معنی لئے گئے ہیں وہ بعض اجلہ مفسرین کے قول کے بالکل موافق ہیں۔

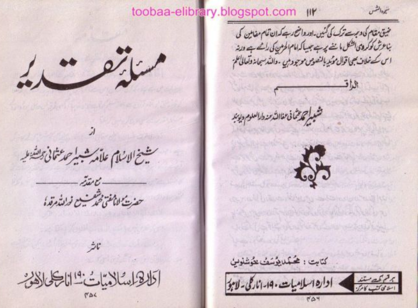
اس کے بعد اگر گفتگو کی کچھ گنجائش باقی رہتی ہے تو فقط اس بارہ میں کہ جب ہر لمحہ آفتاب کی یہی حالت تھی کہ وہ عرش کے نیچے سجدہ کرتا رہتا اور اجازت مانگتا رہتا ہے تو پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوذرؓ سے خطاب کرنے میں غروب آفتاب کی خصوصیت کو کیوں ملحوظ رکھا۔ لیکن اس کا جواب نہایت سہل ہے۔ کون نہیں جانتا کہ سورج کے تنزل اور بیچارگی کا نمایاں سے نمایاں منظر اور اس کی ادھر سے ادھر حرکت کا ظاہر سے

ظاہر پہلو دیکھنے والوں کو اپنے اعتبار سے صرف غروب ہی کے وقت دکھائی دیتا ہے۔ اور اس لحاظ سے اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تخاطب کے لئے اس وقت کی رعایت فرمائی تو نہایت ہی مناسب ہوا۔ الغرض اس حدیث سے علاوہ دوسرے فوائد کے اس کی بھی بخوبی وضاحت ہوگئی کہ یہ دیکھ کر کہ عالم مشاہدات میں علویات سفلیات سے اشرف ہیں اور پھر آفتاب تمام علویات میں بھی اشرف و اعلیٰ ہے۔ کوئی شخص یہ دھوکا نہ کھائے کہ آفتاب بھی کسی درجہ میں قابل عبادت ٹھہر سکتا ہے۔ ایسے شخص کو یاد رکھنا چاہیے کہ آفتاب بہرحال عرش کے نیچے ایک مزدور کی طرح جو کسی کام پر لگایا گیا ہو پڑا چکر کھا رہا ہے اور مستحق عبادت تنہا وہی نور السمٰوٰت والارض ہو سکتا ہے جو عرش سے بھی ادھر ہے اور جس کی روشنی سے تمام آسمان و زمین و عرش و کرسی جگمگا رہے ہیں۔ ومن اٰیاتہ اللیل والنھار والشمس والقمر لا تسجدوا للشمس ولا للقمر واسجدوا للہ الذی خلقھن ان کنتم ایاہ تعبدون۔ (ترجمہ) اور خدا کی (قدرت کی) نشانیوں میں سے رات اور دن اور سورج اور چاند بھی ہیں (سو) نہ تم سورج کو سجدہ کرو اور نہ چاند کو اور (اگر تم کو خدا کی ہی عبادت کرنی ہے تو اللہ ہی کو سجدہ کرو جس نے ان سب چیزوں کو پیدا کیا ہے۔ ولنعم ما قیل ؎

لنا شمس و للآفاق شمس — وشمسی خیر من شمس السماء

فشمس الناس تطلع بعد فجر — وشمسی تطلع بعد العشاء

(تنبیہ) اس مبحث کے متعلق بعض دوسرے محققین کی تقریرات



ضیق مقام کی وجہ سے ترک کی گئیں۔ اور واضح رہے کہ ان تمام مضامین کی بناعرش کو کروی الشکل ماننے پر ہے جیسا کہ امام الحرمین کی رائے ہے ورنہ اس کے خلاف بھی اقوال مؤید بالنصوص موجود ہیں۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

الراقم

شبیر احمد عثمانی عفا اللہ عنہ دار العلوم دیوبند

کتابت: محمد یوسف خوشنویس

مسئلہ تقدیر

از

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

مع مقدمہ

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع نور اللہ مرقدہ

ناشر

ادارۂ اسلامیات ۱۹۰ انارکلی لاہور

مُقدّمہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

امّا بعد، مسئلہ ایک طرف اپنے آثار و مظاہر کے اعتبار سے اس قدر اجلی بدیہیات میں سے ہے، کہ کوئی انسان اس سے آنکھ نہیں چُرا سکتا، اور ہر وہ انسان جو خدا تعالےٰ کو قادر مطلق اور تمام قوتوں سے بالاتر تسلیم کرتا ہے خواہ مذہباً وہ کسی فرقہ میں داخل ہو وہ از روئے مسئلہ تقدیر سے کسی طرح گریز نہیں کر سکتا۔

دوسری طرف انسان بالطبع حقائقِ اشیاء تک پہنچنے کی کوشش کرنے کا خوگر ہے، جب اس راہ سے اس مسئلہ میں غور کیا جاتا ہے کہ اس کی کنہ اور حقیقت معلوم ہو تو بڑے بڑے ماہر و محقق پھسلنے لگتے ہیں، اور اصل وجہ اس کی ظاہر ہے کہ مسئلہ تقدیر صفاتِ الٰہی کا مسئلہ ہے جس کی پوری حقیقت تک انسانی عقل کی پرواز نہیں اور انسانی عقل و فکر کا مختصر سا دائرہ اس کو سما نہیں سکتا۔

لاتدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار (القرآن)

اس کو نظریں نہیں پا سکتیں اور وہ سب نظروں کو پا سکتا ہے۔

ہر مذہب و ملت کے بڑے بڑے محققین نے اس مسئلہ پر قلم اُٹھایا لیکن آخری حقیقت سب کے بیان کی اس سے آگے نہیں بڑھی کہ ؎

کہ حیرت گرفت آستینم کہ قُم،

اس دورِ الحاد و زندقہ میں اس کی شدید ضرورت تھی کہ اہلِ عصر کے مذاق اور ذہن و فکر کے مطابق کسی سلیس عنوان سے مسئلہ کے مختلف پہلوؤں کو واضح کیا جائے۔

سیدی و استاذی شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی قدس سرہ کو حق تعالیٰ نے بیان و توضیح کا ایک خاص ملکہ عطا فرمایا تھا، اس لئے ہمیشہ اکابر اہلِ عصر کی نظریں بھی اس قسم کے مسائل میں انہیں پر پڑتی تھیں، میرے استاذ محترم محدث العصر حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہٗ نے بار بار آپ سے فرمایا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ دو مسئلوں کی توضیح آپ مستقل رسالوں کی صورت میں لکھدیں ایک مسئلہ معجزات انبیاءؑ دوسرے مسئلہ تقدیرؒ، پہلے مسئلہ پر تو حضرت ممدوح نے عرصہ ہوا ایک رسالہ "خوارق عادات" کے نام سے تصنیف فرما دیا تھا جو اسی وقت شائع بھی ہو گیا دوسرا مسئلہ باقی تھا، اس کے لئے فرصت کا انتظار رہا، تا آنکہ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل ضلع سورت میں ایک سال درس صحیح بخاری میں آپ نے اس مسئلہ پر ایک جامع تقریر فرمائی یہ تقریر بخاری حضرت مولانا کے ایماء سے پوری ضبط کی جاتی تھی، یہ مسئلہ بھی اس میں پوری وضاحت و تفصیل کے ساتھ ضبط ہو گیا، پھر حضرت مولانا نے اس تقریر پر نظر ثانی کر کے جا بجا اصلاحات فرمائی، اور مسئلہ تقدیر پر خصوصیت سے اضافے فرما کر اس کو ایک مستقل رسالہ میں شائع کرنے کے قابل بنا دیا، مگر بحکم قضا و قدر شیخ الاسلام کی حیات میں اس کی اشاعت کی نوبت نہ آئی، اب اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے مولانا مرحوم کے برادر خورد بھائی فضل حق صاحب عثمانی کو کہ انہوں نے اس کی اشاعت کا انتظام فرما دیا۔

اس رسالۂ نافعہ کی پوری قدر و قیمت تو حضرت شاہ صاحبؒ ہی پہچانتے مگر افسوس ہے کہ وہ آج ہم میں نہیں، لیکن اتنی بات ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ رسالہ اس موضوع میں بے نظیر ہے، اور دفع شبہات کے لئے اکسیر ہے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس سے مستفید فرمائیں۔ آمین،

بندہ محمد شفیع عثمانی دیوبندی
مقیم کراچی ۲۹ محرم ١٣٧١ھ

مسئلۂ تقدیر
پر
ایک اہم شبہ اور اس کا ازالہ

فقال رجل یا رسول اللہ افلا نتکل علی کتابنا الخ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فرمایا کہ سب کچھ پہلے سے متعین اور فیصل شدہ ہے، اس پر صحابہ کو یہ شبہ ہوا کہ جب سب کچھ طے شدہ اور متعین و مشخص ہو چکا، اور جو وہاں طے ہو چکا وہی واقع ہو کر رہے گا پھر عمل کرنے سے کیا فائدہ؟ کیونکہ علم الٰہی میں جو متعین اور طے شدہ ہے، اس کے خلاف ہونا تو ممکن نہیں، عمل کرو یا نہ کرو، کم کرو یا زیادہ، اسی کے مطابق ہو کر رہے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو جواب ارشاد فرمایا اس کا حاصل یہ ہے کہ تم عمل کرتے رہو، کیونکہ تم کو کیا خبر ہے کہ اللہ کے علم میں کیا چیز طے شدہ ہے، لہٰذا تم اپنا کام کرتے چلے جاؤ۔ فضول بحثوں میں مت پڑو، اور تم ناگزیر کرو گے وہی جو علم الٰہی میں طے ہو چکا ہے، پھر ایسی بے کار بحثوں میں اُلجھنے سے کیا فائدہ۔

رہا یہ کہنا کہ کسی شخص کا جنتی یا جہنمی ہونا اور اسی طرح سعید و شقی ہونا جب پہلے لکھا جا چکا ہے تو عمل کی کیا ضرورت، تقدیر کا لکھا تو بہر حال پورا ہو کر رہے گا قلت تدبر

کی دلیل ہے کیونکہ تقدیر میں جہاں یہ لکھا ہے کہ فلاں شخص جنتی یا سعید ہوگا وہیں یہ بھی لکھا جا چکا ہے کہ وہ شخص فلاں فلاں عمل کر کے اس نتیجہ پر پہنچے گا۔ لہٰذا وہ اعمال بھی مقدر ہوئے اور ان کا صدور بھی تقدیر ہی کا ایک جزو ہوا، پھر اس کے خلاف کیسے ہو سکتا ہے پس یہ سوال کہ ہم عمل کیوں کریں، یا عمل میں زیادہ جان کیوں ماریں، اس کا جواب یہ ہوگا کہ ہماری تقدیر میں جن اعمال کے ذریعہ جنت میں پہنچنا یا درجات عالیہ حاصل کرنا لکھا ہے ان کا صدور بھی ہم سے ضروری و لابدی ہے، جس طرح دنیا میں ایک مدت متعینہ تک ہماری حیات جن اسباب کے ذریعہ مقدر ہے ان اسباب کی مباشرت بھی تقدیری طور پر ہمارے لئے ضروری ہے، تقدیر میں صرف نتائج و مسببات ہی نہیں، ان کے اسباب و ذرائع اور مبادی بھی پہلے سے لکھے ہوئے ہیں۔ لہٰذا یہ سوال بالکل بے موقع ہے۔

خلاصہ یہ کہ جس شخص کا جنتی یا جہنمی ہونا مقدر ہے وہ خواہ کتنی ہی بحث و تکرار کرے اس کی طبیعت آخر کار اسی طرف چلے گی اور وہی اعمالِ صالحہ یا افعالِ کفریہ اس کے لئے آسان ہوتے چلے جائیں گے، جو اس کے آخری نتیجہ تک پہنچنے کے وسائل و ذرائع ہیں اور ان اچھے بُرے اعمال کی تفریق و امتیاز جن اسباب پر مبنی ہے مثلاً انزالِ کُتب و ارسالِ رُسُل وغیرہ ان سب کا وقوع پذیر ہونا بھی ناگزیر ہوگا، بہر حال جس طرح ایک شخص کا جنتی یا جہنمی ہونا مقدر ہے، اس کے مناسب اعمال کا صدور بھی مقدر ہے اور اچھے بُرے اعمال کی تقسیم کے لئے کتابوں اور رسولوں کا آنا بھی مقدر ہے، یہ سب چیزیں ایک طے شدہ پروگرام کے مطابق ہو کر رہیں گی۔

انسان مختار ہے یا مجبور

خیر یہ تو ایک سوال وجواب کی تقریر وتشریح تھی جو صحابہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان پیش آچکا، اس کے بعد یہاں ایک دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے یہ اعمال آیا ہمارے ارادہ و اختیار میں ہیں، یعنی اُن کے صدور میں ہمارے اختیار و ارادہ کو کچھ دخل ہے یا ہم بالکل مجبور محض اور مضطر ہیں، یہ سوال اس لئے ہو رہا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کے علم کے خلاف ایک ذرہ بھی نہیں ہل سکتا ہر شخص وہی عمل کر سکتا ہے اور کر گیا جو علم الٰہی میں پہلے سے مقرر اور طے شدہ ہے، تو پھر بظاہر عامل اپنے عمل میں مجبور و مضطر ہُوا، اور عامل کے اپنے ارادہ و اختیار کو کوئی دخل اس کے صدور میں نہ رہا۔ گویا بندوں کے سارے افعال اضطراری ہو گئے، لیکن فی الحقیقت یہی بات غلط ہے کہ علم الٰہی کی وجہ سے عامل کا ارادہ و اختیار سلب ہو جاتا ہے۔ بیشک ہر چیز ٹھیک اسی طرح وقوع پذیر ہوگی جو علم الٰہی میں ازل سے طے شدہ ہے ایک رتی برابر بھی اس سے تخلف نہیں ہو سکتا، مگر یہ علم الٰہی ازلی ہمارے ارادہ و اختیار کو پھر بھی سلب نہیں کرتا بلکہ اُلٹا اس کو اور زیادہ ثابت و مستحکم کرتا ہے، کیونکہ علم الٰہی میں مثلاً ہمارے افعال اختیاریہ کے متعلق یہ طے شدہ ہے کہ فلاں شخص اپنے ارادہ و اختیار سے فلاں عمل فلاں وقت میں کرے گا، بناءً علیہ یہ ضروری اور لازم ہوگا کہ وہ شخص اپنے ارادہ و اختیار ہی سے وہ عمل انجام دے، ورنہ ایک چیز کا علم الٰہی کے خلاف واقع ہونا لازم آئے گا جو محال ہے۔

علاوہ بریں علم الٰہی میں کسی عمل کے مقرر و متعین ہونے کی وجہ سے عامل کا مسلوب الارادہ والاختیار نہ ہونا ایک اور جہت سے بخوبی سمجھ میں آ سکتا ہے، تھوڑی دیر کے لئے افعال و اعمال عباد کے متعلق بحث کو ملتوی رکھیے، میں پوچھتا ہوں کہ خود اللہ تعالیٰ کے جو کچھ افعال و تصرفات ہر وقت اس کائنات میں مشاہد ہیں وہ سب اس کے علم قدیم محیط میں پہلے سے ثابت ہیں یا نہیں؟ اگر نہیں ہیں تو جہل لازم آتا ہے۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ خود اللہ تعالےٰ جو کچھ افعال اس دنیا میں کرتے ہیں وہ سب علم قدیم میں پہلے ہی سے طے شدہ ہیں، کیونکہ جہل ممتنع ہے، اب سوال یہ ہے کہ خود اللہ تعالےٰ کا کوئی فعل اس کے علم ازلی محیط کے خلاف ہو سکتا ہے؟ اگر نہیں ہو سکتا، جیسا کہ ظاہر و مسلّم ہے تو یہاں بھی وہی بحث آ گئی جو تم افعال عباد کے متعلق کر رہے تھے اگر جب علم قدیم سے خلاف نہیں ہو سکتا، تو عامل اپنے عمل میں مجبور و مضطر ہو گا، اس بنا پر تو یہ لازم آتا ہے کہ بندے تو رہے ایک طرف خود اللہ تعالیٰ بھی فاعل و مختار نہ ہو، تم تو افعال عباد کی فکر میں تھے، یہاں خود افعال باری کا اضطراری ہونا لازم آ گیا۔

پس ثابت ہُوا کہ کسی فعل کے ساتھ علم الٰہی کے متعلق ہونے سے فاعل کا مضطر اور مسلوب الارادہ ہونا لازم نہیں، خواہ وہ فاعل اللہ تعالیٰ ہو یا بندے ہوں تو اصل بات وہی ہوئی جو میں کہہ چکا ہوں کہ علم الٰہی قدیم عامل کے ارادہ و اختیار کی نفی نہیں کرتا، اسے ایک ناتمام سی مثال سے سمجھئے، آپ جانتے ہیں کہ ریل گاڑیوں کی آمد و رفت تا بحدِ امکان طے شدہ ٹائم ٹیبل بالکل موافق و مطابق ہوتی ہے لیکن کیا اس ٹائم ٹیبل کو ریل کے چلنے اور اس کی حرکت میں ذرا سا بھی دخل ہے؟ ظاہر ہے کچھ بھی دخل نہیں، تو بطور تقریب الی الفہم کے علم الٰہی بطور ٹائم ٹیبل کے سمجھئے فرق یہ ہے

کہ ٹائم ٹیبل بنانے والوں کا علم چونکہ محیط و کامل نہیں وہ لوگ محض اپنے قواعد و اصول کی بنا پر طے کر لیتے ہیں کہ فلاں اسٹیشن پر گاڑی فلاں وقت پہنچے گی، اُن کو یہ خبر نہیں ہوتی کہ کسی دن درمیان میں لائن ٹوٹ جائے گی، یا انجن خراب ہو جائے گا، یا اور کوئی حادثہ پیش آئے گا، اس لئے گاڑی لیٹ ہو جائے گی، اس قسم کے عوارض و موانع جزئیہ کا علم محیط ان کو نہیں ہو سکتا، لہٰذا کبھی کبھی ان عوارض و حوادث کی بنا پر ان کے طے کئے ہوئے ٹائم ٹیبل سے تخلف ہونا ناگزیر ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کا علم چونکہ تمام جزئیات پر ہو بہو بجمیع تفاصیلہا محیط ہے، لہٰذا ذرہ برابر بھی اس کے علم سے تخلف نہیں ہو سکتا، فرض کرو کہ ٹائم ٹیبل بنانے والوں کو بھی اگر ایسا ہی علم محیط حاصل ہوتا، تو تخلف ہرگز نہ ہوتا، بہر حال یہاں تشبیہ دیتے وقت تخلف و عدم تخلف کی بحث نہیں، بلکہ تشبیہ صرف اتنی بات میں ہے کہ انجن کی حرکت اور اسٹیم کے فعل میں اس ٹائم ٹیبل کو کوئی مدخل نہیں، انجن اسٹیم کی طاقت اور اپنی حرکت سے ڈرائیور کے ارادہ کے موافق چلتا ہے، ٹائم ٹیبل کا اس حرکت کرنے میں کوئی دخل نہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ کا علم قدیم عامل کی قدرت و اختیار کو سلب نہیں کرتا، بلکہ علم تو معلوم کے تابع ہوتا ہے کیونکہ علم اس معلوم کے صحیح انکشاف ہی کا نام ہے، معلوم کے واقع ہونے میں علم کا کوئی مدخل نہیں۔

مسئلۂ تقدیر کے متعلق معتزلہ کے عقائد

یہاں تک حدیث اسباب کے متعلق گفتگو ختم ہوئی، اب میں مستقل طور پر مسئلہ تقدیر

کے متعلق کچھ مزید روشنی ڈالنا چاہتا ہوں، صحیح مسلم کی کتاب الایمان میں ایک روایت ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ ایک شخص حضرت ابن عمرؓ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا کہ ہماری طرف کچھ لوگ ہیں جو علم میں اشتغال رکھتے ہیں اور اس کی گہرائی میں گھستے ہیں وہ لوگ کہتے ہیں، کہ اَنْ لَّا قَدْرَ وَاَنَّ الْاَمْرَ اُنُفٌ یعنی تقدیر کوئی چیز نہیں اور بندہ جو کچھ کام کرتا ہے پہلے سے اللہ تعالیٰ کو ان افعال کا کوئی علم نہ تھا (معاذ اللہ) کچھ نہیں جانتا تھا کہ بندے کیا کام کریں گے بلکہ کسی بندے سے کوئی فعل صادر ہو چکنے کے بعد اللہ تعالیٰ کو اس کا علم ہوتا ہے، جیسا کہ صدور افعال کے بعد ہمیں اور تمہیں بھی کچھ علم ہو جاتا ہے۔

الغرض یہ لوگ اللہ سے علم قدیم محیط کی نفی کرتے ہیں۔ افعال عباد کے وجود میں آنے سے پہلے ان کا علم اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت نہیں کرتے۔ یہ عقیدہ بعض قدماء معتزلہ کا تھا جیسا کہ حافظؒ نے تصریح کی ہے لیکن بعد میں معتزلہ نے اس عقیدہ کو جس سے حضرت حق جل مجدہ کی طرف جہل کی نسبت آتی تھی جو اس کی جناب رفیع میں سخت ترین گستاخی ہے ترک کر دیا، کما صرح بہ القرطبی۔ (فتح الملہم ص ۱۶۱، ج ۱)

اب متاخرین معتزلہ کا عقیدہ یہ ہے کہ افعال عباد وجود میں آنے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ کے علم قدیم محیط میں طے شدہ ہیں اس کو پہلے ہی سے سب کچھ علم ہے کون بندہ کیا کیا کام کرے گا، جیسا کہ اہل السنت کا عقیدہ ہے لیکن یہ متاخرین معتزلہ حق تعالیٰ کو جہل کے عیب سے منزہ سمجھتے ہوئے ساتھ ہی یہ کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ عباد کا خالق تو ضرور ہے، پر ان کے افعال کا خالق نہیں۔ عباد اپنے افعال کے خود خالق ہیں، خدا کا اس میں کچھ دخل

نہیں ہوتا۔ اصل یہ ہے کہ بندے دونوں قسم کے کام کرتے ہیں، اچھے بھی، بُرے بھی طاعات اور عدل و انصاف کا بھی ان سے صدور ہوتا ہے، اور مظالم و معاصی کا بھی، اب اگر بندوں کے جملہ افعال کا خالق باری تعالیٰ کو قرار دیا جائے تو شرور و قبائح کی نسبت اس کی طرف لازم آتی ہے جو محال ہے، اس سے بچنے کی تدبیر قدماء معتزلہ نے تو جیسا کہ ابھی گزر چکا ہے یہ سوچی تھی کہ سرے سے علم باری ہی کا انکار کر دیا جاوے" نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری" یعنی باری تعالیٰ نے سب مخلوقات کو پیدا کر دیا، اور بندوں میں ہر قسم کے کام کرنے کی قدرت اور قوتیں بھی رکھ دیں، آگے چل کر بندے ان قوتوں کو کن کاموں میں استعمال کریں گے۔ اچھے یا بُرے میں، اس کا کوئی علم اُسے نہ تھا" اس نے تو گویا بندے کے ہاتھ میں تلوار دے دی، آگے وہ شخص تلوار سے جہاد فی سبیل اللہ کرے گا، یا اُسے کسی معصوم اور بے گناہ آدمی کی گردن پر چلائے گا، اس کی نہ باری کو پہلے سے خبر تھی، نہ اس میں اس کا کچھ دخل (العیاذ باللہ)

متاخرین نے سمجھا کہ علم باری کا انکار کرنا تو بدترین جہل و حماقت ہے، ہاں بندوں کے افعال کو انہی کی ذوات تک محدود رکھا جائے، اور ان کا رشتۂ انتساب باری تعالےٰ سے منقطع کر لیا جائے، تو پھر اُن کے بُرے بھلے کی ذمہ داری بھی اُنہی پہ عائد ہوگی شرور و قبائح کی نسبت خداوندِ قدوس کی طرف نہ رہے گی" اس لئے یہ دعویٰ کر دیا کہ بندوں کے افعال خود بندوں کی مخلوق ہیں۔ ان کے صدور میں حق تعالےٰ کے ارادے اور مشیت کو کوئی دخل نہیں، گو خود بندے اور ان کی تمام قوتیں اس خدا کی پیدا کی ہوئی ہیں

لیکن ان قوتوں سے اچھا یا بُرا کوئی کام کرنا یہ بالکلیہ بندوں کے اختیار میں ہے گویا جس تلوار سے وہ کسی بے گناہ کو قتل کرتا ہے وہ خدا کی دی ہوئی ضرور ہے، تاہم اس تلوار کا چلانا، یہ بندے کا کام ہے جس سے خدا کے ارادے کا کوئی تعلق نہیں، اس طرح اس فعل کی بُرائی کا باری تعالےٰ کی جانب انتساب نہیں ہو سکتا۔ لیکن ان لوگوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ ارتکابِ جرم کی طرح اعانتِ جرم بھی جرم ہے۔ خونِ ناحق کے تمامی اسباب و وسائل اور آلات و قویٰ اگر ایک شخص نے قاتل کے لئے فراہم کئے اور قطعی و یقینی طور پر یہ جانتے ہوئے کہ قاتل ان سامانوں اور قوتوں کو بے گناہوں کے قتل ہی میں استعمال کرے گا، باوجودیکہ وہ قادر تھا کہ اگر چاہتا تو یہ سامان اور قوت اس کے ہاتھ میں نہ دیتا یا ایسا مفلوج کر دیتا کہ اسے قتل پر قدرت ہی نہ رہتی، تو عرفاً یا قانوناً کسی عاقل حکیم کے نزدیک ایسا شخص جرم مذکور سے بالکلیہ بَری نہیں کہا جا سکتا، البتہ اگر اسے اسباب و آلات دیتے وقت یہ علم نہ ہوتا کہ لینے والا اُن چیزوں کو کہاں استعمال کریگا تو بیشک معذور سمجھا جا سکتا تھا اس اعتبار سے قدماء معتزلہ اپنی گمراہی میں دُور اندیش تھے کہ انہوں نے شروع سے علمِ الٰہی تسلیم کرنے سے ہی انکار کر دیا، متاخرین جب علم الٰہی کی ہمہ گیری اور احاطہ کو تسلیم کر چکے تو اب عباد کو خالقِ افعال مان کر بس اُن کے لئے عقلاً کوئی چارہ کار نہیں رہتا کہ اللہ کی طرف شرور کی نسبت سے انکار کر سکیں، کیونکہ اس ظالم قاتل کو آخر پیدا تو اسی نے کیا، اس کے بازو میں قوت اسی نے رکھی جس سے وہ تلوار اُٹھاتا ہے۔ اس کے اندر قدرت اور قوتِ ارادی اور تمام اسبابِ قتل اسی نے

پیدا کیئے اور ان پر اس ظالم کو دسترس دی قطعی طور پر یہ جانتے ہوئے کہ ظالم ان سامانوں سے کام لے گا۔ ان حالات میں تمہارے زعم کے مطابق حق تعالیٰ کی تنزیہ و تقدیس کیسے قائم رہ سکتی ہے۔ حالانکہ اس تنزیہ و تقدیس کو ثابت رکھنے کے لئے تم نے ایک خالق کے سوا کروڑوں خالق تجویز کئے تھے، یعنی ہر بندے کو مستقل خالق مانا تھا۔ پھر بارش سے بھاگ کر پرنالہ کی پناہ لینے سے کیا فائدہ ہوا جبکہ عباد کو اپنے افعال کا خالق بنا کر اور ایک نوع کا شرک اختیار کر کے بھی نسبت شرور الی اللہ سبحانہٗ کا الزام جوں کا توں رہا۔

ایک واضح مثال

مثال کے طور پر سمجھئے کہ فرعون کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا۔ اُسے تندرستی دی قسم قسم کی علمی و عملی قوتیں اس میں رکھیں، ساز و سامان حشم و خدم، قوت و اقتدار اور ملک و سلطنت کے لوازم اس کے قبضہ میں دیئے جس کے غرور اور گھمنڈ میں انا ربکم الاعلیٰ کا دعوی کر بیٹھا حضرت موسیٰؑ کی دعوتِ حق کو ٹھکرا دیا، بنی اسرائیل پر ظلم کئے اور ظاہری اقتدار پر اترا کر کہنے لگا۔ الیس لی ملک مصر وھذہ الانھار تجری من تحتی، حالانکہ خداوند قدوس اپنے علمِ قدیم سے جانتا تھا کہ یہ ملعون ان تمام سامانوں اور قوتوں کو اس طرح کی شرارت و فساد اور اغواء و اضلال کے کاموں میں صرف کرے گا۔ اب متاخرین معتزلہ سے سوال یہ ہے کہ یہ سب باتیں جانتے ہوئے اسے پیدا ہی کیوں کیا، پیدا ہی نہ کرتے یا پیدا ہونے کے بعد اندھا، لنگڑا، اپاہج بنا دیتے، یا اس پر فالج گرا دیتے یا ساز و سامان کچھ نہ دیتے، ایک

بھیک منگا فقیر بنا دیتے مگر ان باتوں میں سے کچھ نہ ہوا بلکہ اسباب و وسائل کی فراوانی انتہا کو پہنچا دی گئی اور فرعون سے پہلے ابلیس کو دیکھیے جو تمام شرور کا مادہ ہے، وہاں اس سے بھی زیادہ یہ صورت نمایاں ہے۔ الغرض محض افعال کا خالق مان کر بھی وہ عقدہ حل نہیں ہوتا جس کے حل کرنے کے لئے اس عقیدۂ شرکیہ کے ارتکاب کا تحمل کیا گیا تھا نسبت الشر الی اللہ کا شبہ بدستور باقی رہتا ہے اور تنزیہ کامل کی تصویر پوری نہیں ہوتی۔

الحاصل جب متاخرین معتزلہ نے علم قدیم کو تسلیم کر لیا تو اب ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کو پہلے ہی سے معلوم تھا کہ فلاں شخص یہ فساد اور شرارت و بغاوت کرے گا تو اس کو روکنے پر اللہ تعالیٰ کو قدرت ہے تاکہ یہ شرارت کر ہی نہ سکے، یا قدرت نہیں، اگر قدرت نہیں تو عجز لازم آتا ہے اور وہ بھی ایسا بدترین عجز کہ خالق اپنی مخلوق کے اور خدا اپنے بندہ کے مقابلہ میں عاجز ٹھہرتا ہے اور اگر روکنے پر قدرت ہے پھر نہیں روکتا بلکہ اس کو شرارت کے سامان اور قوت سے امداد دیتا ہے تو سفہ لازم آئے گا، پس علم قدیم کو مان لینے کے بعد اشکال سے چھوٹنے کی کوئی صورت نہیں اس لئے امام شافعیؒ نے فرمایا، کہ "ان سلم القدری العلم خصم" علم کو تسلیم کر لینے کے بعد عجز یا سفہ ضرور لازم آئے گا جو سب کے نزدیک نقص ہے۔

افعالِ عباد کی حکیمانہ تشریح

اس کے بعد ادھر بھی غور کرنا چاہیئے کہ عباد کو ان کے افعال کا خالق کہنا کہاں تک

قابلِ قبول ہو سکتا ہے کسی چیز کے خالق ہونے کے معنی بالارادہ وجود عطا کرنے کے ہیں۔ اب دیکھئے کہ مثلاً زید کا وجود خود اس کے قبضہ میں نہیں خُدا کے قبضہ میں ہے اور اسی کا عطا کیا ہُوا ہے، اس میں ادراک، احساس، تعقل، قدرت، قوت ارادی اور جوارح یہ سب چیزیں جن سے وہ کوئی عمل کرتا ہے خُدا کی پیدا کی ہُوئی ہیں، اور آگے چلئے مراتب قصد (یعنی ہاجس، خاطر، حدیث النفس، ہم اور عزم) کو چھوڑ کر کسی فعل اختیاری کے نفسِ صدور و وقوع کی کیفیت ملاحظہ فرمایئے، ابن سینا نے "قانون" میں لکھا ہے کہ حرکت ارادی جو اعضاء سے متعلق ہے اس کی تکمیل اس قوت سے ہوتی ہے جو دماغ سے بواسطہ اعصاب اعضاء میں پہنچتی ہے اس کی صورت یہ ہے کہ عضلات جو اعصاب و رباطات وغیرہ پر مشتمل ہیں جب سمٹ جاتے ہیں تو وتر جو رباط و عصب سے ملتئم اور اعضاء میں نفوذ کئے ہوئے ہے کھنچ جاتا ہے جس سے اعضاء بھی کھنچ جاتے ہیں اور جب عضلہ منبسط ہوتا ہے تو وتر ڈھیلا پڑ جاتا ہے اور عضو دُور ہو جاتا ہے۔ اھ"

اس تقریر سے معلوم ہُوا کہ نفس انسانی ادراک کے بعد کسی کام کا ارادہ کرتا ہے تو عضلات کو جو جسم انسانی میں پانچ سو انتیس ہیں کشش وغیرہ دے کر کسی عصب خاص کے ذریعہ جو "ستتر" ہیں جس عضو کو چاہتا ہے خاص حرکت دیتا ہے جس سے فعل عالم وقوع میں آتا ہے۔ یہاں یہ امر قابلِ غور ہے کہ نفسِ انسانی کو سر سے لے کر پاؤں تک جس عضو کو حرکت دینا ہو تو ضرور ہے کہ پانچ سو انتیس عضلات اور "ستتر" اعصاب میں سے اس عضلے اور اس عصب کو حرکت دینا ہوگا جو اس خاص عضو سے متعلق ہے اور یہ ظاہر ہے کہ

قبل اس کے کہ کسی عضلے اور عصب کو حرکت دیں اس کو متعین کرنے کی ضرورت پڑے گی تاکہ خاص اسی کو حرکت دی جائے جس کی طرف توجہ ہے اور یہ متعین کرنا اس بات پر موقوف ہے کہ پیشتر تمام اعصاب و عضلات کو بالتفصیل جان لے، اس کی مثال بعینہٖ ایسی ہوگی جیسے لکھنے کے وقت قلم کو حرکت دینے کے واسطے پہلے چند انگلیوں کو متعین کرتے ہیں جن سے قلم کو حرکت دینا ہوتا ہے پھر ان انگلیوں کو ارادہ و اختیار سے حرکت دیتے ہیں جن سے قلم کو حرکت ہوتی ہے، اس موقع پر ہم اہل انصاف سے درخواست کرتے ہیں کہ جس عضو کو چاہیں بکرات و مرات حرکت دے کر بغور و تعمق اپنے وجدان سے دریافت کریں کہ اس اختیاری حرکت کے وقت کسی عضلہ یا عصب کی طرف نفس کی ادنیٰ توجہ بھی ہوتی ہے، یا یہ معلوم ہوتا ہے کہ اندر کوئی عضلہ یا عصب بھی ہے یا کسی چیز کو ہم کھینچتے ہیں جس سے وُہ عضو کھنچتا ہے کوئی اس کی گواہی نہیں دے سکتا کہ اندرونی کیا کیفیت ہے اور عضلات کو اعصاب کیونکر کھینچتے ہیں ہمیں دانست میں اگر کوئی پوری پوری وجدانی حالت کی ایمان سے خبر دے تو یہی کہے گا کہ اعصاب و عضلات کو میں تو نہیں کھینچتا ہاں اتنا معلوم ہوتا ہے کہ فلاں عضو کو حرکت دینا چاہتے ہیں، پھر ہوتا یہ ہے کہ اِدھر توجہ ہوئی اور اُدھر اس کو حرکت ہوگئی۔ یہاں یہ کہنا بے موقع نہ ہوگا کہ عصب و عضلے کو حرکت دینا بھی ہمارے اختیار سے خارج ہے، کیونکہ اختیاری حرکت ہوتی تو اس کا علم اور ارادہ بھی ضرور ہوتا اور یہ نہیں کہہ سکتے کہ حرکت کا ارادہ بعینہٖ عصب و عضلے کی حرکت کا ارادہ ہے، اس لئے کہ جب ہمارے وجدان ہی میں نہیں کہ عصب بھی کوئی چیز ہے تو پھر یہ کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ اس کی حرکت کا ارادہ ہُوا، پھر جب بجسب تحقیق

حکماؤ اطبا، سے یہ ثابت ہے کہ بغیر عضلات و اعصاب کی حرکت کے کوئی عضو حرکت نہیں کر سکتا، تو ضرور ہوا کہ وہی منفعت الیہ بالذات ہو گو مقصود بالذات ان کی حرکت نہ ہو، حاصل یہ ہے کہ فعل کے وقت تحریک وغیرہ جو ہوتی ہے وُہ یا خود بخود ہوتی ہے، یا ہمارے ارادہ سے یا حق تعالیٰ کے خلق سے چونکہ یہ مسلّم ہے کہ کسی حادث چیز کا وجود بغیر موجد کے نہیں ہو سکتا، اس لئے خود بخود تحریکِ عضلات ہونا باطل ہے اور تقریرِ سابق سے ثابت ہے کہ حرکت ہمارے ارادہ سے بھی نہیں ہوتی تو اب وُہ تیسری صُورت باقی رہ گئی کہ حق تعالیٰ ہی کا کام ہے۔ الحاصل فعل کے سلسلہ میں ابتدا جس سے لے کر وقوعِ فعل تک کوئی درجہ ایسا نہیں کہ حق تعالیٰ کا مخلوق نہ ہو، اس سے ثابت ہُوا کہ جس طرح آدمی کی ذات و صفات مخلوقِ الٰہی ہیں اسی طرح اس کے جملہ حرکات و سکنات اور افعال بھی مخلوق الٰہی ہیں۔

مسئلہ کی یہ حکیمانہ تقریر فضیلت جنگ مولانا انوار اللہ خاں مرحوم نے اپنے رسالہ "خلقِ افعال" میں کی ہے۔

افعالِ عباد کے متعلق حضرت مولینا نانوتویؒ کی تحقیق

حضرت مولینا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ نے اسی مضمون کو ایک عامیانہ مثال میں سمجھایا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ دو شخص ایک کھیت کی پیداوار پر جھگڑتے ہوئے حاکم کے پاس آئے۔ ان میں سے ہر ایک کا دعویٰ ہے کہ کھیت کی یہ تیار شدہ پیداوار میری ہے۔ اور میں ہی اس کا مالک ہوں۔ ان میں ایک سے حاکم نے پُوچھا کہ زمین کس کی ہے؟ اس نے جواب

دیا کہ زمین میری نہیں دُوسرے کی ہے بیج بھی اسی کا تھا، آب پاشی بھی اسی نے کی تھی، ہل بھی اسی نے چلایا تھا، غرض جس قدر چیزیں اور کام اس کھیت کے تیار ہونے تک پیش آئے سب دوسرے کے ہیں، البتہ ان سب سے جو پیداوار حاصل ہوئی وہ میری ہے میں صرف اس پیداوار کے مالک ہونے کا مدعی ہوں، اب بتلایئے کہ کون سی دُنیا کی عدالت ہے جو اس مسخرے کے حق میں ڈگری دے گی، بس اسی طرح سمجھ لو کہ افعالِ عباد جن اشخاص جن قوتوں اور جن اسباب و آلات وغیرہ سے وقوع پذیر ہوتے وہ سب من اوّلہا الی آخرہا، جب خُدا کی مخلوق ہیں تو نفسِ افعال جو اُن کا حاصل اور نتیجہ ہے خُدا سے ہٹ کر بندوں کی مخلوق کیسے بن جائیں گے۔

معتزلہ کا انجام

معتزلہ نے خلق کے معنی میں غور نہیں کیا ورنہ ایسا مضحکہ خیز دعویٰ ہرگز نہ کرتے، اس تمام تقریر سے میرا مقصود یہ ہے کہ یہ جو قدما معتزلہ نے علم ہی کا انکار کر دیا یا ان کے متاخرین نے افعال عباد کا خالق عباد کو قرار دیا جس کے نتیجہ میں ان کو لاکھوں کروڑوں خالقِ حقیقی ماننے پڑے، اور ایک ایک بندہ کے حصہ میں لاکھوں کروڑوں مخلوقات تسلیم کرنی پڑیں جن کا عدد خدائی مخلوقات سے بھی زیادہ ہو جائے گا، اس گندے اعتقاد پر معتزلہ کو کس چیز نے مجبور کیا، صرف اسی بات نے کہ ظلم کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف لازم نہ آئے تو مجھے یہ دکھلانا ہے کہ بالفرض اگر تم اس سے بچ بھی گئے تو کونسا تیر مارا، اگر ظلم وغیرہ کی

نسبت سے تم نے دامن بچا لیا تو اس سے زیادہ شنیع و قبیح چیزوں کی نسبت میں مبتلا ہو گئے، یعنی جہل یا عجز یا سفہ، دھوپ سے بھاگ کر آگ کی پناہ لینا اس کو کہتے ہیں، پھر اس پر طرہ یہ کہ جس اعتراض سے بچنا چاہا تھا وہ بھی قائم رہا، اسی لئے علماء نے لکھا ہے کہ بیشک مسئلہ تقدیر کے ماننے میں اشکالات اور دشواریاں ضرور ہیں، مگر اس کا نہ ماننا ماننے سے بھی زیادہ مشکل ہے، یہ تو معتزلہ کا حشر تھا۔

فرقہ جبریہ کے عقائد

ان کے بالمقابل ایک فرقہ جبریہ کہلاتا ہے معتزلہ نے تو عباد کو اپنے افعال کا خالق قرار دیا تھا، جبریہ کہتے ہیں کہ خالق ہونا تو کجا بندہ اپنے افعال میں بالکل مجبور محض ہے، اس کے ارادہ و اختیار کو کوئی دخل اس کے کاموں میں نہیں، ان لوگوں سے ہمارا سوال یہ ہے کہ تم بندہ کو اپنے افعال میں ایسا مجبور محض مانتے ہو جیسے اینٹ پتھر حالانکہ تم کو خود بھی انسانی حرکات میں فرق کرنا ناگزیر ہے، مثلاً کاتب کے ہاتھ کی حرکت اور مرتعش کے ہاتھ کی حرکت میں فرق بدیہی ہے، آخر ان دونوں حرکتوں میں وجہ فرق تم کو بیان کرنا ہوگی اگر ان میں فرق کا انکار کرتے ہو تو یہ محض مکابرہ اور بداہت کا انکار ہے اور جس شخص کی بلادت اس حد تک پہنچ گئی ہے وہ قابل خطاب ہی نہیں، اسی لئے کہا جاتا ہے کہ قدریہ تو بے ایمانی میں فائق ہیں، کیونکہ انہوں نے اللہ کے سوا بے شمار خالق تجویز کر لئے، اور جبریہ حماقت و بلادت میں گوئے سبقت لے گئے، کیونکہ حرکتِ ارادیہ اور حرکتِ غیر ارادیہ اضطراریہ

کو حرکتِ المرتعش میں ایک جانور بھی فرق کرتا ہے مثلاً ایک کتے کو آپ نے پتھر مارا تو کتا اس پتھر کی طرف بھونک کر نہیں جائے گا، بلکہ پتھر مارنے والے کی طرف متوجہ ہوگا، حالانکہ اس پر جو چوٹ پڑی وہ پتھر ہی کی حرکت سے پڑی، لیکن وہ کتا بھی سمجھتا ہے کہ پتھر کی یہ حرکت قسری اور اضطراری ہے، اس کا کوئی قصور نہیں، ایسا ہی اگر آپ نے سانپ پر لاٹھی یا شیر پر گولی چلائی تو وہ سانپ اور شیر لاٹھی یا گولی چلانے والے پر آئے گا، لاٹھی یا گولی کے پیچھے نہیں دوڑے گا، گویا جانوروں کے نزدیک بھی حرکتِ ارادیہ اور حرکت اضطراریہ میں فرق بیّن اور علم ضروری سے ثابت ہے تو ان کے درمیان کوئی مابہ الفرق ہونا چاہیئے یہیں سے مسئلہ کسب سامنے آجاتا ہے۔

مسئلہ کسب

مسئلہ کسب جس میں بڑے بڑے لوگ ٹھوکر کھا گئے، حتیٰ کہ بعض متکلمین نے یہ کہہ دیا کہ جبر و کسب توام ہیں دونوں میں کوئی واضح فرق نہیں لیکن یہ بالکل غلط ہے اور دونوں میں فرق و امتیاز بالکل بے غبار ہے، اس کی وضاحت کے لئے پہلے ایک مقدمہ سمجھ لیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے جو انسان کو پیدا کیا اس میں کچھ قویٰ اور ادراکیہ رکھی ہیں جیسا کہ حواس اور عقل، اسی طرح کچھ قویٰ عملیہ مثلاً قدرت، ارادہ اور مشیّت بھی اس میں ودیعت کی ہیں، جن کے ذریعہ وہ اپنے جوارح (ہاتھ پاؤں وغیرہ) کو حرکت دیتا ہے اور جیسا عمل چاہتا ہے کرتا ہے، مثلاً کتابت کے لئے ہاتھ ہلانا ہر شخص سمجھتا ہے کہ یہ حرکت اس کے ارادے اور اختیار سے ہے

کہ اگر وُہ چاہے اپنے ہاتھ کو حرکت دے کر لکھنا شروع کر دے اور جب چاہے اسے روک لے ہاتھ کی یہ حرکت اس طرح کی یقیناً نہیں جیسے حرکتِ رعشہ یا سردی سے کسی کی حرکت کہ اس کو اگر وُہ بند کرنا چاہے تو بند نہیں کر سکتا، آخر ان دونوں حرکتوں میں جو فرق ہے وُہ کس بنا پر ہے، لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسی قوّت انسان کے اندر رکھی ہے جو اُن دونوں حرکتوں میں فرق و امتیاز کرتی ہے، اسی قوت کا نام ہے قدرت یا قوّتِ ارادی جس سے حجر و شجر وغیرہ محروم ہیں۔ اسی کے ساتھ یاد رہے کہ حق تعالیٰ کی ذات منبع الکمالات بھی وجُود کا خزانہ اور سرچشمہ ہے، جس کا وجُود ذاتی ہے۔ اور جہاں کہیں وجُود کا کوئی ذرہ یا شائبہ آتا ہے وہ اسی خزانہ سے آسکتا ہے، دُنیا میں اعیان و اوصاف، جواہر و اعراض افعال اور انفعال میں سے جو چیز بھی مُنصۂ وجُود پر جلوہ گر ہوگی وُہ اسی موجدِ حقیقی کے اعطاءِ وجود اور افاضۂ نور سے ہوگی، اور جب تک عالمِ وجود میں باقی رہے گی اسی حیّ و قیوم کے ابقاء سے رہے گی۔ بنابریں بندوں کی تمامی حرکات و افعال بھی خواہ وہ اضطراری ہوں یا اختیاری اپنے وجود میں آنے کے لئے اسی موجدِ حقیقی کی قدرتِ عامّہ اور ارادہ و مشیتِ تامہ کے دست نگر ہوں گے، اس لئے وُہ قدرت و اختیار اور قوّتِ ارادی جو اُن میں فاطرِ حقیقی نے پیدائشی طور پر ودیعت کی ہے وُہ بالکلیہ مستقل و خود مختار نہیں ہو سکتی، بلکہ مشیتِ الٰہیہ کے تابع رہے گی، اور قدرتِ غیر مستقلہ کہلائے گی اب کبھی تو انسان کے بدن یا جوارح میں حرکت اس قدرتِ غیر مستقلہ کی توسط کے بدون ہوگی جیسے حرکتِ مرتعش اور کبھی اس کے توسط سے جیسے حرکتِ یدِ کاتب، تو یوں کہیئے کہ اللہ تعالیٰ کی قوت کاملہ و قدرتِ مستقلہ

کا تصرّف انسان کے اندر دو طریقہ سے ہوتا ہے۔ بعض حالات میں تو اللہ تعالیٰ کی قدرت مستقلہ بدون توسط ہماری قدرتِ غیر مستقلہ کے مؤثر و متصرّف ہوتی ہے جیسا کہ حرکتِ رعشہ میں اور کبھی اللہ تعالیٰ کی قدرتِ مستقلہ ہماری اس قدرتِ غیر مستقلہ کو بیچ میں ڈال کر اپنا تصرّف دکھلاتی ہے جیسے حرکتِ کتابت وغیرہا میں، بہر حال دونوں جگہ اصل مؤثر و متصرف و محرک اللہ تعالیٰ ہی کی قدرتِ کاملہ مستقلہ ہے۔ فرق اتنا ہے کہ ایک جگہ اس کی تاثیر و تصرف بلا واسطہ ہے اور دوسری جگہ بالواسطہ، اسے ایک مثال سے سمجھیئے۔

مسئلہ کسب کے متعلق ایک عام فہم مثال

دیکھو دن کے وقت شمس کی شعاعیں اور اس کا نور براہِ راست یعنی بلا توسط قمر ہم تک پہنچتا ہے اور وہی نورِ شمس رات کے وقت قمر کے توسط سے آتا ہے، کیونکہ قمر باجماع حکماء ایک کرۂ مظلمہ ہے اس میں کوئی نور ذاتی نہیں، بلکہ شمس ہی سے نور اخذ کرتا ہے، تو رات کے وقت جو نور ہمیں پہنچتا ہے وُہ کوئی دُوسرا نور نہیں وہی نور ہے جو دن میں پہنچتا تھا لیکن دن کو بلا واسطہ اور رات کو بواسطۂ قمر ہم اس سے فیضیاب ہوتے ہیں لیکن محض اس توسط و عدمِ توسط کی توجہ سے اس کے خواص و احکام اور مزاج و تاثیرات حتیٰ کہ نام میں بھی تفاوتِ عظیم پیدا ہو جاتا ہے، چنانچہ دن کے وقت شمس کا نور جو بلا واسطہ زمین پر پڑتا ہے اس کا نام دھوپ رکھا گیا ہے۔ اس کا مزاج سخت گرم ہے، زمین حجر و شجر اور انسان و حیوان پر اس کی ایک خاص تاثیر ہوتی ہے اور اس کے جُداگانہ خواص ہیں، پھر یہی

نورِ شمس جب شب کے وقت بواسطۂ قمر زمین پر آتا ہے اس کا نام دھوپ نہیں چاندنی ہے، اس کا مزاج ٹھنڈا ہے، دُوسری مخلوقات پر اس کی تاثیر پہلی صورت سے بالکل مختلف ہے، اور اس کے خواص جداگانہ ہیں، اس مثال سے واضح ہوگیا کہ ایک ہی چیز جب بلا واسطہ پہنچے اور بعینہٖ وہی چیز جب بالواسطہ پہنچے تو دونوں حالتوں میں اس کی تاثیرات وخواص اور احکام ومزاج حتیٰ کہ نام بھی مختلف ہو سکتے ہیں۔

اسی کو ایک دُوسری مثال میں سمجھیئے! دیکھیئے کہ شمس کی شعاع کسی چیز کو جب بلا واسطہ پہنچے، اور یہی شعاع جب آتشی شیشہ کے واسطے سے پہنچے، ان دونوں صُورتوں کے اندر اس کی تاثیرات میں کتنا فرق ہو جاتا ہے۔ بلا واسطہ جو شعاع پہنچے گی اس کے سامنے کوئی کپڑا یا کاغذ یا بارُود رکھیئے اس میں فوراً آگ نہیں لگ جائے گی، مگر وہی شعاع جو آتشی شیشہ کے واسطے سے آتی ہے تو مذکورہ بالا چیزوں میں آگ لگا دیتی ہے، ٹھیک اسی طرح سمجھئے کہ خالقِ حقیقی نے انسان کے اندر سمع وبصر وغیرہ حواس وقوٰی کی طرح ایک قوتِ ارادی اور قدرت بھی رکھ دی ہے، گو وہ قوت وقدرت غیر مستقلہ ہے اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے عطا ہوئی ہے! اسی کی مشیت کے تابع ہے اسی کی تحریک سے حرکت کرتی ہے اسی کے ارادے کے مطابق کام کرتی ہے، رتی برابر بھی اس کے خلاف نہیں چل سکتی، مگر وہ قدرت انسان کے اندر ہے ضرور جس کی بنا پر حرکتِ ارادیہ وغیر ارادیہ میں فرق ہوتا ہے اور انسان شجر وحجر وغیرہ سے ممتاز ہے، اب اللہ تعالیٰ کی قدرتِ مستقلہ انسان میں کبھی تو بلا واسطہ اس قدرتِ غیر مستقلہ کے تصرف کرتی ہے، جیسا کہ حرکتِ غیر ارادیہ میں اور کبھی بواسطہ قدرت

غیر مستقلہ کے جیسا کہ حرکتِ ارادیہ میں، اور ہر انسان کی فطرت ہے کہ اس قدرتِ غیر مستقلہ کی وساطت کے ماتحت جو حرکات وافعال اس سے صادر ہوتے ہیں ان کو اپنا فعل سمجھتا ہے اور اپنی طرف منسوب کرتا ہے بس اسی کا نام کسب ہے۔ جیسے پہلی صورت کو جبر کہتے ہیں تو خالق دونوں قسم کی حرکات کا حق تعالیٰ ہوا ہاں بندے کے اعتبار سے اوّل جبرِ محض اور ثانی کسب کہلاتا ہے اور یہ لفظ قرآن کریم سے لیا گیا۔ فرماتے ہیں لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۔ اب کسب کے معنی ہوئے کسی فعل کا بندہ سے بتوسط اس کی قدرتِ غیر مستقلہ بتخلیقِ الٰہی صادر ہونا تو کسب ایک برزخی چیز ہوئی درمیان اختیارِ مستقل اور جبرِ محض کے، نہ بندہ کو مستقل اختیار حاصل ہے کیونکہ اصل محرک ومتصرف اللہ ہی کی قدرتِ مستقلہ ہے، نہ وُہ بالکل مجبورِ محض ہے کیونکہ اس کی قدرتِ غیر مستقلہ کا توسط پایا جاتا ہے اور یہ توسط کوئی معمولی چیز نہیں، کسب و جبر کے مسئلہ میں امام رازی وغیرہ بڑے بڑے لوگ توجیہاتِ رکیکہ کر کے بیٹھ گئے اور اس عقدہ کو دل نشیں طریقہ سے حل نہ کر سکے الشیخ الاکبر نے "فتوحات" میں اس کو خوب حل کیا ہے اور یہ انہی کا کام تھا، عارفین ہی کا منصب ہے کہ ایسے دقائق کی حقیقت کو واضح اور منکشف کریں۔

الحاصل جب کسب کا ایک برزخی درجہ نکل آیا تو اب مجازات کے مسئلہ میں بھی کوئی اشکال نہیں رہے گا کیونکہ مجازات کا مدار اسی کسب پر ہے اور چونکہ اس میں فی الجملہ عامل کی قدرت کا بھی تعلق ہے اور قدرتِ باری تعالیٰ کا بھی دخل ہے، تو اب نہ وہ بات

کہنے کی ضرورت جو معتزلہ نے مجازات کے اشکال سے گھبرا کر کہی کہ افعالِ عباد کے خالق عباد ہی ہیں جس سے کروڑوں خالق ماننے پڑتے ہیں اور نہ اُس احمقانہ قول کے اختیار کرنے کی حاجت جو جبریہ نے اختیار کیا کہ بندہ اپنے افعال میں اینٹ پتھر کی طرح مجبورِ محض ہے جو مشاہدہ بداہت اور جانوروں کی سمجھ کے بھی خلاف ہے، جیسا کہ ہم تفصیلاً عرض کر چکے ہیں۔

البتہ ایک شبہ یہ رہے گا کہ ہم نے مانا کہ افعالِ اختیاریہ انسان کی قدرتِ غیر مستقلہ کے توسط سے صادر ہوتے ہیں، مگر وہ قدرتِ غیر مستقلہ تو اللہ تعالیٰ ہی کی مشیت و قدرت کے تابع ہے، اس کے بدون کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ فی الحقیقت اللہ تعالیٰ کی قدرتِ مستقلہ ہی سب تصرفات کرتی ہے اور خدا کی قدرتِ مستقلہ ہماری اس قدرتِ غیر مستقلہ پر حاکم ہے لہٰذا اس قدرتِ غیر مستقلہ کا ہر فعل اس قدرتِ مستقلہ کا ہی ہوگا، تو اب وہی اشکال پھر عود کر آیا، کہ ان افعال پر انسان کو جزا و سزا کیوں دی جاتی ہے، لیکن اصل شبہ کا اصل منشاء یہ ہے کہ ہم نے اپنے خیال میں اللہ تعالیٰ کی مجازات کو اس دُنیا کی مجازات پر قیاس کر رکھا ہے، حالانکہ یہ قیاس غلط ہے، اللہ تعالیٰ کے یہاں مجازات محض بطریقِ انتقامِ دنیوی نہیں بلکہ بطور تسبّب طبعی کے ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے اس عالمِ اسباب و مسببات کا ایک طویل و عریض سلسلہ پیدا کیا ہے اور اسباب کے اندر ایک نوع تاثیر رکھدی ہے کہ جب کوئی سبب وجود میں آتا ہے تو باذن اللہ مسبب اس پر مرتب ہو جاتا ہے جیسا کہ اس دارِ دُنیا کی چیزوں میں آپ دیکھتے ہیں۔ مثلاً آگ میں قدرت نے احراق کی تاثیر رکھ دی ہے، یا زہر

میں یہ تاثیر ہے کہ وہ انسان کو ہلاک کر دیتا ہے اب جو شخص بھی زہر کھائے گا بشرطِ عدمِ موانع اس کی تاثیر متحقق ہو کر رہے گی، خواہ اپنے قصد و ارادہ سے کھائے یا جبراً و اکراہاً کوئی اُسے کھلا دے، بہرحال اس کی تاثیر ظاہر ہو کر رہے گی، وعلیٰ ہذا القیاس ساری دنیا اسی اسباب و مسببات کے سلسلہ میں جکڑ بند ہے، اور کوئی نہیں بتلا سکتا کہ فلاں سبب میں ایسی تاثیر کیوں ہے کہ اس پر وہ ہی مسبب مرتب ہو، اگر مر مار کر کوئی شخص دو چار جگہ اس کی کوئی وجہ بتلا بھی دے تو پھر اس کی وجہ نہیں بتلا سکتا، مثلاً کوئی کہے کہ آگ اس لئے جلاتی ہے کہ اس میں حرارتِ مفرطہ موجود ہے لیکن اس میں اس درجہ کی حرارتِ مفرطہ کیوں موجود ہے اس کا کوئی جواب نہیں ہو سکتا، اسی طرح دیکھئے کہ انگور کے درخت پر انگور لگتا اور نیم کے درخت پر نبولی لگتی ہے۔ اس دائرہ میں "کیوں" کے سوال کا حق ہی نہیں، ساری دنیا مل کر اس کا جواب نہیں دے سکتی کہ انگور کے درخت پر انگور ہی کیوں لگتا ہے نبولی کیوں نہیں لگتی، و بالعکس؟ زائد از زائد دماغ کھپا کر یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کی صورتِ نوعیہ کا تقاضا یہی ہے، اگر پوچھا جائے کہ انگور کی بیل کی صورتِ نوعیہ کا یہ تقاضا کیوں ہے؟ نیم کی صورتِ نوعیہ کا کیوں نہیں؟ تو کسی کے پاس کوئی جواب نہیں۔

نیچریوں کے لایعنی مفروضات

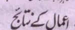
یہ دہری لوگ جو اللہ کو نہیں مانتے وہ کہتے ہیں کہ مادہ یعنی اجزاء المقراطیسیہ

جن کو یہ ایتھر کہتے ہیں، انہی اجزاء کے ذرات سے عالم کی پیدائش ہوئی انہی ذرات کی دائمی حرکت اور جولانی سے بعض اجزاء سے زمین بن گئی اور بعض اجزاء سے چاند سورج وغیرہ بنے، وغیر ذالک۔ اب اگر ان سے کوئی سوال کرے کہ جن اجزاء سے چاند سورج وغیرہ بنے اُن سے زمین کیوں نہ بن گئی وبالعکس، اسی طرح اگر سوال کیا جائے کہ جن اجزاء سے سر کی کھوپڑی بنی ان سے پاؤں کے تلوے کیوں نہ بن گئے؟ پھر جن اجزاء سے سر بنا ہے ان میں کتنے علوم وادراکات اور معارف وکمالات رکھے ہیں، یہ علوم وکمالات ان اجزاء میں کیوں نہ رکھ دیئے گئے جن سے پاؤں بنا ہے؟ ساری دُنیا کے ملاحدہ و دہریئے بھی اس کا جواب بجز اس کے نہیں دے سکتے کہ اُن اجزاء میں یہی استعداد تھی، اب اگر سوال کیا جائے کہ ان اجزاء میں یہی استعداد کیوں ہوئی عکس کیوں نہ ہُوا؟ تو اس "کیوں" کے جواب دینے سے دُنیا عاجز ہے اور رہے گی۔

بے شک ان سوالات کا جواب ہم موحدین بھی نہیں دے سکتے، مگر ملحدین اور موحدین میں یہ فرق ہے کہ ملاحدہ تو خود بھی اس راز کو نہیں جانتے، اور جس مادہ بے شعور کو انہوں نے اپنا خالق بنا رکھا ہے وہ بھی کچھ نہیں جانتا، بلکہ وُہ تو اُن سے بھی بدتر ہے، یہ ملحد کم از کم عقل ودرایت، شعور وادراک اور قدرت وارادہ تو رکھتا ہے، در آں حالیکہ اُن کا خدا بالکل بے شعور جماد لا یعقل ہے، تو ملحد نہ خود جانتا ہے اور نہ اس کا خُدا کچھ جانتا ہے ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ۔ بخلاف موحدین کے، بیشک وہ بھی اس سلسلہ اسباب ومسببات کے رازوں سے واقف نہیں، مگر اُن کا خُدا خالق ومالک، وحدہ لاشریک لہ سب

کچھ جانتا ہے اس کے علمِ محیط سے کوئی چیز خارج نہیں۔ الغرض اس دنیاوی مجازات کی طرح اللہ تعالیٰ کی مجازات محض بطریقِ انتقام نہیں، بلکہ بطریقِ تسبب طبعی کے ہے، انسان جو کچھ اس دارِ دُنیا میں کرتا ہے، آخرت میں اسی عمل کے ثمرات وآثار طبعاً مرتب ہوں گے، مثلاً ایمان واعمالِ صالحہ کی تاثیرِ طبعی یہ ہے کہ اپنے عامل کو جنت میں لے جائے اور اس کے درجات بلند کرے۔

پس ایمان واعمالِ صالحہ کی وجہ سے جنّت میں جانا ایسا ہی ہے جیسا کہ خمیرہ گاؤ زبان عنبری جواہر والا کھانے سے دماغ کو قوّت وتازگی پہنچتی ہے، دُوسری طرف کفر اور معاصی کی تاثیرِ طبعی یہ ہے کہ اپنے مرتکب کو تباہی کے گڑھے میں دھکیل دے جسے جہنم کہتے ہیں، پس کفر اور معاصی کی وجہ سے دوزخ میں جانا ایسا ہی سمجھئے جیسے کوئی شخص زہر کھا جائے تو اس کے لئے ہلاکت لازمی ہے۔



اب اگر یہ سوال کیا جائے کہ ایمان اور اعمالِ صالحہ میں وہ تاثیر اور کفر ومعاصی میں یہ تاثیر کیوں رکھی معاملہ بالعکس کیوں نہ ہُوا؟ تو میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ اسباب ومسببات کے دائرہ میں جو کچھ تاثیر وتأثر کا طبعی سلسلہ ہے اس میں "کیوں" کے سوال کی گنجائش نہیں، ورنہ عالم کی بیشمار چیزوں میں یہی "کیوں" کا سوال ہو سکتا ہے، جس کا منتہی جواب کسی کے پاس نہیں، لہٰذا یہاں یہ سوال لایعنی ہے، دیکھئے اطباء اپنے یا پہلے حکماء کے

تجربہ سے بتا کے ہیں کہ فلاں دوا کی یہ تاثیر اور یہ مزاج ہے، وہاں یہ سوال کسی کے دل میں نہیں آتا کہ اس کی یہ تاثیر کیوں ہوتی؟ اسی طرح انبیاءؑ جو روحانی و باطنی اطباء ہیں انہوں نے بعض افعالِ قلوب یا افعالِ جوارح کی تاثیرات بتلا دیں تو اس قدر شور و شغب اور لایعنی سوالات کی بھرمار کیوں ہے؟ تُف ہے ایسی عقل پر کہ ان معمولی اطباء کی بات پر تو سوال پیدا نہیں کرتی، مگر انبیاء علیہم السلام کی بتلائی ہوئی باتوں پر لغو سوال کرنے میں اتنی جری ہے۔ تو اصل رگ شبہ کی یہ ہے کہ وہاں مجازات کو ہم نے دنیا کی مجازات پر قیاس کر لیا یہی غلط ہے وہاں کی مجازات صرف اسباب و مسببات کا ایک طبعی سلسلہ ہے اس دارِ دنیا میں جو کچھ ہم کسب خیر و شر کرتے ہیں، یہ ہی اعمال کسوبہ وہاں جاکر خاص خاص شکل اختیار کر لیتے ہیں، چنانچہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ جنت قیعان یعنی چٹیل میدان ہے، تمہارے ہی اعمال وہاں جاکر خاص خاص اشکال اختیار کر لیتے ہیں مثلاً تُم نے یہاں سبحان اللہ کہا، یہ کلمہ وہاں جاکر ایک درخت بن گیا، اسی طرح دوسرے اعمالِ صالحہ کو سمجھ لیجئے اور اعمالِ سیئہ جس قدر ہیں یہی وہاں سانپوں اور بچھوؤں کی شکل میں متشکل ہوتے ہیں، اسے یُوں خیال کیجئے کہ جب ہم کوئی بیج زمین میں ڈالتے ہیں تو اس سے درخت اُگتا ہے اُس درخت کی اصل مع اس کی شاخوں، پتّوں اور پھول پھل کے وہی بیج ہے، وہی بیج چند دنوں میں یہ شکل و صورت اختیار کر لیتا ہے، اسی طرح ہمارے اعمال انجام کار وُہ شکل و صورت اختیار کر لیں گے جس کا ہم نے اُوپر ذکر کیا ہے۔ اب یہ سوال کرنا کہ فلاں عمل سے جنت میں فلاں درخت کیوں اُگا۔ ایسا ہی ہے جیسا کوئی یہ

پُوچھے کہ آم کی گٹھلی سے آم کا درخت کیوں نکلا، جامن کا پودا کیوں نہ بن گیا یا گیہوں کے تخم سے چاول کیوں نہ پیدا ہوئے، ظاہر ہے کہ ان سوالات کی عقلاء کے نزدیک کوئی گنجائش نہیں، اور سب کا جواب ایک ہی ہے کہ اس میں استعداد ہی ایسی تھی یا اس کی صورتِ نوعیہ کا اقتضاء یہی تھا۔

اب میری اس تقریر سے یہ بات بھی بخوبی واضح ہو گئی کہ اگر بالفرض بندہ مجبورِ محض بھی ہوتا جیسا کہ جبریہ کا خیال ہے، اور اللہ تعالیٰ بندوں کے ان افعال اضطراریہ ہی میں یہ تاثیر رکھ دیتا کہ انہی پر عذاب و ثواب مرتّب ہو تب بھی مجازات کی حد تک کوئی اشکال نہ ہوتا کیونکہ جب مجازات بطور تسبیب طبعی ہوتی تو ضروری نہیں کہ سبب پر مسبّب کا ترتّب صرف اسی وقت ہو جب سبب ارادے اور اختیار سے صادر ہُوا کرے آخر بہت سے اسبابِ طبعیہ میں برابر تجربہ کرتے ہیں کہ مسبب کا تحقق بالارادہ ہو یا بلا ارادہ سبب اس پر مرتب ہو جاتا ہے لیکن جیسا کہ ہم پہلے تحقیق کر چکے یہ واقعہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے افعالِ عباد میں عباد کو بالکلیہ مجبُور و مضطر نہیں بنایا، بلکہ جبر محض اور اختیار مطلق کے درمیان کسب کی راہ ان کے لئے کُھلی رکھی، اور کسب خیر و شر کو جس میں فی الجملہ عباد کے اختیار و ارادہ کو دخل ہے دخولِ جنت یا دخولِ جہنم کا سبب ٹھہرایا گیا یہ سوال بالکل لغو ہے کہ کسب میں ہی یہ سببیت اور تاثیرات کیوں رکھیں، کیوں کہ یہ سوال تو دنیا بھر کے ہر سبب و مسبب پر وارد ہو سکتا ہے، اس کا جو جواب ساری دُنیا وہاں دے گی وہی ہم یہاں دے سکتے ہیں۔

نوشتۂ تقدیر مطابق استعداد ہے

نیز ہماری تقریر بالا سے ایک اور بات بھی واضح ہو گئی کہ جن اشخاص کو ازل سے شقی یا سعید لکھ دیا گیا ہے جس کے مطابق عملی دنیا میں اور پھر آخری انجام میں تقدیر اپنا کام کرتی رہتی ہے۔ اس پر یہ سوال کرنا بے موقع ہے کہ شقی کو سعید یا سعید کو شقی کیوں نہ تجویز کر دیا گیا۔ ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے علم ازلی میں جس شخص میں جس چیز کی استعداد پائی جاتی تھی نوشتۂ تقدیر اسی کے مطابق ہے۔ آگے یہ کہنا کہ زید میں یہ استعداد کیوں رکھی بکر میں کیوں نہ رکھدی، ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ آگ میں حرارت و احراق اور پانی میں برودت و تبرید کی صفت کیوں موجود ہے۔ اگر کہا جائے کہ جس مادہ سے آگ یا پانی بنا اس میں ایسی ہی استعداد تھی۔ پھر وہی سوال متوجہ ہوگا کہ دونوں کی استعدادوں میں یہ فرق کیوں ہوا اور کہاں سے آیا جس طرح استعداد کے مرحلہ پر پہنچ کر کوئی شخص اس "کیوں ہوا" اور "کہاں سے آیا" کا جواب نہیں دے سکتا ہم پر بھی اس "کیوں رکھی گئی" یا "کیوں پائی گئی" کی جواب دہی ضروری نہیں۔ لیکن سب کے عجز عن الجواب سے حقائق اشیاء بدل نہیں سکتیں، وہ جوں کی توں رہیں گی، لا یسئل عما یفعل وھم یسئلون، وان الی ربک المنتھی۔

یہاں پہنچ کر مناسب ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہ کا ایک نکتہ نقل کر دیا جائے جو انہوں نے کسب خیر و شر کے مدار ثواب و عذاب ہونے کے سلسلہ

میں بیان فرمایا ہے، میں اسے ایک موٹی سی مثال سے سمجھاتا ہوں، مثلاً تین چار سال کا ایک بچہ ہے، بڑے لڑکوں کو پتنگ اُڑاتے ہوئے دیکھ کر اس کو بھی خواہش ہوتی ہے کہ پتنگ اُڑائے مگر اس کو اتنی قوت و قدرت نہیں کہ خود پتنگ اُڑا سکے اور اس کو پکڑ کر سنبھال سکے، تو یہ صورت اختیار کی جاتی ہے کہ اس کا باپ یا بھائی یا اور کوئی بڑا آدمی پتنگ اُڑاتا ہے اور وہ بچہ اپنا ہاتھ پتنگ کی ڈور کو لگائے رکھتا ہے، ظاہر ہے کہ اس صورت میں حقیقۃً واصالۃً پتنگ اڑانے والا وہ بڑا شخص ہے، بچہ خود اس پتنگ کو اڑا نہیں رہا نہ اڑا سکتا ہے محض ایک معمولی اقتران و اتصال اس کے ہاتھ کا ڈور سے ہے، مگر اس معمولی اقتران و اتصال کی وجہ سے وہ اپنا اڑانا تصور کر لیتا ہے۔ اگر اس کے ہاتھ سے ڈور چھڑائی جائے تو روتا ہے اور ہاتھ لگا رہنے سے خوش ہوتا ہے، تو یہ جو کسب کا درجہ اور درمیان میں قدرت غیر مستقلہ کا اقتران و توسط رکھا گیا یہ اس لئے کہ انسان کی فطرت ہی یہ ہے کہ جس فعل کو وہ اپنا سمجھے گو درحقیقت متصرف و مؤثر کوئی اور ہو، مگر اپنا فعل سمجھنے کی وجہ سے اس کے اثرات کو قلب قبول کرتا ہے اور دل اس سے منصبغ اور رنگین ہوتا ہے (جیسا کہ اُوپر کی مثال میں بچہ محض اپنا ہاتھ لگائے رکھنے کی وجہ سے پتنگ اُڑانے کو اپنا فعل سمجھتا ہے اور اس سے اس کا قلب متاثر اور خوش ہوتا ہے، حالانکہ اصل میں پتنگ اُڑانا اس بڑے کا فعل ہے) اور جس فعل کو انسان اپنا فعل نہ سمجھے دوسرے کا تصور کرے اس سے کوئی تاثر و انفعال حاصل نہیں ہوتا، مثلاً ایک شخص کبھی خود اپنے ارادہ سے نماز نہیں پڑھتا دوسرا

آدمی اس کی گردن پکڑ کر جبراً اس کو اوندھا کر دیتا اور زمین پر گرا دیتا ہے، کیا اس جبری رکوع و سجود سے اس کا قلب کچھ متاثر و منصبغ ہوگا ہرگز نہیں، اور اگر خود اپنے ارادہ و اختیار سے نماز پڑھتا جیسی بھی پڑھتا، کچھ نہ کچھ اثر دل پر ضرور ہوتا۔ اور کسی درجہ میں اس کا دل نماز کے رنگ کو قبول کرتا۔

الغرض انسان کی فطرت ہے کہ جس فعل کو وہ اپنا عمل سمجھتا ہے اس سے اس کا قلب متاثر و منصبغ ہوتا ہے اور یہ بھی انسان کی فطرت ہے کہ جو فعل و عمل اس کی قدرتِ غیر مستقلہ کے اقتران و وساطت سے ہو اسی کو وہ اپنا عمل سمجھتا ہے اور اتنے پختہ عقیدے اور جزم و یقین کے ساتھ کہ وہ خود بھی اس عقیدے اور یقین کے دفع کرنے پر قادر نہیں ہوتا، اور جو فعل اس قدرتِ غیر مستقلہ کے اقتران و وساطت سے نہ ہو اس کو وہ اپنا عمل نہیں سمجھتا، ہر شخص اپنے وجدان کی طرف رجوع کر کے انصاف کے ساتھ غور کرے کہ جب کوئی فعل اختیاری وہ کرتا ہے تو اس کا دل اور اس کا ضمیر کیا سمجھتا ہے، اس فعل کو اپنا عمل سمجھتا ہے یا دوسرے کا، وَکَفَاکَ شَهَادَةُ وِجْدَانِکَ تو یہ جو قدرتِ غیر مستقلہ کا ایک اقتران و توسط ہے جس کی وجہ سے انسان فطرۃً ایک فعل کو اپنا فعل سمجھتا ہے اور اپنی طرف منسوب کرتا ہے، اسی کا نام کسب ہے، چنانچہ شیخ اشعری کا لفظ بھی یہی ہے کہ کسب محض ایک اقتران ہے۔

خلاصۂ بحث

خلاصۂ کلام یہ کہ درحقیقت دنیا میں سب کچھ اللہ تعالیٰ کی

قدرتِ کاملہ ہی کے تصرف و اقتدار سے ہوتا ہے مگر درمیان میں قدرتِ غیر مستقلہ کے اقتران و وساطت کی وجہ سے انسان اس کو اپنا فعل قرار دیتا ہے اور اسی بنا پر عمل کر کے اثرات سے اس کا قلب ایک طرح رنگ پکڑتا ہے لہٰذا اس پر جزا و سزا بھی مرتب ہوتی ہے، اگر کوئی شبہ کرے کہ مثالِ مذکور میں چونکہ وہ نادان بچہ تھا اس لئے غلط فہمی سے اس نے ایسا سمجھ لیا، ہم تو بچے نہیں بلکہ عاقل بالغ، سمجھ دار ہیں۔

جواب اس کا یہ ہے کہ اس بچہ کی جو نسبت بڑے آدمی کے ساتھ ہے، اس سے کہیں کم نسبت ہم کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ حاصل ہے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ کوئی نسبت بھی حاصل نہیں، ذرۂ تراب کی رب الارباب کے سامنے کیا حقیقت ہے۔

اب حاصل اس مجموعۂ تقریر کا تین باتیں ہوئیں، ایک تو یہ کہ جبر و اختیار میں فرق باعتبار توسط قدرتِ غیر مستقلہ کے ہے، دوسری یہ کہ آخرت کی جزا و سزا محض عرفی انتقام کی طرح نہیں بلکہ بطریق تسبب طبعی ہے، تیسری یہ کہ نفسِ انسان انہی اعمال کے اثر سے متلوّن و منصبغ ہوتا ہے جن کو وہ اپنا عمل سمجھے، دوسرے کے اعمال سے وہ اثر قبول نہیں کرتا اور وہ اپنا عمل اس وقت سمجھے گا جب اس عمل کے صدور میں اپنی قدرتِ غیر مستقلہ کا اقتران و وساطت دیکھے ان تین باتوں کو پیشِ نظر رکھنے سے سب اشکالات انشاء اللہ مندفع ہو جائیں گے۔

اب ایک اور چیز باقی رہ گئی وہ یہ کہ اہل السنۃ والجماعت شرور و قبائح کا خالق بھی اللہ تعالیٰ ہی کو کہتے ہیں جس میں بظاہر اللہ تعالیٰ کی طرف قبائح کی نسبت لازم

آتی ہے جس سے بچنے کے لئے معتزلہ نے بندوں کا خالقِ افعال ہونا تجویز کیا تھا۔ اس کے متعلق مختصراً اتنی بات یاد رکھو کہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک چیز فی نفسہٖ اگر دُوسری اشیاء سے الگ کر کے دیکھی جائے تو بُری اور خراب ہے مگر وہی چیز دُوسری چیزوں کے ساتھ مل کر مجموعہ مرکب کو حسین و جمیل بنا دیتی ہے یعنی وُہ چیز من کل الوجوہ شر نہیں ہوتی، بلکہ اپنے محل کے اعتبار سے فی حد ذاتہٖ شر ہونے کے باوجود اپنے اندر کوئی پہلو دُوسری جہت سے خیر کا بھی رکھتی ہے مثال کے طور پر ایک حسین و جمیل عورت کو لیجئے، جسے دیکھ کر ہزارہا آدمی عاشق ہو جاتے ہوں، اگر اس کے سر سے سب بال کاٹ کر علیحدہ کریں اور اس کے بدن سے خون اور پیٹ سے تمام الائشیں نکال کر ایک طشت میں رکھ دیں، تو ان گندی چیزوں میں کوئی حسن نظر نہیں آئے گا، بلکہ ان چیزوں کو علیحدہ دیکھ کر اس کے عاشق کا جی بھی متلانے لگے گا۔ اس کے باوجود مجموعی حیثیت سے یہی نجاسات جب اس کے پیٹ کے اندر آنتوں میں ہوں، اور یہی گندا خون جب اس کی رگوں میں دَوڑ رہا ہو اور یہی بال جب اس کے سر پر قرینہ سے موجود ہوں، اس کی خوب صورتی کی ضمانت اور حسنِ رونق کو دوبالا کرنے والے ہیں۔

دُوسری مثال سمجھ لیجئے ایک مکان ہے نہایت خوبصورت عالی شان اس میں قسم قسم کے ساز و سامان میں بہترین کرے ہیں، لاکھوں روپے کا فرنیچر ہے اور ہر قسم کی آرائش و آسائش کے اسباب اس میں مہیا ہیں اگر اس مکان میں خلاء (قضائے حاجت کی جگہ) نہ ہو تو ہر شخص اس مکان کو خراب اور ناقص کہے گا، دیکھئے وُہ خلاء فی نفسہٖ گندی جگہ ہے،

مگر مجموعی حیثیت سے مکان میں اس کا وجود بھی ضروری ہے جس کے بدون مکان کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔

تیسری مثال اور لیجئے کسی زہریلے دُنبل وغیرہ کی وجہ سے ڈاکٹر نے ایک عضو کو کاٹ جسم سے علیحدہ کر دیا اب اگر خاص اس عضو کی حیثیت سے دیکھا جائے تو ڈاکٹر کا ایک عضو کو بدن سے علیحدہ کرنا شر ہے، اگر مجموعہ میں بدن کی حیثیت سے دیکھو تو خیر ہے، کیونکہ اس کی وجہ سے سارے اعضاء بے چین ہو رہے تھے اور اندیشہ تھا کہ اس کی سمیت سارے بدن میں سرایت نہ کر جائے۔

اس قسم کی ہزارہا نظائر و شواہد ہیں مجھے صرف یہ دکھلانا ہے کہ مرکب کے اندر بعض اجزا کو فی نفسہٖ و فی حد ذاتہٖ بیشک قبیح و شر کہا جا سکتا ہے مگر وہی قبیح جزء دوسرے اجزاء کے لحاظ سے یا مجموعہ کے حق میں خیر و حسن بھی ہو سکتا ہے اس حیثیت سے کوئی بھی اس کو قبیح و شر شمار نہیں کرتا، بلکہ اس جزء کے نہ ہونے سے اس مجموعہ مرکب کو ناقص و نا تمام قرار دیا جاتا ہے۔ لہٰذا اس جزء و شر و قبیح کے بنانے والے کو کوئی بُرا نہیں کہتا بلکہ اس جزء کا نہ بنانا بُرا شمار کیا جاتا ہے، جیسا کہ ایک بہترین عالی شان مکان بنایا اور اس میں بیت الخلاء نہ بنایا تو ہر شخص بنانے والے کو بیوقوف کہے گا۔

پس اہلِ سنت والجماعت یہ کہتے ہیں کہ شئی فی نفسہٖ شر ہے مگر مجموعۂ عالم کے حق میں وہ شر نہیں، کیونکہ اس کے بدون عالم کی تکمیل نہیں ہو سکتی تھی۔ آفرینشِ عالم کی غرض و غایت کے پیشِ نظر اس کو پیدا کرنا بھی ضروری تھا۔ لہٰذا شرور و قبائح کی تخلیق میں کوئی بُرائی نہیں

بلکہ ان کی تخلیق عین حکمت ہے ان کے بدون عالم بحیثیتِ مجموعی ناقص رہتا، اور ان شرور و قبائح کے ساتھ صفت خالقیت کے متعلق ہونے سے نفس اس تخلیق میں کوئی قباحت و شناخت نہیں آتی۔

الحاصل کسب شر کا سبب کے حق میں شر ہے مگر خلقِ شر خالق کے حق میں شر نہیں اسے ایک مثال سے سمجھئے ایک جگہ ہے جسے چمنستان کہتے ہیں جس میں رنگ برنگ کے پھول کھل رہے ہیں ان کی بہار دیکھ کر آنکھوں کو تراوٹ اور ان کی پاکیزہ و لطیف خوشبوؤں سے دل و دماغ کو تازگی حاصل ہوتی ہے، اسی چمن کے پہلو دوسری جگہ ہے جہاں کوڑی پڑتی ہے اور نجاسات و قاذورات کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں جن کی بدبو سے دماغ پھٹنے لگتا ہے اور جہاں چلنے سے بدن اور کپڑے ملوث ہوتے ہیں، رات کی سخت تاریکی میں انسانی بصارت دونوں میں کچھ امتیاز نہیں کر سکتی۔ ہاں جب سورج کی روشنی یا چاند کا نور اس کائنات اراضی پر اپنی شعاعیں ڈالتا ہے، تو وہ شعاعیں جس طرح اس سرسبز شاداب گلستان پر پڑتی ہیں اسی طرح اس گندی پلید جگہ پر بھی پڑتی ہیں اور دونوں کو روشن اور ممتاز کرتی ہیں۔ اب کیا یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ اس پلید گندی جگہ پر واقع ہونے کی وجہ سے وہ روشنی اور نور بھی پلید ہو گیا؟ کوئی یہ گمان نہیں کر سکتا! بلکہ وہ نور و روشنی برابر اپنی صفت و صفاء و لطافت پر باقی ہے اور پاکیزہ جگہ بحالہ پاکیزہ اور گندی جگہ بحالہ گندی رہتی ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کی تخلیق کو سمجھو، تخلیق کی ہر کسی چیز کو عدم کی ظلمت سے نکال کر

نورِ وجود سے روشن کرنا تو جب نورِ وجود کی شعاعوں نے اپنے منبع سے نکل کر حقائقِ عالم یا اعیانِ ثابتہ کو چمکایا، تو خیر و شر اچھی بری سب چیزیں روشنی میں آگئیں، اور وہ نور کسی گندگی سے قطعاً آلودہ نہیں ہوا، ہاں شر اپنی جگہ شر اور خیر اپنی جگہ خیر رہی۔ فاطرِ حقیقی کا فیض ان میں سے ہر چیز کو کتمِ عدم سے منصۂ وجود پر لے آیا۔

خلاصۂ کلام

یہ ہے کہ شرور و قبائح اپنی جگہ فی نفسہا و فی حد ذاتہا قبیح اور شر ہیں، مگر ایجادِ عالم کی تر و تازگی، سرسبزی و شادابی، تابانی و درخشانی، رونق و بہار، اس کی زیب و زینت کے لئے ان شرور و قبائح کی بھی ضرورت تھی، جیسا کہ تم کھیتوں میں کھاد ڈالا کرتے ہو، حالانکہ وہ فی حد ذاتہٖ ایک نجس اور گندی چیز ہے، مگر باغ کی سرسبزی اور شادابی کے لئے اس کے بھی چارہ نہیں۔

اسی طرح اگر اس عالم میں شرور و قبائح کا وجود نہ ہوتا تو عالم ناقص و ناتمام رہ جاتا، لہٰذا ان اشیاء کی تخلیق بھی عین حکمت ہے۔ ان کا پیدا نہ کرنا ایسا ہوتا جیسے کوئی بہترین عالیشان مکان تعمیر کرے، مگر اس میں بیت الخلاء نہ رکھے، تو ایسے مکان کو کون پسند کرے گا!

اور تخلیق کی حقیقت یہ ہے کہ کسی چیز کو ظلمتِ عدم سے نورِ وجود میں لانا اس نورِ تخلیق کو ان قبائح کی قباحت سے کوئی لوث نہیں ہوتا جیسا کہ سورج کی شعاع یا چاند کی

روشنی کسی گندی پلید جگہ پر پڑنے سے پلید نہیں ہو جاتی ۔

ایک اور سوال کا جواب

اس کے بعد ایک آخری سوال یہ رہ جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شر کو پیدا ہی کیوں کیا؟ پیدا ہی نہ کرتے تو کیا حرج و نقصان تھا؛ اس سوال کا بہترین جواب حافظ ابن القیمؒ نے "مدارج السالکین" میں دیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ تم تو شر کے متعلق دریافت کرتے ہو، میں پہلے پوچھتا ہوں کہ خیر کو کیوں پیدا کیا؟ تم سوال کرتے ہو کہ ابلیس و فرعون وغیرہ کے پیدا کرنے میں کیا حکمت ہے؟ میں دریافت کرتا ہوں کہ جبرئیل، میکائیل، ابراہیم موسیٰ اور محمد صلوات اللہ وسلامہ علیہم کے پیدا کرنے کا راز کیا ہے؟ کیونکہ یہ تو سب مانتے ہیں کہ اگر ساری دُنیا خیر سے بھر جائے اور سارے جہان کے آدمی فرشتوں کی طرح بن جائیں اور سب مل کر شب و روز اس کی عبادت و اطاعت میں لگے رہیں، تب بھی اس کی صفاتِ عالیہ میں ذرہ برابر اضافہ نہ ہوگا۔ وہ اپنی صفات و کمالات میں قرآن کما کان لم یزد لا یزال ہمہ وقت کامل و اکمل ہے، پھر خیرات و حسنات کے پیدا کرنے کی غرض و غایت کیا ہے؛ پہلے اسی کو سوچو، پھر شر کے متعلق بھی غور کر لیں گے بلکہ عنوانِ سوال میں تعمیم کر کے سارے عالم کے متعلق ہی یہ سوال زیرِ بحث لاؤ کہ اس عالم کو اللہ تعالیٰ نے کیوں پیدا کیا؟ اسی کے ضمن میں خلقِ شر کی حکمت بھی خود بخود واضح ہو جائے گی۔

تخلیقِ عالم کی حکمت

یاد رکھیئے کہ دُنیا کے سب مذاہب والوں نے اس سوال کے حل کرنے کی کوشش کی ہے اور اپنے اپنے انداز میں مختلف جوابات دیئے ہیں ہمارے نزدیک اس بارے میں محقق عارفین نے جو کچھ لکھا ہے اس سے آگے بڑھنا ممکن نہیں۔ ان کی تحقیق کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات مستجمع کمالات، مخزنِ حسنات اور منبعِ خیرات ہے اس کا ارادہ ہوا کہ ان کمالات و صفات کا اظہار ہو اور مظاہر کے آئینہ میں وہ اپنے کمالات و صفات کا عکس دیکھے، اور مخلوق اس کے کمالاتِ ذاتیہ و فعلیہ کی حسبِ مراتب صحیح معرفت حاصل کرلے۔

قرآن کریم میں فرماتے ہیں:- اللہ الذی خلق سبع سمٰوٰت ومن الارض مثلھن یتنزل الامر بینھن لتعلموا ان اللہ علیٰ کل شیٔ قدیر وان اللہ قد احاط بکل شیٔ علماً۔ یعنی آسمان و زمین پیدا کیئے اور ان میں انتظامی احکام جاری کرنے سے مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات علم و قدرت کا اظہار ہو (نبّہ علیہ ابن القیم فی بدائع الفوائد) بقیہ صفات باری انہی دو صفتوں سے کسی نہ کسی طرح کا تعلق رکھتی ہیں۔

صوفیہ جو ایک حدیث نقل کرتے ہیں کنت کنزاً مخفیاً فاحببت ان اعرف گو محدثین کے نزدیک صحیح نہیں مگر اس کا مضمون شاید اس آیت کے مضمون سے ماخوذ

مستفاد ہو۔ واللہ اعلم۔ ابن عباس کی بعض روایات میں و ما خلقت الجن والانس الا لیعبدون کی تفسیر لیعرفون سے آئی ہے، یہ وہی معرفت ہوگی جسے آیات مذکورہ میں لتعلموا سے تعبیر فرمایا ہے، اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارادہ ہی کیوں ہوا۔ تو سوال بالکل مہمل ہے۔ لا یسئل عما یفعل وھم یسئلون۔

ایسے "کیوں" تو فضول ہی ہیں۔ لاکھوں ہیں جن کا کوئی جواب نہیں دے سکتا جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اگر آپ ہی سے کوئی سوال کرے کہ آپ عزت و راحت کی زندگی کیوں چاہتے ہیں اور کیوں اس کے لئے جد و جہد کرتے ہیں تو اس کا جواب آپ کے پاس کیا ہے؟ پھر اللہ شان شانہٗ کے معاملات میں ہر ایک "کیوں" کے جواب کی توقع رکھنا حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟

پس جب تخلیق عالم کی حکمت یہ ٹھہری کہ حق تعالیٰ اپنے کمالات و صفات کا خارجی مظاہر میں معائنہ کرے اور کرائے تو آگے معاملہ بالکل صاف ہو جاتا ہے، کیونکہ اس کی صفات مختلف متقابل اور متضاد ہیں۔ وہ غفور و رحیم بھی ہے اور جبار و قہار بھی، وہ منعم بھی ہے اور منتقم ذوالبطش الشدید بھی و ھلم جراً۔ تو جب صفات مختلف و متقابل ہوئی ان کے مظاہر بھی مختلف و متضاد ہونے چاہئیں، اب بتلاؤ اگر ابلیس اور فرعون و نمرود وغیرہ بڑے بڑے باغی و کافر نہ ہوتے تو جبار و قہار اور بطش شدید کا مظہر کون بنتا؟ اور ان صفات کا ظہور کس طرح ہوتا؟ اور اگر انبیاء و صالحین و مطیعین پیدا نہ ہوتے تو منعم وغیرہ صفات جمالیہ کہاں ظاہر ہوتیں؟ اسی طرح ہم جیسے گنہگار و عاصی نہ ہوتے تو غفور و رحیم

جیسی صفات کا اظہار کن پر ہوتا؟

الغرض آفرینش عالم کی اصل غرض و غایت اور تخلیق اکوان کے اصل مقصد کی تکمیل اسی وقت ہو سکتی ہے جب مخلوقات میں اس کی ہر قسم کی صفات کا مظاہرہ ہو، اگر ان میں سے بعض صفات کو معطل فرض کر لیا جائے تو خدائی ناقص اور غیر مکمل ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ اس عالم میں خیر اور شر دونوں کے سلسلے اس حکیم مطلق نے پیدا کئے اور شر گو بجائے خود شر ہے لیکن پیدا کرنا اس کا بھی خالق کے کمال اور مجموعہ عالم کے حسن و خوبی کی دلیل ہے۔

اس لئے اس شر کی برائی اپنے محل تک محدود رہتی ہے خالق حقیقی تک اس کی رسائی نہیں بلکہ خلق شر بھی اس کے اعتبار سے خیر ہی ہے۔ والخیر کلہ فی یدیک والشر لیس الیک۔ دیکھئے نور شمس جب تابدانوں اور دریچوں سے گزرتا ہے تو مختلف اشکال و تقطیعات اختیار کر لیتا ہے۔ یہ سب اشکال مختلفہ اسی نور سے ظاہر ہوتی ہیں۔ لیکن ذات آفتاب میں یہ اشکال موجود نہیں، وہ تو صرف نور کا خزانہ ہے، اشکال ادھر اُدھر آکر نمودار ہوتی ہیں تو آفتاب نور کے لئے مصدر ہے اور ان اشکال کے حق میں اسے خالق مجازی کہہ سکتے ہیں، صادر کا مصدر میں موجود ہونا ناگزیر ہے اور مخلوق کا خالق کے اندر موجود ہونا ضروری نہیں۔ بہر حال اللہ تعالیٰ خیرات و کمالات کا مصدر ہے اور خالق بھی، اور شرور و قبائح کا خالق ہے مصدر نہیں، مخلوق کی ذاتی برائی ادھر ہی رہ جاتی ہے، خدا کی طرف محض اس کے خلق کی نسبت ہوتی ہے جو سراسر خیر ہے۔

یہاں ایک مثال جو بہت ہی حقیر ہے اور حضرت حق سے اسے کوئی نسبت نہیں

محض تقریب الی الفہم کے لئے پیش کرتا ہوں۔

آجکل سینما میں جو مناظر دکھلائے جاتے ہیں وہ دونوں طرح کے ہوتے ہیں اچھے بھی بُرے بھی، نہایت فرحت بخش مسرت انگیز بھی، اور سخت ہولناک وحشت انگیز بھی بہت سے مناظر دیکھ کر ناظرین شاداں و فرحاں اور ہشاش وبشاش ہوتے ہیں، اور بعض کو دیکھ کر عورتیں، بچے، اور ضعیف القلب دہشت زدہ ہو جاتے ہیں اور بعض اوقات چیخیں مارنے لگتے ہیں۔ اب دیکھئے ان میں ایک منظر کیسا حسین، دل کش اور خوب صورت اور دوسرا اپنی جگہ کس قدر کریہہ، بھیانک قبیح اور بد ہیئت مگر سینما کے مدیر کا کمال کہ دونوں صورتوں میں برابر ظاہر ہوتا ہے اور سینما دکھلانے کی غرض دونوں سے حاصل ہو رہی ہے بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر اس کا مدیر صرف ایک ہی نوع کے مناظر دکھلاتا، اور دُوسری قسم کے مناظر کی عکاسی پر قدرت نہ رکھتا تو یہ اس کے کمال ومہارتِ فن میں ایک کمی اور نقص متصور ہوتا۔

ہم نے اپنے بچپن میں شعبدہ باز، بازیگروں کو دیکھا کہ کبھی وہ اپنی خالی پٹاری میں سے کبھی سانپ نکال کر دکھاتے تھے اور باوجودیکہ کبوتر ایک اچھا پرندہ اور سانپ سخت موذی جانور ہے مگر بازیگر کا کمال دونوں میں یکساں سمجھا جاتا تھا، اور تماشہ جو اس کا مقصود تھا وہ دونوں سے یکساں حاصل ہوتا تھا، تماش بینوں کی نگاہ اس پر ہوتی تھی کہ جو چیز بظاہر پٹاری میں موجود نہ تھی وہ کیسے وجود میں نظر آنے لگی۔ حالانکہ یہ صرف نظر بندی تھی جس کے پیچھے کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔

تو اس سے اندازہ کر لیجئے کہ خالقِ حقیقی کا کمال یعنی ہر قسم اور ہر نوع کی چیزوں

کو خواہ وہ خیر ہوں یا شر، پردۂ عدم سے منصّۂ وجود پہ لانا، کیا دونوں صورتوں میں ظاہر و باہر نہیں! اور اس عالم کی تخلیق کی جو غرض اصلی ہے کیا وہ دونوں صورتوں میں نمایاں نہیں۔

یہی نکتہ ہے کہ سورۂ شمس میں جہاں اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کی قسم کھائی وہاں متقابل ومتضاد اشیاء کا بھی ذکر کیا، فرماتے ہیں والشمس وضحٰھا والقمر اذا تلاھا والنھار اذا جلّٰھا واللیل اذا یغشٰھا والسماء وما بنٰھا والارض وما طحٰھا ونفس وما سوّٰھا فالھمھا فجورھا وتقوٰھا۔

ان متضاد اشیاء کی قسم کھا کر ارشاد فرمایا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان متضاد اشیاء کو اس کائنات میں پیدا کیا، اسی طرح نفسِ انسانی میں تقویٰ وفجور دو متضاد کیفیات کا الہام والقاء بھی کر دیا، پھر ان دونوں حالتوں پر فلاح یا خیبہ کے مختلف ثمرات بھی مرتب کئے۔ ایسا ہی ارشاد ہے واللیل اذا یغشٰی والنھار اذا تجلّٰی وما خلق الذکر والانثٰی ان سعیکم لشتّٰی الآیہ

غرض متقابل اضداد کا پیدا کرنا خالق کا انتہائی کمال ہے، خیر وشر کی تخلیق سے فاطرِ حقیقی کی طرف کوئی عیب یا نقص عائد نہیں ہوتا۔

آخر میں ایک بات اور یاد رکھنے کی ہے کہ کبھی کسی موصوف کے لئے ایک صفت ثابت کرتے ہیں اور اس کا نفسِ اثبات واقع کے اعتبار سے غلط نہیں ہوتا لیکن صرف اسی قدر صفت کا ثابت کرنا چونکہ دوسرے لحاظ سے ایک گونہ نقص کا ایہام پیدا کرتا ہے، اس لئے عرفاً اس صفت کے ذکر پر اکتفا محمود نہیں سمجھا جاتا، بلکہ تأدب واحترام کے خلاف

شمار ہوتا ہے۔ مثلاً کوئی شخص بادشاہ یا وائسرائے کے اختیارات بیان کرتے وقت یہ کہے کہ وہ ہمارے گاؤں کے مکھیا یا قصبہ کے تحصیلدار سے بھی زیادہ اقتدار و اختیار رکھتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ بات فی نفسہٖ غلط تو نہیں مگر عرفاً محض اتنی بات کے بیان سے ان کے اعلیٰ اقتدار و اختیار کی تنقیص متوہم ہوتی ہے اس لئے عقلاء متاد بین اس قسم کی عبارات کو ایک طرح کی توہین قرار دیتے ہیں۔

اسی طرح سمجھ لیجئے کہ اللہ جل شانہٗ گو فی الواقع ہر ایک خیر و شر کا خالق ہے اور اس کی خالقیت عامہ کے متعلق اعتقاد رکھنا جزو ایمان ہے، تاہم بعض شرور و قبائح کی تخصیص کر کے اس کی طرف نسبت کرنا، مثلاً یوں کہنا الحمد للہ خالق الکلاب والخنازیر سوءِ ادب میں داخل ہے، اور بارگاہِ قدس کے ادب شناس تو اس بارہ میں بہت ہی احتیاط برتتے ہیں اور کسی شر یا قبیح و مکروہ چیز کی علانیہ نسبت حضرت حق کی طرف کرنے سے گو وہ خلقاً صحیح ہوتا بحدِ امکان گریز کرتے ہیں۔

دیکھئے حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے یطعمنی و یسقین و اذا مرضت فھو یشفین میں اطعام و سقی اور شفاء کو اپنے رب کی طرف منسوب کیا، اور مرض کو اپنی طرف تمریض کی نسبت اُدھر نہیں کی۔

مومنین جن سے کہا تھا وانا لاندری اشراُرید بمن فی الارض ام اراد بھم ربھم رشدا، شر کی جانب میں اُرید بصیغۂ مجہول لائے، رُشد کی طرح اراد شر کے فاعل کو تصریحاً ذکر نہیں کیا۔

موسیٰؑ اور خضرؑ کے قصہ میں تین واقعات کا ذکر تھا، سفینہ کو توڑ کر عیب دار بنانا، غلام کا قتل کرنا، دیوار کو سیدھا کر دینا، پہلے واقعہ میں خضرؑ نے فاردتُّ ان اعیبھا فرمایا، کیونکہ عیب دار بنانے کے الفاظ کی نسبت باری تعالیٰ کی طرف صراحۃً کرنا خلافِ ادب سمجھا، گو نتیجہ کے اعتبار سے وہ بھی خیر تھا۔

قتل غلام میں دو پہلو تھے بظاہر غلام کے نفس زکیہ ہونے کے اعتبار سے ابتداءً یہ فعل قبیح تھا، لیکن باعتبار انجام و نتیجہ کے اس میں بہت بڑی چیز مضمر تھی وہاں خضرؑ نے بعینہٖ جمع فاردنا ان یبدلھما ربھما الخ اختیار کیا، گویا ظاہری صورت حال کے اعتبار سے اسے اپنے ارادے کے ماتحت رکھا، اور باطنی حکمت کے لحاظ سے اس کا انتساب اللہ تعالیٰ کے ارادے کی طرف رہا۔

تیسرا واقعہ اقامتِ جدار کا تھا جو ابتداءً و انتہاءً ہر پہلو سے خیر محض تھا، جو دیوار گرا چاہتی تھی اسے گرنے سے بچایا اور یتیموں کا مال محفوظ کر دیا، اس لئے وہاں اپنا توسط بالکل اٹھا دیا، اور صاف طور پر فرما دیا۔ فاراد ربک ان یبلغا اشدھما ویستخرجا کنزھما پھر اخیر میں تمام واقعات میں تمام واقعات کو مجموعی طور پر ایک جملہ وما فعلتہ عن امری میں لپیٹ کر ظاہر کر دیا کہ یہ سب کچھ اُدھر ہی سے ہے۔ اس طرح کی حسن تعبیر کی مثالیں قرآن و حدیث میں بے شمار ہیں۔

اس لئے عارفین کاملین اور علماء متادبین ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے حق ربوبیت اور اپنی شانِ عبودیت کے پیش نظر تقصیرات اور لغزشوں کو اپنی طرف اور طاعات و

خیرات کو اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

جبر و اختیار کے درمیان پُر حکمت راستہ

اور میرے نزدیک اختیارِ مطلق اور جبرِ محض کے درمیان کسب کا درجہ قائم کرنے کی بڑی حکمت یہی ہے کہ بندہ اعتدال پر قائم رہ کر اپنی ہر ایک نقل و حرکت پر ربوبیت و عبودیت کے صحیح آداب بجا لائے اور بندگی کے کڑے امتحان و آزمائش میں اپنے کو ثابت قدم رکھے۔

حافظ ابن قیم نے "مدارج السالکین" میں ایک عجیب اثر نقل کیا ہے جس سے اس مسئلہ کی پوری عقدہ کشائی ہوتی ہے وہ اثر یہ ہے:۔

ان العبد اذا اذنب فقال یا ربِّ ھٰذا قضاءك وانت قدرت علیَّ وانت حکمت علیَّ وانت کتبت علیَّ، یقول اللّٰہ عز وجل وانت عملت و انت کسبت وانت اردت واجتھدت وانا اعاقبك علیه، واذا قال یا رب انا ظلمت وانا اخطاتُ وانا اعتدیت وانا فعلت، یقول اللّٰہ عزوجلّ وانا قدرت علیك و قضیتُ وکتبتُ وانا اغفر لك،

واذا عمل حسنةً فقال یا ربِّ انا عملتها وانا تصدقت وانا صلیتُ وانا اطعمت یقول اللّٰہ عز وجل وانا اعنتك وانا و فقتك واذا قال یا رب انت اعنتنی وانت مننت علیَّ، یقول اللّٰہ وانت عملتها

وانت اردتها وانت کسبتها (مدارج السالکین ص۹۹ ج ۱)

اس کا خلاصہ مطلب یہ ہے کہ بندہ جب گناہ کر کے کہتا ہے کہ اے پروردگار جو کچھ مَیں نے کیا تو نے میری تقدیر میں پہلے لکھ دیا تھا، اور تو میرے حق میں تکویناً اس کا فیصلہ کر چکا تھا، تو اللہ تعالیٰ اس کا جواب دیتا ہے کہ یہ سب کچھ سہی مگر عمل تو تو نے کیا کسب تیرا ہے، تیرے ارادے اور کوشش سے یہ کام ہُوا، اب میں اس پر تجھے سزا دوں گا:۔

اس کے برعکس جب گناہ کا ارتکاب کر کے عرض کرتا ہے کہ اے پروردگار! مَیں نے ظلم کیا، مجھ سے خطا اور زیادتی ہُوئی اور یہ سب میری کرتوت ہے:۔ تو اُدھر سے جواب ملتا ہے کہ ٹھیک ہے مگر یہ سب تقدیری بات تھی، جو مَیں تیرے حق میں پہلے ہی لکھ چکا تھا اب تیری اس تقصیر پر میں تجھے معاف کرتا ہُوں۔

یہ تو گناہ کی صُورت تھی، اب اطاعت کی صُورت سنیئے:۔

اُدھر سے کوئی بندہ اچھا کام کر کے دعویٰ کرتا ہے کہ پروردگار میں نے یہ علم کیا، مَیں نے صدقہ کیا، میں نے نماز پڑھی، میں نے کھانا کھلایا، تو حق تعالیٰ کی طرف سے ارشاد ہوتا ہے کہ بے شک ایسا ہُوا، مگر مَیں نے تیری مدد کی اور میری توفیق سے تو یہ کام کر سکا، کیا میری امداد و توفیق کے بدون تو کچھ کر سکتا تھا، اس کے برخلاف جب بندہ اپنی طرف سے عرض کرتا ہے کہ آپ نے میری مدد فرمائی اور آپ نے احسان فرمایا کہ مُجھ سے یہ کام بن پڑا، تو جواب ملتا ہے کہ عمل تیرا ہے، تیرے ارادہ سے ہُوا ہے اور تُو نے یہ نیکی کمائی ہے:۔

اب غور کیجیے کہ کسب کا یہ ذوالوجہین اور برزخی درجہ اگر نہ رکھتے تو عبودیت اور نیاز و ادب و اخلاص کے پرکھنے کی اس سے بہتر کسوٹی اور کیا ہو سکتی تھی۔ سبحان اللہ کیا لطف و کرم ہے اور کیا امتحانِ محبت و اطاعت ہے، یہی وہ پاک حقائق ہیں جن کے چہرہ سے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نے پردے اٹھائے ہیں۔ یہ حکماء متفلسفین کے بس کا روگ نہ تھا، حق تعالیٰ کا شکر کہ اس نے نورِ نبوت کے فیض سے یہ باریک عقدے اپنے مخلص بندوں پر کھول دیئے۔

فالحمد للہ الذی ھدانا لھذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ لقد جاءت رسل ربنا بالحق ولولا اللہ ما اھتدینا ولا تصدقنا ولا صلینا واٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

الشہاب لرجم الخاطف المرتاب

یعنی مرزائیوں کے ارتداد کا ثبوت اور قتل مرتد کے شرعی دلائل

جسمیں نہایت سلیس معقول اور منصفانہ طریقہ سے مرزائیوں کے ارتداد کا ثبوت قتل مرتد کے شرعی دلائل اور اس کا عقلی فلسفہ اور جہاد بالسیف کی حکمت اور حدود اور دولت مستقلہ خداداد افغانستان کے فیصلہ دربارۂ تعزیر مرتد کی تحسین و تصویب اور ان تمام شبہات کا ازالہ کیا گیا ہے۔ جو اس فیصلہ پر کئے جاتے ہیں۔

مصنفہ

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ

ناشر

ادارہ اسلامیات ۱۹۰ انار کلی لاہور

فہرست مضامین

الشہابُ الرجم الخاطف المرتاب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ خیر خلقہ محمد وآلہ وصحبہ اجمعین:- کابل میں نعمت اللہ قادیانی کی سنگساری کے واقعہ سے ہندوستان کے اخباروں میں قادیانیوں کے ارتداد کی بحث پھر تازہ ہوگئی اور ساتھ ہی یہ مسئلہ بھی زیر بحث آگیا کہ اسلام میں مرتد کی سزا کیا ہے۔ مسٹر محمد علی امیر جماعت احمدیہ لاہور نے پیغام صلح کے ضمیمہ کے طور پر ایک پمفلٹ بھی اسی مضمون کے متعلق بڑی تعداد میں شائع کرایا ہے۔ جس میں پورے زور خطابت سے حکومت افغانستان اور علمائے دیوبند کے خلاف (جو افغانستان کے اس فعل کی سب سے بڑھ کر تحسین کرنے والے ہیں) نفرت اور اشتعال پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اگرچہ مجھے یقین ہے کہ مسلمان اب بہت کچھ قادیانیوں کی فتنہ پردازیوں اور اسلام کے خلاف اُن کی دسیسہ کاریوں سے واقف ہوگئے ہیں۔ اور اسی لئے اُن کا کوئی پروپیگنڈا افغانی گورنمنٹ یا علماء دیوبند کے خلاف انشاء اللہ موثر نہیں ہوسکتا۔ تاہم سلسلہ تحریرات جس حد تک پہنچ گیا ہے اُسے دیکھتے ہوئے مناسب معلوم ہوا کہ اس باب میں توسط کے ساتھ کچھ عرض کیا جاوے۔

اس ضمن میں پہلی بحث جو ہمارے سامنے آتی ہے وہ قادیانی جماعت کے ارتداد کا مسئلہ ہے اور پھر یہ دیکھنا ہے کہ مُرتد کی نسبت اسلام کیا فیصلہ کرتا ہے۔ تو ضروری

ہُوا کہ اوّلاً ارتداد کے معنے سمجھ لئے جائیں۔

ارتداد کی تعریف

مرتد کے معنی لغت میں (راجع) یعنی کسی چیز سے لوٹنے اور پھر جانیوالے کے ہیں اور شریعت کی اصطلاح میں مرتد اس شخص کو کہا جاتا ہے جو دین اسلام کو اختیار کرکے اُس سے پھر جائے۔ امام راغب ارتداد کے معنی لکھتے ہیں۔

ھو الرجوع من الاسلام الی الکفر "اسلام سے کفر کی طرف پھر جانا"

مفردات صد ۱۹۲ اور محمد علی صاحب اپنے پمفلٹ میں لکھتے ہیں:-

"ارتداد یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو قبول کرکے پھر اُس سے انکار کر دے اور کہہ دے کہ آپ رسول نہیں"

لیکن یہ بات صاف ہو جانی چاہیئے کہ امام راغبؒ کی تعریف میں کفر اور محمد علی صاحب کی تعریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت سے انکار کرنے کا کیا مطلب ہے۔ کیا رسالت کا انکار اُسی وقت سمجھا جائیگا کہ وہ زبان سے کہدے کہ میں آپ کو رسول نہیں جانتا۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی یقینی خبر اور قطعی فرمان کا انکار کرنے سے بھی رسالت کا منکر ٹھہرے گا؟

فرض کیجیے ایک شخص زبان سے اقرار کرتا ہے کہ جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے رسول ہیں۔ نماز بھی قبلہ کی طرف پڑھتا ہے۔ زکوٰۃ بھی ادا کرتا ہے۔ مسلمانوں کا ذبیحہ بھی کھاتا ہے۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ میرے خیال میں سورۂ احزاب یا سورۂ نساء قرآن کی سورۃ نہیں۔ یا حضرت عیسٰے (علیہ السلام) خدا کے پیغمبر نہیں

(معاذ اللہ) باقی سارے قرآن اور سارے انبیاء کی میں تصدیق کرتا ہوں تو کیا ایسی تصریحات کے باوجود بھی محمد علی صاحب اسے مسلمان سمجھتے رہیں گے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان رکھنے والا تصور کریں گے اور ان بعض انبیاء یا ان بعض اجزائے قرآن کی تکذیب کو خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلکہ رب محمدؐ کی تکذیب قرار نہ دیں گے۔

اگر ایسے شخص کو باوجود زبانی اقرار رسالت کے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت بلکہ خود خداوند رب العزت کا منکر ہی قرار دیتے ہیں جیسا کہ،

ان الذین یکفرون باللہ ورسلہ ویریدون ان یفرقوا بین اللہ ورسلہ ویقولون نؤمن ببعض ونکفر ببعض ویریدون ان یتخذوا بین ذالک سبیلا اولئک ھم الکافرون حقا کے تحت میں انہوں نے لکھا ہے:۔

"اللہ اور اس کے رسولوں میں تفریق سے مراد صرف یہی نہیں کہ اللہ کو مان لیا اور رسولوں کا انکار کر دیا جیسے برہمو ہیں۔ بلکہ یہ بھی کہ بعض رسولوں کو مان لیا اور بعض کا انکار کر دیا جیسے تمام اہل کتاب کی حالت ہے اور یہ اس لئے کہ اللہ کے سوا کسی رسول کا انکار گویا اللہ کا ہی انکار ہے۔" (بیان القرآن صفحہ ۵۶۱)

اور ان کے مسیح موعود (مرزا غلام احمد قادیانی) حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۷۹ میں لکھتے ہیں کہ

"کافر کا لفظ مومن کے مقابلہ پر ہے اور کفر دو قسم پر ہے:۔

(۱) ایک یہ کفر کہ ایک شخص اسلام ہی سے انکار کرتا ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا رسول نہیں مانتا۔

(۲) دوسرے کفر کہ مثلاً وہ مسیح موعود کو نہیں مانتا۔ اور اس کو باوجود اتمام حجت

کے جھوٹا جانتا ہے۔ اور اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ دونوں قسم کے کفر ایک ہی قسم میں داخل ہیں الخ

اور اسی کتاب کے صفحہ ۱۶۳ پر لکھتے ہیں جو مجھے نہیں مانتا وہ خدا اور رسول کو بھی نہیں مانتا الخ

تو اس قسم کے اقرار اور تسلیم سے ثابت ہوا کہ ان کے نزدیک بھی اللہ اور اس کے رسول کے انکار کی صرف یہ ہی صورت نہیں کہ ایک شخص زبان سے صریح طور پر یوں کہے کہ میں خدا کو یا اس کے پیغمبر رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں مانتا بلکہ بسا اوقات بعض نہایت ہی قطعی اور ضروری چیزوں کا انکار کرنیوالا بھی جن کی اطلاع خدا اور اس کے رسول نے دی ہو خدا اور اس کے رسول ہی کا انکار کرنیوالا سمجھا جائیگا جو قرآن کی تصریح اور مرزا صاحب کے اقرار کے موافق کفر ہے۔

پس جب کہ امام راغبؒ کی تصریح کے موافق اسلام سے کفر کی طرف پھر جانے کا نام ارتداد ہے۔ اور محمد علی صاحب اور اُن کے مسیح موعود کی تصریحات سے یہ ثابت ہو چکا کہ کفر صرف یہی نہیں کہ اللہ اور اس کے رسول کا صریح طور پر زبان سے انکار کیا جائے، بلکہ بعض قطعیات اسلام کا انکار کرنا بھی حقیقت میں اللہ اور اس کے رسول کا انکار کرنا ہے جو کفر ہے۔ تو معلوم ہوا کہ ارتداد یعنی اسلام سے کفر کی طرف پھر جانے کی دو صورتیں ہیں۔

(۱) ایک یہ کہ کوئی مسلمان صریحاً اسلام سے کفر کر بیٹھے۔

(۲) دوسرے یہ کہ ایسا نہ ہو، مگر بعض ضروریات دینیہ اور قطعیات شرعیہ سے، انکار کرے۔ دونوں صورتوں میں ایسا شخص مرتد یعنی اسلام سے نکل کر کفر میں جانے

والا ہے (العیاذ باللہ)

کیا مرزا قادیانی اور اُس کی امّت مرتد ہیں؟

جو لوگ مرزا غلام احمد کو مرتد کہتے ہیں اُن کے نزدیک معیار ارتداد وہی ہے جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ مرزا صاحب پہلے مسلمان تھے، اور جمہور اہل اسلام کے سے عقائد رکھتے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے بتدریج ایسی باتیں لکھیں اور شائع کیں جن کا ماننا کھلے طور پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا نہ ماننا ہے۔ وہ اگرچہ بار بار زبان سے یہ بھی اظہار کرتے رہے کہ حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم خدا کے رسول ہیں۔ اور خاتم الانبیاء ہیں اور تمام انبیاء و مرسلین خدا کے پاک اور برگزیدہ بندے ہیں لیکن ساتھ ہی وہ قلم اور زبان سے نہایت اصرار کیساتھ ایسی چیزیں بھی نکالتے رہے جو اُن کے پہلے ادعاء کی مکذب ہیں۔

وہ جب کہتے ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم قرآن کی تصریح کے موافق خاتم النبیین ہیں تو ساتھ ہی یہ بھی کہتے جاتے ہیں کہ میں آپ کے بعد نبی ہو کر آیا ہوں۔ پھر یہ نبوت جس کا انہیں دعویٰ ہے صرف وہ ولایت محدثیہ نہیں جسے صوفیہ نے (مثلاً شیخ اکبرؒ) نے اپنی اصطلاح میں نبوۃ کے لفظ سے تعبیر کر دیا ہے اور کہا ہے کہ وہ گروہ اولیاء میں موجود ہوتی ہے، گو اس کی وجہ سے وہ انبیاء نہیں کہلاتے۔ اور نہ کبھی آج تک کسی ولی نے حتیٰ کہ اس محدث نے بھی جس

۱ فالاتصاف بکمالات النبوۃ لا یلزم الاتصاف بالنبوۃ (مبحث ۱۵ / ۱۴)	پس کمالات نبوت سے متصف ہونا اتصاف بالنبوت کو مستلزم نہیں۔ (باقی حاشیہ آگے)

کے محدث ہونے کی تصدیق زبان رسالت سے ہو چکی تھی۔ (حضرت عمر بن الخطابؓ) اپنی اس نبوت پر ایمان لانے کی طرف لوگوں کو دعوت دی ہے۔ اور نہ مرزا صاحب

فاخبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان الرؤیا جزء من اجزاء النبوۃ فقد بقی للناس فی النبوۃ ھذا وغیرہ ومع ھذا لا یطلق اسم النبوۃ ولا النبی الا علی المشرع خاصۃ فحجر ھذا الاسم لخصوص وصف معین فی النبوۃ۔ (فتوحات ۴۹۵ / ۲)	رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ہم کو بتلایا کہ خواب اچھا، اجزاء نبوۃ میں سے ایک جزء ہے تو لوگوں کے واسطے نبوۃ میں سے یہ جزء (رؤیا) وغیرہ باقی رہ گیا۔ لیکن اس کے باوجود بھی نبوۃ کا لفظ اور نبی کا نام بجز مشرع (امر و نہی لانے والے) کے اور کسی پر بولا نہیں جا سکتا۔ تو نبوت میں ایک خاص وصف معین کی موجودگی کی وجہ سے اس نام (نبی) کی بندش کر دی گئی ہے۔
کمن یوحی الیہ فی المبشرات وھی جزء من اجزاء النبوۃ وان لم یکن صاحب المبشرۃ نبیاً فتفطن لعموم رحمۃ اللہ فما تطلق النبوۃ الا لمن اتصف بالمجموع فذلک النبی وتلک النبوۃ التی حجرت علینا وانقطعت فان من جملتھا التشریع بالوحی فی التشریع وذالک لا یکون الا للنبی خاصۃ	جیسے کسی کی طرف مبشرات کی وحی آئی اور وہ مبشرات اجزاء نبوت میں سے ہیں۔ اگرچہ صاحب مبشرہ نبی نہیں ہو جاتا پس رحمت الٰہیہ کے عموم کو سمجھو تو نبوت کا اطلاق اسی پر ہو سکتا ہے جو تمام اجزاء نبوت سے متصف ہو۔ وہی نبی ہے۔ اور وہی نبوت ہے جو منقطع ہو چکی اور ہم سے روک دی گئی۔ کیونکہ نبوت کے اجزاء میں سے تشریع بھی ہے جو وحی ملکی سے ہوتی ہے۔ اور یہ بات صرف نبی کے ساتھ مخصوص ہے۔ (فتوحات ۵۶۸ / ۳)

ایسی گھٹیا نبوت کے مدعی ہیں جو ایک سچا خواب دیکھنے سے بھی کسی مومن صالح کو فی الجملہ حاصل ہو سکتی ہے۔

مرزا صاحب کا دعویٰ نبوت

بلکہ وہ محدثیت وغیرہ سے آگے بڑھ کر مدعی ہوئے ہیں ایسی نبوت کے جس پر نہ صرف قادیان کو نہ صرف پنجاب کو، نہ انڈیا کو بلکہ خاتم النبیین صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی طرح تمام عالم کو ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے۔ پھر جو کوئی اس دعوت کے پہنچنے پر بھی ایمان نہ لائے وہ دائرہ ایمان و اسلام سے خارج اور جہنمی ہے۔ جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر ایمان نہ لانے والا بے ایمان اور جہنمی ہوتا ہے۔ بلکہ ان کا نہ ماننے والا بعینہ خدا اور رسول کو بھی نہ ماننے والا ہے۔

نہ صرف یہی کہ ان کو معمولی نبی تسلیم کر لیا جائے۔ بلکہ بعض اولوا العزم پیغمبر اور خاتم انبیاء بنی اسرائیل سیدنا حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام پر بھی ان کی فضیلت کا اقرار کیا جائے۔ پھر فضیلت بھی کوئی جزئی فضیلت نہیں۔ بلکہ کلی فضیلت اور ہر شان میں ان سے بڑھ کر مانا جائے۔ اور اگر ہو سکے تو ان سب کے بعد دبی زبان سے تشریعی (صاحب شریعت) نبی بھی تسلیم کر لیا جائے۔ ملاحظہ ہو مرزا صاحب کی عبارات ذیل۔ "اب ظاہر ہے کہ ان الہامات میں میری نسبت بار بار بیان کیا گیا ہے کہ یہ خدا کا فرستادہ خدا کا مامور خدا کا امین اور خدا کی طرف سے آیا ہے۔ جو کہتا ہے اس پر ایمان لاؤ اور اس کا دشمن جہنمی ہے۔" (انجام آتھم بار دوم صفحہ ۶۲)

"بہر حال جب کہ خدا تعالیٰ نے مجھ پر ظاہر کیا ہے کہ ایک ایک شخص جس کو میری دعوت پہنچی ہے اور اس نے مجھے قبول نہیں کیا ہے وہ مسلمان نہیں ہے۔ اور خدا کے نزدیک قابل مواخذہ ہے۔"

(نہج المصلی جلد اول ص ۲۸۰ منقول از تشحیذ الاذہان جلد ۶ ص ۱۲۵)

"علاوہ اس کے جو مجھے نہیں مانتا وہ خدا اور رسول کو بھی نہیں مانتا کیونکہ میری نسبت خدا اور رسول کی پیشین گوئی موجود ہے (حقیقۃ الوحی بار دوم ص ۱۶۳) اب جو شخص خدا اور رسول کے بیان کو نہیں مانتا اور قرآن کی تکذیب کرتا ہے اور عملاً خدا تعالیٰ کے نشانوں کو رد کرتا ہے اور مجھ کو باوجود صدہا نشانوں کے مفتری ٹھہراتا ہے تو وہ مومن کیوں کر ہو سکتا ہے۔" (ایضاً ص ۱۶۴)

"اوائل میں میرا یہی عقیدہ تھا کہ مجھ کو مسیح بن مریم سے کیا نسبت ہے۔ وہ نبی ہے اور خدا کے بزرگ مقربین سے ہے۔ اور اگر کوئی امر میری فضیلت کی نسبت ظاہر ہوتا تو میں اس کو جزئی فضیلت قرار دیتا تھا۔ مگر بعد میں جو خدا تعالیٰ کی وحی بارش کی طرح میرے اوپر نازل ہوئی، اس نے مجھے اس عقیدہ پر قائم نہ رہنے دیا۔ اور صریح طور پر نبی کا خطاب مجھے دیا گیا۔ مگر اس طرح سے کہ ایک پہلو سے نبی اور ایک پہلو سے امتی۔" (حقیقۃ الوحی بار دوم ص ۱۴۹)

"خدا نے اس امت میں سے مسیح موعود بھیجا۔ جو اس پہلے مسیح سے اپنی تمام شان میں بہت بڑھ کر ہے۔"

(حقیقۃ الوحی ص ۱۴۸ منقول از ریویو جلد اول ۶ صفحہ ۲۵۷)

☆☆☆☆☆☆☆☆

کافر کس طرح کے رسول کا نہ ماننے والا ہوتا ہے

اس کے متعلق تریاق القلوب صفحہ ۱۳۰/۳۲۵ میں لکھتے ہیں:-

"یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے لائق ہے کہ اپنے دعوے سے انکار کرنے والے کو کافر کہنا یہ صرف ان نبیوں کی شان ہے جو خدا تعالیٰ کی طرف سے شریعت اور احکام جدیدہ لاتے ہیں۔ لیکن صاحب شریعت کے ماسوا جس قدر ملہم اور محدث ہیں گو وہ کیسے ہی جناب الٰہی میں اعلیٰ شان رکھتے ہوں۔ اور خلعتِ مکالمہ الٰہیہ سے سرفراز ہوں اُن کے انکار سے کوئی کافر نہیں بن جاتا۔"

ماسوا اس کے یہ بھی تو سمجھو کہ شریعت کیا چیز ہے جس نے اپنی وحی کے ذریعہ سے چند امر و نہی بیان کیے۔ اور اپنی اُمت کے لئے ایک قانون مقرر کیا وہی صاحب شریعت ہو گیا۔ پس اس تعریف کی رُو سے بھی ہمارے مخالف ملزم ہیں۔ کیونکہ میری وحی میں امر بھی ہے اور نہی بھی اور اگر کہو کہ شریعت سے وہ شریعت مراد ہے جس میں نئے احکام ہوں تو یہ باطل ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ ان ھٰذا لفی الصحف الاولیٰ صحف ابراھیم وموسیٰ۔ یعنی قرآنی تعلیم توریت میں بھی موجود ہے اور اگر یہ کہو کہ شریعت وہ ہے جس میں باستیفاء امر و نہی کا ذکر ہو تو یہ بھی باطل کیونکہ اگر توریت یا قرآن شریف میں باستیفاء احکام شریعت کا ذکر ہوتا تو پھر اجتہاد کی گنجائش نہ رہتی۔" اربعین ح ۴

لہ شیخ اکبر رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:- (حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کیا مسٹر محمد علی اور بے خبری سے ان کی تائید کرنیوالے یہ عبارتیں سن رہے ہیں

فما بقی للاولیاء الیوم بعد ارتفاع النبوۃ الا التعریفات و انسدت ابواب الاوامر الالٰھیۃ والنواھی فمن ادعاھا بعد محمد صلی اللہ علیہ وسلم فھو مدع شریعۃ اوحی بھا الیہ سواء وافق بھا شرعنا او خالف (فتوحات ج۱ ص۵۱)

نبوت اٹھ جانے کے بعد آج اولیاء کے لئے بجز تعریفات کے کچھ باقی نہیں رہا اور اوامر نواہی کے سب دروازے بند ہو چکے اب جو کوئی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد امر و نہی کا مدعی ہو (جیسے مرزا صاحب) وہ اپنی طرف وحی شریعت آنے کا مدعی ہے۔ خواہ وہ شریعت ہماری شریعت کے موافق ہو یا مخالف۔

شیخ عبدالوہاب شعرانی رحمہ اللہ اس عبارت کے ساتھ اس قدر اور اضافہ کرتے ہیں:-

فان کان مکلفا ضربنا عنقہ والا ضربنا عنہ صفحا (الیواقیت والجواہر ج۲ ص۳۷)

قال الشیخ الاکبر فی الباب الحادی والعشرین من الفتوحات من قال ان اللہ تعالیٰ امرنی بشیء فلیس ذالک بصحیح انما ذالک تلبیس لان الامر قسم الکلام وصفتہ و ذالک باب مسدود دون الناس (الیواقیت والجواہر ج۲ ص۳۴)

پھر اگر یہ مدعی وحی شریعت مکلف ہے (یعنی مجنون وغیرہ نہیں ہے) تو ہم اس کی گردن ماریں گے، اور اگر مکلف نہیں تو ہم اس سے کنارہ کشی کریں گے۔ شیخ اکبر فتوحات کے اکیسویں باب میں فرماتے ہیں کہ جو کوئی (بعد نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے) یہ دعویٰ کرے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو کسی چیز کا حکم کیا ہے (جیسا کہ مرزا صاحب کہتے ہیں کہ میری وحی میں امر بھی ہے اور نہی بھی) تو یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے محض تلبیس ہے۔ کیونکہ امر کلام کی قسم اور اس کی صفات میں سے ہے۔ اور یہ کلام کا دروازہ لوگوں پر بند کیا جا چکا ہے۔

کیا یہی وہ صوفیوں کی اصطلاحی یا مجازی یا لغوی نبوت ہے جس کا ثبوت رؤیا کی حدیث یا شیخ اکبر کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ کیا قادیانیوں کا یہی ظلی اور بروزی، نبی ہے جو اصلی اور حقیقی نبیوں سے بھی بڑھ گیا ہے۔ کیا اُمتی نبی نام رکھ دینے سے اصل حقیقت پر پردہ پڑ سکتا ہے۔ اور کیا یہ سخت حیرت انگیز اور مضحکہ خیز منطق نہیں ہے کہ کسی پرانے نبی (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کا دوبارہ آنا تو یہ آیۂ خاتم النبیین کے خلاف ہو لیکن نبیوں پر فضیلت کلی رکھنے والا ایک نیا نبی قادیان میں آجائے یہ خاتم النبیین کے خلاف نہ ہو۔ گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود باجود نے مفضول انبیاء کے آنیکا سلسلہ تو بند کر دیا لیکن ان سے اعلیٰ اور افضل انبیا کی تشریف آوری کا دروازہ کھول دیا ہے۔ کاش کہ قرآن میں بھی خاتم النبیین کی آیت کے ساتھ فاتح النبیین کی کوئی آیت ہوتی اور جس صراحت اور تکرار کے ساتھ حضور سے پہلے آنے والے انبیا کا تذکرہ ہوا ہے اس کا عشر عشیر ہی پیچھے آنے والے نبی کے متعلق ہوتا کہ امت کو زیادہ کام ان ہی پچھلوں سے پڑنا تھا۔ اور ان پہلوں سے افضل بھی تھے۔

کیا مرزائیوں میں کوئی بھی خوف خدا رکھنے والا نہیں۔ کیا اُن کے دلوں پر مہر ہو چکی ہے۔ کیا ان کی قلوب پتھر سے بھی زیادہ سخت ہو گئے ہیں۔ جو ایسی، ایسی صریح عبارتوں کے بعد بھی ایک مفتری علی اللہ کو سچا پیغمبر بناتے چلے جاتے ہیں۔ عجیب تماشا ہے کہ اس مفتری نے اپنے تئیں سچا ثابت کرنے کے لئے آتھم کے قصہ میں اور محمدی بیگم کے آسمانی نکاح میں معاذ اللہ خدا کو اور اس کی قضا مبرم تک کو جھوٹا ٹھہرا دیا۔ مگر وہ محروم الخیر جماعت جو آج علماء دیوبند پر خدا کو جھوٹا

کہنے کا محض فرضی الزام رکھ کر اپنے لئے اور نئی لعنت خرید رہی ہے۔ اُس مفتری کا برابر کلمہ پڑھتی جاتی ہے۔ جو اپنی سچائی کا ثبوت ہی جب پیش کر سکتا ہے جب پہلے خدا کو جھوٹا ثابت کر دے۔ (کبرت کلمۃ تخرج من افواھھم)

شاید محمد علی صاحب کو علماء دیوبند کے آئینۂ اعتقاد میں اپنا چہرہ نظر آگیا ہے جو معاذ اللہ خدا کے جھوٹ بولنے کی تصویر سامنے آگئی۔ ان فی ذالک لذکریٰ لمن کان لہٗ قلبٌ او القی السمع وھو شھید۔

خوب سمجھ لو کہ جھوٹے حیلے اور بیہودہ عذر تراش کو ختم نبوت جیسے قطعی اور، اسلام کے بنیادی عقیدہ کی تکذیب کرنا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور صدق و راست بازی اور قرآنِ کریم کے وحی الٰہی ہونے سے انکار کرنا ہے۔

فانھم لایکذبونک ولکن الظٰلمین بآیٰت اللہ یجحدون۔	یہ لوگ تجھے نہیں جھٹلاتے بلکہ ظالم خدا کی آیات کا انکار کرتے ہیں۔

اور جیسا کہ ابتداء میں عرض کر چکا ہوں یہ بھی ارتداد ہے کہ آدمی اسلام کا اقرار کرنے کے بعد پھر اس سے صریحاً انکار کرنے لگے یا ایسی قطعی اور صاف چیزوں کا انکار کر بیٹھے جو انکار رسالت کو مستلزم ہو۔

ارتداد کی اس قسم خفی کا نام یعنی یہ کہ آدمی زبان سے اسلام کا نام بھی لیتا ہے اور کلمہ بھی پڑھتا رہے مگر نامعقول تحریفات اور ناقابل قبول تاویلات باطلہ سے قطعیات کے انکار پر بھی تلا ہو۔ سلف کی زبان میں "زندقہ" ہو گیا ہے اور جیسا کہ ہم آگے چل کر بیان کریں گے زنادقہ کا حکم بھی وہی عام مرتدین کا سا ہے۔

اس تمام تقریر سے یہ نتیجہ نکلا کہ مرزا غلام احمد قادیانی جس کی ختم نبوت کو

رد کرنے والی تصریحات ہم نقل کر چکے ہیں۔ اسلام کے ایک قطعی عقیدہ کو تسلیم نہ کرنے کی وجہ سے مرتد اور زندیق ہے۔ اور جو جماعت ان تصریحات پر مطلع ہو، کر ان کو صادق سمجھتی رہے، اور اس کی حمایت میں لڑتی رہے وہ بھی یقیناً مرتد اور زندیق ہے خواہ وہ قادیان میں سکونت رکھتی ہو یا لاہور میں۔ جب تک وہ ان، تصریحات کے غلط اور باطل ہونے کا اعلان نہ کرے گی خدا کے عذاب سے خلاصی پانے کی اُس کے لئے کوئی سبیل نہیں۔

یہاں تک ہم نے مرزا صاحب اور ان کے اذناب ارتداد کا صرف ایک سبب بیان کیا ہے۔ کیونکہ محمد علی صاحب نے اپنے پمفلٹ میں اسی کا تذکرہ کیا تھا۔ دوسرے موجبات ارتداد مثلاً توہین انبیاء علیہم السلام وغیرہ سے عمداً اغماض کیا گیا ہے۔ شاید اس خدمت کو میرا کوئی دوسرا بھائی انجام دے گا اور بہت سے بزرگ مجھ سے پہلے بھی فی الجملہ انجام دے چکے ہیں۔

آپ یقین کیجئے کہ ہم کو مرزا صاحب یا کسی ایک کلمہ گو کے کافر اور مرتد ثابت کرنے میں کوئی خوشی نہیں ہے۔ ہماری حالت تو یہ ہے کہ نہ ہم غیر مقلدین کو کافر کہتے ہیں۔ نہ تمام شیعوں کو نہ سارے نیچریوں کو حتیٰ کہ ان بریلویوں کو بھی کافر نہیں کہتے جو ہم کو کافر بتلاتے ہیں۔ اور ہماری تمنا تھی کہ کوئی صورت ایسی نکل آتی کہ مرزائیوں کی تکفیر سے بھی ہم کو زبان آلودہ نہ کرنی پڑتی لیکن۔ ان کے ملحدانہ دعاوی نے جن سے بارگاہ رسالت میں سخت گستاخی ہوتی ہے اور کسی طرح ختم نبوت کا ستون کھڑا نہیں رہ سکتا۔ ہم کو مضطر کر دیا ہے کہ بادل ناخواستہ ان کی گمراہی سے لوگوں کو بچائیں۔ کہ جو زہر دودھ یا مٹھائی میں مخلوط ہو گیا ہو وہ سخت

خطرناک ہے۔

جو عبارتیں مرزا صاحب کی میں اوپر نقل کر چکا ہوں کیا ان کے مطالعہ کے بعد اس مسئلہ کا اعلان نہیں ہو جاتا کہ جو کوئی ان کو نبی اور مسیح موعود نہ مانے وہ دائرہ، ایمان و اسلام سے خارج ہے۔ اب تم خود دنیا کی مردم شماری کر لو کہ تمہارے کافر بنائے ہوئے غیر مسلموں کے سوا کتنے آدمی مسلمان رہ جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ کروڑوں غیر مسلم (فی زعمکم) لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا اقرار بھی کرتے ہیں۔ اور سارے احکام بجا لاتے ہیں۔

کیا مسٹر محمد علی اپنے اس فقرہ میں:۔

"لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا اعتراف کرنے والے کو کافر کہنا بڑی خطرناک غلطی ہے خواہ مرزا محمود صاحب کہیں یا مولوی کفایت اللہ صاحب"

دونوں ناموں سے پہلے مرزا غلام احمد قادیانی کا اور اضافہ کریں گے۔ اور ان کی قبر پر جا کر ولا تقولوا لمن القیٰ الیکم السلام لست مؤمنا کی تلاوت فرمائیں گے؟

ایک طرف تو آپ کے مسیح موعود سارے جہان کے کلمہ پڑھنے والوں کو بجز چند لاکھ نفوس کے مسلمانی سے نکال رہے ہیں۔ اور دوسری طرف آپ شاید ہر اس شخص کو جو مسلمانوں کو سلام کر لے (خواہ وہ ہندو ہو یا یہودی یا نصرانی یا دہریہ) مومن تسلیم کرتے ہیں۔ اس سے نبی قادیانی اور امتی دونوں کی شریعت فہمی اور قرآن دانی کی حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے۔

کہا گیا ہے کہ قادیانی بڑے نمازی ہیں۔ قرآن بہت پڑھتے ہیں۔ روزے

رکھتے ہیں۔ زکواۃ دیتے ہیں۔ اگر اس پر بھی وہ مسلمان نہیں تو بڑی حسرت اور حیرت کا مقام ہے۔

میں کہتا ہوں کہ ایک ایسی ہی بدبخت قوم کا تذکرہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحیحین کی احادیث میں فرمایا ہے کہ جو قرآن کی تلاوت بھی کرے گی اور بظاہر سچے مسلمانوں سے بھی زیادہ نمازیں پڑھے گی اور روزے رکھے گی مگر ان کا قرآن ان کے حلقوم سے آگے نہ بڑھے گا اور وہ اسلام میں سے ایسی ہی نکل چکی ہو گی جیسے تیر شکار کا جسم چھید کر صاف نکل جاتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اگر میں نے ان کو پایا تو عاد و ثمود کی طرح ان کو قتل کر دوں گا۔

حق تعالیٰ شانہ اپنی پناہ میں رکھے اور اس دنیا سے ایمان پر اٹھا لے کہ یہ مقام بڑے خوف اور عبرت کا ہے۔

مرزائیوں کو بڑا فخر ہے۔ اور بعض سادہ لوح آزاد منش مسلمان بھی ان کی مدح سرائی میں رطب اللسان ہو جاتے ہیں۔ کہ وہ آج اسلام کی ایسی خدمت کر رہے ہیں۔ جو کسی دوسری جماعت مسلمین سے بن نہیں پڑی۔ یعنی یورپ میں اسلام پھیلاتے ہیں۔ ملکانوں کو اشدھ ہونے سے روکتے ہیں۔ آریوں وغیرہ کے مقابلہ پر سینہ سپر ہوتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

ان کا یہ فخر اور منقبت اگرچہ سمجھدار مسلمان اس لئے تسلیم نہیں کرتے کہ جس چیز کی وہ اشاعت اور حمایت کرتے ہیں وہ صحیح اسلام نہیں ہے بلکہ یا تو وہ مرزا صاحب کی نبوت کی تبلیغ ہوتی ہے۔ اور یا مرزا صاحب کا ترمیم کیا ہوا اسلام جسے انہوں نے بہت سے اصول و فروع کاٹ کر نوجوانانِ یورپ یا،

یورپ کی وحی پر ایمان لانے والوں کے اہواء و ظنون کے سانچہ میں ڈھالا ہے۔

لیکن اس سے قطع نظر کر کے علی سبیل التنزل کہتا ہوں کہ ان کا یہ سب امتیاز اور خدمات اسلام کو تسلیم کرنے کے بعد بھی ان کا مومن اور ناجی ہونا ضروری نہیں ہے۔

صحیح مسلم کے ابواب الایمان میں اس شخص کا واقعہ پڑھیئے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہم رکاب جہاد میں تھا۔ اور اس نے وہ خدمت اور اعانت اسلام اور مسلمانوں کی کی تھی جس کا اعتراف صحابہؓ نے حضورؐ کی جناب میں ان الفاظ سے کیا:۔

ما اجزأ منا الیوم احد ما اجزأ فلانٌ ۔	آج کے دن ہم میں کوئی بھی ایسا کافی نہیں ہوا جیسا کہ فلاں آدمی ہوا ہے۔

مگر لسانِ نبوت سے باوجود ان خدمات جلیلہ کے ارشاد ہوا انہ من اھل النار یاد رکھو وہ دوزخی ہے۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ:۔

ان اللہ یؤید ھذا الدین بالرجل الفاجر	بیشک حق تعالیٰ اس دین کو مدد پہنچا دیتا ہے بدمعاش آدمی سے۔

اور جامع صغیر میں حدیث ہے کہ:۔

سیشد ھذا الدین برجال لیس لھم عند اللہ خلاق (السراج المنیر شرح جامع الصغیر ص ۲۳۲ ج ۲)	قریب ہے کہ اس دین کی تائید اور تقویت ایسے لوگوں کے ذریعہ سے ہو جائیگی جن کے لئے خدا کے یہاں حصہ نہیں۔

اور عبداللہ بن عمرؓ نے ایک ایسی جماعت کے متعلق جو قرآن کو اور رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کو سکھاتی تھی صرف قدر کا انکار کرتی تھی فرمایا:۔

اذا القیت اولئک فاخبرھم انی بریٔ منھم وانھم برآء منی والذی یحلف بہ عبد اللہ بن عمر لو ان لاحدھم مثل احد ذھبا فانفقہ ما قبل اللہ منہ حتی یؤمن بالقدر۔

جب تم ان سے ملو تو کہہ دو کہ میں (عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ) ان سے علیحدہ ہوں اور وہ ہم سے بے تعلق ہیں قسم ہے اس ذات کی جس کی عبد اللہ بن عمر قسم کھا سکتا ہے اگر ان میں سے کسی کے پاس احد (پہاڑ) کی برابر سونا ہو پھر وہ اسے خرچ کر ڈالے تب بھی اللہ تعالیٰ ہرگز اسے قبول نہیں کرے گا تاآنکہ وہ تقدیر پر ایمان لے آئے۔

ابوطالب سے بڑھ کر اسلام اور پیغمبر اسلام کی حمایت اور اعانت ایسی نازک ترین ساعت میں کس نے کی ہوگی لیکن وہ ساری خدمات اور جانبازیاں بھی اس کو ضحضاحِ نار سے نہ بچا سکیں۔

روایات بالا کو پڑھ کر کس کی ہمت ہے کہ قادیانیوں کی محض نام نہاد خدمات اسلامیہ کو دیکھ کر اُن کے مومن یا ناجی ہونے کا فتویٰ دیدے۔ اور ان کے عقائد کفریہ کی طرف کچھ التفات نہ کرے۔

عہد رسالت میں منافقین کا گروہ برابر اپنے کو مسلمان کہتا تھا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر قسمیں کھا کر گواہی دیتا تھا۔ اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھنے کا اظہار کرتا تھا۔ مسجدوں میں مسلمانوں کے ساتھ ان کے قبلہ کی طرف منہ کر کے نمازیں پڑھتا تھا اور ان کا ذبیحہ بھی کھاتا تھا۔ لیکن اس پر بھی اُن کو جھوٹا اور بے ایمان کہا گیا۔ اور مسلمانوں کو اُن کے مکائد سے بچتے

رہنے کی ہدایت کی گئی۔ کیونکہ ان کے دوسرے قرآئن واحوال اور مخاطبات سر بیان کے دعوائے ایمان کی تکذیب کرتے تھے۔ ولتعرفنھم فی لحن القول اور ان کا دل ایمان سے خالی تھا۔ اور وہ لوگ بھی ہمارے یہاں کے پنجابی نبی کی اُمت کی طرح اندر ہی اندر اسلام اور مسلمانوں کی جڑ کاٹتے رہتے تھے۔

فرق صرف اتنا ہے کہ پنجابی نبی اور اس کی امت نے تنگ ظرفی سے اسلام کے خلاف بعض عقائد کا اعلان بھی کر دیا اور اس لئے وہ منافق کے بجائے مرتد کے حکم کے تحت میں آگئے۔ اور امیر افغانستان ان کو منافقین کی سی مہلت نہ دے سکے۔ اگر قادیانی پارٹی منافقین میں شامل ہو کر افغانی حدود تعزیر سے بچنا چاہتی ہے تو اس کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ وہ جہاراً اپنے خبیث عقائد کا اقرار کرنا چھوڑ دے۔ پھر ان کے دلوں کا حال خدا کے اور یوم آخرت کے حوالہ کر دیا جائے گا۔ غالباً مرزا محمود نے جو مشورہ نعمت اللہ کے واقعہ کے بعد اپنی پارٹی کو دیا ہے اس میں اسی نفاق کی تعلیم کی طرف ایک قدم اٹھایا ہے۔

محمد علی صاحب کو بڑی فکر اس کی ہے کہ اگر علماء دیوبند قادیانیوں کو کافر بتلاتے ہیں تو سنیوں کو شیعہ اور شیعوں کو سنی۔ مقلدوں کو غیر مقلد اور غیر مقلدوں کو مقلد۔ علی ہذا القیاس دیوبندیوں کو بریلوی اور بریلویوں کو دیوبندی کافر قرار دیتے ہیں اس صورت میں تو کوئی مسلمان نہ رہے گا اور ایک دوسرے کو مرتد سمجھ کر قتل کر دیں گے۔

لیکن اوّل تو یہ دعویٰ ہی غلط ہے کہ ان میں سے ہر ایک فرقہ دوسرے کو کافر اور مرتد اور واجب القتل سمجھتا ہے۔ دوسرے واقعات آپ کے اس

خطرہ کی تردید کرتے ہیں کیا اسوقت تک افغانستان میں تین مرتد قتل نہیں کئے گئے۔ پھر بھی خدا کے فضل سے کوئی موقعہ ایسا پیش نہیں آیا کہ کوئی مسلمان محض فرضی جرم ارتداد پر کسی جگہ قتل کر دیا گیا ہو۔ اور اگر کسی جگہ آئندہ ایسا ہی کیا گیا تو آپ دیکھ لیں گے کہ اس کا خون بحول اللہ وقوتہ رنگ لائے بدوں نہیں رہیگا۔

محمد علی صاحب کو ایسا لکھتے وقت اسلام کے نام اور اپنی نام نہاد امامت کی شرم کرنی چاہیے۔ کیا وہ نہیں جانتے کہ مسلمان یہود و نصاریٰ کو اور وہ سب لوگ مسلمانوں کو کافر کہتے ہیں۔ تو کیا اس اختلاف کے وقت یہود و نصاریٰ کے کافر کہنے سے آپ کو اپنے مزعوم اسلام میں کچھ تردد ہو جاتا ہے یا آپ کے ہاتھ میں کوئی معیار ایسا دیا گیا ہے جس پر آپ اپنے اسلام اور ان کے کفر کو پرکھ سکتے ہیں۔

اسی طرح کیا قرآن و سنت نے کوئی معیار صحیح و محکم ہمارے ہاتھ میں ایسا، نہیں دیا کہ ہم مدعیانِ اسلام کے اختلاف کے وقت ہر ایک کے کفر و ایمان کو اس پر کس کر دیکھ لیں۔

تو صرف اتنا کہدینے سے کہ ہر ایک فرقہ دوسرے کو کافر و مرتد کہتا ہے یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ ان میں کوئی کافر و مرتد نہیں یا سارے کافر و مرتد ہی ہیں۔ (معاذ اللہ)

خدا نے اگر تم سے نور ایمان چھین لیا ہے تو کیا عام انسانوں کو جو نور فہم عطا ہوتا ہے وہ بھی سلب کر لیا گیا ہے۔ تم کو بڑا غیظ ہے کہ جب مرزائی افغانستان میں قتل کئے جاتے ہیں تو بابی اور بہائی شاہ ایران اور ترکوں کے حکم سے کیوں قتل نہیں کئے جاتے۔ یہ سوال یا تو آپ کو کب ہند والے سید محفوظ الحق سے کیجئے۔ اور یا شاہ ایران اور ترکی پالیمنٹ سے اور یا ان ملعونین مرحومین سے جو کابل کے قلمرو میں اس علم کے بعد

کہ وہاں خالص اسلامی حدود و تعزیر کی تلوار چمکتی رہتی ہے ارتداد کا جھنڈا اٹھا کر گئے اور انجام کار آخرت سے پہلے دنیا میں بھی ان کو حق تعالیٰ کے غضب و انتقام کا مورد بننا پڑا۔

کیا اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے؟

اب میں دوسرے مسئلہ کی طرف آتا ہوں وہ یہ کہ اسلام میں مرتد کی سزا کیا ہے اور افغانستان کا فعل کس حد تک اصل قانون اسلام پر منطبق ہو سکتا ہے۔

اسلامی اصول کے موافق کسی مسئلہ شرعی کے اثبات کیلئے چار دلیلیں ہو سکتی ہیں۔ کتاب اللہ، سنت رسول اللہ، اجماع مجتہدین، قیاس و استنباط۔

اگرچہ یہ ضروری نہیں کہ ہر مسئلہ کا ثبوت چاروں طریقوں سے ہو۔ اور نہ ہر ایک دلیل ہر مسئلہ میں کارآمد ہو سکتی ہے تاہم مسئلہ زیر بحث (قتل مرتد) میں اتفاق سے چاروں دلیلیں جمع ہو گئی ہیں۔

چونکہ بار ہا کہا گیا ہے کہ قتل مرتد کا ثبوت قرآن کریم سے پیش کرو (حالانکہ مرزا صاحب کی نبوت جس کے نہ ماننے سے مسلمان خارج از اسلام ہو جاتے ہیں۔ قرآن، حدیث اجماع وغیرہ سب کو چھوڑ کر صرف ایک دو صوفیوں کی ناتمام عبارتوں سے ہی ثابت ہو جاتی ہے) اس لئے ہم نے بہمہ وجوہ اتمام حجت کے لئے مناسب سمجھا ہے کہ اولاً مرتد کے بارہ میں قرآن ہی کا فیصلہ سنایا جائے۔

مرتدین کے حق میں قرآن کا فیصلہ

یوں تو قرآن کریم کی بہت سی آیات ہیں جو مرتد کے قتل پر دلالت کرتی

لیکن ایک واقعہ جماعتِ مرتدین کے بحکم خدا قتل کئے جانے کا ایسی تصریح اور ایضاح کے ساتھ قرآن میں مذکور ہے کہ خدا سے ڈرنے والوں کے لئے اس میں تاویل کی ذرا گنجائش نہیں۔ نہ وہاں محاربہ ہے۔ نہ قطع طریق۔ نہ کوئی دوسرا جرم۔ صرف ارتداد اور تنہا ارتداد ہی وہ جرم ہے جس پر حق تعالیٰ نے ان کے بیدریغ قتل کا حکم دیا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی برکت سے بنی اسرائیل کو جب خدا نے فرعون کی غلامی سے نجات دی۔ اور فرعونیوں کی دولت کا مالک بنا دیا۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک ٹھہرے ہوئے وعدہ کے موافق حضرت ہارون کو اپنا خلیفہ بنا کر کوہ طور پر تشریف لے گئے جہاں آپ نے چالیس راتیں خدا کی عبادت اور لذتِ مناجات میں گزاریں۔

اور توراۃ شریف آپ کو عطا کی گئی۔

ادھر تو یہ ہو رہا تھا اور اُدھر سامری کی فتنہ پردازی نے بنی اسرائیل کی ایک بڑی جماعت کو آپ کے پیچھے راہ حق سے ہٹا دیا۔ واضلھم السامری یعنی سونے چاندی کا ایک بچھڑا بنا کر کھڑا کر دیا جس میں کچھ بے معنی آواز بھی آتی تھی۔ بنی اسرائیل جو کئی صدی تک مصری بت پرستوں کی صحبت بلکہ غلامی میں رہے تھے۔ اور جنہوں نے عبور بحر کے بعد بھی ایک بت پرست قوم کو دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ بیہودہ درخواست کی تھی کہ:۔

اجعل لنا الٰھا کما لھم الھۃ — ہمارے لئے بھی ایسا ہی معبود بنا دیجئے جیسے ان کے معبود ہیں۔

وہ سامری کے اس بچھڑے پر مفتون ہو گئے۔ اور یہاں تک کہہ گزرے کہ یہی، تمہارا اور موسیٰ کا خدا ہے جس کی تلاش میں موسیٰ بھول کر ادھر اُدھر پھر رہے ہیں۔

حضرت ہارون علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کی جانشینی کا حق ادا کیا اور اس کفر و ارتداد سے باز آ جانے کی ہدایت کی۔

یا قوم انما فتنتم بہ وان ربکم الرحمٰن فاتبعونی واطیعوا امری	اے لوگو تم اس بچھڑے کے سبب فتنہ میں ڈالدیئے گئے حالانکہ تمہارا پروردگار تو رحمٰن ہے تو تم میری پیروی کرو اور میری بات مانو

لیکن وہ اپنی اسی سخت مرتدانہ حرکت پر جمے رہے۔ بجائے توبہ کے یہ کہا کہ:۔

لن نبرح علیہ عاکفین حتی یرجع الینا موسیٰ۔	ہم برابر اپنے اس فعل پر جمے رہیں گے یہاں تک کہ خود موسیٰ ہماری طرف واپس آویں۔

ادھر حضرت موسیٰ کو پروردگار نے اطلاع کی کہ تیری قوم تیرے پیچھے فتنہ ارتداد میں پڑ گئی۔ وہ غصہ اور غم میں بھرے ہوئے آئے۔ اپنی قوم کو سخت سست کہا، حضرت ہارونؑ سے بھی باز پرس کی۔ سامری کو بڑے زور سے ڈانٹا۔ اور ان کے بنائے ہوئے معبود کو جلا کر راکھ کر دیا اور دریا میں پھینک دیا۔

یہ سب ہوا لیکن اُن مرتدین کی نسبت خدا کا کیا فیصلہ رہا جنہوں نے موسیٰ کے پیچھے گوسالہ پرستی اختیار کر لی تھی تو دنیا میں تو ان کیلئے خدا کا فیصلہ یہ تھا:۔

ان الذین اتخذوا العجل سینالھم غضب من ربھم وذلۃ فی الحیٰوۃ الدنیا وکذٰلک نجزی المفترین	جنہوں نے بچھڑے کو معبود بنایا ضرور ان کو دنیا میں ذلت اور خدا کا غضب پہنچ کر رہے گا۔ اور مفترین کو ہم ایسی ہی سزا دیتے ہیں۔

اور اس غضب و ذلت کے اظہار کی صورت عباد عجل کے حق میں یہ تجویز ہوئی جو سورۂ بقرہ میں ہے:۔

انکم ظلمتم انفسکم باتخاذکم العجل	اے قوم بنی اسرائیل تم نے بچھڑے کو معبود بنا کر اپنی جانوں

فتوبوا الیٰ بارئکم فاقتلوا انفسکم | پر ظلم کیا تو اب خدا کی طرف رجوع کرو پھر اپنے آدمیوں کو قتل کرو

اور فاقتلوا انفسکم میں انفسکم کے معنی وہی ہیں جو ثم انتم ھٰؤلاء تقتلون انفسکم میں ہیں۔ اور قتل کو اپنے اصلی اور حقیقی معنے سے (جو ہر طرح کے قتل کو خواہ لوہے سے ہو یا پتھر سے شامل ہے) پھیرنے کی کوئی وجہ موجود نہیں بلکہ، غضب اور ذلت فی الحیوٰۃ الدنیا اس کے نہایت ہی مناسب ہے اور یہی غضب کا لفظ دوسری جگہ تمام مرتدین کے حق میں بھی آیا ہے۔ جیسا کہ فرماتے ہیں۔ من کفر باللہ من بعد ایمانہٖ الا من اکرہ وقلبہ مطمئن بالایمان ولکن من شرح بالکفر صدرا فعلیہم غضب من اللہ ولہم عذاب عظیم (نحل)

اس حکم کا نتیجہ جیسا کہ روایات میں ہے یہ ہوا کہ کئی ہزار آدمی جرم ارتداد میں خدا کے حکم سے موسیٰ علیہ السلام کے سامنے قتل کئے گئے۔ اور صورت یہ ہوئی کہ قوم میں سے جن لوگوں نے بچھڑے کو نہیں پوجا تھا ان میں سے ہر ایک نے اپنے اس عزیز و قریب کو جس نے گوسالہ پرستی کی تھی اپنے ہاتھ سے قتل کیا اور جیسا کہ بعض روایات میں آیا ہے قاتلین کا اپنے عزیزوں کو اپنے ہاتھوں سے قتل کرنا یہ اس کی سزا تھی کہ انہوں نے اپنے آدمیوں کو ارتداد سے روکنے میں کیوں تساہل کیا۔

ولما سقط فی ایدیہم وراوا انہم قد ضلوا قالوا لئن لم یرحمنا ربنا و یغفر لنا لنکونن من الخاسرین۔ | اور جب وہ نادم ہوئے اور معلوم کر لیا کہ وہ رستہ سے بھٹک گئے ہیں تو کہنے لگے کہ ہمارا پروردگار ہم پر رحم نہ فرمائیگا اور ہمکو نہ بخشیگا تو ہم ضرور خسارہ اٹھانیوالوں میں سے ہونگے

لیکن اس توبہ نے بھی ان کو دنیا کی عقوبت سے نہیں بچایا۔ جیسا کہ اب بھی بعض اقسام مرتد کے متعلق علماء کا یہی فتویٰ ہے کہ وہ توبہ کے بعد بھی حداً قتل

کیا جائے گا۔ خواہ توبہ آخرت کے عذاب کو اس سے اٹھا دے۔

اسی طرح گوسالہ پرستوں سے بھی اگرچہ دنیا میں خدا کی تعزیر ساقط نہیں ہوئی لیکن قتل کئے جانے کے بعد خدا نے احکام اخروی کے اعتبار سے ان کی توبہ کو قبول فرمایا۔ اور ان قاتلین کی بھی جنہوں نے اپنے اقرباء کے ارتداد کے معاملہ میں مداہنت کی تھی۔

ذلکم خیر لکم عند بارئکم فتاب علیکم انہ ھو التواب الرحیم | یہ تمہارے خالق کے یہاں تمہارے حق میں بہتر ہے پھر خدا نے انکی توبہ قبول کر لی کیونکہ وہ توبہ قبول کرنیوالا مہربان ہے،

محمد علی صاحب جن کی تفسیر پر مرزائیوں کو بڑا ناز ہے لکھتے ہیں کہ سینالھم غضب من ربھم وذلۃ فی الحیوٰۃ الدنیا وکذالک نجزی المفترین کے بعد والذین عملوا السیئات ثم تابوا من بعدھا وآمنوا ان ربک من بعدھا لغفور الرحیم واقع ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ توبہ کے بعد جرم معاف ہو جاتا ہے۔

لیکن ان کو یاد رکھنا چاہئے کہ جو مرتد توبہ کے بعد بھی حداً یا تعزیراً قتل کیا جائے جیسا کہ عباد عجل کئے گئے۔ اس کے حق میں یہ معافی کی آیت ایسی ہے جس طرح سارق کے بارہ میں والسارق والسارقۃ فاقطعوا ایدیھما جزاءً بما کسبا نکالاً من اللہ واللہ عزیز حکیم کے بعد فمن تاب من بعد ظلمہ واصلح فان اللہ یتوب علیہ ان اللہ غفور رحیم ہے اس کی معافی کی طرف اشارہ ہے اگرچہ سرقہ کی سزا دنیا میں اس سے ساقط نہیں ہوتی۔

الحاصل واقعہ عجل سے یہ بات بخوبی واضح ہو گئی کہ مرتدین کی ایک جماعت کو جس کی تعداد ہزاروں سے کم نہیں تھی حق تعالیٰ نے محض ارتداد کے جرم میں نہایت

اور ذلت کے ساتھ قتل کرایا۔ اور ارتداد بھی اس درجہ کا قرار دیا گیا کہ توبہ بھی انکو خدائی سزا سے محفوظ نہ کر سکی۔ بلکہ توبہ کی مقبولیت بھی اسی صابرانہ مقتولیت پر مرتب ہوئی، کہا جا سکتا ہے کہ یہ واقعہ موسوی شریعت کا ہے۔ امتِ محمدیہ کے حق میں اس سے تمسک نہیں کیا جا سکتا لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ پہلی امتوں کو جن شرائع اور احکام کی ہدایت کی گئی ہے اور قرآن نے ان کو نقل کیا ہے وہ ہمارے حق میں بھی معتبر ہیں اور ان کی اقتدا کرنے کا امر ہم کو بھی ہے جب تک کہ خاص طور پر ہمارے پیغمبر یا ہماری کتاب اس حکم سے ہم کو علٰحدہ نہ کر دیں۔

چند انبیاء و مرسلین کے تذکرہ کے بعد جن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی ہیں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہوا ہے کہ:۔

اولئك الذين هدى الله فبهداهم اقتده	یہ وہ لوگ ہیں جن کو خدا نے ہدایت کی تو آپ بھی ان کی ہدایت پر چلئے۔

یہ خطاب فی الحقیقت ہم کو سنانا ہے۔ خود محمد علی صاحب اپنی تفسیر میں، لکھتے ہیں کہ "قرآن شریف میں کسی انسان کا ذکر ہو یا کسی قوم کا سب مسلمانوں کی تعلیم کیلئے ہے (بیان القرآن) پس اسی قاعدے سے بنی اسرائیل کے مرتدین کو قتل کئے جانے کے حکم میں بھی تعلیم ہم ہی مسلمانوں کو ہوگی۔

مرتد کا فیصلہ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے

خصوصاً جب کہ دوسری آیات کی معیت میں خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا عام و تمام فیصلہ بھی (جو لتبین للناس ما نزل الیھم کے تحت میں داخل

ہے) یہی ہو اکہ:۔

من بدل دينه فاقتلوه (صحیح بخاری)	جو اپنا دین بدلے اسے قتل کر دو

محمد علی صاحب نے بخاری کی اس حدیث کے ساتھ خوب ٹھٹھا کیا ہے اور اس طرح اپنے دل کی گندگی کو اور بڑھایا ہے۔

کہتے ہیں کہ یہاں دین سے کیا مراد ہے۔ کیا ہر ایک دین کو بدلنے والا واجب القتل ہے تو یہودی سے کوئی نصرانی بنے یا ہندو سے عیسائی وہ بھی واجب القتل ہوگا۔

کیا محمد علی صاحب ایمان سے کہہ سکتے ہیں کہ جب وہ یہ لکھ رہے تھے خود ان کا ضمیر اندر سے ان پر لعنت نہیں کر رہا تھا؟ کیا واقعی طور پر وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے کسی ایک لفظ کا بھی کوئی ایسا مطلب لینا جائز سمجھتے ہیں جس سے یہ لازم آتا ہو کہ ہر شخص جو اپنا پرانا مذہب چھوڑ کر اسلام میں آتا جائے اسے تم قتل کرتے جاؤ۔ یہاں تو آپ معنی ڈالنے میں سوامی دیانند سے بھی گوئے سبقت لے گئے۔

جس وقت آپ کے دل میں یہ سوال آیا تھا کہ حدیث میں جو مسلمانوں کو خطاب ہے من بدل دینہٗ فاقتلوہ اس میں کونسا دین خدا کے رسول کی مراد ہے تو اس کے جواب میں قرآن کی آواز پر کان دہرا ہوتا۔ جو کہتا ہے کہ:۔

ان الدين عند الله الاسلام و من يبتغ غير الاسلام دينا فلن يقبل منه	بلا شبہ دین تو اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے اور جو کوئی اسلام کے سوا اور دین کی تلاش کرے تو وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔

مگر آپ کے دل میں تو وہ خدا کا دین ہے ہی نہیں اس لئے آپ مجبور ہیں کہ کافروں کے دین کی طرف جائیں۔ الاناء یترشح بما فیہ۔

بہر حال حدیث صحیح نے مرتد کے معاملہ میں خواہ وہ بر سر پیکار ہو یا نہ ہو فیصلہ کر دیا کہ وہ واجب القتل ہے۔ اور لطیفہ یہ ہے کہ حضور نے کمالِ بلاغت سے من ارتدعن دینہ نہیں فرمایا کہ شاید کسی کو شبہ ہوتا کہ یہ صرف اس کے حق میں ہے جو مثلاً یہودیت وغیرہ کسی مذہب باطل کو چھوڑ کر اسلام میں آیا تھا پھر ادھر ہی لوٹ گیا بلکہ من بدل دینہ فرمایا کہ واجب القتل ہونے کے لئے خدائی دین کو تبدیل کرنا کافی ہے ضرورت نہیں کہ جس مذہب سے آیا تھا اس میں لوٹ کر جائے۔

خدائے عزوجل اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم

دونوں کا فیصلہ مرتد کے متعلق

یہاں تک تو آپ نے مرتد کے بارہ میں خدا اور رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم کا الگ فیصلہ سنا۔ اب یک جائی بھی سن لیجئے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یمن کا علاقہ تقسیم کر دیا تھا۔ دونوں اپنے اپنے حلقہ میں کام کرتے تھے ایک دفعہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کے پاس بغرض ملاقات آئے دیکھا کہ ایک شخص ان کے پاس بندھا کھڑا ہے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ مرتد ہے یعنی پہلے یہودیت سے اسلام لایا۔ پھر یہودی بن گیا۔ حضرت ابوموسیٰؓ نے معاذؓ سے کہا کہ تشریف رکھئے۔ انہوں نے فرمایا نہیں۔ میں اسوقت تک نہ بیٹھوں گا جب تک یہ قتل نہ کر دیا جائے تین مرتبہ یہی گفتگو ہوئی۔ معاذ بن جبلؓ نے فرمایا قضاء اللہ ورسولہ یعنی یہ اللہ کا اور اس کے رسول

کا فیصلہ ہے۔ چنانچہ وہ قتل کر دیا گیا۔ (صحیح بخاری)

زنادقہ کے متعلق حضرت علیؓ کا فیصلہ

یہ تو آپ نے ان دو صحابیوں کا ذکر سنا جو غالباً آپ کے خیال میں علماء دیوبند سے بھی زیادہ تنگ نظر ہوں گے۔ اب نبی کے چوتھے خلیفہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی (بقول آپ کے) تنگ نظری بھی ملاحظہ کیجئے۔

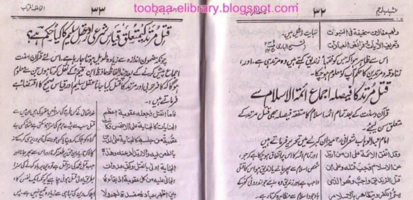
عن عکرمۃ قال اُتی علی بزنادقۃ فاحرقھم فبلغ ذالک ابن عباس فقال لو کنت انا لم اُحرقھم لنھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تعذبوا بعذاب اللہ ولقتلتھم لقول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من بدّل دینہ فاقتلوہ (صحیح بخاری)

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے پاس چند زنادقہ لائے گئے انہوں نے ان کو جلا دیا۔ یہ خبر ابن عباسؓ کو پہنچی انہوں نے فرمایا کہ اگر میں ہوتا تو ان کو جلاتا نہیں کیونکہ رسول اللہ ؐ نے فرمایا کہ اللہ کے عذاب (آگ) سے کسی کو سزا مت دو البتہ میں ان کو قتل کرتا کیونکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو اپنا دین تبدیل کرے اسکو قتل کر دو۔

حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں روایات نقل کی ہیں جن میں تصریح ہے کہ یہ زنادقہ مرتدین تھے۔ پھر بعض علماء کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:۔

ومن الزنادقۃ الباطنیۃ وھم قوم زعموا ان اللہ خلق شیئاً ثم خلق منہ شئ آخر فدبر العالم باسرہ ویسمونھا العقل و النفس الی قولہ

اور زنادقہ میں ہی سے باطنیہ فرقہ ہے ان کے خیالات تخلیق عالم کی نسبت نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ (نبوت اور تحریف آیات وعبادت میں ان کے اقوال



ولھم مقالات سخیفۃ فی النبوات وتحریف الآیات وفرائض العبادات

نہایت ذلیل ہیں۔ (نسیم الباری ج ۲۳ ص ۱۲)

اس سے ظاہر ہوا کہ جس کو فقہاء زندیق کہتے ہیں وہ مرتد ہی ہے۔ اور زنادقہ و مرتدین کا حکم آپ کو معلوم ہو چکا۔

قتل مُرتد کا فیصلہ اجماع ائمۃ الاسلام سے

قرآن وسنت کے بعد تمام ائمہ اسلام کا متفقہ فیصلہ بھی قتل مرتد کے متعلق سن لیجئے۔

امام عبدالوہاب شعرانی رح میزان کبرٰے میں تحریر فرماتے ہیں

وقد اتفق الائمۃ علی ان من ارتد عن الاسلام وجب قتلہ وعلی ان قتل الزندیق واجب وھو الذی یسترالکفر ویتظاھر بالاسلام

اور تمام ائمہ کا اس پر اتفاق ہو چکا ہے کہ جو شخص اسلام سے پھر جائے یا زندیق ہو اس کا قتل واجب ہے اور زندیق وہ ہے جو اندرونی کفر کے باوجود اسلام سے مظاہرہ کرتا ہے۔

اس عبارت کو پڑھ کر یہ آیت بھی تلاوت فرمائیے۔

ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبین لہ الھدٰی ویتبع غیر سبیل المومنین نولہ ما تولی ونصلہ جھنم وساءت مصیرا۔

اور جس کسی نے رسول کی مخالفت کی ہدایت ظاہر ہو جانے کے بعد اور مومنین کے راستہ کے سوا کسی اور راستہ پر چلا تو ہم اس کو حوالہ کریں گے اس چیز کے جس کو وہ اختیار کرتا ہے اور داخل کریں گے دوزخ میں اور وہ برا ٹھکانا ہے۔

قتل مُرتد کے متعلق قیاس شرعی اور عقل سلیم کا کیا حکم ہے؟

چونکہ مضمون اندازہ سے زیادہ طویل ہوتا جا رہا ہے۔ اس لئے قرآن، سنت اجماع پیش کرنے کے بعد چند الفاظ حافظ ابن قیم رح کے نقل کرتا ہوں جن سے معلوم ہوگا کہ کافر حربی اور مرتد کا قتل کیا جانا عقل سلیم اور قیاس صحیح کا اقتضاء ہے فرماتے ہیں:۔

فاما القتل فجعلہ عقوبۃ اعظم الجنایات کالجنایۃ علی الانفس فکانت عقوبتہ من جنسہ کالجنایۃ علی الدین بالطعن فیہ والارتداد عنہ وھذہ الجنایۃ اولی بالقتل وکف عدوان الجانی علیہ من کل عقوبۃ اذ بقاؤہ بین اظھر عبادہ مفسدۃ لھم ولا خیر یرجی فی بقائہ ولا مصلحۃ فاذا احبس شرہ وامسک لسانہ وکف اذاہ والتزم الذل والصغار وجریان احکام اللہ ورسولہ واداء الجزیۃ لم یکن فی بقائہ بین اظھر المسلمین ضرر علیھم والدنیا بلاغ ومتاع الی حین

خدا تعالیٰ نے کس طرح کی سزائیں مقرر کی ہیں ان میں سے قتل سب سے بڑے جرم کی سزا ہو سکتی ہے مثلاً کسی بے گناہ کو ہلاک کر دینا یا کسی عورت کی آبروریزی کر کے منہ کالا کرنا یا دین حق پر طعنہ کرنا اور اس سے پھر جانا اور جب قتل عمد کی سزا قتل ہے تو دین برباد کرنے کی سزا بطریق اولیٰ قتل ہونی چاہیے کیونکہ ایک نفس کا ہلاک دین کی تباہی سے زیادہ قبیح نہیں ہے۔ پس اس شخص کا وجود جو دین حق پر طعن کر کے یا اس سے پھر جائے مسلمانوں کی جماعت کے اندر بڑی خرابی کا باعث ہے۔ جس کے باقی رکھنے میں کسی نیکی اور بہتری کی امید نہیں کیا سکتی ہاں اگر وہ طعن کرنے والا اپنی زبان کو روک لے اور اپنی شرارت سے باز رہے اور مسلمانوں کو دکھ نہ دے اور ذلیل وخوار اور خدا

وجعلہ ایضاً عقوبۃ الجنایۃ علی الفروج المحرمۃ لما فیہا من المفاسد العظیمۃ واختلاط الانساب والفساد العام۔

اور رسول کے احکام کے سامنے پست ہو کر رہنا پسند کرے تو اس چند روزہ زندگی میں اس کے لئے گنجائش ہے۔ (اعلام الموقعین جلد ۲ ص ۲۱۸)

یہاں تک ہم نے ادلۂ اربعہ سے قتل مرتد کا بقدر کفایت ثبوت پیش کر دیا، ہے اور اگر ضرورت محسوس ہوئی تو آئندہ اس کی مزید تشریح کی جائے گی۔

یہ بات رہ گئی ہے کہ بعض لوگوں نے قرآن کی وہ آیات پیش کی ہیں جنمیں مرتد کے اعمال حبط ہونے یا ان پر لعنت برسنے یا آخرت میں غضب اور عذاب ہونے کا ذکر ہے ان آیات میں ساتھ ہی ساتھ اس کے قتل کئے جانے کا حکم مذکور نہیں۔

لیکن اس میں تو غالباً مرزائیوں کو بھی تردد نہ ہوگا کہ قتل عمد کی سزا اسلام میں قتل ہے پر حق تعالیٰ نے جس جگہ قرآن میں یہ فرمایا ہے:۔

ومن یقتل مومنا متعمدا فجزاؤہ جہنم خالدا فیہا وغضب اللہ علیہ ولعنہ واعد لہ عذابا عظیما۔

اور جو شخص کسی مسلمان کو عمداً قتل کریگا تو آخرت میں اسکی سزا جہنم ہوگی جس میں ہمیشہ رہنا ہوگا اور اس پر اللہ غضب اور لعنت کریگا اور ایسے شخص کے لئے خدا نے عذاب عظیم تیار کر رکھا ہے۔

تو اس کا بدلہ صرف یہ قرار دیا ہے کہ اس کو دوزخ میں خلود ہوگا۔ اور اللہ کا غضب اور اس کی لعنت اس پر ہے اور خدا نے اس کے لئے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ تو کیا اس جگہ صرف اخروی سزا مذکور ہونے سے مرزائیوں کے مایۂ ناز مفسر کے، نزدیک قاتل کو بھی دنیا میں آزاد چھوڑ دیا جائے گا۔ اگر یہی آپ کی قرآن فہمی اور نکتہ سنجی کو اپنے نام نہاد اسلام اور اس کے فلسفہ کو آپ دنیا میں خوب نیک

نام کریں گے۔

اور اگر آپ قاتل کی نسبت فیصلہ کرنے میں آیت مذکورہ کے ساتھ قرآن کی دوسری آیات کو بھی ملاتے ہیں تو مرتد کے متعلق فیصلہ کرتے وقت ایسا، کرنے سے کیا چیز مانع ہے۔

آپ کتنی ہی کوشش کیجئے اور احادیث و آثار سے بھاگ کر قرآن کی پناہ لیجئے۔ مگر قرآن آپ کو ضرور دھکے دے گا۔ اور آپ کے حیل فاسدہ کے منہ پر طمانچے ماریگا۔ کیونکہ رسول سے بھاگنے والے کیواسطے خدا کے یہاں کوئی پناہ نہیں ہے۔

مرتد کی نسبت اسلامی حکومت کا فیصلہ

قرآن، حدیث، اجماع، قیاس کے فیصلوں کے بعد ایک خالص اسلامی حکومت (افغانستان) کا فیصلہ بھی وہی ہونا تھا جو ہوا۔

لیکن جب سے دولت علیہ افغانیہ کی سب سے بڑی شرعی عدالت نے نعمت اللہ قادیانی کو اس کے ارتداد کے جرم میں نہایت ذلت اور رسوائی کے ساتھ قتل کرایا ہے مرزائی امت نے اس خالص اسلامی قانون کی تنفیذ اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ایک محکم سنت کے احیاء کے خلاف سخت شور و ہنگامہ بپا کر رکھا ہے۔ کبھی وہ افغانستان کے مقابلہ پر امریکہ اور یورپ کو ابھارتے ہیں۔ کبھی ہندوؤں سے فریاد کرتے ہیں کبھی آزاد منش لیڈروں کو اکسانا چاہتے ہیں۔ اور سب سے آخر میں رائے عامہ سے اپیل کی جاتی ہے۔

لیکن ان کو یاد رکھنا چاہئے کہ قتل مرتد کا قانون نہ تو یورپ و امریکہ کی حکومتوں

کا بنایا ہوا ہے اور نہ کانگریس یا کسی اور دنیوی انجمن کی منتظمہ کمیٹی سے اس کی منظوری میں رائے لی گئی ہے اور نہ ہی پبلک کے غوغائے عام یا ووٹروں کی کثرت کو اس کے پاس کئے جانے میں کچھ دخل ہے۔

وہ تو آسمانی فیصلہ ہے جو خدا کے ان وفادار بندوں کے ہاتھوں سے نفاذ پذیر ہوتا ہے۔ جن کی نسبت قرآن حکیم میں یہ ارشاد ہوا ہے:۔

فسوف یاتی اللہ بقوم یحبھم و یحبونہ اذلۃ علی المؤمنین اعزۃ علی الکافرین یجاھدون فی سبیل اللہ ولایخافون لومۃ لائم ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء	تو قریب ہے کہ خدا لائیگا ایک ایسی قوم کو جنکو وہ محبوب رکھتا ہے اور وہ خدا کو محبوب رکھتی ہے کہ کافروں کے مقابلہ میں غالب اور مومنین کے سامنے خاکسار جو جہاد کریگی خدا کے راستہ میں اور کسی ملامت کرنیوالے کی ملامت سے نہ ڈرے گی یہ خدا کا فضل ہے جسکو چاہے دے

اور وہ ایک فرمانِ رسالت ہے جس کا امتثال ان ہی سعید روحوں کا حصہ ہے جن کو حق تعالیٰ نے اپنے باغیوں کی سرکوبی کے لیے سارے جہان میں سے چن لیا ہے اور جن کو اس نے محض اپنے افضال سے اشداء علی الکفار رحماء بینھم کا تمغہ مرحمت فرمایا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ اس دورِ فتن میں جب کہ الحاد اور لامذہبیت کی رَو کے، خلاف کوئی کام کرنے کی بہت ہی کم جرأت ہو سکتی ہے۔ اعلیٰ حضرت امیر غازی ایداللہ بعونہ ونصرہ نے اس سنت سنیہ کو زندہ کر کے بارگاہِ الٰہی اور قلوب مومنین میں وہ عزت پیدا کر لی ہے جو انسانوں کی دی ہوئی اور بادشاہوں کی تسلیم کی ہوئی عزتوں سے بالاتر ہے۔ قاعدہ ہے کہ جو شخص جس گورنمنٹ کے،

کے قانون کو قبول کرتا اور اس کی حمایت کرتا ہے اس کی پشت پر اس گورنمنٹ کی ساری طاقت ہوتی ہے۔ پس ضرور ہے کہ جو بادشاہ خدائی قانون کی حمایت اور تنفیذ کرے خدائی طاقت اسکی حامی اور سرپرست ہو۔ اور اسی لئے ہم کو یقین رکھنا چاہئے کہ اعلیٰ حضرت امیر غازی جس وقت تک قانون الٰہی کو بلا خوف، لومۃ لائم اپنا دستور العمل بنائے رہیں گے خدائی طاقت ان کو ہر شیطانی طاقت کے مقابلہ میں مظفر و منصور کرے گی۔ فان اللہ ھو مولاہ وجبریل وصالح المؤمنین والملائکۃ بعد ذالک ظھیر۔

آج تاجدار افغانستان نے اقامت حدود والٰہیہ سے قرن صحابہ کی یاد تازہ کر دی۔ اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک کو خوش کرنے میں اس بات کی کچھ پرواہ نہیں کی کہ دنیا ان کو وحشی سمجھے گی یا جاہل۔

انہوں نے بڑی دلیری کے ساتھ اسلام کے حقیقی حسن و جمال اور قدرتی سادگی و خوبصورتی سے پردہ اٹھا دیا۔ اور اس نے بناوٹی خوب صورتی اور مصنوعی رنگ و روپ سے اس کو بے نیاز ثابت کر دیا جس میں اسلام کے نادان دوست یا دانا دشمن اسے پیش کر رہے تھے۔

امیر کابل جیسے خالص خود مختار اسلامی فرماں روا سے اسلام کی یہ خدمت کچھ زیادہ عجیب نہیں لیکن تعجب اور تعجب سے زیادہ مسرت ہم کو اس بات پر ہے کہ غلام ہندوستان کے اسلامی اخباروں کو جن میں معزز زمیندار اور سیاست خصوصیت سے قابل ذکر ہیں حق تعالیٰ نے ایسی سیدھی سمجھ اور مؤمنانہ جرأت اور صراط مستقیم پر چلنے کے لئے بصیرت کی وہ روشنی عطا فرمائی ہے جس نے حضرت

محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے اسلام کی اصلی ہیئت اور فتنہ عظیمہ مرزائیت کے کفریات اور بدنتائج کا مشاہدہ کرنے کے لئے غافلوں اور بے خبروں کی آنکھوں کے سامنے اجالا کر دیا ہے۔

مسلمان قوم کے حق میں یہ بڑی مبارک فال ہے کہ اس مؤقر اخبار تجارتی مقاصد اور لومۃ لائمین کی پرواہ نہ کر کے ٹھیک ٹھیک اسلامی تعلیمات لوگوں کے سامنے پیش کریں اور ان کی حمایت پر علیٰ وجہ البصیرت کمر بستہ ہوں۔

ان اخباروں کی روش افغانستان کے اس فعل کی تائید و تحسین میں حق پرست مسلمانوں پر یہ ثابت کر رہی ہے کہ یہ اخبار محض کسب زر کا آلہ نہیں بلکہ اسلام کے بہترین خادم ہیں۔ جو چاہتے ہیں کہ حد سے بڑھے ہوئے آزاد مسلمانوں کے جذبات و محسوسات کی ٹرین کو کچھ پیچھے ہٹا کر اسی سیدھی لائن پر کھڑا کر دیں جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ نے عرب کی زمین پر بچھائی تھی۔

لاہوری پارٹی کے امیر محمد علی صاحب، تو لکھتے ہیں کہ افغانستان کے اس فعل نے اسلام کی ترقی کو دس برس پیچھے ڈال دیا۔ مگر میں انہیں خوشخبری سناتا ہوں کہ دس برس نہیں۔ اُس نے اولوالامر مسلمانوں کو نہایت ہی مہلک آزادی کی طرف ترقی کرنے سے تیرہ سو سال پیچھے ہٹا دیا ہے۔

مرزائیوں کو بڑی فکر ہے کہ افغانستان کا یہ فعل جب اسلام کی طرف منسوب ہوگا تو غیر مسلم قومیں اسلام سے نفرت کرنے لگیں گی۔ اور یہ سمجھ جائیں گی کہ اسلام صرف تلوار کے زور سے قائم رکھا جا سکتا ہے۔ اور یہ ایک بڑی روک اشاعت اسلام کے راستہ میں ہوگی۔

لیکن قرون اولیٰ کا تجربہ ہم کو یہ بتلاتا ہے کہ حبب صدیق اکبرؓ اور دوسرے خلفاءؓ کے عہد میں ارتداد کا فیصلہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے حکم کے موافق تلوار کی نوک سے کیا جاتا تھا حتیٰ کہ بعض اوقات سرزمین عرب کا وسیع رقبہ، مرتدین کے خون سے رنگین ہوگیا اسوقت اشاعت اسلام کی رفتار ترقی اس قدر سریع اور حیرت میں ڈالنے والی تھی کہ جسے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ایک عظیم الشان معجزہ کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

جیسا کہ تھوڑی دیر پہلے میں ثابت کر چکا ہوں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے حکم مَن بدل دینہ فاقتلوہ کی تعمیل میں ایک لمحہ کا توقف بھی روا نہ رکھتے تھے لیکن مرزائیوں کے لئے یہ کس قدر تعجب اور غصہ کا مقام ہوگا کہ ان ہی صحابہ کے عہد میں بے شمار کفار اسلام سے بدگمان ہوئے اور نہ انہوں نے حاملین اسلام سے نفرت کی۔ بلکہ وہ یہ دیکھ کر مسلمان حکمرانوں کے زیر سایہ جہاں تمام یہود و نصاریٰ اور دوسری غیر مسلم اقوام اس طرح آزادانہ زندگی بسر کرتے اور اپنے مذہبی وظائف کو بلا روک ٹوک بجالاتی ہیں۔ کسی مرتد کا بے دریغ قتل کیا جانا اس بات کی دلیل ہے کہ مسلمان صرف ایک ہی چیز کے خواہاں ہیں اور وہ یہ کہ ان کے دین میں زہریلے جراثیم کی تولید نہ ہونے پائے۔ اور کبھی ہو جائے تو اس کو ترقی اور تعدیہ کا موقع نہ ملے۔ جراثیم ارتداد کا فنا کرنا فی الحقیقت بقیہ سچے ایمانداروں کی حفاظت کرنا ہے۔

مرتد کا وجود ایک مجسم فتنہ ہے۔ جس سے کمزور اور سادہ لوح مسلمانوں کے خیالات میں تشویش اور ان کے جذبات میں تلاطم پیدا ہو سکتا ہے۔

جو لوگ عہد رسالت میں اپنے آدمیوں کو امنوا بالذی انزل علی الذین امنوا وجہ النہار واکفروا آخرہٗ کا مشورہ دیتے تھے۔ ان کی غرض بھی لعلھم یرجعون ہی تھی۔ یعنی یہ کہ کچھ مصنوعی مسلمانوں کو اسلام سے پھرتے دیکھ کر سچے مومنین کو بھی جھوٹ اور باطل کی طرف آنے کی ترغیب ہو گی۔ یا کم از کم یہ خیال کر کے کہ آخر کچھ تو وجہ ہے کہ یہ لوگ اسلام قبول کرنے کے بعد اس سے منحرف ہو گئے ہیں۔ اُن کے دلوں میں بھی ایک طرح کا تردد اور تذبذب پیدا ہو جائے گا۔

اس لئے اسلام نے ارتداد کے مہلک جراثیم کو تباہ کر ڈالنے کے لئے پوری قوت استعمال کرنے کا حکم دیا ہے۔

بہتر ہے کہ مرتد کو اوّلاً سمجھاؤ۔ اس کے شبہات کا ازالہ کرو۔ اگر وہ خدا کی کھلی کھلی آیات دیکھنے اور واضح دلائل سننے کے بعد بھی اپنی معاندانہ ضد اور ہٹ دھرمی پر قائم رہے۔ اور اپنی ہوا و ہوس یا اوہام باطلہ کی پیروی سے باز نہ آئے تو مسلمانوں کی جماعت کو اس کے زہریلے وجود سے پاک کر دو کہ تبین رشد من الغی کے بعد دین میں کوئی اکراہ نہیں ہے۔ لیھلک من ھلک عن بینۃ ویحییٰ من حیّ عن بینۃ

ایک شخص اتفاقاً گھوڑے سے گر پڑا۔ ٹانگ ٹوٹ گئی۔ ہڈی کے ریزے اِدھر اُدھر گھس گئے۔ سول سرجن کا کام یہ ہے کہ ہڈی کو جوڑے۔ زخم صاف کرے پٹی باندھے اور مرہم لگائے۔ لیکن اگر کسی تدبیر سے زخم مندمل نہ ہو سکے، بلکہ اس کے پلوں دوڑنے اور باقی ٹانگ کو بھی خراب اور مسموم کر ڈالنے کا اندیشہ ہو تو کیا اس وقت اس سول سرجن کا یہ ایک مشفقانہ فرض نہیں ہو جاتا کہ وہ

ٹانگ کے مسموم حصہ کو کاٹ کر پھینک دے اور فاسد عضو بدن پر یہ سمجھ کر کچھ رحم نہ کھائے کہ گھوڑے سے گرنا اور ٹانگ ٹوٹ جانا اور مریض کا زخم مندمل نہ ہونا اس کے اختیار میں نہیں تھا۔ اس وقت سول سرجن کا فرض یہ دیکھنا نہیں کہ آیا مریض نے اپنے اختیار سے مرض کو پیدا کیا ہے یا بے اختیاری طور پر پیدا ہو گیا ہے۔ بلکہ اپنے اختیار کو دیکھنا ہے جسے وہ مریض کے بقیہ اعضاء بدن کو بچانے کے لئے استعمال کر سکتا ہے۔

یاد رکھو کہ ارتداد ایک سخت زہریلا مادہ ہے جو جسم مسلم میں پیدا ہو جاتا ہے خدائی سول سرجن جب اس کی تحلیل یا اخراج کی تدبیر سے تھک جاتے ہیں تو آخر الحیل السیف کے قاعدے سے اس عضو فاسد کو کاٹ کر پھینک دیتے ہیں اور وہ ایسا کرنے کے وقت خدا کی طرف سے ولا تاخذکم بھما رأفۃ فی دین اللہ اور واغلظ علیھم کے مخاطب ہوتے ہیں۔

کسی سخت اپریشن کا مشاہدہ کرنے سے بعض اوقات نازک دل عورتیں یا بعض ضعیف القلب مرد بھی غش کھا کر گر پڑتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی کمزور دل ڈاکٹر اس سے متاثر ہو کر اپریشن چھوڑ بیٹھے تو نہیں کہا جا سکتا کہ وہ بڑا رحمدل ہے بلکہ کہا جائے گا کہ وہ اپنے منصب سے معزول کر دینے کے قابل ہے۔

ہم کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیئے کہ اس نے موجودہ عہد انحطاط میں امیر غازی امان اللہ خاں اور ان کے والد مرحوم کو وہ اختیارات بخشے اور ان اختیارات کے استعمال کی توفیق مرحمت فرمائی جو جسم مسلم کو نہایت ہی سمّی آلائشوں سے پاک کرنے اور اصلاح پر لانے کے لئے ضروری تھے۔

اگر بفرض محال یہ صحیح بھی ہو کہ امیر صاحب کے اس فعل سے اشاعت اسلام میں کچھ رکاوٹ پیدا ہوتی ہے تو اس میں پھر بھی کوئی شبہ نہیں کہ حفاظت اسلام میں اس سے بڑی بھاری مدد ملے گی۔ اور شاید قادیان کو کسی چوتھی بکری کو اب مدت تک یہ ہوس نہ ہوگی کہ علانیہ افغانیوں کے اسلام یا ان کی متحدہ قومیت میں، سینگ مار کر کابل کے ذبیحہ خانہ سے شہادت کا فخر حاصل کرے۔

مرزا محمود ہوں یا محمد علی ان کو چاہیے کہ وہ دُوَل یورپ یا سوراجی ہندو، مسلمانوں کو اتنا بے وقوف نہ سمجھیں کہ وہ سب کے سب امیر کابل کو آپ کے کہنے سے اتنا سفاک اور جاہل سمجھ لیں گے کہ وہ دُوَل غیر کے تمام سفراء کو اس قدر مامون و مصئون رکھنے اور افغانی ہندوؤں کو ہندوستانی ہندوؤں سے زیادہ آزادی اور طمانیت عطا کرنے کے باوجود مشق تیغ آزمائی یا بجبر و اکراہ اسلام پھیلانے کیلئے قادیان کی ایک بکری (نعمت اللہ) پر شمشیر چلا کر خوش ہوتے ہیں۔

کوئی شبہ نہیں کہ کسی آدمی کو عمداً قتل کر ڈالنا بڑی سخت چیز ہے۔ مگر قرآن نے جسکو فتنہ کہا ہے وہ قتل سے بھی بڑھکر سخت ہے۔ والفتنۃ اشد من القتل، والفتنۃ اکبر من القتل۔

یہ فتنہ دین حق سے ہٹنے یا ہٹائے جانے کا فتنہ ہے جس پر واحذرھم ان یفتنوک عن بعض ما انزل اللہ الیک میں تنبیہ کیا گیا ہے اور جس کو حضرت ہارون علیہ السلام نے اپنی قوم کے مرتد گوسالہ پرستوں کو مخاطب کرتے ہوئے یاقوم انما فتنتم بہ سے تعبیر فرمایا تھا۔ اور جو ان کفار کا ہمیشہ مطمح نظر رہتا ہے جن کی نسبت قرآن میں کہا گیا ہے:۔

ودّوا لو تکفرون کما کفروا فتکونون	وہ چاہتے ہیں کہ جیسے وہ خود کافر ہیں تم بھی کافر ہو کر ان کی

سواء اور ودّ کثیر من اھل الکتاب لو یردونکم من بعد ایمانکم کفارا حسدا من عند انفسھم اور ولا یزالون یقاتلونکم حتی یردوکم عن دینکم ان استطاعوا	برابر ہو جاؤ۔ بہت سے اہل کتاب از راہ حسد یہ آرزو رکھتے ہیں کہ تم کو ایمان لانے کے بعد پھر کافر بنا ڈالیں اور وہ ہمیشہ تم سے اس لئے جنگ کرتے رہینگے کہ اگر ان کا بس چلے تو تم کو تمہارے دین سے ہٹا دیں۔

اسی فتنہ کے روکنے اور مٹانے کے لئے وہ جارحانہ اور مدافعانہ جہاد بالسیف مشروع کیا گیا جس کا خیال مسلمانوں کے دلوں سے محو کرنے کے لئے لاہوری پارٹی کا الغوی اور محمودی پارٹی کا بروزی نبی مبعوث ہوا ہے۔ پڑھو۔

وقاتلوھم حتی لاتکون فتنۃ و یکون الدین للہ۔	دشمنان اسلام سے اس وقت تک لڑو کہ فتنہ کا وجود نہ رہے اور خدا کا دین ہی غالب ہو کر رہے۔

(جیسا کہ لیظھرہ علی الدین کلہ سے مفہوم ہوتا ہے)۔

صحیح بخاری میں ابن عمر سے اور سنن ابن ماجہ میں عمران بن حصین سے منقول ہے کہ اس فتنہ سے مراد ارتداد کا فتنہ ہے (دیکھو فتح الباری ج ۸ ص ۱۴۰) اور اسی طرح اشارہ صحیح مسلم میں سعد بن ابی وقاص کی روایت میں موجود ہے۔

پس اسلام کا سارا جہاد و قتال خواہ ہجوم کی صورت میں ہو یا دفاع کی صرف مرتد بننے یا بنانے والوں کے مقابلہ میں ہے۔ جس کی غرض یہ ہے کہ فتنہ ارتداد یا اس کے خطرہ سے مومنین کی حفاظت کی جائے۔ اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ مرتدین کا جو مجسم فتنہ ہیں استیصال ہو اور مرتد بنانے والوں کے حملوں اور تدبیروں اور ان کی شوکت و قوت کو جس سے وہ مسلمانوں کے ایمان کو موت کی دھمکی دے سکتے ہیں ہر ممکن طریقہ سے روکا جائے یا توڑا جائے۔

چنانچہ کفار اگر جزیہ دے کر اسلامی رعایا بننے یا مسلمانوں کے امن میں آجانے یا باہمی مصالحت اور معاہدہ کی وجہ سے مسلمانوں کو عملاً مطمئن کر دیں کہ وہ ان کے دین میں کوئی رخنہ اندازی نہ کریں گے۔ اور ان کے غلبہ اور شوکت کی وجہ سے مسلمانوں کو مرتد بنائے جانے کا کوئی اندیشہ باقی نہ رہے گا تو ایسی اقوام کے مقابلہ میں مسلمانوں کو ہتھیار اٹھانا جائز نہیں۔

حتی یعطوا الجزیۃ عن ید وھم صاغرون
یہاں تک کہ وہ جزیہ ادا کریں ہاتھ سے ذلیل ہو کر

وان احد من المشرکین استجارک فاجرہ حتی یسمع کلام اللہ ثم ابلغہ مأمنہ
اور اگر مشرکین میں سے کوئی تم سے پناہ مانگے تو تم اس کو پناہ دے دو یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے پھر اس کو اس کی امن کی جگہ پہنچا دو۔

وان جنحوا للسلم فاجنح لھا وتوکل علی اللہ۔ فان اعتزلوکم فلم یقاتلوکم والقوا الیکم السلم فما جعل اللہ لکم علیھم سبیلا ۰ وان نکثوا ایمانھم من بعد عھدھم وطعنوا فی دینکم فقاتلوا ائمۃ الکفر۔
اور اگر وہ صلح کے لئے جھکیں تو تم بھی اس کے لئے جھک جاؤ اور خدا پر بھروسہ کرو پھر اگر وہ تم سے علیحدہ رہیں اور نہ لڑیں اور صلح کی سلسلہ جنبانی کریں تو پھر اللہ تم نے ان کے مقابلہ میں تم کو کوئی راستہ نہیں دیا اور اگر عہد و پیمان کے بعد اپنی قسمیں توڑ ڈالیں۔ اور تمہارے دین پر زبان درازی کریں تو لڑو تم کفر کے سرداروں سے۔

پس جہاد بالسیف خواہ ہجومی ہو (یعنی بطریق حفظ ما تقدم) یا دفاعی (یعنی بطریق چارہ سازی) صرف مومنین کی حفاظت کے لئے۔ اور یہ ایک ایسا فطری حق ہے جس سے کوئی عقلمند اور مہذب انسان مسلمانوں کو محروم نہیں کر سکتا۔

اس لئے احکام جہاد کی نسبت جو قرآن میں بکثرت موجود ہیں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ لا اکراہ فی الدین اور افانت تکرہ الناس حتی یکونوا مومنین کے معارض ہیں بلکہ کہا جائے گا کہ دین میں کوئی اکراہ نہیں۔ البتہ جو فتنے دین میں رخنہ ڈالتے ہوں ان کے روکنے میں ضرور اکراہ ہے۔ یعنی جہاں تک مسلمانوں کی طاقت میں ہوگا فتنہ کو اجازت نہیں دی جائے گی کہ وہ مسلمانوں کی جماعت میں سر نکالے یا نشوونما پائے۔

اگر اسلام کی اسی حفاظت خود اختیاری کے معنی اس کا بزور شمشیر پھیلایا جانا ہے تو میں اقرار کرتا ہوں کہ بلاشبہ ایسی حفاظت کے لئے شمشیر استعمال ہوئی ہے اور برابر ان لوگوں کے ہاتھوں سے جنہیں خدا ایسی قوت اور توفیق بخشے گا استعمال ہوتی رہے گی۔ الجہاد ماض الی یوم القیامۃ۔

خواہ قادیان کا متنبی اپنے قلم کی چوں چوں سے کتنا ہی اس تلوار کی جھنکار کو پست کرنا چاہے۔

ہم بحمد اللہ خوب سمجھتے ہیں کہ اسلام کے بہت سے دانا دشمنوں نے اس امر کی حمایت میں کہ اسلام ہرگز بزور شمشیر نہیں پھیلا موٹی موٹی کتابیں لکھی ہیں اور کیسی خوب صورتی اور دانائی سے ایک سچی بات کہہ کر دوسری سچی بات (جہاد بالسیف) کی اہمیت اور فرض کو مسلمانوں کے دلوں سے محو کرنا چاہا۔ اور اسلام کے بہت سے نادان دوست بھی اُن کی اس منافقانہ ہمدردی کا شکار ہو گئے ہیں۔ اور انہوں نے اپنی اصلاح کی قینچی سے مسئلہ جہاد کے بازو کتر ڈالے ہیں لیکن یاد رکھئے کہ قائمین بالحق کا گروہ نہ تو کسی کی تجہیل اور تحمیق سے ڈرتا ہے

اور نہ کسی کی مکاری اور چرب لسانی سے پسیجتا ہے۔

وہ بلاخوف تردید کہتا ہے کہ تم حقیقت جہاد سے جاہل ہو۔ اور خدائے قدوس کی انتہائی وفاداری اور اس کی راہ میں شجاعانہ سرفروشی کو اگر تم وحشیانہ حرکت اور مذہبی دیوانگی سے موسوم کرتے ہو تو ہم اپنی دیوانگی اور تمہاری فرزانگی کی نسبت مولانا رومیؒ کی زبان میں صرف اتنا ہی کہہ سکتے ہیں ؎

آزمودم عقلِ دور اندیش را | بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را
اوست دیوانہ کہ دیوانہ نہ شد | اوست فرزانہ کہ فرزانہ شد،

بہر حال قتل مرتد یا جہاد بالسیف کا حکم مسلمانوں کو فتنہ سے محفوظ رکھنے کے لئے ہے جس کا اول مخاطب امام صاحب اقتدار ہوتا ہے جن ممالک میں مسلمانوں کا امام صاحب اقتدار نہ ہو وہاں عام مسلمان اس قسم کے احکام کے مکلف نہیں ہیں (جیسے ہندوستان ہے) براہِ علیہ ہندوستان کے مرتد یا الخیر مسلم اقوام کو نعمت اللہ خاں کے قتل سے خوف کھانے کی کوئی وجہ نہیں۔ بلکہ خود افغانستان کی غیر مسلم رعایا یا مستامنین کو بھی جیسا کہ مشاہدہ کیا جا رہا ہے کوئی خطرہ نہیں۔

لاہوری پارٹی کے امیر کی سمجھ میں ابھی تک یہ فلسفہ نہیں آیا کہ ایک ہندو پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم کو نعوذ باللہ جھوٹا سمجھ کر حکومت افغانستان کے ماتحت آزاد ہے ایک عیسائی یا یہودی آپ کو نعوذ باللہ مفتری قرار دے کر حکومت افغانستان کے کسی عہدہ پر بھی فائز ہو سکتا ہے۔ لیکن ایک مسلمان یہ کہہ کر خاتم النبیین کے یہ معنی ہیں یہ نہیں (یعنی خاتم النبیین کا تاویل باطل کے پردہ میں، انکار کر کے، واجب القتل ہو جاتا ہے۔

مجھے افسوس ہے کہ ایسی سیدھی اور موٹی سی بات امیر جماعت احمدیہ کی سمجھ میں کیوں نہیں آتی۔ وہ کروڑوں انسان جو برٹش قلمرو سے باہر رہتے ہیں اور انہوں نے آج تک انگریزوں کی حکومت اپنے اوپر قبول نہیں کی، آزاد ہیں کہ جو چاہیں قانون اپنے لئے بنائیں اور جس طرز سے چاہیں زندگی بسر کریں انگریزی حکومت کو ان سے کوئی سروکار نہیں۔ لیکن وہ شخص جو برٹش حکومت اور برٹش قانون کو قبول کر کے انگریزی رعایا بن چکا ہے وہ چاہے بغاوت کا جھنڈا کھڑا کر دے اور سڈیشن یا انار کی پھیلائے اور حکومت کے قانون کو توڑے ساتھ ہی زبان سے یہ بھی کہتا رہے کہ میں انگریزوں کی وفادار رعایا میں سے ہوں حکومت اس سے اغماض نہیں کر سکتی۔ حکومت اگر اس کے لئے پھانسی یا حبس دوام کی سزا تجویز کرے تو یہ سوال نہیں کیا جا سکتا کہ جب کروڑوں، آدمی دنیا میں انگریزی حکومت سے باہر ایسے موجود ہیں جو انگریزی قانون اور اس کی حکومت کو قطعاً نہیں مانتے۔ اور حکومت ان سے کوئی تعرض نہیں کرتی تو کیا وجہ ہے کہ رعیت ہونے کا اقرار کرنے والے شخص کو سڈیشن کے جرم میں اس قدر سخت اور سنگین سزا دی جا رہی ہے۔

خوب سمجھ لو کہ جو شخص اسلام میں داخل ہوا وہ اس کے حلقۂ حکومت میں آگیا۔ اور اس نے اسلام کے پورے قانون کو اپنے حق میں قبول کر لیا۔ اب اگر وہ اسلام کا زبانی دعویٰ رکھتے ہوئے اسلام سے نکلنا چاہتا ہے اور اس کے قانون کو توڑنا چاہتا ہے۔ اور خاتم النبیین کی رعیت بننے کے بعد کسی، کذاب کو جدید نبی مان کر فی الحقیقت آپ کے دعوائے خاتم النبیین کو،

جھٹلاتا ہے وہ اسلام کا باغی ہے۔ پس اسلام کی طرف سے وہ یقیناً ایسی سزا کا مورد ہوگا۔ جس کے موردوہ غیر مسلم لوگ نہیں ہیں جو ابھی تک اسلام کے حلقہ میں داخل ہی نہیں ہوئے اور جو من شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر کی تہدید آمیز آزادی سے ابھی تک متمتع ہو رہے ہیں۔

امیر جماعت احمدیہ سوال کرتے ہیں کہ:۔

"اگر مسلمان حکومتیں اپنے ملکوں میں یہ قانون بنائیں گی کہ غیر مسلم کو ان کے ملک میں اپنے مذہب کی تبلیغ کی اجازت نہیں تو اس کے بالمقابل کیا عیسائی طاقتیں اسی قسم کا قانون اسلام کے خلاف بنانے میں حق بجانب نہ ہوں گی کہ ان کی حکومت میں تبلیغ اسلام کی اجازت نہیں۔ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ یہ ہی کہ تبلیغ اسلام کا کام دنیا میں قطعی طور سے رک جائے گا۔"

اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام اپنے اختیار سے کسی شخص کو مرتد بنائے جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ اسلام کا یہی قانون افغانستان میں بہت پہلے سے رائج ہے اب اگر اس کے جواب میں محمد علی یا مرزا محمود کے مشورہ سے غیر مسلم حکومتیں اپنے قلمرو میں تبلیغ اسلام کو روک دیں تو اگرچہ ہم مسلمان اپنے اس عقیدہ کے موافق کہ آج دنیا میں صرف ایک مذہب اسلام ہی سچا اور مکمل اور عالمگیر مذہب ہو سکتا ہے ان کی اس بندش کو حق بجانب نہیں کہہ سکتے۔ تاہم یہ ضرور ہے کہ وہ ایسا کر گزریں تو ہم اُن کو روک بھی نہیں سکتے نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک طرف اگر نو مسلموں کا سلسلہ رک جائیگا تو دوسری جانب پرانے مسلمانوں کا اسلام سے نکلنا بھی بند ہو جائیگا۔ اور میں خیال

کرتا ہوں کہ موجودہ دولت کی حفاظت غیر موجود دولت کی تحصیل سے اہم اور مقدم ہے کسی چھوٹی سے چھوٹی اور ضعیف سے ضعیف سلطنت کی غیرت بھی اسکی اجازت نہیں دے گی کہ وہ اپنے حاصل شدہ حقوق و فوائد کی حفاظت کیلئے فوج بھرتی کرنے اور بڑی سے بڑی طاقت کی ٹکر اٹھانے سے پہلو تہی کرے۔

حالانکہ وہ جانتی ہے کہ اس تحفظ کے سلسلہ میں اس کے سپاہیوں کا نقصان غنیم کے سپاہیوں سے بہت زیادہ ہوگا۔

پھر کیا وجہ ہے کہ اسلام اپنے پیروؤں کے ایمان کی حفاظت میں ایسی غیرت اور مضبوطی نہ دکھلائے۔ اور اس خوف سے کہ اس کو دوسری جگہ بعض غیر حاصل فوائد سے محروم ہونا پڑیگا اپنے حاصل شدہ حقوق کی حفاظت سے دست بردار ہو جائے۔

مرزا محمود اور محمد علی اپنی ذریات کے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر ... طاقتوں سے ایسا قانون بنوالیں۔ اور تبلیغ اسلام کے قانوناً روک دیئے جانے کا گناہ اور قتل مرتد کے جواب میں قتل کئے جانے والے نو مسلموں کا خون اپنی گردن پر اٹھالیں۔ لیکن وہ یہ امید ہرگز نہ رکھیں کہ افغانی حکومت انکی ان دھمکیوں سے مرعوب ہو کر اپنا اسلامی قانون بدل ڈالے گی۔ اور ان کو یہ موقعہ دیا جائیگا کہ، افغانستان کے نہایت ہی پکے اور سچے مسلمانوں میں ایک جھوٹے نبی کا نام لیکر اور غیر مسلموں کے ایجنٹ بن کر تفرقہ اندازی کرتے پھریں۔

محمد علی صاحب کہتے ہیں کہ اسلام کی فتح اس میں نہیں کہ مسلمان ملکوں میں، دوسرے مذہب کی تبلیغ رکی رہے، بلکہ اسلام کی فتح یہ ہے کہ اسلام کے مخالف

اپنی ساری مادی طاقتوں کو صرف کر لیں۔ اور جس قدر اسلام سے لوگوں کو نکالنے کیلئے زور لگا سکتے ہیں لگا لیں اور آخر دیکھ لیں کہ کس طرح پر وہ ناکام رہتے ہیں۔

بیشک اس نتیجہ کا ہم کو بھی یقین ہے اور خدا کی مہربانی اور امداد سے ہم کو پورا وثوق ہے کہ اسلام کے خلاف سب دجالانہ کوششیں اندرونی ہوں یا بیرونی آخر کار ناکام ہو کر رہینگی لیکن اس تیقن اور وثوق سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہم برائی کی جس کوشش کو ظہور میں آنے سے پہلے روکنے پر قادر ہوں نہ روکیں۔ اور جس بدی کو نمودار ہونے سے قبل ہی ہم بند کر سکتے ہیں بند نہ کریں۔

اسلام صرف بہادر ہی نہیں حکیم بھی ہے۔ وہ اپنی بہادری کے جوش میں اور آخری فتح کے یقین پر احتیاطی تدابیر اور حفاظتی وسائل کو نظر انداز نہیں کرتا۔ بلکہ بطور انجام بینی جہاں تک ممکن ہو فتنہ کے آنے سے پہلے ہی بند لگاتا ہے اگر اس پر بھی فتنہ کسی جگہ نہ رک سکے تو پھر بہادرانہ مقابلہ کرتا ہے۔ اور ہر صورت میں انجام یہی ہوتا ہے کہ حق کی فتح اور باطل کا سر نیچا ہو۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مرتدین پر چڑھائی کی لیکن جب انہوں نے مانعین زکوٰۃ سے (حکم زکوٰۃ ماننے کی وجہ سے) قتال کا ارادہ کیا تو عمر رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ مانع آئے کہ تم کلمہ پڑھنے والوں کے ساتھ قتال کیسے کروگے آپ نے فرمایا کہ واللہ لاقاتلن من فرق بین الصلوٰۃ والزکوٰۃ۔ خدا کی قسم میں ضرور اس شخص سے قتال کرونگا جو نماز اور زکوٰۃ میں فرق کریگا۔

چنانچہ حضرت عمرؓ اور دوسرے معترضین کی سمجھ میں یہ بات آگئی اور حق تعالیٰ نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے فتنہ ارتداد کا استیصال کر

دیا۔ اور حق کو وہ فتح و نصرت نصیب ہوئی کہ بعد میں صحابہ ابوبکر کے اس کارنامہ پر رشک کرتے تھے۔

غور کرنے کا مقام ہے کہ مانعین زکوٰۃ اگر خلیفہ کے مقابلہ میں چڑھ کر آئے تھے تو کیا حضرت عمر جیسے جلیل القدر صحابہ اس کی مدافعت سے ابوبکر صدیق کو روک سکتے تھے۔ کیا انہوں نے فقاتلوا التی تبغی حتی تفئ الی امر اللہ قرآن میں نہیں پڑھا تھا۔ پھر ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب میں یہ فرمایا کہ یہ لوگ باغی ہیں اور خلافت کے مقابلہ پر انہوں نے چڑھائی کی ہے اس لئے ان سے لڑنا ضرور ہے۔ جو جواب دیا وہ صاف بتلاتا ہے کہ اگر کوئی جماعت مسلمان ہونے کے بعد نماز یا زکوٰۃ یا اسلام کے کسی قطعی حکم کے ماننے سے انکار کرے گی تو اس سے ضرور قتال کیا جائے گا۔ تاوقتیکہ وہ راہ راست پر نہ آجائے۔

ہاں حنفیہ نے قتل مرتد کے حکم سے عورت کو مستثنیٰ کہا ہے۔ اگرچہ حبس دوام کا حکم وہ بھی دیتے ہیں یہ اس لئے نہیں کہ جرم ارتداد کی سزا قتل نہیں ہے بلکہ ایک ہی جرم کی دو سزائیں مجرمین کے احوال کے تفاوت کی بنا پر ہیں۔

میں پہلے ثابت کر چکا ہوں کہ ارتداد اسلام سے بغاوت کا نام ہے۔ تو کیا حکمت وانصاف کی بڑی بڑی مدعی گورنمنٹوں کے یہاں بھی بغاوت کے جرم کی سزا ہر ایک مجرم کے حق میں یکساں ہے۔

پس اگر امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ نے بعض نصوص کے اشارہ سے دو مجرموں کے لئے ایک ہی جرم کی دو سزائیں تجویز کی ہیں تو اس پر کیا اعتراض ہے۔ کیا شریعت میں امتہ اور حرہ کی حد میں فرق نہیں ہے۔ حالانکہ جرم ایک۔

ہی ہوتا ہے۔ کیا ایک ہی فعل زنا زانی کے محصن اور غیر محصن ہونیکے فرق سے الگ الگ سزاؤں کا موجب نہیں ہے؟ اسی پر مرتد اور مرتدہ کے جرم ارتداد اور اسکے علاج کو قیاس کرلو۔ یعنی مرتد اور مرتدہ کی سزاؤں کے تفاوت سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ سزا جرم ارتداد کی نہیں ہے۔

زیادہ توضیح چاہو تو برادر محترم مولانا سراج احمد صاحب اور مولانا میرک شاہ صاحب کے مضامین کا مطالعہ کرو۔

اب میں مضمون ختم کرتا ہوں اور جانتا ہوں کہ اس کے جواب میں مجھے بہت سی گالیاں دی جائیں گی۔ لیکن میری پھر بھی یہی دعا ہوگی کہ خدائے قادر و توانا مرزائیوں کو ارتداد کے دلدل سے نکال کر دنیا و آخرت کی سزا سے بچائے اور ہم سب کا خاتمہ ایمان پر کرے۔ اور بادشاہ اسلام امیر افغانستان کو کو اجراء حدود اسلامیہ اور محافظہ حقوق مسلمین کی بیش از بیش توفیق مرحمت فرمائے۔ ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ ھدیتنا وھب لنا من لدنک رحمۃ انک انت الوھاب، ربنا لا تؤاخذنا ان نسینا او اخطانا ربنا ولا تحمل علینا اصرا کما حملتہ علی الذین من قبلنا ربنا ولا تحملنا ما لا طاقۃ لنا بہ واعف عنا واغفر لنا وارحمنا انت مولانا فانصرنا علی القوم الکفرین○

شبیر احمد عثمانی عفا اللہ عنہ۔ دیوبند

۱۸۔ ربیع الاول ۱۳۴۳ھ

****

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تذنیب

یعنی

ضمیمۂ الشہاب

حامداً و مصلیاً خدا کا شکر میں کس زبان سے ادا کروں جس نے میرے ناچیز رسالہ "الشہاب" کو عام و خاص میں وہ حسن قبول عطا فرمایا جس کا مجھے لکھتے وقت کچھ بھی اندازہ نہ تھا۔

الشہاب کی اشاعت شروع ہوئی اور چاروں طرف سے اسکی مانگ ہونے لگی بشکریہ اور تحسین کے بہت سے خطوط آئے۔ مسلمانوں کو توقع سے بڑھ کر فائدہ پہنچا اور حق تعالیٰ نے باطل پرستوں کے دلوں میں ایسی ہیبت ڈالدی کہ آج ڈیڑھ ماہ سے زائد اسکی اشاعت کو ہوا۔ لیکن مرزائیوں کی کوئی پارٹی بھی جواب سے عہدہ برآنہ ہوسکی۔ رسالہ کے بڑھتے ہوئے اثر کو دیکھ کر مرزائی دانت پیس رہے ہیں۔ اور ان کے سینوں پر آرے چل رہے ہیں۔ لیکن جسطرح انہیں قبول حق کی توفیق نہیں ہوئی جواب دینے کی ہمت بھی نہیں ہوسکی۔

البتہ آج ۶ جنوری ۱۹۲۵ء کو ایک رسالہ مسٹر محمد علی امیر جماعت احمدیہ لاہور کا اتفاقاً ہمارے ہاتھ آیا جو سزائے ارتداد کے متعلق اُن کے پہلے رسالہ کی صدائے

بازگشت سے زیادہ نہ تھا۔

اس رسالہ پر ۲۲ دسمبر کی تاریخ پڑی ہے اور دیوبند سے ۱۹ نومبر کو الشہاب غوداں کے نام روانہ ہو چکا تھا لیکن آپ اپنے رسالہ کے بالکل آخر میں لکھتے ہیں کہ:

"مضمون یہاں تک پہنچ چکا تھا کہ رسالہ "الشہاب" ملا" گویا دیوبند سے لاہور ایک ماہ سے زائد میں رسالہ پہنچا۔

بہرحال آپ کے جدید رسالہ کا خلاصہ چند الفاظ میں یوں ہو سکتا ہے کہ کسی شرعی مسئلہ کے اثبات کیلئے تین چیزیں ہیں۔ قرآن، حدیث، اجتہاد ائمہ۔

اجتہاد ائمہ میں خطا اور غلطی ہو سکتی ہے۔ حدیث بھی غلط روایتوں اور غلط فہمیوں سے محفوظ نہیں ہے۔ لہٰذا ان دونوں سے علیحدہ ہو کر صرف قرآن رہ گیا جو محفوظ ہے پس اُس کیخلاف جو چیز آئے گی رد کر دی جائیگی اور خلاف کا مطلب بھی یہ سمجھنا چاہیئے کہ اُن کے مزعوم معنی اور تفسیر کی رُو سے جس مسئلہ میں قرآن خاموش بھی ہو اسکے متعلق صحیح سے صحیح اور ناطق سے ناطق حدیثیں بھی یہ کہکر نظر انداز کر دی جائیں گی کہ اُن کا ذکر قرآن میں اُن کی بتلائی ہوئی تفسیر کے موافق نہیں ہے۔

اسی طرح تمام مسائل اور مباحث کا فیصلہ اس ایک اصول سے ہو جاتا ہے اور کسی قسم کی کد و کاوش کی ضرورت نہیں رہتی"۔ اس تمہید کے بعد آپ نے وُہ آیات قرآنیہ پیش کی ہیں جن میں مرتد کے قتل کئے جانے کا حکم نہیں ہے۔ نہ یہ کہ اس کے قتل نہ کرنے کا ذکر ہے۔ بلاشبہ اُن کا یہ استدلال ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص وَمَن یَقتُل مُؤمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ وَأَعَدَّ لَهُ عَذَابًا عَظِيمًا۔ کو پیش کر کے یہ کہنے لگے کہ قتل عمد

کی سزا بھی قتل نہیں ہے کیونکہ اس آیت میں باوجودیکہ قتل عمد کا ذکر کیا گیا۔ مگر ساتھ کے ساتھ قاتل کی سزا قتل نہیں بتلائی گئی۔

اُس کے جواب میں وُہ کہہ سکتے ہیں کہ یہاں سزا دینا اور نہ دینا دونوں سے سکوت ہے اور دوسری جگہ قرآن میں کُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى فرما کر قاتل کی سزا بتلا دی گئی۔

ٹھیک اسی طرح ان کو سمجھنا چاہیئے کہ فَاقْتُلُوا أَنفُسَكُمْ بھی جو مرتدین ہی کے متعلق قرآن میں دوسری جگہ آیا ہے اُس میں ہم کو تعلیم دیدی گئی۔ کہ ارتداد کی سزا اللہ کے نزدیک قتل ہے۔

آپ نے میرے استدلال قرآنی پر پیچ وتاب تو بہت کھائے اور علما کو گالیاں بھی دیں جو اس نبی کے اُمتی کے لئے نہایت زیبا ہیں۔ جو زعم اخلاق سب وشتم اور لعن وطعن کی تکمیل ہی کے لئے شاید مبعوث ہوا تھا۔ لیکن آیۃ قرآنی فَاقْتُلُوا أَنفُسَكُمْ کا کوئی مطلب پھر بھی نہ بتلا سکے۔ آپ نے میرے استدلال پر جو سوالات کئے ہیں ان کا نمبروار جواب سُنیئے۔

(۱) کیا گوسالہ پرستی سے بنی اسرائیل مرتد تھے؟ اگر یہ صحیح ہے تو کسی قوم کا عقیدہ خواہ کچھ ہو کیا عملی طور پر کسی تعلیم سے انحراف پر ارتداد کا فتویٰ صادر ہو سکتا ہے اور کیا آج لاکھوں مسلمان جو قبر پرستی اور کئی قسم کی من دون اللہ پرستش

(۱) کیا ایمان لانیکے بعد گوسالہ پرستی جس کیساتھ یہ بھی اعلان ہو کر ہٰذا الٰہکم والٰہ موسیٰ فنسی اسکے ارتداد ہونے میں بھی آپ کو کچھ تردد ہے؟ پھر تو کھلے سے کھلی بت پرستی بھی آپکے نزدیک کفر نہیں ہوگی۔ کیا قبر پرست یہ کہتے ہیں



میں مبتلا ہیں، ان پر ارتداد اور سنگساری کا حکم صادر ہو سکتا ہے۔

کہ یہ قبر یا صاحب قبر ہی مسلمانوں کا اور حضرت محمد صلعم کا معبود ہے (معاذ اللہ)

۲۔ قرآن شریف میں صاف مذکور ہے کہ سامری کو جو اس ساری شرارت کا بانی تھا قتل نہیں کیا گیا۔ سوال یہ ہے کہ حکم شریعت کو سب سے بڑے مرتد پر کیوں نہ صادر کیا گیا؟ کیا وہ اس قوم کا مولوی تھا اور اس لئے حکم شریعت سے مستثنیٰ تھا۔

۲۔ سامری اس شرارت کا ایسا ہی بانی تھا جیسا آنحضرت صلعم کے عہد میں عبداللہ بن اُبی رئیس المنافقین قضیہ افک کا بانی اور "الذی تولیٰ کبرہ" کا مصداق اعظم تھا۔ مگر آپ کو شاید یہ خبر نہ ہو کہ حسب روایات صحیحہ اُس پر حد قذف جاری نہ کی گئی۔ حالانکہ حضرت حسان بن ثابت وغیرہ مومنین پر حد قذف جاری ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ منافقین سب سے بڑھ کر شرارتیں کرتے ہیں۔ لیکن اپنے نفاق کی وجہ سے دنیا میں قانونی گرفت سے اپنے کو بچاتے رہتے ہیں۔ جھوٹ بولنے اور بات بنا دینے میں اُن کو کوئی باک نہیں ہوتا ساری کارروائی کر کے بھی قانونی زد سے اپنے کو بچا لیتے ہیں۔ جیسا کہ لاہوری پارٹی باوجودیکہ مرزا صاحب کی اُن کتابوں کے حرف بحرف صحیح و صادق ہونے پر ایمان رکھتی ہے، جو دعاوی نبوت پر مشتمل ہیں۔ مگر از راہ خداع و فریب زبان سے یہی کہتی ہے کہ ہم اُن کو نبی نہیں مانتے۔ سامری کا نفاق اُن سے بھی زیادہ عریق تھا۔ وہ شروع سے ہی مومن نہ تھا بلکہ ایک پکا منافق تھا جو ملت موسوی کی گھات میں رہتا تھا گویا وہ اس عہد کا عبداللہ بن اُبی تھا۔ علامہ سید محمود آلوسی البغدادی رحمہ اللہ روح المعانی میں بہت سے اقوال نقل کر کے فرماتے ہیں وہ بالجملۃ کان عند الجمہور منافقا یظہر الایمان

ویبطن الکفر (روح المعانی صفحہ ۱۱۹) پس جیسا کہ میں رسالہ "الشہاب" میں بتلا چکا ہوں منافق کے احکام کھلے ہوئے مرتد سے علیحدہ ہیں۔ اس لئے سامری ان مرتدین کے ذیل میں نہیں آیا ہاں اس کے فتنہ سے محفوظ کرنے کے لئے حق تعالیٰ نے اس کو یہ سزا دی۔ فَاِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ وَاِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهٗ۔

(۳) اگر فاقتلوا انفسکم کے یہ معنی درست ہیں کہ شرک کرنے والے لوگوں کو قتل کر دو تو اس شرک میں ساری قوم مبتلا ہے۔ اسکے بعد جس قوم بنی اسرائیل کا ذکر ہے وہ کہاں سے آئی تھی۔

(۳) یہ آپ ثابت کیجئے کہ گوسالہ پرستی میں ساری کی ساری قوم مبتلا تھی۔ لفظ قوم تو بارہا قرآن میں ایسے واقعات کے ذیل میں استعمال ہوا ہے جنکا تعلق مخصوص جماعت یا افراد سے تھا۔

(۴) قرآن شریف میں انکی توبہ قبول کرنیکا بھی ذکر ہے۔ اور اسی واقعہ کا ذکر کر کے یہ بھی فرمایا ہے ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ہم نے تمہیں معاف کر دیا تاکہ تم شکر گزار ہو اگر قتل کر دیئے گئے تو وہ معافی جس پر شکر گزاری کا حکم ہوتا ہے اور جو اسی دنیا کی زندگی سے تعلق رکھتی ہے کیا تھی؟

(۴) اگر اس آیت میں ان ہی مقتولین کی معافی کا ذکر ہے تو بیشک نجات اخروی کے اعتبار سے اُن کی توبہ مقبول ہو چکی اور جب اس کی مقبولیت کی اطلاع باقی قوم کو دی گئی تو باہمی تعلقات کی بناء پر ان کو بھی شکر گزار ہونا چاہیئے۔ اگر کسی کے ماں باپ، بھائی، بہن کا جرم حق تعالیٰ معاف کر دے اور اس سے اپنا عذاب اٹھالے تو کیا یہ ایک طرح کا احسان اس شخص پر نہیں ہے۔

دیکھو بنی اسرائیل اذکروا نعمتی التی انعمت علیکم میں اُن بنی اسرائیل کو خطاب ہو رہا ہے جو آنحضرت صلعم کے عہد میں موجود تھے۔ اور جس انعام کا ان پر ذکر کیا گیا ہے مثلاً فرعون کے ہاتھ سے نجات دلانا دریا سے پار کرنا وغیرہ وغیرہ وہ ان بنی اسرائیل سے متعلق نہیں بلکہ ان کے اسلاف سے متعلق تھا۔ اسی طرح یہاں بھی سمجھ لو۔

اور اگر آپ کے نزدیک دنیا میں ہی ان کا جرم معاف ہو چکا تھا تو ان الذین اتخذوا العجل سینالہم غضب من ربہم وذلۃ فی الحیٰوۃ الدنیا" کس طرح صحیح ہو گا کیا خدا تعالیٰ ایک جرم معاف کر کے پھر اسی پر سزا بھی دیتا ہے۔

(۵) کیا یہ صحیح ہے کہ راغب جیسے امام لغت نے فاقتلوا انفسکم کے معنی یہ بھی لکھے ہیں قیل عنی بقتل النفس اماطۃ الشہوت یعنی قتل نفس سے مراد شہوت کا دور کرنا ہے تو وہ تصریح اور ایضاح رہی جس کا مولوی صاحب کا دعوٰی تھا۔

(۵) راغب نے یہ معنی خود اختیار نہیں کئے کسی اور کا قول نقل کیا ہے۔ وہ بھی بصیغہ تمریض۔ اور پتہ نہیں کہ اس کا قائل کون ہے اور کس رتبہ اور درجہ کا ہے۔ ایک ایسے مجہول قائل کے غیر معروف قول کے مقابلہ میں کیا۔ ان الذین اتخذوا العجل سینالہم غضب من ربہم وذلۃ فی الحیٰوۃ الدنیا سے دست بردار ہو جائیں گے۔ کیا اماطۃ الشہوات اور نفس کشی بھی خدا کا غضب اور ذلت ہے ایسے غیر ناشی عن الدلیل احتمالات کسی مضمون کی صراحت اور وضوح کو باطل نہیں کر سکتے۔

*

یہ تو امیر جماعت احمدیہ لاہور کی قرآن دانی کا حال تھا اب حدیث فہمی کا نمونہ دیکھئے۔

میں نے سنت رسول اللہ صلعم کے ذیل میں چند احادیث قولیہ صحیحہ پیش کی تھی آپ فرماتے ہیں کہ یہ تو نبی کریم صلعم کے اقوال وارشادات ہیں۔ سنت رسول اللہ صلعم تو آپ کا عمل ہوتا ہے۔ عمل دکھلاو۔

بلا شبہہ جو لوگ احادیث رسول اللہ صلعم سے گھبراتے اور بھاگتے ہیں خدا کی لعنت سے کچھ ایسے خبطی ہو جاتے ہیں کہ موٹی موٹی چیزوں کے سمجھنے کا مادہ بھی ان میں نہیں رہتا۔ اور دنیا کی ذلت اور آخرت کی رسوائی سب کو بھول جاتے ہیں۔ کسی ادنیٰ طالب علم سے پونچھ لیا ہوتا کہ علمائے حدیث واصول صرف فعل رسول اللہ صلعم ہی کو سنت کہتے ہیں یا حضورؐ کے قول کو بھی؟ بلکہ اگر قول وفعل میں معارضہ ہو تو۔

قول کو فعل پر ترجیح دیتے ہیں۔

امیر جماعت احمدیہ کا اہمال اور قول وفعل میں امتیاز اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ حضرت معاذ بن جبل رضؓ کی صحیح حدیث قضاء اللہ ورسولہ کو قرآن کے مقابل صحابی کا ایک فعل قرار دیتے ہیں۔ اور پھر کھسیانے ہو کر کہتے ہیں کہ یہ واقعہ اپنی ساری تفصیلات کے ساتھ مذکور نہیں ہمیں کیا علم ہے کہ اس مرتد نے اور کیا کچھ کیا تھا۔ گویا آپ کا جہل (نہ جاننا) بھی بخاری کی صحیح حدیث کو رد کر سکتا ہے۔

یہ امتی تو اپنے نبی سے بھی بڑھ گیا۔ کیونکہ مرزا صاحب تو کسی حدیث کو رد کرنے کے لئے اپنی وحی کی آڑ پکڑتے تھے لیکن آپ کے یہاں ایک چیز کا نہ،

معلوم ہونا بھی اس کے رد کرنے کے لئے کفایت کرتا ہے۔

اجماع ائمہ جو میں نے امام شعرانی کی کتاب سے نقل کیا تھا اس کا جب کچھ جواب نہ بن پڑا تو فرماتے ہیں کہ لیستتاب ابدًا اور لاقتل الا بالحراب اس کے معارض ہے۔

مگر یہ نہ بتلایا کہ یہ جملے اجماع کے مخالف کس طرح ہیں۔ جن بعض لوگوں کی رائے لیستتاب ابدًا کی ہے۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ اگر مرتد قتل سے پہلے ارتداد سے توبہ کرے پھر ارتداد کیا پھر توبہ کر لی اور اسی طرح کرتا رہا تو توبہ قبول ہوتی رہے گی۔ اجماع اس پر ہے کہ مرتد واجب القتل ہے۔ اور ان حضرات کے نزدیک جب توبہ قبول ہو جاتی ہے تو وہ بعد توبہ مرتد ہی نہیں رہتا پھر کیوں قتل کیا جاوے فی الحقیقت یہ جملہ ان علماء کے مقابلہ میں ہے جو فرماتے ہیں کہ تیسری دفعہ مرتد ہونے والے کی توبہ بھی قبول نہیں۔

اور لاقتل الا بالحراب جس جگہ لکھا ہے وہیں اس کی تفصیل بھی موجود ہے کہ حراب سے بالفعل جنگ کرنا مراد نہیں۔ اور آپ خود بھی اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ کی تفسیر میں تسلیم کر رہے ہیں کہ ہر جگہ حراب کے معنی جنگ کرنے کے نہیں ہوتے اور اس کے شواہد قرآن شریف سے پیش کرتے ہیں۔ دیکھو بیان القرآن صد ۶۱۵/۱۲

*

قیاس شرعی جو میں نے حافظ ابن قیم سے نقل کیا تھا اس کا آپ نے کچھ ذکر نہ کیا بلکہ اس کی جگہ ایک دوسری عبارت جو میں نے اس سیاق میں نہیں

لکھی تھی نقل کر دی۔ اور افسوس کہ اس کا بھی کچھ جواب نہ دے سکے۔

*

میرے مضمون میں ایک جگہ آخر الحیل السیف عربی کا یہ جملہ آگیا تھا جسے کاتب نے نسخ میں لکھ دیا آپ اسے آیت قرآنی سمجھ کر قرآن میں تلاش کر رہے ہیں حالانکہ بہتر ہوتا کہ آپ اسے کابل کے اسلحہ خانہ میں تلاش کرتے۔

*

آپ کہتے ہیں کہ جس طرح خلیفۃ المسلمین کو یورپین طاقتوں کے دباؤ سے قتل مرتد کا قانون بدلنا پڑا ان علماء کو بھی ذلیل ہو کر ایک دن ایسا کرنا پڑیگا۔

مگر آپ کو یہیں سے سمجھ لینا چاہیئے تھا کہ علماء ربانیین کو حق تعالیٰ نے کیا جرأت اور قوت قلبی بخشی ہے کہ جو چیز آپ کے ادعا کے موافق یورپین طاقتوں کے دباؤ سے خلیفۃ المسلمین تک کو ماننی پڑی ہے اسے آج تک ہندوستان کے محکوم مولویوں نے نہ مانا تم تمام علماء کو مرزا صاحب کیطرح بزدل اور ڈرپوک نہ سمجھو بحول اللہ وقوتہ ایسے علماء قلیل کثیر برابر موجود رہیں گے جو تلواروں کی چمک اور بندوقوں کی کڑک کے نیچے بھی حق کا اظہار کریں گے۔

اور خدانکردہ اگر افغانستان بھی ایک قانون اسلامی کو تبدیل کر دے گا وہ جب بھی تبدیل نہ کریں گے۔ آپ نے آخر میں چند سوالات کا جو پمفلٹ میں کئے تھے پھر اعادہ کیا ہے۔ لیکن اُن سب کا جواب یہ ہے کہ ناظرین کرام ایک مرتبہ از راہ مہربانی پھر رسالہ الشہاب کو پڑھ جائیں۔

انشاء اللہ تعالیٰ تمام وساوس شیطانیہ کے لئے لاحول کا کام دے گا۔ اور

کوئی ضروری سوال ایسا نہ ملیگا جس کا جواب اس میں موجود نہ ہو میں تطویل کی ضرورت نہیں سمجھتا کیونکہ آپ نے عملاً میرے رسالہ کے سارے مضامین کو تسلیم کر لیا ہے اور جن ایک دو امور کی نسبت یہ دو ایک ورق سیاہ کئے ہیں اسکی شافی اور مبسوط بحث ہمارے رسالہ میں پہلے سے موجود ہے۔

تم ہزار بار برا کہو لیکن جو کاری ضرب "الشہاب" نے تمہارے اصل بنیاد پر لگائی ہے وہ خدا کے فضل سے بے اثر نہیں گئی جن کروڑوں مسلمانوں کو آپ کے مرزا صاحب نے دائرہ اسلام سے نکالا تھا وہ اس رسالہ سے اطمینان پا رہے ہیں اور دنیا میں جو چند نفوس مرزا صاحب نے مسلمان چھوڑے تھے ان کے دلوں میں حق تعالیٰ نے ایسا رعب ڈال دیا ہے کہ وہ اب الشہاب کے کسی مطالعہ کرنیوالے سے اپنے ارتداد کو نہیں چھپا سکتے۔

ایک طرف اگر مرزائی اور آریہ اور عیسائی چند جاہلوں کو مرتد بنا رہے ہیں تو دوسری طرف خدا تعالیٰ کا نور پھیلا رہا ہے۔ بہت سے غافلوں کی آنکھیں کھلتی جاتی ہیں۔ اور بہت سے لوگ اسلام کی فطری کشش سے اسلام کی طرف جذب ہوتے جاتے ہیں۔

كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۚ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ۝

تم جلتے رہو اور غیظ کھاتے رہو۔ ہماری طرف سے یہ جواب ہے۔

مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۔

الراقم

شبیر احمد عثمانی دیوبند

۱۰ جمادی الاخریٰ سنہ ۱۳۴۳ھ

590